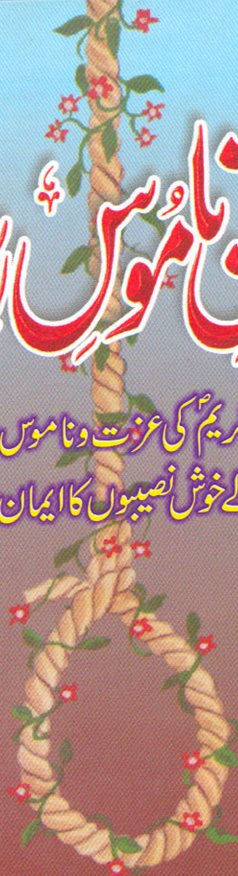
شہیدانِ ناموسِ رسالت ﷺ





حضور نبی کریم ﷺ کی عزت وناموس پر قربان ہو جانے والے خوش نصیبوں کا ایمان افروز تذکرہ



ترتیب وتحقیق

محمد متین خالد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شہیدانِ ناموسِ رسالت ﷺ

کہنے والے کہتے ہیں کہ آج نعت کا دور ہے' وہ بھول جاتے ہیں کہ ہر دور ہی نعت کا دور رہا ہے کہ یہ صنفِ سخن ازل انوار بھی ہے اور ابد آثار بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نعت' مخالفینِ اِسلام کی لسانی گستاخیوں کے جواب کے لیے وجود میں آئی تھی۔ خود حضور ﷺ کی مبارک رضا اِس میں شامل تھی اور اِس کے خال وخط اور اسلوب واصول بھی زبانِ رسالت ہی نے متعین فرمائے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دل آزار تحریریں بھی لکھی جاتی رہیں' وقت کے راجپال نئے نئے لباووں میں سامنے بھی آتے رہیں اور عصرِ نو کے رُشدی ہنود و یہود کی سرپرستی میں وندناتے بھی رہیں اور حُبِ رسول ﷺ کے دعوے دار محض نعت گوئی میں مصروف رہیں۔ ایسی نعت گوئی قلم قلم اور حرف حرف منافقت ہے کہ اس میں محبت کا ادعا' غیرت کی چنگاری سے محروم ہے۔

؎ محبت خوب ہے' غیرت مگر اس سے فزوں تر ہے

شہیدانِ ناموسِ رسالت ﷺ

حضور نبی کریم ﷺ کی عزت و ناموس پر قربان ہو
جانے والے خوش نصیبوں کا ایمان افروز تذکرہ



ترتیب و تحقیق
محمد متین خالد

فاتح پبلشرز
یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ
اردو بازار لاہور ☏ :7321118


5
ترتیب عنوانات



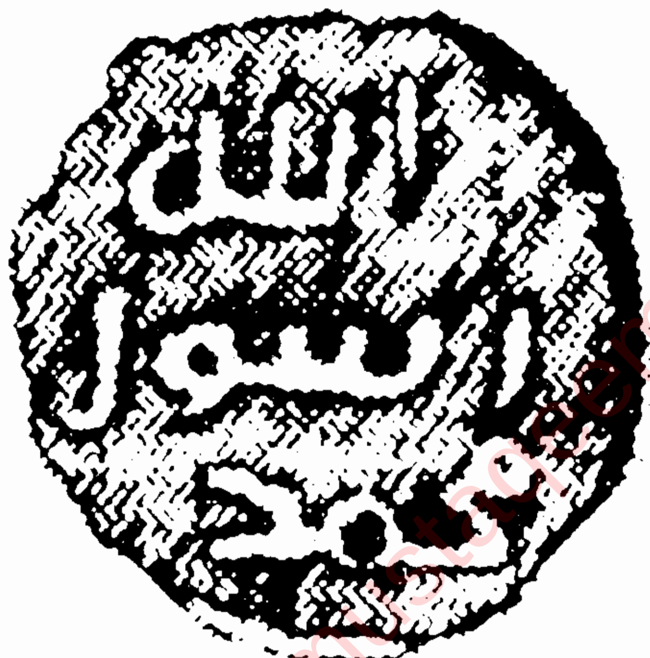

اللهم
صل على محمد وعلى آل محمد
كما صليت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم
انك حميد مجيد
اللهم
بارك على محمد وعلى آل محمد
كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم
انك حميد مجيد

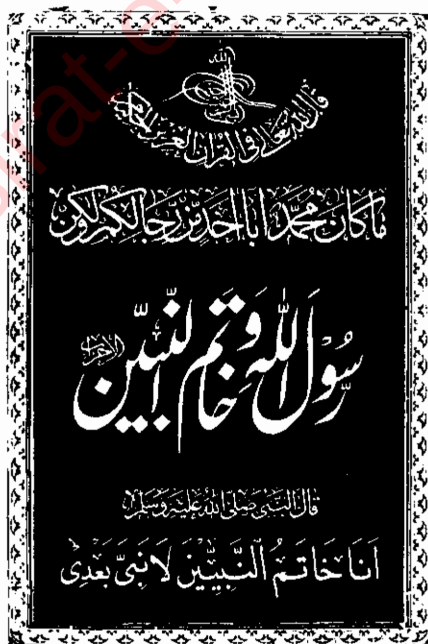
انتساب!

یہ جون 1999ء کا واقعہ ہے۔ برطانیہ کے شہر مانچسٹر میں واقع لڑکیوں کے اہم سکول LEVENSHULME HIGH SCHOOL کے ہال میں تقریری مقابلہ ہو رہا تھا۔ موضوع تھا Famous Religious person (مشہور مذہبی شخصیت) اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک بچی نے حضور نبی کریمؐ کی شخصیت کو اپنی تقریر کا موضوع بنایا۔ اپنی تقریر کے دوران یہ بچی جب بھی لفظ ''محمد'' ادا کرتی تو غیر ارادی طور پر ''صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' نہ کہتی۔ کلاس میں بیٹھی ایک بچی کو یہ حرکت انتہائی ناگوار گزری' اس غیر ارادی لغزش کو ایک دو دفعہ برداشت کرنے کے بعد اس بچی سے نہ رہا گیا پھر وہ اچانک اپنی نشست سے اٹھی اور زوردار الفاظ میں بے اختیار پکار اٹھی۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ سکول کی تاریخ میں پہلی بار کسی نے نظم وضبط کی خلاف ورزی کی تھی۔ بچی کو فوری طور پر ہال سے باہر نکال دیا گیا۔ یہودی وعیسائی اساتذہ اور ماہرین نفسیات پر مشتمل بورڈ نے بچی سے متعدد سوالات کئے اور اس بے ساختہ حرکت کے بارے پوچھا۔ بچی نے ہچکیوں اور سسکیوں میں ایمان افروز جواب دیا کہ جب کوئی شخص ہمارے پیارے نبی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اسم گرامی استعمال کرتا ہے تو اس پر فرض ہے کہ وہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ادا کرے۔ میں اس پر کوئی Compromise نہیں کرسکتی۔ حضور نبی اکرمؐ کا اسم گرامی سن کر صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کہنا میرا ایمانی اور دینی استحقاق اور فریضہ ہے' اس فریضہ اور استحقاق کی ادائیگی سے مجھے ڈسپلن کے نام پر نہیں روکا جاسکتا۔

برطانیہ ایسے سیکولر' مادر پدر آزاد اور جنسی بے راہروی کے شکار معاشرے میں ایسی بچیاں اسلام کے روشن اور محفوظ مستقبل کی ضمانت ہیں۔ میں اس کتاب کا انتساب اس بچی کے نام کرتا ہوں۔

ویل ڈن صبا حسین چوہدری!......ویل ڈن!! وی آل پراؤڈ آف یو!!!




قال الله تعالى في القرآن العظيم
ما كان محمد أبا أحد من رجالكم ولكن
رسول الله وخاتم النبيين
قال النبي صلى الله عليه وسلم
أنا خاتم النبيين لا نبي بعدي

قربان جانے والوں کے قربان جائیے!

حضور خاتم النبیین علیہ التحیہ و الثناء سے لامحدوداور غیر مشروط محبت واحترام ہر مسلمان کے ایمان کی بنیاد ہے۔ وہ جب تک نبی کریم ﷺ کو اپنے والدین' اولاد' عزیز رشتہ دار' دولت و کاروبار حتی کہ خود اپنی جان سے زیادہ عزیز ترین نہ جانے' مسلمان نہیں کہلوا سکتا۔ یہ قانون قرون اولیٰ کے صحابہ کرامؓ سے لے کر قیامت کی آخری صبح تک اسلام قبول کرنے والے ہر شخص پر یکساں لاگو ہے۔ اس سے ذرہ برابر روگردانی' رتی بھر انحراف' معمولی لاپروائی اور ادنیٰ سی بے حسی بھی ایک مسلمان کو احسن تقویم کی چوٹیوں سے اٹھا کر سے اسفل سافلین کی اتھاہ گہرائیوں میں گرادیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی بدبخت' مسلمانوں کے مرکز نگاہ اور محبوب ترین شخصیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان میں ادنیٰ سی بھی توہین کرتا ہے تو غیرت وحمیت سے سرشار ہر مسلمان کا خون کھول اٹھتا اور اس کے رگ و پے میں لاوا سا دوڑنے لگتا ہے' دیکھتی آنکھوں اس کا وجود غیظ وغضب کی کڑکتی بجلیوں کا روپ دھار لیتا ہے اور اسے اس وقت کسی پہلو قرار نہیں آتا جب تک وہ شاتم رسول کے ناپاک اور غلیظ وجود سے اس دھرتی کو پاک نہیں کر لیتا۔ اس ہدف تک رسائی کے لیے وہ رات دن بے تاب رہتا ہے۔ اس جاں گسل مہم کو سر کرنے کے لیے چاہے اسے لاکھ چٹانیں اور خون کے سمندر ہی کیوں نہ عبور کرنا پڑیں' اس کے بے قابو جذبوں' ناقابل تسخیر جنوں اور کہسار صفت اخلاص و وفا کے سامنے کفر کی ہر طاقت گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ راہ محبت کا یہ راہی اور لشکر عشق کا یہ سپاہی جانتا ہے کہ اس کی یہ جدوجہد ہی حاصل زندگی ہے۔ اسی میں اس کی بقا ہے اور یہ کہ یہ رہگزر شفاعت محمدی ﷺ کی طرف اور یہ راستہ اللہ کی خوشنودی کی طرف جاتا ہے۔

یہ شہیدانِ عشق و وفا اپنے ہاتھوں میں حق و صداقت کی مشعلیں اٹھائے' اپنے سینوں میں عشق مصطفی ؐ کی شمعیں جلائے' اپنے دماغوں میں شہادت کی آرزو سمائے اور نظروں میں تصورِ مدینہ جگائے موت کا انتخاب خود کرتے ہیں۔ اِسی لئے تو موت ان سے دہشت زدہ رہتی ہے' ان کی روحیں دادورسن کی طالب ہوتی ہیں' کسی شخص کو جتنی محبت زندگی سے ہوتی ہے' اس سے ہزار گنا پیار انہیں موت سے ہوتا ہے۔ بلاشبہ اسلام کی عزت و آبرو انہی کے دم قدم سے ہے۔

اِن شہیدان ناموسِ رسالتؐ نے گورے اور کالے انگریز کی عدالت کے ایوانوں میں عزیمت و استقامت کا وہ مظاہرہ کیا کہ ہر مسلمان عش عش کر اٹھا اور کفر انگشت بدنداں ہو کر رہ گیا۔ وکلاء کے دلائل اور بے شمار دباؤ کے باوجود انہوں نے عدالت میں جس شان و شوکت اور ذوق و شوق کے ساتھ اپنے جرم کا بار بار اعتراف کیا' عدالتی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ پھانسی کی سزا سنتے ہی اپنی مرادوں کے برآنے پر وہ وجد میں آ کر خوشی سے رقص کرتے ---اپنی قسمت پر ناز کرتے' حلیف و حریف حیران رہ جاتے کہ موت کی سزا کے منتظران جاں نثاروں کا وزن جیل کی کال کوٹھڑیوں میں کیسے بڑھ جاتا؟

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

کوئی لہجہ' کوئی طرزِ بیان' کوئی لغت' کوئی پیرایۂ اظہار اتنی تاب نہیں رکھتا کہ وہ ان مجاہدین کی جرأت بے مثل کا قصیدہ کہہ سکے---خراج تحسین پیش کر سکے---یہی وجہ ہے شہیدانِ ناموسِ رسالتؐ آج بھی ہماری آنکھوں میں رہتے' دلوں میں بستے اور سانسوں میں مہکتے ہیں--- یہ ہماری جمع پونجی ہیں---یہ ہمارا اثاثہ ہیں---یہ ہمارا سرمایہ افتخار ہیں---یہ اس گم کردہ راہ قوم کے راہنما اور برگشتہ بخت ملت کے محسن ہیں۔

غیرت' حمیت اور عشق و مستی سے عاری نام نہاد مسلمان اس لذت' اس سرمستی اور اس سرشاری سے نا آشنا ہیں۔ ویران کھنڈروں کی بوسیدہ چھتوں میں پناہ گزیں چمگادڑوں کو اس کا عرفان ہو سکتا ہے نہ ادراک اور نہ پہچان--- خوف سحر سے لرزاں--- تقدیر' تدبیر اور تعمیر کے لیے ترساں---منزل کی بجائے پگڈنڈیوں کے خم و پیچ میں الجھ کر رہ جانے والے ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔

شہیدانِ ناموسِ رسالتؐ...... آج بھی فردوس بریں سے ہر مسلمان سے شکوہ کناں ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ سے عشق و محبت کا دعویٰ کرنے والو! دعویٰ صرف کھوکھلے الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے کچھ عملی تقاضے بھی ہوتے ہیں...... اپنے دعوائے عشق کے سچا ہونے کا کوئی جیتا جاگتا ثبوت دو اور

ثابت کروا اپنی محبت حضور نبی کریم ﷺ سے۔ دعوے اور ثبوت کے لیے زبان نہیں، خود حرکت میں آنا چاہیے۔ آزمائش اخلاص کی ہوتی ہے۔ دعوے پر پورا اترنے والے اپنی حقیقی منزل کو پالیتے ہیں لیکن حمیت سے عاری اور غیرت سے ناآشنا برائے نام مسلمان شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے پر مجبور ہوتے ہیں---کم از کم مشاہدہ اور تاریخ تو یہی کہتی ہے۔

شہیدانِ ناموسِ رسالتؐ کو وارثانِ منبر و محراب اور خداوندانِ مکتب سے بھی شکایت ہے کہ اب یہاں سے دار و رسن کی کوئی بات نہیں اٹھتی۔ محبت و معرفت سے تہی دامن، مسجد و مدرسہ شاہین بچوں کو خاکبازی کا سبق دے رہے ہیں۔ منکرین ختم نبوت کی سرکوبی کے لئے سنت صدیق اکبرؓ پر عمل درآمد نہیں ہو رہا۔ گستاخانِ رسولؐ کے لیے ننگی تلوار سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے نقش قدم پر چلنے والے نجانے کہاں چلے گئے ہیں؟ قادیانیت، یوسف کذاب اور گوہر شاہی ایسے فتنوں کا سر کیوں نہیں کچلا جاتا؟ ان اہم اور سلگتے مسائل سے بے اعتنائی برت کر فرقہ واریت ایسے تاجرانہ مباحث میں الجھ جانے والے حاملان دین و ملت، روزِ محشر کس منہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے شفاعت کے طلب گار ہوں گے؟ اپنے نام کے ساتھ قطب الاقطاب، ولی کامل، امین علم لدنی، واقف رموز حقیقت، ماہر علوم شریعت، قطب ربانی، صوفی باصفا، عاشق غوث الوریٰ، مرشد حق، رہبر شریعت، پیر طریقت، سگ مدینہ، زبدۃ العلماء، نابغہ عصر، مفکر اسلام، حضور قبلہ، حضرت علامہ، عظیم عاشق رسولؐ اور فخر اہلسنت ایسے ہیوی ویٹ، من گھڑت اور سرقہ شدہ القابات استعمال کر کے سادہ لوح مخلوق کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے آخر کس طرح شافع محشر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے؟ غرور، گھمنڈ اور ڈھٹائی کی کوئی حد ہوتی ہے۔ مرنے سے پہلے انہیں ایک بار ضرور سوچ لینا چاہیے کہ آخر وہ کس کو دھوکہ دے رہے ہیں اور کب تک؟ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا تھا ؎

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
فیصلہ ترا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

ہمارے ہاں کسی کا بیٹا، بھائی یا قریبی عزیز فوت ہو جائے تو رسم دنیا نبھانے کے لیے لواحقین سے تعزیت کی جاتی ہے لیکن ان غازیوں اور مجاہدوں کی قید و شہادت پر لوگوں نے ان کے لواحقین کو مبارکبادیں پیش کیں اور خود شہیدوں کی عفت مآب ماؤں نے فرطِ مسرت سے مٹھائیاں تقسیم کیں۔ یہ لائق رشک کردار پوری ملت اسلامیہ کے لیے باعث صد فخر و ناز ہے۔

اسلام کی سربلندی اور امت مسلمہ کی عظمت رفتہ کی بحالی کی خاطر ان شہیدانِ ناموسِ رسالت ﷺ نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کر کے اسلام کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اپنے

مقدس لہو سے چمن اسلام کی آبیاری کرنے والے یہ وہ خوش قسمت ہیں جن پر روح فطرت ناز کرتی ہے۔ یہ روشن کردار ہماری تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ ان شہیدوں کی زندہ قبریں اہل عالم کے لیے آج بھی چشمہ نور کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ لوگ اسلام کے مقدر کے درخشاں ستارے ہیں۔ ان کی رفعت پر پوری ملت اسلامیہ رشک کرتی ہے۔ فردوس بریں بازو پھیلائے محبوب کائنات ﷺ کے ان محبوبوں کی منتظر ہے۔ حور وغلمان ایسے ہی قدسیوں کی راہ تکتے ہیں۔ فرشتے جبریل امیںؑ کی قیادت میں اپنے ہاتھوں میں تاجِ عظمت لیے انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ اللہ کی رضا پر راضی ہو جانے اور اس کے محبوب کی آبرو پر فدا ہو جانے والے ان خوش بختوں کو اللہ تعالیٰ اپنے دیدار سے مشرف فرماتے ہیں۔

شوقِ شہادت کی یہ سبیل آج بھی جاری وساری ہے۔ کاتب وقت نے ہر کوچہ وبازار کی پیشانی پہ یہ تحریر جمیل رقم کردی ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

خاکپائے شہیدانِ ناموسِ رسالتؐ
محمد متین خالد
لاہور



شکریہ !!!

- مجاہد ختم نبوت برادر گرامی جناب محمد طاہر رزاق (معروف سکالر) کا جنہوں نے اس کتاب کو مرتب کرنے کی بھرپور تحریک دلائی۔
- مجاہد تحفظ ناموس رسالتؐ جناب حافظ شفیق الرحمٰن (معروف کالم نگار) کا جنہوں نے قدم قدم پر میری راہنمائی فرمائی
- اسلام اور پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ جناب محمد عطاء اللہ صدیقی اور سفیر محبت محترم ڈاکٹر لیٰسین رضوی (اسلام آباد) کا جنہوں نے ہر مرحلہ پر حوصلہ افزائی فرمائی۔
- صاحب علم و دانش جناب محمد صدیق شاہ بخاری کا جنہوں نے کتاب کی تحقیق و تدوین میں ہر ممکن ہاتھ بٹایا۔
- غرقاب عشق رسولؐ محترم پروفیسر محمد اقبال جاوید (گوجرانوالہ) کا جنہوں نے اس کتاب پر ایمان پرور تقریظ لکھ کر کتاب کو چار چاند لگا دیئے۔
- وکیل ختم نبوت جناب غلام مصطفیٰ چوہدری (ایڈووکیٹ) اور جناب میاں محمد نوید انجم (چیئرمین سگما کمپیوٹرز) کا جنہوں نے بے حد مفید مشورے عنایت فرمائے۔
- معروف دانشور و کالم نگار جناب جمیل احمد عدیل کا جنہوں نے کتاب کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے کئی مفید تجاویز دیں۔
- شاہین ختم نبوت حضرت مولانا اللہ وسایا اور صاحب جنوں صاحبزادہ طارق محمود کا جنہوں نے مکمل سرپرستی فرمائی۔

- مجاہدین ختم نبوت جناب قمر نسیم (پشاور) اور جناب عابد ترنگزئی (پشاور) کا جنہوں نے بے حد محبت وشفقت کا اظہار فرمایا۔
- سراپا محبت جناب رانا محمد عقیل اور ہر دلعزیز شخصیت جناب محمد جاوید چوہدری کا جنہوں نے حرمین شریفین بالخصوص بارگاہِ رسالت ﷺ میں اپنی پُر تاثیر دعاؤں میں ہمہ وقت اس ناکارہ کو یاد رکھا۔
- جناب راجا رشید محمود (ایڈیٹر ماہنامہ نعت) اور جناب خواجہ عابد نظامی (ایڈیٹر ماہنامہ درویش) کا جن کے رسائل سے میں نے کافی استفادہ حاصل کیا۔
- مجاہدین تحفظ ناموس رسالت ﷺ جناب محمد نواز کھرل اور جناب عمران حسین چوہدری (برطانیہ) کا جن کے اخلاص ووفا سے یہ کتاب جلد مکمل ہوئی۔
- مجاہدین ختم نبوت جناب ظفر اقبال شیخ اور جناب ثاقب خورشید کا جنہوں نے جرمنی سے متعدد فون اور خطوط کے ذریعے اس کتاب پر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔
- مجاہد ختم نبوت جناب حاجی عبدالحمید رحمانی اور اراکین عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ننکانہ صاحب کا جنہوں نے ہمیشہ میری آواز پر لبیک کہا۔
- مجاہدین ختم نبوت جناب چوہدری محمد شفیق، جناب نصیب الٰہی گوجر اور جناب عبدالمجید پہلوان (سابقہ کونسلرز) کا جنہوں نے ہمیشہ میری توقع سے بڑھ کر تعاون کیا۔

کریں کس کس زباں سے شکریہ ادا ہم
کہ الفاظ کم ہیں عنایت زیادہ



سر بیچ کر متاعِ دل وجاں خریدنا

ناموسِ رسالتؐ کے تحفظ کے لیے سرفروشی ایک ایسا سودا ہے جس میں خسارہ نہیں' فائدہ ہی فائدہ ہے کہ اسی سے ایمان کی تکمیل کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی سے محبت کے اعتبار اور وفا کے افتخار کا پتا چلتا ہے کہ یہی واحد پیمانہ ہے اس عظیم وجلیل محبوب ﷺ کی محبت کا' جو وجہِ وجودِ کائنات ہے' جس نے اس ظلمت کدے میں ہدایت' سعادت اور رحمت کی کرنیں برسائیں۔ جس کی ذات پاک سے ہماری حیاتِ مستعار کی ہر آبرو وابستہ ہے۔ جو فی الواقع رُخِ جمالِ الٰہی کا آئینہ ہے اور دستِ فطرت کا وہ عظیم ترین شاہکار ہے جس پر خود حُسن آفرین کو ناز ہے کہ --- طور پر تجلیوں کی بارش اسی وقت تک کے لیے تھی جب تک قدرت کے فن کو اوجِ کمال نہ ملا تھا۔ یہ فن ذاتِ محمدی ﷺ کی صورت میں ظاہر ہو گیا اور تخلیق کو معراجِ کمال نصیب ہو گئی' تو اب فنکار کی بے حجابی کی ضرورت باقی نہ رہی' تخلیق بے حجاب ہو گئی اور خالق چُھپ گیا' کیونکہ اب تخلیق' خالق کی معرفت کے لیے کافی تھی --- یہی وجہ ہے خالقِ حقیقی نے اپنی محبت اور اپنی اطاعت کو اُسی ذاتِ اقدسؐ سے وابستہ کر دیا اور یہی باعث ہے اس امر کا کہ مالک دو جہاں اسؐ کی شان میں ہلکی سی شوخی اور ادنیٰ سی گستاخی بھی برداشت نہیں کرتا --- نہ کسی ماتھے کی کوئی سلوٹ' نہ نگاہوں کا کوئی زاویہ اور نہ ہونٹوں کی کوئی حرکت --- اور تاریخ شاہد ہے کہ ایسی نازیبا سلوٹوں' ایسے ناپاک زاویوں اور ایسی گستاخ حرکتوں کے حامل وجود غبارِ معصیت بن کر اُڑتے رہے ہیں۔ حق یہ ہے کہ جب بھی کوئی غیرت مند' محبوبِ خدا ﷺ کے بارے میں گستاخی کرنے والے کی زبان اس کی گدی سے کھینچ باہر کرتا ہے اور خود دار و رسن کو بوسہ دیتا ہے تو الوہی ہونٹوں پر تبسم سا بکھر جاتا ہے اور ساتھ ہی اس کے لیے جنت کے سبھی ایوان کھل جاتے ہیں کہ وفا کا سوز ہی انسان کو کندن بنایا کرتا ہے اور

؎ محبت جس کو خاکستر کرے گی کیمیا ہو گا

ہماری پندرہ سو سالہ تاریخ کے حاشیے ایسے ہی جاں نثاروں کے لہو سے گلرنگ ہیں جو اشارتاً

اور کنایتاً بھی اپنے نبی کریم ﷺ کی توہین ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کرتے' صراحتاً تو بہت دور کی بات ہے۔ حق یہ ہے کہ وہ شخص جو شانِ رسالت ﷺ میں توہین کا کوئی بول سن کر خاموش رہتا اور محض لفظی ردِعمل پر اکتفا کرتا ہے' اس کی منافقت' دنیاوی اور اُخروی تذلیل پر منتج ہوا کرتی ہے کہ وہ ایمان کی شرطِ اول سے بھی محروم ہے۔ محبوب کی ایک نگہ ناز کے حصول کے لیے محبت ہی چاک گریباں نکل سکتی ہے۔ اور محبت کے بغیر اطاعت کا ہر تصور فریبِ نفس ہے جبکہ ایمان' عمل کے بغیر ایک لفظ ہے بے معنی' ایک جسم ہے بے روح اور ایک خاکہ ہے بے رنگ--- محض پانی' پانی پکارنے سے پیاس نہیں بجھا کرتی اور صرف روٹی روٹی کی رٹ لگانے سے بھوک نہیں مٹا کرتی جب تک پانی پیا نہ جائے اور روٹی کھائی نہ جائے' بعینہٖ خود کو مسلمان' مسلمان کہنے سے انسان' مسلمان نہیں بنتا۔ جب تک اس کا عمل' اس کے ایمان کی تائید نہیں کرتا۔ محض لفظوں کی شطرنج بچھانے سے ناموسِ رسالت مآب ﷺ کے تحفظ کے تقاضے پورے نہیں ہوا کرتے کہ محض لفظی خوشنمائی' اعمال کی سیاہی کی دلیل ہوا کرتی ہے۔

معنی ہیں معدوم' تحریریں بہت
ہے عمل مفقود' تقریریں بہت
بُغض دل میں منہ پہ تعریفیں بہت
کفر دل میں' لب پہ تکبیریں بہت
ایک اہلِ درد ہی ملتا نہیں
ورنہ دردِ دل کی تدبیریں بہت

آج خبر و نظر کے چمن ہیں نہ فکر و عمل کے سمن' ذوق کی رعنائی ہے نہ شوق کی زیبائی' سجدوں کا کیف ہے نہ آنسوؤں کی چمک' کوئی ویرانی سی ویرانی ہے--- زندگی سراب بھی ہے اور خراب بھی---

اور

رہ رہ کے پوچھتی ہے صبا' شاخ شاخ سے
سارے چمن میں درد کا مارا کوئی نہیں؟

کہنے والے کہتے ہیں کہ آج نعت کا دور ہے' وہ بھول جاتے ہیں کہ ہر دور ہی نعت کا دور رہا ہے کہ یہ صنفِ سخن ازل انوار بھی ہے اور ابد آثار بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نعت' مخالفین اِسلام کی لسانی گستاخیوں کے جواب کے لیے وجود میں آئی تھی۔ خود حضور ﷺ کی مبارک رضا اِس میں شامل تھی اور اِس کے خال و خط اور اسلوب و اصول بھی زبانِ رسالت ہی نے متعین فرمائے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دل آزار تحریریں بھی لکھی جاتی رہیں' وقت کے راجپال نئے نئے لبادوں میں سامنے بھی آتے

رہیں اور عصر نو کے رُشدی ہنود و یہود کی سر پرستی میں دندناتے بھی رہیں اور حبِ رسول ﷺ کے دعوے دار محض نعت گوئی میں مصروف رہیں۔ ایسی نعت گوئی قلم قلم اور حرف حرف منافقت ہے کہ اس میں محبت کا ادعا' غیرت کی چنگاری سے محروم ہے۔

محبت خوب ہے' غیرت مگر اس سے فزوں تر ہے

توصیفِ رسالت ﷺ کی معراج' گستاخانِ رسولؐ کے سر کاٹنے اور اپنا سر کٹانے کی عملی کوشش میں پوشیدہ ہے۔ کیونکہ حمیت کے اس جذبے کے بغیر' ایک مسلمان کا وجود ہی بے جواز ہو کر رہ جاتا ہے کہ امت کا اجماع اِسی پر ہے کہ شانِ رسالت مآب ﷺ میں گستاخی کرنے والے کو اُسی لمحے قتل کر دیا جائے کہ یہی اس کی سزا ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ اگر وہ دریدہ دہن مسلمان ہے تو اس کی توبہ کو بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا جائے۔ وہ بہر نوع واجب القتل ہے اور اس سلسلے میں کسی نوع کا تساہل' نہ چرخِ نیلی فام کو گوارا ہے نہ گنبدِ اخضر کو' کہ حضور ﷺ سے ذاتی' جذباتی اور شعوری وابستگی ضروری ہے۔ یہ پاکیزہ تعلق جتنا ڈھیلا پڑتا جائے گا' ایمان بھی اسی قدر کمزور ہوتا چلا جائے گا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ وابستگی' نظریات ہی سے ہونی چاہئے۔ شخصیات سے نہیں۔ حضور ﷺ کی شخصیت سے شخصی اور ذاتی محبت ہی ہمارے دنیاوی اور اُخروی وقار کی ضامن ہے۔ اہلِ مغرب آزادیٔ اظہار کے دلفریب نعروں کی آڑ میں دراصل حضور ﷺ سے مسلمانوں کی شدید ترین محبت کو ختم کر کے اُن کی حمیت اور جمعیت کو پراگندہ کرنے کے درپے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کا فوری قتل طے شدہ بات ہے خواہ وہ خانہ کعبہ کے غلاف ہی سے کیوں نہ لپٹا ہوا ہو۔ اور یہ بھی لازم ہے کہ قاتل عدالت میں اپنا دفاع ہرگز نہ کرے بلکہ قتل کا برملا اعتراف کر کے اپنے لیے جنت اور دوسروں کے ایمان کے لیے منزل کا نشان چھوڑ جائے۔ اس ضمن میں صحابہ کرامؓ کا مقدس دور' ایثار و وفا کی ایمان افروز مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ مگر عصر حاضر بھی اس نوع سے' کلیتاً بانجھ نہیں ہے اور ہماری خاکستر میں ابھی کچھ چنگاریاں باقی ہیں۔

سربلندی پھر وفا کی دیکھنے میں آ گئی
پھر وفا کے نام پر کچھ لوگ ہارے زندگی

اللہ تعالیٰ' ناموسِ نبوتؐ کے تحفظ کے سامان خود فراہم کیا کرتے ہیں۔ ہم ایسے لوگ تحریریں لکھتے اور تقریریں کرتے رہ جاتے ہیں اور قدرت کسی سادہ دل کے جگر میں آگ لگا کر اس کے ایمان کو عمل کا خوش رنگ نقش بنا دیتی ہے کہ لالے کی حنابندی فطرت کا محبوب مشغلہ ہے۔

دہد حق' عشقِ احمدؐ' بندگانِ چیدہ خود را
بہ خاصاں می دہد شہ' بادۂ نوشیدۂ خود را

اس سلسلے میں دو واقعات محفوظ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک کے راوی پروفیسر عطاء الرحمٰن عتیق (سابق صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ) ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں ختم نبوت کی تحریک زوروں پر تھی۔ سیالکوٹ دارالعلوم شہابیہ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور دیگر اکابرین جمع تھے۔ پروفیسر موصوف تب وہاں ایک کمسن طالب علم تھے اور مہمانوں کی خدمت پر مامور تھے۔ محفل میں مرزا قادیانی ملعون زیر بحث تھا کہ پروفیسر صاحب نے شاہ جی سے اچانک مخاطب ہو کر کہا کہ ''حضرت! جب اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا' آپ تبھی اسے قتل کر دیتے تو اِن تقریروں کی نوبت ہی نہ آتی''۔ یہ سُن کر شاہ جیؒ زار زار رونے لگ گئے اور کافی دیر آبدیدہ اور گلوگیر رہے--- تاریخ نے یہ حقیقت بھی محفوظ رکھی ہے کہ جب علامہ اقبالؒ نے غازی علم الدین شہیدؒ کے شگفتہ چہرے کی آخری زیارت کی تو وہ بے اختیار کہہ اٹھے تھے کہ ''اسیں گلاں ای کردے رہے' تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا''---

دوسرا ایمان افروز واقعہ پروفیسر میاں محمد یعقوب (شعبہ اردو نیشنل سائنس کالج گوجرانوالہ) یوں بیان کرتے ہیں۔

۱۹۶۶-۶۷ء کی بات ہے میں لاہور کے سنٹرل ٹریننگ کالج میں B.Ed کا طالب علم تھا۔ وہاں ہمارے ایک بزرگ پروفیسر تھے چودہری فضل حسین' انہوں نے یہ واقعہ کلاس روم میں سنایا۔

''میں بیروت کی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا اور وہاں ہندوستان (تقسیم سے قبل) کے بہت سے طلبہ وطالبات زیر تعلیم تھے۔ اُن میں سے ایک لڑکی (نام نہیں بتایا) بہت شوخ وشنگ اور الٹرا ماڈرن قسم کی تھی۔ اُس کا تعلق ہندوستان کے کسی مسلمان نواب گھرانے سے تھا۔ وہ خود شاید فیشن کے طور پر کمیونزم کی پرچارک تھی۔

ایک دن ٹک شاپ پر اسلام اور کمیونزم کی بحث چل رہی تھی کہ اس ناہنجار لڑکی نے حضور ﷺ کی شان میں ایک آدھ نازیبا لفظ کہہ دیا۔ میں نے اُسے بے نقط سنائیں' بہت برا بھلا کہا اور ہمیشہ کے لیے اس سے قطع کلامی کر لی۔ پھر یوں ہوا کہ مجھے (پروفیسر فضل حسین) اور اس نابکار لڑکی کو جو اپنی امارت اور حُسن پر بہت نازاں تھی' دوران تعلیم ہی میں برص کا حملہ ہوا۔ اُس نے اپنے حُسن کو بچانے کے لیے اس وقت کے اعلیٰ ترین ڈاکٹروں اور ہسپتالوں سے رجوع کیا لیکن برص پھیلتا چلا گیا اور وہ خود بھی پھیلتی چلی گئی' یعنی بے اندازہ موٹی ہو گئی۔ ہندوستان واپسی پر اُس کا کہیں رشتہ نہ ہو سکا اور اپنی مضحک ہیئت کذائی کی وجہ سے اُس نے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا اور وہ جو کبھی جانِ محفل ہوا کرتی تھی' سوسائٹی میں نسیاً منسیا ہو گئی۔

اُدھر واپسی کے بعد میں نے جہلم کے ایک معمولی سے ڈاکٹر سے علاج کروایا اور اللہ کے فضل سے (چہرہ پر ایک آدھ داغ کے سوا) شفا ہو گئی۔''

تقریباً ساری کلاس نے سوال کیا۔ ''سر! اُسے تو رحمۃ للعالمین ﷺ کی شانِ اقدس میں

گستاخی کے سبب یہ سزا ملی۔ آپ پر برص کیوں حملہ آور ہوا؟''۔

بوڑھے پروفیسر کے جواب نے نہ صرف کلاس کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا بلکہ سب کو آنسوؤں سے رُلا دیا۔ فرمایا ''مجھے اس وجہ سے برص ہوا کہ میں نے گالیوں پر اکتفا کیوں کی اور اُسے اسی دم قتل کیوں نہ کر دیا''

جناب محمد متین خالد کو اللہ تعالیٰ نے قلب ونظر کی صالحیت کے ساتھ ساتھ حُب رسول ﷺ کی سعادت سے بھی نواز رکھا ہے۔ حضور ﷺ کی شان میں ان کی قلمی کاوشیں اور قادیانیت کے رد میں اُن کی تحریریں عبرت اور محبت کا پیغام بھی ہیں اور نشانِ راہ بھی اور خود اُن کے لیے ذخیرۂ عقبیٰ اور توشۂ آخرت--- زیرِنظر تالیف اُن شہیدانِ وفا کا دل آویز تذکرہ ہے جن کی اکثریت علمی، فکری، لسانی اور قلمی ثروت سے کم وبیش بے تعلق مگر قلبی، روحانی، جذباتی اور ایمانی حمیت سے کہیں بہرہ ور تھی۔ بنا بریں اللہ تعالیٰ نے اُن کی غیرت کو سنبھالا دے کر اسے شعلۂ جوالہ بنا دیا اور انہوں نے لوحِ ایام پر اپنے لہو سے نعت کا مقطع لکھ دیا کہ

سجدہ اس سر کا ہے جو تن سے جدا ہوتا ہے
یوں کہیں سجدۂ شکرانہ ادا ہوتا ہے

زیرِنظر اوراق کی غایتِ تدوین، توفیقِ عمل کو آواز دینا ہے۔ جو عطا ہو جائے تو تیمور کے گھر سے گئی ہوئی حمیت آج بھی لوٹ سکتی ہے۔ تاریخ ہماری منتظر ہے اور وقت ہمیں اُمید بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے--- اور آخر میں احسان دانشؒ کی ہم ''پسماندگان'' کے لیے ایک آرزو۔

اللہ تم کو صاحبِ سیف وسناں کرے
جسموں میں روحِ خالدؓ و طارقؒ رواں کرے
دے کر شعورِ زیست، ارادے جواں کرے
جو جم چکا ہے خون رگوں میں دواں کرے
تم کو رہِ رسولؐ پہ چلنا نصیب ہو
کب سے گرے پڑے ہو سنبھلنا نصیب ہو۔

پروفیسر محمد اقبال جاوید
سابق صدر شعبہ اردو
گورنمنٹ کالج، گوجرانوالہ

2 ستمبر 2000ء

جو ناموسِ رسالت ﷺ پہ فدا تھے!

لحم خنزیر کھانے اورام الخبائث پینے والا فرنگی، مکار ہندو بنیا اور انگریز کی ناجائز اولاد قادیانی سمجھ بیٹھے تھے کہ پیہم غلامی اور فرنگی تہذیب کے مسلسل کاری حملوں سے ہندوستان کے مسلمان پر موت کا سکوت طاری ہے۔ اس کی ایمانی نبضیں ڈوب چکی ہیں۔ اس کے قلب کی اسلامی دھڑکنیں خاموش ہوگئی ہیں۔ اس کے ماتھے کی حدت، ٹھنڈک میں بدل گئی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کا آخری ٹیسٹ لینا چاہا تاکہ اس کے بعد اسے سپردِ خاک کر دیا جائے۔ انہوں نے ہندوستان میں شتم رسول کی تحریک چلا دی۔ مختلف شہروں سے ناموسِ رسالتؐ پہ کتے بھونکنے لگے۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے مسلمانوں نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور شیروں کی طرح ان کتوں پر پل پڑے اور ان کا ایسا حشر کیا کہ ہر ایک کو عبرت کی مثال بنا دیا۔

راجپال نے توہین رسالت کی، ملت اسلامیہ کا شیر غازی علم الدین شہید اس پہ جھپٹا اور اسے چیر پھاڑ کے رکھ دیا۔۔۔ رام گوپال نے سرور کائنات ﷺ کی شان میں گستاخی کی۔۔۔ غازی مرید حسین اس پہ لپکا اور اسے راہی ملک نار کیا۔۔۔ سوامی شردھانند نے ہذیان بکا۔۔۔ غازی عبدالرشید نے اسے جہنم واصل کیا۔۔۔ نتھورام نے دریدہ دہنی کی۔۔۔ غازی عبدالقیوم نے اسے ابوجہل اور ابولہب کے پاس پہنچا دیا۔۔۔ چنچل سنگھ نے بکواس کیا۔۔۔ غازی عبداللہ نے ایک ہی وار میں اسے ہاویہ میں پٹخا دیا۔۔۔ کھیم چند گنبد خضراء کی طرف منہ کر کے بھونکا۔۔۔ غازی منظور حسین نے اس جہنمی کتے کو اس کے دیس میں پہنچا دیا۔۔۔ پالال نے اپنا متعفن منہ کھولا۔۔۔ تو۔۔۔ غازی محمد صدیق نے اسے موت کا رقص کرایا۔۔۔ اور اسے جہنم کے لپکتے بھوکے شعلوں کی خوراک بنا دیا۔۔۔ ملعون بھیشو نے

ہرزہ سرائی کی۔۔۔تو۔۔۔غازی عبدالمنان نے اسے موت کے گھاٹ اتارا۔۔۔ چرن داس نے جب اپنے غلیظ منہ سے غلاظت اگلی۔۔۔تو۔۔۔غازی میاں محمد نے اس کے وجود کو ادھیڑ دیا اور اسے اللہ کے شدید انتقام کے سپرد کر دیا۔۔۔ جب ویدا سنگھ نے زہر میں ڈوبی ہوئی اپنی بچھو نما زبان کھولی۔۔۔ تو۔۔۔ غازی احمد دین نے اسے قتل کر کے ملت اسلامیہ کے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچائی۔۔۔ ہر دیال سنگھ جب قصرِ نبوت کی طرف پھنکارا۔۔۔تو غازی معراج دین نے اس کی زبان مروڑ دی۔۔۔ گردن توڑ دی۔۔۔ جب عبدالحق قادیانی نے زہر اگلا۔۔۔حاجی محمد مانک اس پر رعد بن کے کڑکا۔۔۔اور اسے نارِ جہنم میں بیٹھے مرزا قادیانی کی جھولی میں پھینک دیا۔۔۔ جب نعمت احمر حرمت رسولؐ پہ حملہ آور ہوا۔۔۔ تو غازی فاروق نے اسے خاک وخون میں تڑپایا۔۔۔اور اسے دوزخ کی اتھاہ گہرائیوں میں جھونک دیا۔۔۔!!!

ان عظیم عاشقانِ رسولؐ نے صحابہ کرامؓ اور قرونِ اولیٰ کے فنافی الرسولؐ مجاہدین کو مخاطب کر کے کہہ دیا کہ ہم آپ سے شرمندہ نہیں۔ ہم نے گلے میں غلامی کا طوق، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پہننے کے باوجود گستاخانِ رسول سے وہی سلوک کیا جو اپنے عہد میں تم کیا کرتے تھے۔ ہم نے اس کسمپرسی کے عالم میں بھی اپنے آقا ﷺ سے بے وفائی نہیں کی۔

ان شہیدوں نے ماں باپ کے بڑھاپوں کے سہاروں کی پرواہ نہ کی۔۔۔ بیویوں کے سہاگ اُجڑنے کو خاطر میں نہ رکھا۔۔۔ بچوں کی یتیمی ان کے رستے کی رکاوٹ نہ بنی۔۔۔ مال واسباب کی کشش ان کے پاؤں کی زنجیر نہ بن سکی۔۔۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنی متاعِ زیست بھی سرورِ کونین کی عزت پر نچھاور کر دی۔۔۔ وہ دار پہ جھولتے ہوئے اپنی خاموش زبان سے یہ اعلان کر رہے ہوتے تھے۔

اے اہل دنیا! دیکھو۔۔۔ ہمیں اپنے آقا ﷺ اپنے والدین سے زیادہ پیارے ہیں۔
ہمیں اپنے آقا ﷺ اپنے بچوں سے زیادہ محبوب ہیں۔
ہمیں اپنے آقا ﷺ دنیا کی رعنائیوں اور دنیا کے مال واسباب سے زیادہ عزیز ہیں۔
ہمیں اپنے آقا ﷺ اپنی جان سے زیادہ قیمتی ہیں۔

جب ان شہیدوں کو پھانسی سے نیچے اتارا جاتا تو ان کی کھلی آنکھوں میں ایسی چمک ہوتی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔۔۔ کیونکہ وہ ان آنکھوں سے اپنے رب کا دیدار کر چکے ہوتے تھے۔ ان کے لبوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ ہوتی۔۔۔ کیونکہ وہ چہرہ مصطفےٰ ﷺ کی زیارت کر چکے ہوتے تھے۔ ان کے چہرے پر طمانیت کا نور ہوتا۔۔۔ کیونکہ وہ جنت میں اپنا مقام عالی شان دیکھ چکے ہوتے تھے۔۔۔ مسلمانو! یہ مجاہدین ناموسِ رسالت، ملت اسلامیہ کی آبرو ہیں۔۔۔ یہ اسلام کے چہرے

کا غازہ ہیں۔ اسلام اپنے ان فرزندوں پہ ناز کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی جانیں نثار کر کے ہندوستان میں اسلام کو حیات بخشی۔ انہوں نے پھانسی پہ جھول پہ کے ہمیں غیرت رسول کا عملی درس دیا۔ انہوں نے موت کو گلے لگا کر ہمیں یہ پیغام دیا۔۔۔ کہ۔۔۔ مسلمانو! جب تک زندہ رہو' اللہ کے حبیبؐ کے کسی گستاخ کو زندہ نہ رہنے دینا۔

صاحب کتاب محمد متین خالد خود بھی مجاہدین کے اسی قبیلے کا فرد ہے۔ وہ صاحب جنوں ہے۔ اس کے دل میں عشق رسولؐ کا ایک شعلہ رقصاں ہے جو اسے مضطرب رکھتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی نئی نسل تک ان شہیدوں اور غازیوں کا جذبہ منتقل کرنا چاہتا ہے۔ وہ عشق رسولؐ کی اس میراث کو ملت اسلامیہ کے شاہینوں کے قلوب میں اتارنا چاہتا ہے۔ وہ انہیں عشاق کے اس جنتی قافلے کے نقوش دکھانا چاہتا ہے۔ وہ انہیں اس خنجر کی آب دکھانا چاہتا ہے جو شاتمان رسول کی رگ جان کاٹتا تھا۔ وہ انہیں اس پُر جوش نعرۂ تکبیر کی گرج سنانا چاہتا ہے' جو ہر شاتم رسول کو فی النار کرنے سے قبل عاشق رسول مجاہد کے گلے سے نکلتی تھی۔

محمد متین خالد کا جنوں اسے تاریخ کے اوراق پارینہ میں لمبی سیاحت پہ لے گیا۔ جب یہ صاحب دل واپس آیا تو آسمان عشق سے شہیدوں اور غازیوں کی ایک کہکشاں توڑ لایا۔ اور پھر اسے صفحات قرطاس پر اس طرح سجایا کہ کتاب بقعہ نور بن گئی اور پڑھنے والوں کے قلوب ونظر روشن روشن اور درخشاں درخشاں ہو گئے۔

یہ کتاب عشق کی سفیر ہے۔ یہ کتاب عشق رسول کی ایک توانا صدا ہے۔ یہ صدا جہاں بھی پہنچے گی۔ وہاں عاشقانِ رسولؐ کی ایک فوج تیار ہوگی۔ وہاں معاذؓ اور معوذؓ کی تاریخ دہرائی جائے گی۔۔۔ کہ ہر شمشیر بکف عاشق رسولؐ پوچھے گا کہ گستاخ رسول کہاں ہے؟

خاکپائے شہدائے ناموسِ رسالت

محمد طاہر رزاق

غازی علم الدین شہید

رحمان مذنب

1857ء کی تحریکِ آزادی کی ناکامی نے ہر فرنگی حکمران کو پورے ہند میں سیاہ وسفید کا مالک بنادیا۔ اس کے سامنے ہندو اور مسلمان دو قومیں تھیں جو سیاسی نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی تھیں۔ سکھ اگرچہ گنتی میں بہت کم تھے لیکن مضبوط تھے۔ ہندوؤں نے انہیں ساتھ ملالیا۔ انہیں خواتین کے ذریعے شادی کے رشتے میں باندھ لیا۔ ہندوؤں کا یہ پلان تھا کہ سکھوں کا اپنا تشخص قائم نہ ہو چنانچہ یہ پلان اس قدر کامیاب ہوا کہ 1947ء میں جب بٹوارہ ہوا تو ادھر سکھوں نے ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ مسلم کشی میں وہ اپنے رہنما تارا سنگھ کی قیادت میں ہندوؤں سے بھی آگے نکل گئے۔ ادھر ہند کی قدیم قوم جسے شودر کہا جاتا تھا' اکثریت میں تھے لیکن آریاؤں کی آمد کے بعد انہیں اس حد تک پامال کیا کہ ہندو معاشرے میں ان کی حیثیت تیسرے درجے کے غلام کی ہو کر رہ گئی۔ ان میں بڑے بڑے سکالر پیدا ہوئے لیکن ہندو قیادت اور عوام نے انہیں سیاسی سطح پر ابھرنے نہ دیا اور انہیں اپنی گرفت میں رکھا۔

فرنگی کے لیے ہندو کوئی پرابلم نہ بنے۔ وہ جلد ہی نئے آقا کی چھتری تلے آ گئے اور ایک ہزار سال کی غلامانہ خو سے انہوں نے جو تجربہ حاصل کیا تھا' وہ کام آیا۔ آقا اور غلام میں سمجھوتہ ہو گیا۔ اس کی بدولت ہندوؤں کو پنپنے کے لیے ہر نوع کی مراعات حاصل ہوئیں۔ انہوں نے تعلیم' تجارت اور صنعتکاری میں خوب ترقی کی۔ سرکاری دفاتر میں ان کی ریل پیل ہوئی۔

مسلمان پیچھے رہ گئے۔ فرنگی کے زیرِ عتاب آئے۔ ہندو غلبہ پا گئے۔

مسلمانوں کو ایک ہزار سال کی حکمرانی کے بعد اس سے محروم ہونا پڑا تو انہیں سخت جھٹکا لگا۔ انہوں نے غلامی کا مزہ نہیں چکھا تھا۔ لہٰذا وہ سرکش ہوئے۔ فرنگی نے ان کی قابلِ فخر درسگاہیں مٹا دیں۔ Mental Reservation نے مسلمانوں کے پاؤں پکڑ لیے۔ ان کی صنعت گاہیں بری طرح ختم کیں اور انگلستان کی مصنوعات کے لیے جگہ بنائی۔ مسلمان ہنرمندوں کے ہاتھ کاٹے' مسلمانوں کے کلچر کو برباد کیا' فرنگی کلچر کو رواج دیا۔ مسلمانوں کو غم ہوا۔

فرنگی نے جانا کہ مسلمان کسی وقت بھی بغاوت کا علم سنبھال لیں گے لہٰذا ان کا تشخص پامال کیا جائے۔ انہیں مسلسل ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا اور اس حد تک دبایا جائے کہ جینا دشوار ہو جائے۔ ادھر ہندوؤں نے اپنے مہربان آقا کی شہ پر مسلمانوں کو دبایا۔ سرکاری دفاتر کے دروازے ان پر بند کیے۔ تجارت اور صنعت و حرکت کے میدان میں نزدیک نہ پھٹکنے دیا۔ تجارتی منڈیاں اپنے قبضے میں کر لیں۔

مسلمانوں کے لیے زندگی بہت پیچیدہ مسئلہ بن گئی۔ آقا نا مہربان' پڑوسی جو ایک ہزار سال سے مل جل کر ہنسی خوشی رہے تھے' اپنے نہ رہے' پرائے بن کر دندنانے لگے۔ مسلمان سخت کشمکش میں مبتلا ہوئے' فرنگی کو آقا کے طور پر کیسے قبول کرتے؟ زندگی کی راہیں تنگ کر دی گئیں۔ انہیں کمترین غلام کا درجہ دیا۔ بھوک اور افلاس کے صحرا میں انہیں چھوڑ دیا۔ خوانچے والے' سبزی فروش' قصائی' لوہار' ترکھان اور کوچبان دو وقت کی دال روٹی چلانے کے لیے صبح سے شام تک جان مارتے۔ آلو چھولے' کلفی کلفہ اور نان کباب بیچتے۔ ہر گلی' ہر بازار میں ہندوؤں کی ہر قسم کی دکانیں تھیں۔ مسلمان انہی سے سودا خریدتے۔ ہندو کسی مسلمان سے کچھ نہ خریدتے۔

ہندو فرنگی گٹھ جوڑ نے مسلمانوں کو کچلنے میں کبھی غفلت نہیں برتی۔ مسلمانوں نے زندہ رہنے کے لیے فوج اور پولیس کی نوکری کی۔ دو عالمگیر جنگوں میں انہوں نے بے دریغ جانیں قربان کیں۔ یونین جیک کو فتح یاب اور فرنگی کو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت عطا کی۔

یہ دور مناظروں کی گرما گرمی سے عبارت رہا۔ شردھانند ایسے متعصب ہندوؤں نے فضا کو خراب کرنے اور نفرت پھیلانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اسلام اور بانی اسلام کے خلاف مہم شروع کی گئی۔ 1899ء میں شریمتی آریہ پرتی ندھی سبھا نے رسوائے زمانہ کتاب ستیارتھ پرکاش چھاپی جس میں اسلام دشمنی کا حق ادا کیا۔ یکم نومبر 1927ء کو لاہور کے راجپال پبلشر نے اس کا آخری ایڈیشن چھاپا۔ "چودھواں باب (دربارہ تحقیق مذہب اسلام)" میں صفحہ 707 سے ص 781 تک قرآنی سورتوں کے بارے میں اس کتاب کے ناقص العقل مصنف نے جی بھر کے ہرزہ سرائی کی ہے۔ اس اندھے محقق نے اسلام کو سمجھنے کی رتی بھر کوشش نہیں کی۔ اس کا تو مشن ہی اسلام کے خلاف سوچے سمجھے منصوبے پر عمل

کرنا تھا۔ راجپال اس ناپاک منصوبے کی روح رواں تھا۔ وہ بڑی تن دہی سے مالی نقصان اٹھا کر کام کر رہا تھا۔ اس نے آٹھ سو صفحے کی اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے:

"اردو ستیارتھ پرکاش کی قیمت پہلے دو روپیہ تھی پھر میں نے ڈیڑھ روپیہ کر دی۔
پچھلے ساتویں ایڈیشن کی قیمت پرچار کے خیال میں چودہ آنے رکھی گئی۔
اب ستیارتھ پرکاش کے خلاف جو ایجی ٹیشن ہو رہا ہے۔ اس نے اس کی مانگ کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس لیے اس نئے ایڈیشن کی محنت اور لاگت سے بھی کم صرف 10 (دس آنہ) قیمت رکھی جاتی ہے۔ امید ہے کہ آریہ پرش ہزاروں کی تعداد میں اس کی اشاعت کریں گے۔"

یکم نومبر 1927ء   راجپال پبلشر

کتاب کی اشاعت سے ہندو مسلم اتحاد کا ماحول یکسر تباہ ہو گیا۔ دلوں میں گرہیں بیٹھ گئیں۔ فرنگی بھول گیا کہ مسلمانوں نے دو عالمگیر جنگوں میں جانی قربانی دی ہے' وہ ہندو کی پیٹھ ٹھونکتا گیا۔ وہ خوش تھا کہ مسلمانوں کا دل دکھایا جا رہا ہے۔ ہند میں وہ نفرت کے جذبے کا سب سے بڑا خریدار تھا۔ یہ جذبہ اس کے لیے توانائی کا سرچشمہ تھا' انمول شے تھا' وہ بھی اس جذبے کی توسیع اور اشاعت کے لیے ملک گیر سطح پر کام کر رہا تھا۔ ہندوؤں کو شہ ملی' وہ اس کے دست و بازو بن گئے۔

راجپال نے ستیارتھ پرکاش کی اشاعت سے نفرت کا جو زہر پھیلایا تھا اس نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ اس نے ایک نہایت ہی خطرناک اقدام کیا۔ اس مرتبہ اس نے دنیا کی اہم ترین' عظیم ترین اور پاکیزہ ترین ہستی...... محبوب خدا محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات کو ہدف بنایا۔ حضور ﷺ کی ذات گرامی کو رسوا کرنے کی غرض سے "رنگیلا رسول" کے ناپاک نام سے کتاب چھاپی۔

حضور ﷺ محض بانی اسلام اور مسلمانوں کے پیغمبر ہی نہیں تھے بلکہ انسان دوستی' پیار' محبت' ایثار و احسان' خیر' اخوت' مساوات' عدل اور ایسے تمام اوصاف کے علمبردار تھے جو ہر انسان کو معاشرتی آداب کا خوگر بناتے' انہیں رواداری اور کشادہ دلی سے مل جل کر رہنے کی تعلیم و ترغیب دیتے ہیں' آدمی کا احترام بڑھاتے ہیں۔ حضور ﷺ کی تریسٹھ سال کی زندگی تاریخ کی درخشاں ترین مثال ہے۔ حضور ﷺ نے نفرتوں سے پاک معاشرہ آدمی کو دیا۔

آپ ﷺ نے اکھڑ' جاہل' ہٹ دھرم' نفرتوں کی آگ میں جلنے جھلسنے والے' وحشی انسانوں کو آدابِ حیات سکھائے۔ پھر وہی انسان مسلمان ہونے کے بعد دنیا جہان میں پھیل گئے۔ ایسے اچھے انسان ثابت ہوئے کہ جہاں گئے وہاں بستیوں کی بستیاں ان کے حسنِ اخلاق دیکھ کر حلقہ بگیر اسلام

ہوئیں۔محبتوں کے سرچشمے پھوٹ پڑے۔انسان نے غسل صحت لیا۔دلوں کے اندھیرے چھٹ گئے۔
نور ہی نور ہو گیا چار کھونٹ۔

حضور ﷺ نے مکمل اور مفید ترین ضابطہ حیات دیا۔یہی نہیں بلکہ ایک ایک شق پر عمل کیا تاکہ آنے والی نسلیں جان لیں کہ اسلام سہولت اور سادگی کا بہترین نمونہ ہے' آسانی سے قابل عمل ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں' سچ کا راستہ ہے' خوشی اور خوشحالی کی ضمانت دیتا ہے' دین اور دنیا دونوں کا حسین امتزاج ہے' رہبانیت (ترک دنیا) کو رد کرتا ہے۔

دنیا کا کوئی مسلک' کوئی مذہب اسلام کی برابری نہیں کرتا' اس خوش اسلوبی سے زندگی اور معاشرے کے مسائل و معاملات حل نہیں کرتا جس خوش اسلوبی سے اسلام کرتا ہے۔

یہ کہنے کی بات نہیں۔قرآن پڑھ لو' از خود پتہ چل جائے گا۔اس کا مطالعہ کسی طبقے کے لیے مخصوص نہیں۔قرآن کی تعلیم جمہور کے لیے ہے' جمہوریت سکھاتی ہے۔ یہ انسان کو طبقوں میں نہیں بانٹتی۔اس کے آئین میں کوئی شخص مخصوص مراعات کا مستحق نہیں۔حقوق و فرائض میں سب برابر ہیں۔ دنیوی اعتبار سے بندوں میں فرق ہے' دینی اعتبار سے نہیں۔اسلام کی اخلاقیات میں دین ہی دراصل کارفرما ہے۔دنیوی معاملات میں یہی اخلاقیات قابل اعتناء ہیں۔

رسول عربی محمد ﷺ جیسی بے مثال' عظیم القدر ہستی کی شان میں گستاخی پوری انسانیت کے خلاف جرم کا ارتکاب ہے۔آپ حضور ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کیجئے! آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ خالق اکبر نے حضور ﷺ کو دنیا میں بھیج کر کتنا بڑا احسان کیا ہے! حضور ﷺ نے بندگان خدا کو نیک و بد اور خیر و شر میں امتیاز کرنا سکھایا۔ذات پات کی تمیز اور پروہت شاہی (Priesthood) نے جن لوگوں کو ذلیل و خوار اور پامال کیا' انہیں بلند مرتبہ کیا۔بلال حبشیؓ جیسے کروڑوں غلاموں کو برگزیدہ کیا۔ان کو آقاؤں سے برتر مقام دیا جنہیں اسلام کی اخلاقی اور روحانی تعلیم موافق نہ آئی۔آج اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر میں اخوت و مساوات اور عدل و انصاف کے سلسلے میں جو شقیں پائی جاتی ہیں وہ حضور ﷺ کے الوداعی خطبہ حج سے لی گئی ہیں۔طلاق' بیوہ' نکاح' وراثت میں عورتوں کا حصہ اور ایسے کتنے ہی قوانین جو غیر مسلموں نے اپنائے اسلام سے لیے گئے۔یہ قوانین ان کے یہاں موجود نہ تھے اور یوں ان کے معاشرے میں صدیوں سے مشکلات پیدا تھیں۔محمد مصطفیٰ ﷺ کی رہنمائی اور حضور ﷺ کے عمل کی بدولت غیر اسلامی معاشرے ان منصفانہ اور انسانیت پسندانہ قوانین کو اپنانے پر مجبور ہوئے۔

بہرحال آریا سماج جو صدیوں سے آنکھوں پر تعصب کی عینک چڑھائے ہوئے تھا' حضور

کے آئین وقوانین کو سمجھے بغیر درپے آزار ہوا۔ لاہور دل آزاری کی مہم کا گڑھ بن گیا۔ راجپال پبلشر تحریک کا آلہ کار بنا۔ اس نے زندگی کا مشن بنایا کہ وہ اسلام اور بانی اسلام ﷺ کے خلاف عمر بھر کتابیں چھاپتا رہے گا اور اس سلسلے میں بے دریغ پیسہ خرچ کرے گا۔ ستیارتھ پرکاش کے خلاف ایجی ٹیشن ہوا لیکن اس کے کان پر جوں نہ رینگی۔ راجپال کے تعاون سے پولیس کے ملازم منشی رام کو بڑی تقویت ملی جس نے ترکِ ملازمت کے بعد ترکِ دنیا کا ڈھونگ رچایا اور پھر دیکھتے دیکھتے ''شریمان مہاتما منشی رام سورگ باشی سوامی شردھانند جی'' بن گیا۔ وہ اسلام اور بانی اسلام ﷺ کے خلاف لٹریچر شائع کرتا رہا۔ شکر الحمدللہ ایک مجاہد نے اسے واصل جہنم کیا۔ ان کا نام قاضی عبدالرشید (شہید) تھا۔

فرنگی آقا کے زیر سایہ انتہائی شر انگیز مہم چلتی رہی۔ اس کا سدباب نہ کیا گیا۔ ادھر لاہور میں راجپال اس مہم کا بڑا ستون تھا۔ ستیارتھ پرکاش ہی کچھ کم زہریلی کتاب نہ تھی کہ اس بدبخت نے ایک اور انتہائی دل آزاری کے اقدام کی ٹھانی۔ ایک اور زہریلی کتاب (رنگیلا رسول) چھاپ دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلم آزاری میں وہ منشی رام سے کم نہ تھا اور عقلِ سلیم سے یکسر عاری تھا۔

کیا عجیب ماحول تھا کہ غلام 'غلام پر حملہ آور ہورہا تھا' صرف اس لیے کہ آقا اس پر مہربان تھا۔ کوئی اخلاقی آئین' کوئی انسانی قانون' ہمسایہ پن کا کوئی رویہ' ہندو مسلم تحریک کا کوئی پہلو اس پر اثر نہ کر رہا تھا۔ آنکھیں بند کیے نفرتوں کی جوالامکھی پر بیٹھا مذموم حرکتیں کررہا تھا۔ وہ کسے خوش کررہا تھا' بھگوان کو یا گمراہی پھیلانے والی' تعصبات کی ماری شریمتی آریہ پرتی ندھی سبھا کو؟

قدرت اس نادان بداندیش پر ہنس رہی تھی۔ اسے خبر نہ تھی کہ ایک ان پڑھ مگر صداقت کا متوالا' اپنے رسول محمد عربی ﷺ سے اٹوٹ محبت کرنے والا' پردۂ غیب میں بے قرار ہے جو آنِ واحد میں اس کا قلع قمع کردے گا۔ یہ عام انسانوں میں سے ایک گمنام انسان تھا جو اپنے شاندار کارنامے کی بدولت دوام پا گیا' جس کا نام عدل وانصاف کی تاریخ میں درخشاں ہوگیا' زندہ و پائندہ ہوگیا۔ آج وہ میانی (لاہور) کے قبرستان میں آسودہ حیات ہے۔ ایک دنیا اس کے نام سے واقف ہے۔ یہ غازی علم الدین شہید ہے۔

غازی علم الدین 4 دسمبر 1908ء کو متوسط طبقے کے ایک شخص طالع مند کے گھر (لاہور) میں پیدا ہوئے۔ یہ ان کے دوسرے بیٹے تھے۔ نجاری پیشہ تھا' عزت سے دن گزر رہے تھے' ایسے نامور نہ تھے اپنے محلے تک ان کی شہرت محدود تھی یا پھر لاہور سے باہر جا کر کہیں کام کرتے تو محنت' شرافت اور دیانتداری کی بدولت مختصر سے حلقے میں اچھی نظر سے دیکھے جاتے۔ زندگی اس ڈھب کی تھی۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے　　　عمر یونہی تمام ہوتی ہے

کوچہ چابک سواراں میں طالع مند اپنے اہل خانہ کے ساتھ امن و آشتی سے رہتے تھے۔ بڑے بننے کی دل میں آرزو نہ تھی۔ اس دور میں لوگ اپنی قسمت آپ بنانے' تقدیر کا منہ چڑانے یا حالات کا پھندا گردن سے اتارنے...... راتوں رات لکھ پتی بننے کے آرزومند نہ ہوئے۔ نام طالع مند تھا' آبرومند تھے...... وہ اپنی سمٹی سکڑی بری بھلی زندگی پر قانع تھے۔ اس میں ہلچل مچانے کا ارادہ نہ رکھتے تھے۔

اس دور میں دولت سے زیادہ عزت کی قدر کی جاتی۔ ان کی تو ایک ہی آرزو تھی کہ علم الدین بڑا ہو کر انہی جیسا سعادت مند' محنتی' دیانتدار اور نیک کاریگر ہو' گھر بسائے اور اچھا نام پائے۔ خدا اسے برائی سے بچائے۔ کسے خبر تھی کہ علم الدین بڑا ہو کر گھر کی اوقات بدل دے گا۔ اسے زمین سے اٹھا کر اوجِ ثریا پر لے جائے گا۔ محلہ چابک سواراں کو تاریخ کا درخشاں ستارہ بنا دے گا۔ لاہور کو اس پر ناز رہے گا' لاہور کے ماتھے کا جھومر بن جائے گا۔

اس زمانے میں مسجد محلے کے بچوں کی ابتدائی درسگاہ تھی۔ اب وہ زمانہ تو نہ رہا تھا جب مسجد علم وعرفان کا بہت بڑا ذریعہ تھی۔ دینی اور دنیوی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں بڑے بڑے علماء' سائنس دان یہیں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے تھے۔ اب تو یہی غنیمت تھا کہ بچے بچیاں مسجد میں آ کر قرآن پڑھتی تھیں' بعض مساجد میں درسِ قرآن و حدیث بھی دیا جاتا تھا۔ مسئلے مسائل بیان کیے جاتے تھے۔ انگریزی تعلیم کے لیے دوسرے مدرسے تھے۔ پرائمری تک مفت تعلیم کا نہایت معقول بندوبست تھا۔ اس سے آگے سرکاری وغیر سرکاری درس گاہیں تھیں۔ تعلیم بہت سستی تھی۔ اساتذہ بڑے پڑھے لکھے' ہمدرد اور فرض شناس ہوتے تھے۔

طالع مند نے اپنے بیٹے کو بھی مسجد میں بھیجا تا کہ قرآن مجید پڑھیں۔ علم الدین نے کچھ دن وہاں گزارے۔ تعلیم حاصل کی لیکن وہ زیادہ تعلیم نہ پا سکے۔ قدرت کا کوئی راز تھا۔ ان سے ایسا کام لیا جانا تھا جو عمل کی دنیا میں تعلیم سے بڑھ کر تھا بلکہ تعلیم کا مقصود تھا۔ ان میں من جانب اللہ ایسا جوہر مخفی تھا جس کی بچے کو خبر نہ تھی لیکن اس جوہر نے آگے چل کر وہ کام کر دکھایا جس سے انہیں ''تب وتاب جاودانہ'' میسر آئی۔ اس کام کا کوئی بدل نہ تھا۔

طالع مند اعلیٰ پایہ کے ہنرمند تھے۔ وہ علم الدین کو گاہے گاہے اپنے ساتھ کام پر لاہور سے باہر بھی لے جاتے۔ بڑا بیٹا محمد دین تو پڑھ لکھ کر سرکاری نوکر ہو گیا لیکن علم الدین نے موروثی ہنر ہی سیکھا۔

محمد دین اور علم الدین میں بڑا پیار تھا۔ علم الدین والد کے ساتھ کبھی باہر جاتا تو محمد دین کو قلق

ہوتا۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ محمد دین نے علم الدین کے بارے میں خواب پریشان دیکھا۔ علم الدین والد کے ساتھ سیالکوٹ گیا ہوا تھا۔ محمد دین بے چین ہوا اور چھوٹے بھائی کی خیریت معلوم کرنے سیالکوٹ پہنچا۔ دونوں بھائیوں کی باہمی محبت کا یہ عالم تھا کہ جب محمد دین اپنے والد کے ٹھکانے پر پہنچا تو علم الدین چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی علم دین اچھل پڑا۔

''شدت جذبات سے دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ایک عرصہ بعد دونوں بھائی ملے تھے۔ نجانے کتنی دیر تک وہ ایک دوسرے سے بغلگیر رہے کہ طالع مند نے محمد دین کو بیٹھ جانے کو کہا۔''

محمد دین نے خواب میں علم الدین کو زخمی ہوتے دیکھا تھا۔ خواب کتنا سچا نکلا۔ علم الدین واقعی زخمی ہوئے تھے' ہاتھ پر پٹی بندھی تھی۔ شیشہ لگا تھا۔ ہاتھ زخمی تو ہوا لیکن زخم گہرا نہ تھا۔

اگلے روز محمد دین لاہور آ گئے۔

علم الدین والد کے ساتھ رہتے' والد کا ہاتھ بٹاتے اور کام سیکھتے۔ اہل خانہ سمجھ گئے کہ علم الدین نجار بنیں گے اور نجاری ہی کو ذریعہ معاش بنائیں گے۔ ابھی اناڑی تھے' جبھی تو ہاتھ زخمی کر بیٹھے۔ ویسے تیز دھار اوزاروں سے کام کرنے اور سیکھنے میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

طالع مند کبھی بیکار نہ رہتے۔ لاہور میں کام کرتے' لاہور سے باہر بھی جاتے۔ جہاں کام کرتے' نیک نامی سے کرتے۔ اپنے مالکوں سے صرف بسولے اور رندے کے حوالے سے تعلق قائم نہ کرتے بلکہ انسانی ہمدردی کا رشتہ قائم کرتے جس کی وجہ سے لوگ ان سے محبت کرتے' ان کی عزت کرتے۔

علم الدین کا گھر پرانی وضع کا تھا جہاں وہ والدین کے زیر سایہ تربیت پا رہے تھے۔ گھر سے عزت اور شرافت کا سبق لیا۔ وہیں دیانتداری کی خُو پائی۔ گھر ہی درسگاہ ٹھہری جہاں سے کتابی علم تو نہ ملا لیکن اس کی روح جذب کی' اس کی غایت جانی پہچانی' علم تو ان کے نام کا حصہ تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کا انسان بن رہے تھے۔ علم تو نور ہے۔ جب یہ بندے کے اندرون کو روشن کرے تو وہ نورانی ہو جاتا ہے۔

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

گھر کے شریفانہ ماحول میں ڈھل گئے۔ والد کی صحبت میں رہ کر معلوم ہوا کہ بندہ وہ ہے جو دوسروں کے کام آئے۔ ایثار اور احسان کو زندگی کا بنیادی عنصر قرار دے' خلوص سے پیش آئے' اس کا صلہ کسی نہ کسی شکل میں بندے کو مل جاتا ہے۔

علم الدین نے بچپن ہی میں بعض ایسے واقعات دیکھے جن کے نقوش ان کے دماغ پر ثبت

ہوئے اور ان کی کردار سازی میں کام آئے۔

ایک سال والد کے ساتھ کوہاٹ میں رہے۔ یہ علاقہ غیور اور بہادر پٹھانوں کا ہے۔ تب یہاں باڑہ قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ یہ اچھے' بہت ہی اچھے لوگوں کا ڈیرہ ہے۔ پٹھانوں کا یہ وصف ہے کہ جو ان سے نیکی کرے وہ اسے بھلاتے نہیں' یاد رکھتے ہیں' بڑے مخیر طبع اور متواضع لوگ ہیں' محسن کو قرار واقعی صلہ دیتے ہیں۔ جان تک نثار کر دیتے ہیں۔ یہی ان کی زندگی ہے' یہی چلن ہے' یہی دستورِ حیات ہے۔

علم الدین نے پٹھانوں کی اعلیٰ صفات کا بہ نفس نفیس مطالعہ کیا۔ والد نے کوہاٹ جا کر رہنے کے لیے مکان کرائے پر لیا جس کا مالک اکبر خاں پٹھان تھا۔ کام کے لیے گھر سے باہر جاتے۔ ایک دن روشن خاں نامی ایک شخص کے گھر پر کام کرنے گئے۔ کام میں مصروف تھے کہ کسی نے آ کر بتایا کہ ان کے مالک مکان اکبر خاں کا بھائی سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ ''اس کا بھائی شدید زخمی ہو گیا ہے اور اس کی رپورٹ پولیس نے اکبر خاں کو گرفتار کر لیا ہے۔''

اکبر خاں کی خبر سنتے ہی طالع محمد نے کام چھوڑا اور اکبر خاں کی مدد پر جانے کو تیار ہو گئے۔

روشن خاں حیران ہوا کہ یہ پردیسی پنجابی روزی چھوڑ کر پٹھان کی مدد کو جا رہا ہے۔ اس نے پوچھا......

''تمہاری اس کے ساتھ کوئی رشتہ داری ہے جو یوں کام چھوڑ کر جا رہے ہو؟''

طالع مند نے کہا......

''میں اس کا کرایہ دار ہوں۔ وہ میرا محسن ہے۔ اگر خوشی کے وقت وہ مجھے نہیں بھول سکتا تو پھر میں مصیبت کی گھڑی میں اس کی خبر کیوں نہیں لے سکتا؟''

روشن خاں پردیسی کے جواب سے بہت متاثر ہوا۔ وہ بھی ساتھ چل دیا اور دونوں کی کوشش سے اکبر خاں پولیس کی گرفت سے چھوٹ گیا۔ اس واقعہ کا اکبر خاں پر یہ اثر ہوا کہ طالع مند کی ضد اور اس کے اصرار کے باوجود اکبر خاں نے ایک سال تک کے قیام میں طالع مند سے کرایہ وصول نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ واپس لاہور آنے کا ارادہ کیا تو اکبر خاں نے پیار کی نشانی کے طور پر باپ بیٹے کو ایک ایک چادر دی۔

تب آج سے کہیں زیادہ پنجابی اور پٹھان آپس میں پیار کرتے تھے۔ شرافت' خلوص' ایثار اور محبت کا دریا بہتا تھا جس کے پانی سے لوگ غسلِ صحت کرتے تھے۔ علم الدین کی آبیاری بھی اسی سرچشمۂ حیات سے ہو رہی تھی۔

زندگی امن اور چین سے گزر رہی تھی۔ بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ اب علم الدین کی باری تھی چنانچہ ماموں کی بیٹی سے منگنی ہو گئی۔ شادی کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔

علم الدین کو گھر اور کام سے سروکار تھا۔ باہر جو طوفان برپا تھا اس کی خبر نہ تھی۔ ''اس وقت انہیں یہ بھی علم نہ تھا کہ گندی ذہنیت کے شیطان صفت راجپال نامی بدبخت نے نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان کے خلاف ایک دل آزار کتاب (رنگیلا رسول) شائع کر کے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا ہے۔''

وہ سیدھے سادھے مسلمان یعنی انسان تھے۔ باہر تو اور بھی کئی طوفان اٹھ رہے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد زندہ باد! انقلاب زندہ باد! فرنگی راج مردہ باد اور اسی نوع کے فلک شگاف نعرے رات دن گونج رہے تھے۔ ادھر اس سب کو تہس نہس کرنے کے لیے راجپال نے نفرتوں اور کراہتوں سے لدا پھندا طوفان برپا کر دیا تھا۔ اس طوفان بدتمیزی سے ہندو آپس میں بٹ گئے۔ مسلم دشمن ایک طرف ہو گئے۔ عدل و انصاف کے پرستار اور ہندو مسلم اتحاد کے طلبگار دوسری طرف ہو گئے۔ ثانی الذکر کی تعداد کم تھی چنانچہ ان کی دال نہ گل رہی تھی۔

اب تو علم الدین کے دل میں بھی طوفان برپا ہوا جس نے ایک دم ان کی سوچ ہی بدل دی۔ شاید ان کی گھریلو تعلیم و تربیت کا یہی نتیجہ تھا۔ علم الدین کی سرفرازی اور ان کے گھرانے کی سربلندی کا وقت آ گیا تھا۔ قدرت کو اسی گھڑی کا انتظار تھا۔ وقت نے انہیں اسی کے لیے تیار کیا تھا۔ انہوں نے امن و سکون سے جو بیس سال گزارے وہ اب زندگی کے نئے موڑ پر آ گئے۔ ہوا کا رخ بدل گیا۔ یہی نہیں بلکہ ہوا طوفان خیز ہو گئی۔

حکومت کو راجپال کے خلاف مقدمہ چلانے کو کہا گیا۔ مقدمہ چلا لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ عبدالعزیز اور اللہ بخش کو الجھا کر سزا دی گئی۔ الٹا چور سرخرو ہوا اور کوتوال ان کے ساتھ مل گیا۔ اخبارات چیختے چلاتے' راجپال کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کرتے۔ جلسے ہوتے' جلوس نکلتے لیکن حکومت اور عدل و انصاف کے کان بہرے ہو گئے۔

مسلمان دل برداشتہ تو ہوئے لیکن سرگرم عمل رہے۔ دلی دروازہ سیاسی سرگرمیوں کا گڑھ تھا۔ یہاں سے جو آواز اٹھتی پورے ہند میں گونج جاتی۔ وہ دور ہی ایسا تھا۔ دلی دروازہ اور موچی دروازہ میں ہر دم جوالا مکھی سلگتی رہی۔ آتش نفس مقرر انہیں ہوا دیتے رہے۔ یہ باکمال مقرر زندگی کو موت سے لڑا دیتے۔ زندگی دیوانہ وار موت کے گلے پڑ جاتی۔ لوگ سود و زیاں سے بالاتر ہو جاتے اور بے دریغ جانوں پر کھیل جاتے۔ راجپال کا معاملہ اتنی اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ دلی دروازے کے باغ میں اس کا

ذکر لازم ہو گیا۔

''علم الدین حالات سے بے خبر تھے۔ ایک روز حسب معمول کام پر گئے ہوئے تھے۔ غروب آفتاب کے بعد گھر واپس جا رہے تھے تو دلی دروازے میں لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا۔ ایک جوان کو تقریر کرتے دیکھا تو رکے۔ کچھ دیر کھڑے سنتے رہے لیکن ان کے پلے کوئی بات نہ پڑی۔ قریب کھڑے ایک صاحب سے انہوں نے دریافت کیا تو انہوں نے علم الدین کو بتایا کہ راجپال نے نبی کریم ﷺ کے خلاف کتاب چھاپی ہے' اس کے خلاف تقریریں ہو رہی ہیں۔'' (نگینہ ص 20)

وہ دیر تک تقریریں سنتے رہے۔ پھر ایک اور مقرر آئے جو پنجابی زبان میں تقریر کرنے لگے۔ یہ علم الدین کی اپنی زبان تھی جس کی تربیت گھر سے ملی تھی۔ اردو کی تعلیم مدرسے سے ملتی تھی۔ مدرسے وہ گئے ہی نہیں۔ پنجابی تقریر اچھی طرح ان کی سمجھ میں آ ئی جس کا ماحصل یہ تھا کہ راجپال نے کتاب چھاپی ہے جس میں ہمارے پیارے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے اور نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں۔ راجپال واجب القتل ہے۔ اسے اس شرانگیز حرکت کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔

علم الدین کی زندگی کے تیور ہی بدل گئے۔ پڑھے لکھے نہ تھے۔ سیدھے سادھے مسلمان تھے۔ اور کچھ نہ سہی' کلمہ تو انہیں آتا تھا۔ یہی بہت بڑا سرمایہ حیات تھا ان کے لیے۔ کلمے میں اللہ اور رسول ﷺ کا نام ایک سانس میں لیتے تھے۔ یہی دو سہارے' دو محور تھے ان کی سوچ کے۔

جب جہاد باللسان اور جہاد بالقلم سے کام نہ بنے تو پھر جہاد بالسیف ہی سے قضیہ نمٹتا ہے۔ علم الدین بیچارے کے پاس اس سلسلے میں لسان اور قلم کہاں سے آئے؟ تقریر کر سکتے نہ لکھ پڑھ سکتے لیکن ان کے ہاتھ میں وہ خوبی تھی' وہ ہنر تھا جس نے جہاد بالسیف کا راستہ ہموار کیا' آسان کیا۔ اس کے پیچھے وہ شدید اور گراں قدر جذبہ تھا جو شر کو مٹانے کے لیے حرکت میں آیا۔

انہوں نے راجپال کو اس کی شرارت بلکہ شرانگیزی کی سزا دینا ضروری سمجھا۔

دلی دروازے کے باغ سے آتش نوا مقرروں کی تقریریں سن کر دیر سے گھر آئے تو طالع مند (والد) نے پوچھا' دیر سے کیوں آئے ہو؟ تو انہوں نے جلسے کی ساری کارروائی بیان کی۔ راجپال کی حرکت کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ جلسے میں اسے واجب القتل قرار دیا گیا ہے۔

طالع مند بھی سیدھے سادھے کلمہ گو تھے۔ ہر مسلمان کی طرح انہیں بھی اپنے نبی ﷺ کی شان میں گستاخی گوارا نہ تھی۔ انہوں نے بھی اس بات کی تائید کی کہ رسول اکرم ﷺ کی ذات پر حملہ

کرنے والے بداندیش کوواصلِ جہنم کرنا چاہیے۔

یوں علم الدین کو گویا گھر سے بھی اجازت مل گئی اور دشمن کا کام تمام کرنے کے خیال کوتقویت پہنچی۔علم الدین کے دل میں جو بھانبڑ مچا تھا' اس کی خبر کسی کو نہ تھی۔

وہ اپنے دوست شیدے سے ملتے۔راجپال اور اس کی کتاب کا ذکر کرتے۔ان دنوں کوچہ و بازار میں ہر جگہ یہی موضوع زیر بحث آتا۔جہاں دو بندے اکٹھے ہوئے' راجپال کی حرکت پر تبادلہ خیال شروع ہوگیا۔فرنگی کی جانبداری' مجرم کو کھلی چھٹی دینے اور مسلمانوں کو جبر و تشدد کا نشانہ بنانے کا تذکرہ ہوتا۔مسلمانوں کی تاریخی رواداری اور غیر مسلم ہمسایوں سے حسنِ سلوک کی باتیں ہوتیں۔رات دن یہی ہوتا۔باقی تمام موضوع اس موضوع میں دب کر رہ گئے۔ذکر خدا اور ذکر محمد ﷺ کو اولیت حاصل نہ ہو تو اور کس موضوع کو ہو؟

شیدا اچھا لڑکا تھا لیکن ایک بھلے آدمی نے طالع مند کے دل میں شک بٹھا دیا کہ وہ آوارہ ہے' علم الدین کی اس سے دوستی ٹھیک نہیں۔طالع مند نے بیٹے کو سمجھایا لیکن بات نہ بنی۔علم الدین کا یہی ایک نوجوان مزاج آشنا تھا۔اسی کے ساتھ علم الدین گھومتے پھرتے۔

پتہ نہ چل رہا تھا کہ راجپال کون ہے؟ کہاں ہے دکان اس کی؟ کیا حلیہ ہے اس کا؟

انجام کار علم الدین کو شیدے کے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ شاتم رسول ہسپتال روڈ پر دکان کرتا ہے۔طالع مند کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ علم الدین کو کیا ہو گیا ہے۔کام پر باقاعدہ نہیں جاتا' کھانے کا بھی ناغہ کر لیتا ہے۔کیا عجب کہ علم الدین کے روز و شب کے معمولات میں جو بے قاعدگی آئی ہے اس کا سبب شیدا ہو جس کے باپ کی نسبت خبر ملی کہ وہ جواری ہے اور اپنی دکان جوئے میں ہار چکا ہے۔

طالع مند کی طبیعت غصیلی تھی پھر علم الدین جب دیر سے گھر آئے اور طالع مند کو پتہ چلا کہ شیدے لوفر کے ساتھ پھرتے رہے ہیں تو وہ غصے سے لال پیلے ہو گئے۔باپ کے سامنے جوان بیٹا خاموش سر جھکائے کھڑا رہا۔باپ کا ادب بھی تھا' ڈر بھی تھا۔باپ نے انہیں پکڑ کر دھکیلا......اور کہا؟ چلا جا اُس لوفر کے پاس!

بڑے بھائی محمد دین کو اپنے چھوٹے بھائی سے بڑا پیار تھا۔فوراً بیچ بچاؤ کے لیے آئے اور باپ کو منا لیا۔بھائی اندر لے گئے اور ناصحانہ درس دیا۔اونچ نیچ سمجھائی' بری صحبت سے بچنے کو کہا۔

علم الدین کو اپنی ذات پر یقین تھا اور جانتے تھے کہ وہ بری صحبت کا شکار نہیں۔شیدے کے حوالے سے بری صحبت کا سن کر آبدیدہ بھی ہوئے اور برہم بھی۔

وہ پوری طرح بات واضح نہیں کر سکتے تھے۔ان کے دل میں جو بھانبڑ مچا تھا اس کا وہ کیسے ذکر کرتے؟ موت اور زندگی کا سوال تھا۔انہوں نے سر پر کفن باندھ لیا تھا لیکن کسی کو نظر نہ آ رہا تھا۔اپنے ارادے کا خفیف سا اشارہ بھی کسی کو نہ دے سکتے تھے' مبادا کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے اور وہ شک کی بھول بھلیوں میں جا پہنچیں۔البتہ اب اتنا ضرور ہو گیا کہ گھر میں راجپال کے قتل کی بات عام انداز میں ہونے لگی۔اس گفتگو میں طالع منداور علم الدین شریک ہوتے۔یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔گھر گھر اس کا چرچا تھا۔

لوگوں کے دلوں میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ادھر باہر بھی آگ بھڑک رہی تھی۔مسلمانوں کے لیڈر' رہنما' سیاسی اور مذہبی خطیب پوری قوت سے کہہ رہے تھے کہ زبان دراز راج پال کو عبرت ناک سزا دی جائے تا کہ ایسا فتنہ پھر کبھی سر نہ اٹھائے۔عاشق رسولؐ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے بڑی رقت انگیز تقریر کی۔دفعہ 144 کا نفاذ تھا جس کی رو سے کسی نوع کا جلسہ یا اجتماع نہیں ہو سکتا تھا لیکن مسلمانوں کا ایک فقید المثال اجتماع بیرون دہلی دروازہ درگاہ شاہ محمد غوثؒ کے احاطہ میں منعقد ہوا۔ وہاں اس عاشق رسول ﷺ نے ناموسِ رسالت پر جو تقریر کی' وہ اتنی دل گداز تھی کہ سامعین پر رقت طاری ہو گئی۔کچھ لوگ تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔شاہ جی نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''آج آپ لوگ جناب فخر رسل محمد عربی ﷺ کے عزت و ناموس کو برقرار رکھنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔آج جنس انسان کو عزت بخشنے والے کی عزت خطرہ میں ہے۔آج اس جلیل المرتبت کا ناموس معرض خطر میں ہے جس کی دی ہوئی عزت پر تمام موجودات کو ناز ہے۔'' اس جلسہ میں مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی بھی موجود تھے۔شاہ جی نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

''آج مفتی کفایت اللہ اور احمد سعید کے دروازے پر ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اور ام المومنین خدیجۃ الکبریٰؓ کھڑی آواز دے رہی ہیں۔ہم تمہاری مائیں ہیں' کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کفار نے ہمیں گالیاں دی ہیں۔ارے دیکھو! کہیں ام المومنین عائشہ صدیقہؓ دروازہ پر تو کھڑی نہیں؟''

یہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے اس جوش اور ولولہ کے ساتھ ابل پڑے کہ سامعین کی نظریں معاً دروازے کی طرف اٹھ گئیں اور ہر طرف سے آہ و بکا کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔پھر اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

''تمہاری محبتوں کا تو یہ عالم ہے کہ عام حالتوں میں کٹ مرتے ہو لیکن کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آج گنبد خضریٰ میں رسول اللہ ﷺ تڑپ رہے ہیں۔آج خدیجہؓ اور عائشہؓ پریشان ہیں۔بتاؤ! تمہارے

دلوں میں امہات المومنین کے لیے کوئی جگہ ہے؟ آج ام المومنین عائشہؓ تم سے اپنے حق کا مطالبہ کرتی ہیں۔ وہی عائشہؓ جنہیں رسول اللہ ﷺ ''حمیرا'' کہہ کر پکارا کرتے تھے' جنہوں نے سید عالم ﷺ کو وصال کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔ یاد رکھو کہ اگر تم نے خدیجہؓ اور عائشہؓ کے لیے جانیں دے دیں تو یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں۔''

شاہ جی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:

''جب تک ایک مسلمان بھی زندہ ہے' ناموس رسالت پر حملہ کرنے والے چین سے نہیں رہ سکتے۔ پولیس جھوٹی' حکومت کوڑھی اور ڈپٹی کمشنر نا اہل ہے۔ وہ ہندو اخبارات کی ہرزہ سرائی تو روک نہیں سکتا' لیکن علمائے کرام کی تقریریں روکنا چاہتا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ دفعہ 144 کے یہیں پر خچے اڑا دیئے جائیں۔ میں دفعہ 144 کو اپنے جوتے کی نوک تلے مسل کر بتا دوں گا۔

پڑا فلک کو دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے راکھ نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

داغ کا یہ شعر شاہ جی نے کچھ اس انداز سے پڑھا کہ لوگ بے قابو ہو گئے۔ اس تقریر نے سارے شہر میں آگ لگا دی۔ لاہور میں بدنامِ زمانہ کتاب' اس کے مصنف اور ناشر کے خلاف جا بجا جلسے ہونے لگے۔''

''انہی دنوں انجمن خدام الدین نے شیرانوالہ دروازہ میں راجپال کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔''

سارا ماحول شعلوں سے بھرپور ہو گیا۔ ملک کے طول و عرض سے احتجاجی جلسے ہونے اور جلوس نکلنے لگے تھے۔ آخر ایک مرد غازی اٹھا اور اس نے ایک صبح راجپال کی دکان پر جا کر چاقو سے حملہ کیا۔ تیس برس کا یہ مجاہد اندرون یکی دروازے کا شیر فروش خدا بخش اکو جہاں تھا۔ راجپال زخمی تو ہوا لیکن اس کی جان بچ گئی۔ مقدمہ چلا اور جلد ہی نمٹا دیا گیا۔ مجاہد خدا بخش کی طرف سے کوئی وکیل پیش نہ ہوا۔ ایک دو دن کی کارروائی کے بعد عدالت نے سات سال قید سخت کی سزا دی جس میں تین ماہ قید تنہائی کے تھے۔ رہائی کے بعد پانچ ہزار روپے کی ضمانت کا بھی پابند کیا گیا۔ مسلمان اس عدالتی فیصلے کو کیونکر قبول کرتے۔ سراسر بے انصافی ہو رہی اور مجرم کو پناہ دی جا رہی تھی۔ عدالت سے ملزم کو قرار واقعی سزا ملنے کی امید نہ رہی تو وہ خود ہی برائی کا قلع قمع کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بات ہند کی حدود سے باہر جا چکی تھی چنانچہ افغانستان کے عبدالعزیز نامی غیور تاجر نے راجپال پر حملہ کیا لیکن انہیں پہچاننے میں غلطی ہوئی۔ عبدالعزیز مہاشے کی دکان پر پہنچ گئے' جہاں دو آدمی بیٹھے اسلام کے خلاف اشتعال انگیز گفتگو کر رہے

تھے۔غازی نے اپنی دانست میں مہاشہ راجپال پر حملہ کیا لیکن وہ سوامی ستیانند تھا۔اب پھر بسرعت فیصلہ کیا گیا۔عبدالعزیز وکیل کے بغیر پیش ہوئے۔عدالت اتنی جلدی میں تھی کہ وکیل بنانے کے لیے وقت ہی نہ ملتا۔9 اکتوبر 1927ء کو حملہ ہوا۔11 اکتوبر کو عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔12 اکتوبر کو عدالت نے سات سال قید سخت کی سزا دی۔تین ماہ قید تنہائی۔رہائی کے بعد پانچ پانچ ہزار روپے کی تین ضمانتیں دینا قرار دیا۔

شاید ہی کبھی عدالت میں قتل کے مقدمات اس عجلت سے پیش ہوئے اور وکیل کے بغیر نمٹا دیئے گئے ہوں۔یہ صورتحال بیسویں صدی کی فرنگی عدالتوں کی تھیں۔کلیسائی عدالتوں کے صدیوں بعد بھی فرنگی کے تیور نہ بدلے۔امن قائم نہ ہوا۔اب غازی علم الدین حرکت میں آئے۔ان کا رد یہ والدین کے لیے تشویش ناک تھا۔علم الدین کے کام میں بے قاعدگی اور طبیعت میں بیکلی آ گئی تھی۔اکھڑ پن آ گیا تھا رویئے میں۔

طالع مند نے علم الدین کے بارے میں سوچا' اس اکھڑ پن کا ایک ہی علاج ہے کہ اس کا بیاہ کر دیا جائے۔ماں باپ کو اولاد کی پریشانی کے سلسلے میں یہی نسخہ یاد ہے۔سب اسی کو آزماتے تھے۔طالع مند نے فیصلہ کر لیا کہ علم الدین کو جلد ہی سلسلہ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے گا۔

ادھر علم الدین کی حالت ہی اور تھی۔ایک رات اس نے خواب دیکھا۔ایک بزرگ ملے اور انہوں نے کہا' علم الدین ابھی تک سو رہے ہو۔تمہارے نبی ﷺ کی شان کے خلاف، دشمن کارروائیوں میں لگے ہیں۔اٹھو جلدی کرو!

"علم الدین ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ان کا تمام جسم پسینے میں شرابور تھا۔" پھر آنکھ نہ لگی۔منہ اندھیرے اٹھے۔اوزار سنبھالے اور سیدھے شیدے کے گھر پہنچے۔

شیدے کو لیا اور بھاٹی دروازے کی طرف چلے گئے۔ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔عجیب بات ہے کہ علم الدین نے خواب دیکھا تھا تو ویسا ہی خواب شیدے نے رات کو دیکھا تھا۔دونوں ہی کو بزرگ نے راجپال کا صفایا کرنے کو کہا...... دونوں پریشان ہوئے۔کون یہ کام کرے' کون نہ کرے۔دیر تک بحث چلتی رہی۔دونوں ہی یہ کام کرنا چاہتے تھے۔لیکن ان میں کوئی فیصلہ نہ ہو رہا تھا۔دونوں ہی اپنے مؤقف پر ڈٹے تھے۔آخر قرار پایا کہ قرعہ اندازی کی جائے۔دونوں اس پر رضامند ہو گئے۔دو مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی۔دونوں مرتبہ علم الدین کے نام کی پرچی نکلی۔شیدے نے اصرار کیا کہ تیسری بار پھر قرعہ اندازی کی جائے۔پرچی نکالنے والا اجنبی لڑکا حیران تھا کہ یہ دونوں جوان کیا کر رہے ہیں۔آخر تیسری بار پر علم الدین رضامند ہو گئے۔اب پھر انہی کا نام نکلا۔

اب شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ رہی۔علم الدین مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے۔قرعہ فال انہی کے نام نکلا۔وہی باہمی فیصلے سے شاتم رسول کا فیصلہ کرنے پر مامور ہوئے۔

پھر دونوں وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

گھر والوں کو خبر ہی نہ ہوئی کہ علم الدین نے کیا فیصلہ کیا ہے' ان کے اندر کب سے طوفان انہیں بے چین کر رہا ہے اور اس کا منطقی انجام کیا ہوگا۔ان کی زندگی میں جو بے ترتیبی آئی ہے' اس کا کیا سبب ہے؟

ایک مرتبہ پھر خواب میں آ کر بزرگ نے اشارہ کیا...... ''علم الدین اٹھو! جلدی کرو! دیر کی تو کوئی اور بازی لے جائے گا۔''

ارادہ تو کر ہی چکے تھے۔مکرر خواب میں بزرگ کو دیکھا تو ارادہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔

آخری بار اپنے دوست شیدے سے ملنے گئے۔اسے اپنی چھتری اور گھڑی یادگار کے طور پر دی۔گھر آئے۔رات گئے تک جاگتے رہے۔نیند کیسے آتی؟ وہ تو زندگی کے سب سے بڑے مشن کی تکمیل کی بابت سوچ رہے تھے۔اس کے علاوہ اب کوئی دوسرا خیال پاس بھی پھٹک نہ سکتا تھا۔

اگلی صبح گھر سے نکلے۔گنٹی بازار کی طرف گئے اور آتما رام نامی کباڑیے کی دکان پر پہنچے جہاں چھریوں چاقوؤں کا ڈھیر لگا تھا۔وہاں سے انہوں نے اپنے مطلب کی چھری لے لی اور چل دیئے۔اب ''نغمہ بیش از تار'' ہو گیا۔روح بے قابو ہو گئی۔

''انارکلی میں ہسپتال روڈ پر عشرت پبلشنگ ہاؤس کے سامنے ہی راجپال کا دفتر تھا......''

معلوم ہوا کہ راجپال ابھی نہیں آیا۔آتا ہے تو پولیس اس کی حفاظت کے لیے آ جاتی ہے۔ اتنے میں راجپال کار پر آیا۔کھوکھے والے نے بتایا' کار سے نکلنے والا راجپال ہے۔اسی نے کتاب چھاپی ہے۔

''راجپال ہردوار سے واپس آیا تھا' دفتر میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھا اور پولیس کو اپنی آمد کی خبر دینے کے لیے ٹیلیفون کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ علم الدین دفتر کے اندر داخل ہوئے۔اس وقت راجپال کے دو ملازم وہاں موجود تھے۔کدار ناتھ پچھلے کمرے میں کتابیں رکھ رہا تھا۔جبکہ بھگت رام راجپال کے پاس ہی کھڑا تھا۔راجپال نے درمیانے قد کے گندمی رنگ والے جوان کو اندر داخل ہوتے دیکھ لیا لیکن وہ سوچ بھی نہ سکا کہ موت اس کے اتنے قریب آ چکی ہے...... پل جھپکتے میں چھری نکالی...... ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور پھر راجپال کے جگر پر جا لگا...... چھری کا پھل سینے میں اتر چکا تھا۔ایک ہی وار اتنا کارگر ثابت ہوا کہ راجپال کے منہ سے صرف ہائے کی آواز نکلی اور وہ اوندھے منہ زمین پر جا پڑا۔

''علم الدین الٹے قدموں باہر دوڑے۔ کدار ناتھ اور بھگت رام نے باہر نکل کر شور مچایا......
پکڑو پکڑو...... مار گیا' مار گیا' مار گیا۔''

راجپال کے قتل کی خبر آناً فاناً شہر میں پھیل گئی۔ پوسٹ مارٹم ہوا تو کئی ہزار ہندو ہسپتال پہنچ گئے اور آریہ سماجی ''ہندو دھرم کی جے' ویدک دھرم کی جے'' کے نعرے سنائی دینے لگے۔

امرت دھارا کے موجد پنڈت ٹھاکر دت شرما' رائے بہادر بدری داس اور پرمانند کا وفد ڈپٹی کمشنر سے ملا اور راجپال کی ارتھی کو ہندو محلوں میں سے لے جانے کی درخواست کی لیکن ڈپٹی کمشنر نہ مانا۔ کیسے مانتا؟ اس کی منشاء کے عین مطابق' حسب ضرورت ہندو مسلم اتحاد درہم برہم ہونے کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کسی کو اس حد کے آگے کیونکر جانے دیتا۔ اگلا مرحلہ تصادم کا تھا جس سے امنِ قائم نہ رہتا۔ فرنگی کو اس سے نقصان پہنچتا چنانچہ جب لوگ زبردستی کرنے اور ارتھی کا جلوس نکالنے پر تل گئے تو پولیس کو لاٹھی چارج کا حکم ملا۔ ''پنجاب پولیس امن قائم کرنے کا بڑا تجربہ رکھتی ہے۔'' پولیس نے لٹھ برسائے اور وہ لٹھم لٹھا ہوئی کہ توبہ ہی بھلی۔''

علم الدین کے گھر والوں کو علم ہوا تو وہ حیران ضرور ہوئے لیکن انہیں یہ پتہ چل گیا کہ ان کے چشم و چراغ نے کیسا زبردست کارنامہ سرانجام دیا اور ان کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ پولیس نے بغرضِ حفاظت ان کے گھر پر پڑاؤ ڈال لیا اور ہجوم کو ہٹا دیا۔ اب کوئی ان کے گھر میں جا نہ سکتا تھا' وہ بھی گھر سے باہر نہ آ سکتے تھے۔ شیدا باہر رہ کر انہیں ضرورت کی چیزیں پہنچانے لگا۔

طالع مند کو قرعہ اندازی کا علم ہوا تو شیدے کے بارے میں سارے شکوک وشبہات رفع ہو گئے۔ پھر اس نے جس لگن سے خدمت کی اس سے اس نے ان کا دل موہ لیا۔

مسلمان اب چاہتے تھے کہ حکومت غازی علم الدین کے اقدام کو درست سمجھے کیونکہ انہوں نے بجا طور پر اپنے پیارے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی گوارا نہیں کی۔ ان کا دل مجروح ہوا جس کے نتیجے میں بدباطن راجپال کا خاتمہ کیا۔ علم الدین اپنے فعل میں حق بجانب تھے۔

غازی علم الدین کی بے گناہی میں نہ صرف ہند بلکہ افغانستان تک میں بھی آوازیں اٹھنے لگیں اور علم الدین کی بریت پر زور دیا جانے لگا۔

ادھر آریا سماج والے چلا رہے تھے کہ مسلمان ان کے فرائض منصبی میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ انہیں اسلام اور بانی اسلام ﷺ کی توہین کے لیے کھلی چھٹی دی جائے۔ وہ دل آزار تقریریں کرتے اور اشتعال انگیز کتابیں کھلم کھلا چھاپتے رہیں۔ مسلمان چپ چاپ یہ سب کچھ دیکھتے رہیں اور ان سے باز پرس نہ کریں۔

فرنگی تماشا دیکھ رہا تھا' اور طوفان بدتمیزی کو روک نہ رہا تھا۔

دونوں طرف آگ کے شعلے پھیل رہے تھے۔ نتیجہ واضح تھا۔ بالآخر دونوں قوموں کے رہنماؤں اور اخبار والوں نے سدباب کی تدبیر کی۔ باہمی افہام و تفہیم سے طے پایا کہ لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کیا جائے تاکہ فساد نہ ہو جائے۔ ایسا ہوا تو گلی گلی' کوچہ کوچہ خون کی ندیاں بہہ نکلیں گی اور بڑے پیمانے پر معصوم انسان جانیں گنوا بیٹھیں گے۔ مولانا ظفر علی خاں سے استدعا کی کہ اپنے اخبار ''زمیندار'' میں اشتعال انگیز خبریں اور مضامین نہ چھاپیں۔ مولانا نے صاف صاف کہا' اگر راجپال کے خلاف پہلے ہی کارروائی کی جاتی تو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اب جو بویا ہے سو کاٹو۔ تاہم وہ اس شرط پر مان گئے کہ ہندو اخبارات کی زبان بندی بھی کی جائے۔ ورنہ یہ سلسلہ تو یونہی چلتا رہے گا۔ ڈپٹی کمشنر نے یقین دلایا کہ ہندو پریس کو بھی کنٹرول کیا جائے گا۔ تاہم معاملہ معمولی نہ تھا جسے لوگ دل سے اتار دیتے۔ لاہور میں علامہ اقبالؒ' مولانا محمد علی' سر شفیع' مراتب علی شاہ اور میاں عبدالعزیز نے غازی علم الدین کے حق میں قرارداد پاس کروائی۔ کتنے ہی دوسرے شہروں میں بھی ایسی ہی قراردادیں منظور ہوئیں۔

> ''بخشی بشن داس نے کہا' میں ہندو ہوں اور ہندو بھی کون آریہ بلکہ آریہ سے بھی دس قدم آگے۔ میں نے قرآن شریف پڑھا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ تم کسی بت کو بھی گالی نہ دو۔ اس میں تمام مسلمانوں کا قصور نہیں ہے بلکہ برا فعل کرنے والا اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے۔ سوامی دیانند کو ایک ہندو برہمن نے زہر دے دیا۔ اس میں قصور برہمن کا تھا نہ کہ تمام ہندوؤں کا۔ مہاشے رام چند کو جموں میں ہندوؤں ہی نے لاٹھیاں مار مار کر مار دیا۔ اس میں قصور صرف ان ہندوؤں کا ہی تھا نہ کہ تمام ہندوستان کے ہندوؤں کا۔''

اس طرح ہندو مسلم کشیدگی میں کمی آئی اور اب توجہ اس امر پر دی جانے لگی کہ عدالت انصاف سے کام لے۔ آخر عدالت کا دروازہ کھلا اور غازی علم الدین کی قسمت کے فیصلے کی نوبت آئی۔ سب کی نظریں ایک نقطے پر جمع ہو گئیں۔ 10 اپریل کو پہلی پیشی ہوئی۔ غازی علم الدین کی طرف سے کوئی وکیل پیش نہ ہوا۔ کیسی تعجب کی بات ہے کہ اس سے پہلے بھی یہی صورت تھی۔ مرد غازی خدا بخش اکو جہاں پر راج پال پر قاتلانہ حملہ کرنے کے الزام میں مقدمہ چلا تو انہیں کوئی وکیل میسر نہ آیا۔ اسی طرح افغانستان کے تاجر غازی عبدالعزیز بھی راجپال پر قاتلانہ حملے کے الزام میں وکیل کے بغیر ہی عدالت میں پیش ہوئے۔

بہر حال تین مرتبہ ایسا ہوا۔ بعد ازاں غازی علم الدین کی طرف سے چوٹی کے وکیل پیش

ہوئے۔ بعد ازاں خواجہ فیروز الدین بیرسٹر نے یہ مقدمہ لے لیا۔ ان کے معاون ڈاکٹر اے آر خالد تھے۔فرخ حسین بیرسٹر تو پہلے سے شامل تھے۔ان میں مسٹر سلیم اور دیگر وکلاء بھی شامل ہو گئے۔

وکلاء نے جرح کی اور صفائی میں دلائل دیئے لیکن یہاں دلائل سننے والا اور انہیں درخور اعتناء کرنے والا کون تھا؟ عدالت طوفان میل کی طرح مقدمے کی سماعت کرنے اور فیصلہ سنانے کے لیے بے چین تھی۔صفائی کے وکلاء کی کوئی بات مانی نہ گئی' کوئی دلیل قبول نہ کی گئی اور 22 مئی کو سزائے موت سنا دی۔فرخ حسین بیرسٹر بمبئی گئے اور ہندوستان کے ذہین ترین نوجوان وکیل محمد علی جناح سے ملے تاکہ وہ ہائیکورٹ میں غازی علم الدین کی اپیل کی پیروی کریں۔

جناح صاحب مان گئے۔اس وقت ہائیکورٹ کی صورت یہ تھی کہ سر شادی لال چیف جسٹس تھا۔جسٹس میاں شاہ دین ہمایوں جو شادی لال سے سینئر تھے' انتقال کر چکے تھے۔ان کے پوتے میاں منظر بشیر کے بقول میاں شاہ دین کے نام سے مال روڈ (شاہراہ قائداعظم محمد علی جناحؒ) پر شاہ دین بلڈنگ تعمیر ہوئی۔قریب ہی 23 لارنس روڈ پر وہ کوٹھی ہے جہاں شاہ دین ہمایوں کے فرزند ارجمند میاں بشیر احمد رہے اور قائداعظم تحریک پاکستان کے دوران میں قیام فرماتے تھے۔

میاں شاہ دین کی بے وقت موت کے باعث جونیئر سر شادی لال کو چیف جسٹس بننے کا موقع مل گیا۔جس کی وجہ سے غازی علم الدین کے مقدمے میں عام عدالت سے لے کر ہائی کورٹ تک میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ایک ہی راگ الاپا جا رہا تھا۔راجپال نے جو فتنہ کھڑا کیا' دنیا بھر کے مسلمانوں کی دل آزاری کی' وہ درست ہے۔غازی علم الدین نے شاتم رسول کو قتل کیا' وہ لائق گردن زدنی ہے۔

ہائیکورٹ میں سماعت ہوئی۔قائداعظم محمد علی جناحؒ نے دفاع میں دو نکات پیش کیے:

1- راج پال نے پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی کی ہے' بدزبانی کی ہے' ملزم کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی گئی جس سے غصے میں آ کر اس نے راجپال پر حملہ کیا۔
جرم اس پر ٹھونسا گیا ہے۔

2- ملزم کی عمر انیس اور بیس سال کے قریب ہے۔وہ سزائے موت سے مستثنیٰ ہے۔

(بحوالہ مقدمہ امیر بنام کراؤن نمبر 954 سال 1922ء)

لیکن فرنگی اور سر شادی لال کی موجودگی میں غازی علم الدین کو کیسے بخشا جا سکتا تھا۔
7.7.29 کو سزائے موت دی گئی۔

کب سے امت مسلمہ بالعموم اور اسلامیان ہند بالخصوص سراپا احتجاج بنے ہوئے تھے۔ان کے دل رو رہے تھے۔قانون اور اخلاق کی دھجیاں اُڑائی گئیں۔انصاف کی آنکھ ہمیشہ اس فیصلے پر خون

کے آنسو ٹپکائے گی۔ فرنگی عہد کی عدالتوں کے انتہائی غیر جانبدارانہ اور غیر منصفانہ فیصلے پر اظہار افسوس کرے گی۔ فرنگی منصفوں نے بالعموم شاتم رسول کا کردار ادا کیا ہے۔ چند دیانتدار دانشوروں کو چھوڑ کر باقی اسی مہم میں لگے رہے کہ جہاں تک بن پڑے مسلمانوں کی دل آزاری کی جائے اور غیر مسلموں کی آنکھوں میں دنیا کی عظیم ترین ہستی' انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے انقلاب آفرین پروگرام لانے والے رسولِ عربی کی شخصیت کو گرایا جائے...... اسلام کی تبلیغ کو روکا جائے۔ قرآنی تعلیمات اور حیاتِ رسول ﷺ کا مطالعہ کرنے کے بعد ممکن نہیں کہ غیر مسلم اسلام قبول کیے بغیر رہ سکے۔

آج بھی راجپال فرنگی کے عشرت کدوں میں ملعون رشدی کے نام سے زندگی بسر کر رہا ہے۔



مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا

''شہیدِ محبت''

صاحبزادہ سیّد خورشید احمد گیلانی

علامہ اقبالؒ کا ایک مصرع ہے:

طے شود جادۂ صد سالہ بآ ہے گا ہے

یعنی بعض اوقات ایک آہ کے فاصلے پر منزل ہوتی ہے یا لمحے بھر میں سو سال کا سفر طے ہو جاتا ہے' یہ مصرع زبان پر آتے ہی ذہن بے اختیار شہیدِ ناموسِ نبی ﷺ غازی علم الدین کی طرف منتقل ہو جاتا ہے' اس نے صدیوں کا سفر اس تیزی اور کامیابی سے طے کیا کہ اربابِ زہد و تقویٰ اور اصحابِ منبر و محراب بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس نے ایک قدم انار کلی ہسپتال روڈ پر اٹھایا اور دوسرے قدم پر جنت الفردوس میں پہنچ گیا۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اسی جنت کی تلاش میں زاہدوں اور عابدوں کے نجانے کتنے قافلے سرگرداں رہے' کیسے کیسے لوگ غاروں کے ہو کر رہ گئے' کئی پیشانیاں رگڑتے اور سر پٹختے رہے' ہزاروں سر بگریباں' چلہ کش اسی آرزو میں دنیا سے اٹھ گئے' لاکھوں طواف و سجود میں غرق رہے' بے شمار صوفی و ملا وقفِ دعا رہے' ان گنت پرہیز گار خیالِ جنت میں سرشار رہے' خدا ان سب کی محنت ضرور قبول کرے گا' لیکن غازی علم الدین کا مقسوم دیکھیے! نہ چلہ کیا نہ مجاہدہ' نہ حج کیا' نہ عمرہ کیا' نہ دیر میں قشقہ کھینچا' نہ حرم کا مجاور بنا' نہ مکتب میں داخلہ لیا نہ خانقاہ کا راستہ دیکھا' نہ کنز قدوری کھول کر دیکھی نہ رازی و کشاف کا مطالعہ کیا نہ حزب البحر کا ورد کیا نہ

اسم اعظم کا وظیفہ پڑھا' نہ علم وحکمت کے خم وپیچ میں الجھا نہ کسی حلقہ تربیت میں بیٹھا' نہ کلام ومعانی سے واسطہ رہا نہ فلسفہ ومنطق سے آشنا ہوا' نہ مسجد کے لوٹے بھرے نہ تبلیغی گشت کیا' نہ کبھی شیخی بگھاری نہ کبھی شوخی دکھائی' اسے پاکبازی کا خبط نہیں' محبوبِ حجازی ﷺ سے ربط تھا' وہ تسبیح بدست نہیں مستِ مئے الست تھا' وہ فقیہ مسند آرا نہیں' فقیرِ سرراہ تھا' یہی وجہ ہے کہ اس نے مصلحت کیشی سے نہیں' جذبہ درویشی سے کام لیا' چنین وچناں کے دائروں سے نکل کر کون ومکاں کی وسعتوں میں جا پہنچا' وہم وگمان کی خاک جھاڑ کر ایمان وعشق کے نور میں ڈھل گیا' نجانے ہاتفِ غیب نے چپکے سے اس کے کان میں کیا بات کہی کہ پل بھر میں دل کی کائنات بدل گئی ۔

پروانے کا حال اس محفل میں' ہے قابلِ رشک اے اہلِ نظر
اک شب میں ہی یہ پیدا بھی ہوا' عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

خدا معلوم کتنی ریاضت سے آغوشِ بسطام نے بایزیدؒ کی پرورش کی' خاکِ بغداد نے جنیدؒ کو جنم دیا' شہر قونیہ نے مولانا رومؒ کو بنایا' دہلی نے شاہ ولی اللہؒ کو پیدا کیا اور ادھر علم الدینؒ 'بڑھئی کی دکان سے اٹھا اور ایک ہی جست میں زمان ومکان طے کر ڈالے۔

علامہ اقبالؒ کو جب غازی علم الدینؒ کے بارے میں بتایا گیا کہ ایک اکیس سالہ ان پڑھ اور مزدور پیشہ نوجوان نے گستاخ رسول راجپال کو بڑی جرأت اور پھرتی سے قتل بلکہ واصلِ جہنم کر دیا ہے تو حضرت علامہؒ نے گلوگیر لہجے میں فرمایا:

''اسی گلاں ای کر دے رہ گئے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا''

(ہم باتیں ہی بناتے رہے اور بڑھئی کا بیٹا بازی لے گیا)

حضرت علامہؒ نے غالباً اسی موقع کے لیے کہا ہے:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں نے

جس زمانے میں یہ رسوائے زمانہ کتاب لکھی اور چھاپی گئی' شہر لاہور میں ظاہر ہے حق ہو کے زلزلے ہوں گے' علم وفضل کے چرچے ہوں گے' تقریر وتحریر کے ہمہمے ہوں گے' وعظ ونصیحت کے غلغلے ہوں گے' ادیبوں اور خطیبوں کے طنطنے ہوں گے' لیکن شاتم رسول کو اسفل السافلین میں پہنچانے کی سعادت کسی صوفی باصفا' کسی امامِ ادب وانشاء' کسی خطیب شعلہ نوا اور کسی سیاسی رہنما کے حصے میں نہیں آئی بلکہ ایسے مزدور کو ملی جو ممتاز دانشور نہیں معمولی کاریگر تھا' جس کی پیشانی پر علم وفضل کے آثار نہیں ہاتھوں میں لوہے کے اوزار تھے' خدا معلوم وہ نمازی تھا یا نہیں لیکن صحیح معنوں میں غازی نکلا' وہ کلاہ دستار

کا آدمی نہیں تھا مگر بڑے کردار کا حامل بن گیا۔

غازی علم الدین شہیدؒ کو دیکھ کر کم از کم یہ یقین ضرور ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کی عبادت کے طول وعرض پر نہیں جاتا بلکہ کسی کے جذبۂ بے غرضی کو شرف قبولیت بخشتا ہے' اس کے ہاں شب زندہ داری سے زیادہ دل کی بے قراری کام دیتی ہے' وہ کسی کے ماتھے کا محراب نہیں دیکھتا نہاں خانۂ قلب کا اضطراب دیکھتا ہے' اسے نیکیوں کے سفینے نہیں گوشۂ چشم پر آنسوؤں کے نگینے درکار ہوتے ہیں' اسے کسی کی خوش بیانی متاثر نہیں کرتی' کسی کی بے زبانی پہ پیار آ جاتا ہے' اسے بوعلی کی حکمت کے مقابلے میں کسی بڑھئی کی غربت پسند آ جاتی ہے' اگر یہ بات نہ ہوتی تو غازی علم الدینؒ کبھی مقامِ شہادت سے سرفراز نہ ہوتا۔

کسی غزوے کے دوران ایک شخص حضور ﷺ کے دستِ مبارک پر مسلمان ہوتا ہے' اور ساتھ ہی جہاد کی اجازت مانگتا ہے' چند لمحے قبل وہ سپاہِ کفر میں شامل تھا' دو ساعتوں کے بعد وہ مجاہدین اسلام کا ساتھی بن جاتا ہے' دولتِ اسلام سے بہرہ مند اور جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر میدان میں اترتا ہے اور تھوڑی دیر بعد جام شہادت نوش کر جاتا ہے' جنگ کے خاتمے پر حضور ﷺ شہداء کی لاشوں کا معائنہ فرما رہے تھے جب ثابت بن اصیرؓ کی لاش پر پہنچے تو آپ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا "اس شخص کو دیکھو جس نے اسلام قبول کیا مگر نہ نماز پڑھی' نہ اس نے روزہ رکھا' نہ اسے حج کرنے کا موقع ملا' مگر سیدھا جنت میں پہنچ گیا۔"

یہی حال غازی علم الدین شہیدؒ کا ہے' نہ اس نے فنِ تجوید وقرأت سیکھا' نہ عربی فارسی پڑھی' نہ رومیؒ کی مثنوی دیکھی نہ زمخشری کی کشاف پڑھی' نہ دین کے اسرار و رموز سمجھے مگر ایک راز اس پر ایسا کھلا کہ مقدر کے بند کواڑ کھل گئے' قسمت کا دریچہ کیا کھلا کہ جنت کے دروازے کھل گئے' یہ عقلِ خود بیں کا کرشمہ نہیں عشقِ خدا بیں کا معجزہ تھا' کل تک دکان پر ٹھک ٹھک کرنے والا علم الدینؒ آج کروڑوں مسلمانوں کے سینے میں دل بن کر دھک دھک کر رہا ہے۔

غریب باپ کو کیا علم تھا کہ اس کی گود میں شہرِ محبت کا امیر پل رہا ہے' کچے گھروندے کو کیا خبر تھی کہ اس کے احاطے میں پکے عقیدے کا بچہ چل پھر رہا ہے' سنسان حویلی کو کیا پتہ تھا کہ ایمان کی دولت اس کے دامن میں بھری ہوئی ہے' محلہ چابک سوار کا علم الدینؒ میدانِ عشق کا شہسوار نکلا۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

غازی علم الدین شہیدؒ 1908ء میں پیدا ہوئے اور 31 اکتوبر 1929ء کو تعزیر جرم عشق میں پھانسی پا کر ہمیشہ کے لیے گستاخانِ رسول کے گلے کی پھانس بن گئے۔

21 برس کی عمر میں صدیوں کا سفر اس خوبی سے طے کیا کہ اس کی گردِ سفر کا ایک ایک ذرہ

کاروانِ شوق کے لیے نشانِ منزل بن کر رہ گیا ہے' نجانے عشاق کے اور کتنے قافلے اس راہ سے گزریں گے لیکن ان پر لازم ہوگا کہ وہ علم الدینؒ کے نقشِ کفِ پا کو چوم کر اپنی منزل کی بُو سونگھیں۔

لوگ زندہ جاوید ہونے کی آرزو میں مر مر کر جیتے اور جی جی کر مرتے ہیں۔ انہیں جینے کا فن تو آ جاتا ہے' مرنے کا ڈھنگ نہیں جانتے۔ وہ غازی علم الدینؒ کی روح سے پوچھیں کہ مر کر امر ہو جانے کا کیا راز ہے؟ فنا کے گھاٹ اتر کر لافانی بننے کا کیا طریقہ ہے؟ گمنام ہو کر شہرتِ دوام پانے کا کیا نسخہ ہے؟ کسی کے نام پر مٹ کر انمٹ ہونے کی رمز کیا ہے؟ جامِ شہادت کے ذریعے آبِ حیات پینے کا کیا گُر ہے؟

غازیؒ کو میانوالی جیل میں پھانسی دی گئی' اور وہیں دفن بھی کر دیا گیا' انگریز کا خیال تھا کہ اگر لاش بر سرِ عام لاہور لائی گئی' تو ضبط کے سب بندھن ٹوٹ جائیں گے' مگر مسلمانوں کا احتجاج پورے برصغیر میں شدید سے شدید تر ہو گیا' حکیم الامت علامہ اقبالؒ' سر محمد شفیع' میاں عبدالعزیز مالواڈہ اور مولانا غلام محی الدین قصوری گورنر سے ملے اور غازیؒ کی لاش مسلمانوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا' بالآخر 14 نومبر کو لاش لاہور پہنچی' جنازہ چوبرجی جنازگاہ میں پہنچا' وہاں جنازہ کیا پہنچا' پورا لاہور پہنچ گیا' اس اعزاز و تکریم کو شہنشاہِ ہند ظہیر الدین بابر' مغلِ اعظم' شاہجہاں' غیاث الدین بلبن اور دوسرے سلاطینِ جہاں آج تک ترستے ہوں گے' جو اکرام و اعزاز ''ترکھاناں دے منڈے'' کو نصیب ہوا۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

غازیؒ آج قبرستان میانی صاحب میں آسودہ خاک ہے۔ اس خاک کا ہر ذرہ سرمہ چشم عشاق ہے' لوگ بقائے دوام پانے کے لیے خضر کی تلاش میں ہیں جو انہیں چشمہ حیواں تک پہنچا سکے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آبِ حیات کے دو گھونٹ انہیں حیاتِ جاودانی بخش دیں گے لیکن انہیں معلوم نہیں کہ حضور ﷺ کے تلووں کا دھوون ہی آبِ حیات ہے' اس کا ایک قطرہ حیاتِ ابد عطا کر دیتا ہے' علم الدینؒ اپنے دم خم سے نہیں' انہی کی خاکِ قدم بن کر زندہ و پائندہ ہے۔

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما



غازی علم الدین شہید

مولوی محمد سعید
سابق ایڈیٹر پاکستان ٹائمز

انگریز کے دور میں آزادی کی لگن کے دوش بدوش کئی ناہنجار تحریکیں بھی زور پکڑ رہی تھیں۔ مذہبی مناظرے تو ایک عرصہ سے ہوتے چلے آ رہے تھے۔ اور ان میں چشمک کا رواج تھا۔ لیکن دشنام طرازی کی باقاعدہ ابتداء ہندوؤں کے ایک مخصوص فرقے آریہ سماج نے کی۔ مقصد محض مسلم آزاری تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف چند دریدہ دہن مصنفین نے اس شدت اور تواتر سے گندگی اچھالنا شروع کی کہ مسلمانوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ پوری مسلم قوم خیبر سے لے کر راس کماری تک شعلہ بدامن ہو گئی۔ انہی دریدہ دہن ناشروں میں ایک رسوائے زمانہ راجپال بھی تھا جس نے ایک کتاب ''رنگیلا رسول'' شائع کی۔ مصنف کا نام کو مخفی رکھا گیا' عام خیال تھا کہ یہ کتاب پرتاپ کے مہاشہ کرشن کی ہے۔

مقدمہ چلا۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی نمائندگی سر محمد شفیع نے کی۔ سر محمد شفیع اپنے وقت کے چوٹی کے وکلاء میں سے تھے۔ ان کی ہائی کورٹ میں تقریر اتنی ولولہ انگیز تھی کہ اگلے روز ان کے ازلی دشمن زمیندار تک نے ''سر شفیع کی عشقِ رسول ﷺ میں ڈوبی ہوئی تقریر'' کی سرخی لگائی۔ راجپال کو ہلکی سی سزا ہوئی۔ مسلمانوں کی آتش انتقام کو ہندو نواز انگریز ججوں کی اشک شوئی سرد نہ کر سکی۔ سزا کچھ یوں دی

گئی کہ جیسے مسلمانوں کے سر پر احسان دھرا جا رہا ہے۔

دلی میں شردھانند نے اور لاہور میں راجپال نے اس تحریک کو پروان چڑھایا۔ جب ان کے خبثِ باطن کے چرچے عام ہوئے اور پڑھے لکھے لوگوں کی محفلوں سے گزر کر عام مسلمانوں تک پہنچے تو ایک ہیجان بپا ہو گیا۔ چنانچہ راجپال پر حملے ہونا شروع ہوئے' دو مرتبہ تو وہ بچ نکلا اور حملہ آور لمبی سزائیں بھگتنے کے لیے جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔ حتیٰ کہ لاہور کے سریاں اوجھریاں والے بازار کے ایک بڑھئی طالع مند کے بیٹے علم الدین کو جب علم ہوا کہ حضور ﷺ کی شان میں ایسی بے محابا گستاخیاں ہو رہی ہیں تو اس نے تہیہ کر لیا کہ ایسے منہ پھٹ کا علاج قطعِ شہ رگ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اپریل کی ایک دوپہر کو جب لاہور کے بازار اور گلیاں سنسان تھیں۔ علم الدین چوہٹہ مفتی باقر سے ہسپتال روڈ تک آیا۔ اس نے راجپال کو بیٹھے دیکھا۔ جب آگے بڑھا تو راجپال سہم گیا۔ لیکن پیشتر اس سے کہ وہ مدافعت کرتا' اس نوجوان کا خنجر اس کے جگر کے پار اتر چکا تھا۔ خون کو فوارے کی صورت میں بہتا چھوڑ کر یہ جوان لکڑی کے گوداموں تک خراماں خراماں چلا گیا۔ پھر یکا یک خیال آیا کہ کہیں وار اوچھا نہ پڑا ہو' اور راجپال کہیں پھر نہ بچ نکلا ہو۔ دل کی تشفی کے لیے لوٹا تو گرفتار کر لیا گیا۔ انارکلی کے ایک ذیلی بازار میں دن دہاڑے قتل اور وہ بھی ایک ایسے شخص کا جس کا نام ہر ایک کی زبان پر تھا۔ ہندو محلوں میں ہاہا کار مچ گئی۔ یہ خبر علم الدین کے محلے میں اس وقت پہنچی جب اس کی ماں اس کی سگائی کے لڈو بانٹ رہی تھی۔

مقدمہ چلا۔ سیشن جج نے پھانسی کی سزا دی۔ ہائیکورٹ میں اپیل ہوئی۔ علم الدین کی وکالت کے لیے بمبئی سے قائداعظم محمد علی جناح تشریف لائے۔ مقدمہ کی سیاسی اور مذہبی نوعیت' جناح ایسے فاضل بیرسٹر کی آمد' ملک گیر دلچسپی' عدالت کے کمرے میں بلکہ احاطے میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ فین روڈ پر ہجوم جمع ہو رہا تھا' اور ہر لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس ہجوم میں آہنی جنگلے کے ساتھ مجھے بھی قدم رکھنے کی جگہ مل گئی۔ یکا یک آواز آئی' جناح آ رہے ہیں۔ ہم جنگلے کے سہارے ذرا اور اونچے ہو گئے۔ دور سے دیکھا کہ برآمدے میں جمع ہونے والے لوگ راستہ دے رہے ہیں' اور مسٹر جناح سیاہ گون میں ملبوس بڑے وقار کے ساتھ عدالت کے کمرے کی جانب جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے علم الدین کے والد طالع مند تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کی صندوقچی تھی۔

بحث کے دوران قائداعظم نے زیریں عدالت کے فیصلے اور گواہوں کے بیانات کے پرخچے اڑا دیئے۔ عدالت تک تو ہم لوگوں کی رسائی نہیں تھی کہ وہاں صوبے بھر کے نامور وکلاء کا ہجوم تھا۔ اگلے روز اخبارات میں جو روداد چھپی اس میں عاشقانِ رسول ﷺ کے لیے تازگی ایمان کا بڑا سامان تھا۔ ٹھیٹھ

قانونی اعتبار سے قائداعظم جناح کی تقریر نکتہ آفرینی اور اسلوبِ بیان کا شاہکار تھی۔

انگریز جج براڈوے نے دلائل سننے کے بعد وہی فیصلہ دیا جو متوقع تھا۔ علم الدین کی سزائے موت بحال رہی' اور اب لوگ اس کے واصل حق ہونے کے منتظر رہنے لگے۔ اسے میانوالی جیل میں منتقل کر دیا گیا' اور ایک صبح اسے تختۂ دار پر کھینچ دیا گیا۔ اخباروں میں آخری لمحوں کی جو روداد چھپی' ان سے علم الدین کی پامردی نمایاں تھی۔ موت کو اس نے مردانہ وار خوش آمدید کہا اور بلند آواز سے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

پڑھا اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

مسلمانوں کے لیے یہ بڑے اندوہ والم کی بات تھی کہ ان کا ایک ہیرو یوں پنجاب کے ایک دور دراز علاقے میں موت کی نیند سلا دیا جائے' اور پھر اس کی قبر ان کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔ چنانچہ غم وغصہ کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ وہ لوگ بھی باہم اکٹھے ہو گئے جن کی سیاسی راہیں مدتوں سے جدا جدا تھیں۔ اقبال' سر شفیع اور ظفر علی خان اس تحریک کے روح و رواں تھے۔ سر شفیع کی سرکار دوستی' ظفر علی خان کی سرکار دشمنی' اقبال کی بے نیازی' سبھی پس منظر میں چلی گئیں۔ قوم کے سامنے اب علم الدین کی نعش کا حصول تھا۔ چنانچہ تحریک کا نعرہ ''نعش لیں گے یا نعش بن جائیں گے۔'' ٹھہرا۔

اقبال اور سر شفیع گورنر سے ملے اور اسے یقین دلایا کہ مطالبہ حصول نعش تک محدود ہے۔ اور اگرچہ آج کے دن مسلمانوں کے جذبات کی کوئی حد نہیں پھر بھی غیر مسلموں کی عزت و ناموس یا مال و دولت ان کے ہاتھ سے محفوظ رہیں گے۔ گورنر نے اس یقین دہانی کے بعد لاش مسلمانوں کے سپرد کر دینے کا فیصلہ دے دیا۔ دسمبر کی ایک یخ بستہ صبح کو نعش گاڑی میں لاہور لائی گئی۔ چھاؤنی کے سٹیشن پر پل کے نزدیک گاڑی رکی۔ اور گورا فوج کا ایک دستہ تابوت لے کے گورنر ہاؤس تک آیا۔ جہاں اسے مسلمان زعما کے سپرد کر دیا گیا۔

ایسا جنازہ جو علم الدین کو میسر آیا' تاریخ میں خال خال شخصیتوں کو میسر آیا ہو گا۔ لاہور کی نواحی بستیاں تو در کنار دُور دُور کے مقامات سے لوگ اتنی تعداد میں آئے کہ اس شہر کے لیے ان کا سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ وہ زمانہ ریلوے کی محدود و آمد و رفت کا تھا۔ بسوں کی چلت ابھی عام نہیں ہوئی تھی۔ نجی موٹر گاڑیاں ابھی کم تھیں اور مسلمانوں کے یہاں قریب قریب مفقود تھیں۔ لیکن پھر بھی لوگ جالندھر' امرتسر' گوجرانوالہ' سیالکوٹ' گجرات' منٹگمری اور ملتان سے کھنچے چلے آ رہے تھے۔ نماز جنازہ کے لیے وہ

میدان منتخب ہوا جسے چاند ماری کہتے تھے اور جہاں آج کل چوبرجی کے کوارٹر اور دیگر آبادی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ علاقہ دریا کی ترائی تک بڑا سرسبز تھا۔ حد نظر تک سبزی کے کھیت تھے۔ نماز جنازہ کے بعد جب تابوت اٹھایا گیا تو چارپائی سے لمبے لمبے بانس باندھ دیئے گئے تھے تاکہ لوگ کندھا دینے کی سعادت سے محروم نہ رہیں۔ جنازے کے آگے آگے پھولوں سے لدی ہوئی ایک بیل گاڑی جارہی تھی' جو ہجوم میں پھول تقسیم کرتی جارہی تھی۔ جنازہ نزدیک آیا تو جو لوگ دیر سے کندھا دینے کے لیے منتظر کھڑے ہوتے' ایک ہی ریلے میں سڑک سے دور جا پہنچتے۔ چارپائی کے اردگرد ایک جم غفیر تھا۔

اکثر لوگوں نے کمر سے پٹکے باندھ رکھے تھے اور ایک عجیب سرمستی کے عالم میں لہرا رہے تھے' اور لا الہ الا اللہ کا ورد کرتے جارہے تھے۔ الا اللہ کی ضرب پر ہر بار معلوم ہوتا کہ لاہور کی زمین تھرا اٹھی ہے۔ پھولوں کی بارش میں جنازہ آہستہ آہستہ میانی صاحب کے وسط تک بڑھتا رہا۔ قبر کے قریب اژدہام اتنا بے پناہ تھا کہ بڑے بڑے تنومند قبر تک پہنچنے سے عاجز تھے۔ میں نے بدقت تمام جب جھانک کے دیکھا تو لحد میں پھولوں کی سیج بچھی ہوئی تھی۔

قریب ہی ایک وسیع گڑھے کے وسط میں مولانا ظفر علی خاں کناروں پر اُمڈے ہوئے ہجوم کو انگریز کی ستم رانیوں کی داستان سنا رہے تھے۔ مجمع حسب معمول مسحور تھا۔ جب میاں سر محمد شفیع نے انہیں یہ یاد دلانے کی کوشش کی کہ یہ محل کسی سیاسی تقریر کا نہیں تو مولانا نے بجلی کی طرح تڑپ کر کہا کہ جب تک انگریز کا ظلم ختم نہیں ہوتا' اس کی داستان کیسے ختم ہوسکتی ہے؟ ہندو کو تو یہ افسانے سناتے عار محسوس نہیں ہوتی۔ ہم کیوں اتنے محجوب ہوں؟ وہ آزادی کے نغمے الاپتے ہیں۔ ہم غلامی پر کیونکر قانع رہیں؟ سر شفیع نے مولانا کے تیور دیکھے تو ایک منجھے ہوئے سیاست دان کی طرح وہی راستہ اختیار کیا جو مولانا کا ہر عافیت کوش حریف ایسے موقعوں پر اختیار کیا کرتا تھا۔ تقریر جاری رہی تا آنکہ علم الدین کا جسد خاکی لحد میں اتار دیا گیا۔ اور لاہور کا یہ غیر معروف نجار زادہ چند دنوں میں عالمگیر شہرت پا کر اسی شہر کی خاک میں آسودۂ راحت ہوگیا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف سب وشتم کی تحریک جو ہندوؤں میں اٹھی' وہ اس تحریک کا گھناؤنا پہلو تھی' جس کی بناء عیسائی علماء نے تحقیق کے پردے میں ڈالی تھی' اور جس کے دوران وہ وہ جھوٹ تراشے گئے کہ افشائے حق ہونے کے بعد خود ان کے ہم مذہبوں کی گردنیں ندامت سے جھک گئیں۔ آج یورپ کے علماء میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اس تحقیق و تفتیش کو خود پائے حقارت سے ٹھکرا دیا ہے۔ انگریز جب آزادئ مذہب کی آڑ میں غیر جانبدار ہوگیا تو گھٹیا قسم کے چند ہندو مصنفوں اور ریفارمروں نے پیغمبر اسلام ﷺ پر نجاست اچھالنے کو پیشہ بنالیا۔ بہرکیف دلی میں

عبدالرشید کے ہاتھوں شردھانند کیفر کردار کو پہنچا۔ لاہور میں علم الدین کے ہاتھوں راجپال اور کراچی میں عبدالقیوم کے ہاتھوں شاتمانِ رسول ﷺ کے اس انجام نے اس تحریک کا خاتمہ کر دیا۔

گاؤں میں سناتن دھرمیوں کی پاٹھ شالہ کے سامنے ایک آریہ سماجی دیوان چند بھاٹیہ آٹے کی چکی چلایا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اچھی رسم و راہ تھی جس روز عبدالقیوم نے کراچی میں پراچین کہانی کے مصنف کو قتل کیا' اتفاق سے میرا ادھر سے گذر ہوا۔ مجھے روک کے کہنے لگے: یار سنو! یہ قرآن کی تعلیم میں نقص ہے یا مسلمانوں میں قوتِ برداشت کی کمی ہے کہ مذہبی تحقیق کا جواب انہوں نے ہمیشہ خنجر سے دیا ہے۔'' میں نے کہا کہ اگر تحقیق گالی دینے کی نیت سے کی جائے تو؟ ابھی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک معمر سکھ آ گئے۔ پوچھنے لگے کیا بات ہے؟ میں نے بھاٹیہ کے سوال اور اپنے جواب کو دُہرایا اور ان کی رائے پوچھی۔ وہ جوش میں آ کے کہنے لگے کہ اگر میرے گوروؤں میں سے کسی کو گالی دی جائے تو میں تو سر اتار کر......

میں نے کہا: ''بھاٹیہ جی سن لیجئے۔''

بہرکیف مسلمان قوم نے اپنے غیظ و غضب کے اظہار میں کسی مداہنت کو روا نہیں رکھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک جلسہ میں برملا کہہ دیا: ''اللہ سے گستاخی کرنے والوں سے تو وہ خود نپٹ لے گا۔ لیکن رسول کی طرف اٹھنے والی انگلی کو ہی نہیں' شانے سے بازو تک کو کاٹ دیا جائے گا۔''

یہ محض حادثہ نہیں تھا کہ خلافت ایجی ٹیشن کا اتحاد و اتفاق ہندو مسلم فسادات کے خونیں سلسلے کی نذر ہو گیا' اور آزادی کی قرارداد پاس ہوتے ہی شاتمانِ رسول کی ایک کھیپ پیدا ہو گئی۔ صاف عیاں ہو چکا تھا کہ یا آزادی کا خواب پریشان کیا جا رہا ہے یا آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر دکھائی جا رہی ہے۔

بہرکیف کچھ عوامل ضرور ایسے کارفرما تھے' خواہ وہ نفسیاتی ہوں یا سیاسی' جو دو قوموں کے اتحاد کے درمیان متواتر حائل ہو رہے تھے۔

مسلمانوں کو اس حقیقت کے اظہار میں قطعی حجاب نہیں تھا کہ وہ اسلام سے وابستگی کو اپنے لیے وجہِ افتخار سمجھتے ہیں۔ ہندو اس طرزِ عمل کو فرسودہ خیالی سمجھتے تھے۔ تاہم عملاً خود ان کے لیے منبع حیات ہندو دھرم تھا۔ قول و عمل میں یہ تضاد ہندوؤں کے ساتھ معاملہ کرنے والی ہر قوم کے لیے بڑی پریشانی کا موجب رہا ہے۔ مسلمانوں کا رویہ اکثر و بیشتر اس دو عملی سے مبرا تھا۔ ان کے کانگرسی پکے کانگرسی تھے۔ ان کے مسلم لیگی پکے مسلم لیگی' جو ہندو سے ہر معاملہ پیشگی طے کرنے پر مصر تھے اور ان کے ٹوڈی ایسے ٹوڈی تھے کہ انگریز ہی کے سنگِ آستان کو اپنی منزل سمجھتے تھے۔ ہندو قوم عموماً مذہب سے بیگانگی کا (یا کم

ازکم کشادہ خیالی کا) اظہار کرتی، لیکن اس کے جسم کی ہر شکن زُنار کے پیچ میں بندھی ہوئی دکھائی دیتی۔ چنانچہ ان میں ایسے مذہبی اور سیاسی فرقوں کی کمی نہ تھی، جو اوروں کی دل آزاری میں بڑی تسکین پاتے۔

ایک مرتبہ ہمارے ہاں گاؤں میں ایک آریہ سماجی پرچارک آئے۔ ان کی رات کی تقریر کا اعلان گاؤں میں منادی سے کیا گیا' اور ہر چوک میں یہ آواز لگائی گئی کہ آج رات آریہ سماج میں پنڈت بدھ دیو تقریر کریں گے۔ موضوع ہے: ''وید الہامی ہیں یا قرآن؟'' میں نے آریہ منتری لالہ ہری رام سے کہا کہ اگر اعلان صرف اتنا ہوتا کہ پنڈت بدھ دیو ثابت کریں گے کہ وید الہامی کتاب ہے' تو اس میں کیا حرج تھا؟ کہنے لگے کہ بات اس طرح صاف نہیں ہوتی تھی۔ گویا ہر مسئلہ ان کے یہاں چند دلوں میں غیظ و غضب پیدا کیے بغیر صاف نہیں ہوسکتا تھا۔ مناظروں کی فضا میں عجیب عجیب توجیہات سننے میں آتیں۔ ایک مرتبہ ایک پنڈت جی وشنو مہاراج کے اوصاف بیان کررہے تھے کہ دیکھئے مولانا روم کی مثنوی کی ابتداء وشنو کے نام سے ہوتی ہے۔ بشنو از نے حکایت می کند ''یعنی وشنو بانسری بجا رہا ہے۔ یارانِ وطن کے حلقوں میں اسلام کا تمسخر عام ہو چکا تھا۔ اس ایک رویے نے جتنے سیاسی شکوک پیدا کیے کسی اور مسئلہ نے نہیں کیے۔ اگرچہ اقتصادی پسماندگی اور سماجی بائیکاٹ کسی طرح کم نہیں تھے' موخرالذکر تو مذہب اور اقتصاد دونوں کی پیداوار تھا۔





غازی علم الدین شہید

محمد ابراہیم شاہ

پہلی جنگ عظیم کے بعد مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی خاطر ہندوؤں نے دل آزار لٹریچر شائع کرنا شروع کر دیا۔ وہ کبھی تو کعبہ کے کسی متولی کا فرضی نام لکھ کر یہ وصیت شائع کر دیتے کہ قیامت قریب ہے' نیک کام کرو اور اس وصیت کی چار نقلیں کر کے اپنے ساتھیوں کو دو' ورنہ درگاہِ الٰہی سے معتوب ہو جاؤ گے۔ ہندوؤں کی نیت یہ تھی کہ مسلمان سارا دن اسی نقل نویسی میں مشغول رہ کر دین اور دنیا کا کوئی اور کام نہ کر سکیں۔

اسی طرح سوامی دیانند کے ایک چیلے مہاشہ کرشن (ایڈیٹر "پرتاپ" لاہور) نے ایک نہایت ہی دل آزار کتاب "رنگیلا رسول" لکھی جس میں اس ننگ انسانیت نے رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اتنی دل آزار باتیں لکھیں کہ پڑھنے اور سننے سے ہر مسلمان مر جانے کی دعا کرے۔ اس کتاب میں قرآن کریم کی آیات اور احادیث قدسی کی غلط تاویلات کی گئی تھیں' وہ مسلمانوں کے ایمان کی پختگی سے بھی واقف تھا اس لیے اس نے مسلمانوں کے غم و غصے سے بچنے کی خاطر اپنے بجائے پروفیسر پنڈت چمپو پتی لال ایم اے کا فرضی نام بطور مصنف تحریر کر دیا تھا تاکہ اس کے خلاف کوئی اخلاقی یا قانونی کارروائی نہ کی جا سکے تاہم اس کتاب پر راج پال ناشر ہسپتال روڈ لاہور کا نام و پتہ درست لکھا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے ازراہ اخلاق اس سے ایسی ہزل کتاب کے تلف کرنے کی درخواست کی مگر اس نے

ہندوؤں کی پشت پناہی کے باعث مسلمانوں کے اس جائز مطالبے پر غور کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اس پر مسلمانوں نے 153 الف کے تحت اس پر فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے الزام میں مقدمہ دائر کر دیا۔ مسٹر لوئیس ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے راج پال کو چھ ماہ قید کی سزا دی مگر اس نے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی' جہاں دشمن اسلام اور حد درجہ متعصب چیف جسٹس سر شادی لال کی ذاتی سفارش پر جسٹس کنور دلیپ سنگھ مسیح نے ملزم کو رہا کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی پیغمبر بالخصوص آقائے کائنات ہادئ برحق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین (نعوذ باللہ) کوئی جرم نہیں۔ اس پر غیور مسلمان انتہائی جوش میں آ گئے۔

شاہ جی کی للکار

اس سلسلے میں متعدد جلسے ہوئے اور جلوس نکلے۔ 4 اور 5 جولائی 1927ء کی درمیانی رات کو مسلمانان لاہور کی طرف سے دہلی دروازہ کے باغ میں ایک معرکہ خیز جلسے کا اعلان کیا گیا' جس میں شاہ جی' مولانا احمد سعید' مولانا مفتی کفایت اللہ' چودھری افضل حق' خواجہ عبدالرحمٰن غازی نے تقریریں کرنی تھیں۔ لیکن اسی روز لاہور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر اوگلوی نے دفعہ 144 لگا کر جلسے کو ممنوع قرار دے دیا۔ مگر شاہ جی کی تجویز پر جلسہ میاں عبدالرحیم کے احاطہ میں منعقد کیا گیا۔ (یہ احاطہ موجودہ مزار حضرت شاہ محمد غوثؒ بیرون دہلی دروازہ کے بالمقابل واقع ہے' اس وسیع احاطہ میں ہزاروں لوگ جمع ہو گئے اور جلسے کی صدارت چودھری افضل حق نے کی۔ فوج اور پولیس کے علاوہ مسٹر اوگلوی ذاتی طور پر بھی احاطہ کے باہر موجود تھا اور اندر آ کر اعلان کیا کہ:

> ''دفعہ 144 کے باعث یہ مجمع خلاف قانون ہے۔ آپ لوگ پانچ منٹ کے اندر یہاں سے چلے جائیں ورنہ مجھے گولی چلانے کا حکم دینا پڑے گا۔''

ڈپٹی کمشنر کے اس اعلان پر خواجہ عبدالرحمٰن غازی نے ڈپٹی کمشنر کو انگریزی میں کہا:

> ''ہم اس قانون کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہیں' جو قانون ہمیں ناموسِ پیغمبر کی حفاظت کی ضمانت نہیں دیتا۔ تم جو چاہو کرو' ہم یہ جلسہ کریں گے۔''

اس کے بعد شاہ جی نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

> ''آج ہم سب فخرِ رسل ﷺ کی ناموس کو برقرار رکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ بنی نوع انسان کو عزت بخشنے والے کی عزت خطرے میں ہے۔ آج اس جلیل القدر ہستی کی ناموس معرضِ خطر میں ہے جس کی دی ہوئی عزت پر تمام

موجودات کو ناز ہے۔

آج مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب کے دروازے پر اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور اُم المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا آئیں اور فرمایا کہ ہم تمہاری مائیں ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کفار نے ہمیں گالیاں دی ہیں؟...... ارے دیکھو تو! اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دروازے پر تو کھڑی نہیں؟''

یہ سن کر حاضرین میں کہرام مچ گیا اور مسلمان ڈھاریں مار مار کر رونے لگے۔ شاہ جی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

''تمہاری محبت کا تو یہ عالم ہے کہ عام حالتوں میں کٹ مرتے ہو' لیکن کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آج سبز گنبد میں رسول اللہ ﷺ تڑپ رہے ہیں اور خدیجہؓ اور عائشہؓ پریشان ہیں۔ بتاؤ! تمہارے دلوں میں امہات المومنینؓ کی کیا وقعت ہے؟...... آج ام المومنین عائشہؓ تم سے اپنے حق کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ وہی جنہیں رسول اللہ حمیرا کہہ کر پکارتے تھے۔ جنہوں نے سید دو عالم ﷺ کو رحلت کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔

اگر تم خدیجہؓ اور عائشہؓ کی ناموس کی خاطر جانیں دے دو تو کچھ کم فخر کی بات نہیں۔ یاد رکھو! یہ موت آئے گی' تو پیامِ حیات لے کر آئے گی۔''

(روزنامہ زمیندار' جولائی 1927ء)

یہ تقریر اس قدر موثر اور جذباتی تھی کہ تمام مجمع میں حشر بپا تھا۔ شاہ صاحب کی تقریر پر لوگوں کے جتھے باغ میں جلسہ گاہ جاتے اور گرفتار ہو جاتے۔ ان پر لاٹھی چارج بھی کیا جاتا۔ یہ سلسلہ تھوڑی دیر جاری رہا۔ بعد ازاں شاہ جی نے عوام کو اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی اپیل کی اور کہا:

''ہمارا موقف قتل و غارت گری نہیں۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ برطانوی حکومت تعزیرات ہند میں ایک ایسی دفعہ کا اضافہ کرے جس کی رو سے بانیانِ مذاہب کے خلاف تقریر و تحریر کی پابندی ہو اور اس کی خلاف ورزی کرنے والا مجرم قرار پائے۔''

اس قرارداد کے بعد جلسہ برخاست کر دیا گیا لیکن عوام کو پرامن طور پر احاطہ سے نکالنے کے لیے شاہ جی خود دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ ان کے سامنے مسٹر اوگلوی کھڑے تھے۔ شاہ جی اپنے

مخصوص انداز میں لوگوں کو پرامن رہنے کی تلقین کرر ہے تھے اور ساتھ ہی مسٹر اوگلوی سے پنجابی میں کہا:

''اوگلوی! او کھے گھر نیوندرہ پایا ای''! (اوگلوی! تم نے مشکل گھرانے سے ٹکر لی ہے۔'') (حیات امیر شریعت از مرزا جانباز ص 104,103)

یہ سنتے ہی تمام مسلمانوں کی غیرت جوش میں آ گئی اور جلسہ گاہ میں موجود تمام مسلمان شہادت کے جذبے سے سرشار ہو کر نہ صرف راج پال اور کنور دلیپ سنگھ مسیح بلکہ حکومت کے خلاف نعرے بلند کرتے ہوئے سول سیکرٹریٹ کی طرف چل پڑے۔ حکومت کے ایما پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فوری طور پر دفعہ 144 نافذ کر کے جلوس کو منتشر کرنے کا حکم دیا۔ مگر یہاں قید و بند کی صعوبت کی کس کو پروا تھی۔ یہاں تو سب رسول عربی ﷺ پر اپنی جانیں نثار کرنے کی تمنا رکھتے تھے۔ حکومت سب لوگوں کو تو گرفتار نہ کر سکی تاہم سرکردہ افراد کو حراست میں لے کر فوری طور پر جیل پہنچا دیا۔

ان دنوں مسلمانوں کا صرف ایک انگریزی اخبار ''مسلم آوٹ لک'' تھا۔ اخبار نے جسٹس کنور دلیپ سنگھ مسیح کے فیصلے پر نکتہ چینی کی اور لکھا کہ اس سے بڑھ کر اور کیا فرقہ وارانہ دل آزاری ہو سکتی ہے کہ دنیا کا ہر مسلمان کبیدہ خاطر ہے' بلکہ ناموسِ حبیب کبریا ﷺ پر اپنے خون کا آخری قطرہ تک نثار کرنے کے لیے تیار ہے۔ اخبار نے اسلامی عقیدے کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ مسلمان اپنی زندگی کو حرمت امام المرسلین ﷺ پر نثار کرنا فخر سمجھتا ہے۔ قانون میں اس امر کی واضح اور کافی گنجائش موجود ہے کہ وہ راج پال جیسے دریدہ دہن اور بے غیرت ملیچھ کا محاسبہ کرے۔ اخبار نے غیر منصفانہ فیصلے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا کہ مسلمان ایک زندہ اور فعال قوم ہے۔ اگر عدالت نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہ کی تو کوئی عاشقِ رسول ﷺ اس منہ زور کا پیٹ چاک کر دے گا۔

فرنگی حکومت نے اپنی طاقت کے زعم میں مسلمانوں کے ایمان اور جوش کا صحیح اندازہ لگانے کی کوشش نہ کی اور اس تعمیری نکتہ چینی اور بروقت انتباہ سے استفادہ کرنے کی بجائے اسے توہین عدالت تصور کیا۔ اخبار مذکورہ کے مالک نور الحق اور اس کے مدیر سید دلاور شاہ کو دو دو ماہ قید اور ایک ایک ہزار روپے جرمانے کی سزا دی۔ 1930ء میں ایک من گندم کی قیمت صرف ایک روپیہ تھی۔ اس لحاظ سے جرمانے کی یہ رقم بہت زیادہ تھی۔

اس پر مسلمانوں کے دل میں یہ بات جڑ پکڑ گئی کہ فرنگی حکومت شرافت سے کوئی بات ماننے کو تیار نہیں اور صرف احتجاجی جلسے منعقد کرنا اور جلوس نکالنا جگ ہنسائی کا سبب بنے گا۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے ہرگز نہیں مانیں گے۔ اس لیے اس مسئلے کا کوئی نظریاتی حل نہیں بلکہ کوئی عملی حل سوچا جائے۔ انہوں نے نعرہ لگایا کہ جب تک ایک مسلمان بچہ بھی زندہ ہے' اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی انگلی تک نہ اٹھا سکے گا۔

غازی خدا بخش اکو جہا

آپ کے والد کا اسم گرامی محمد اکرم تھا۔ معروف کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ رہائش اندرون یکی وروازہ لاہور میں تھی۔ بڑے خوبصورت جوان تھے۔ آپ کا جسم فربہ، رنگ سرخ و سپید، قد لمبا اور مضبوط و توانا تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے شیر فروش تھے۔ جلد سازی کا بھی کام کر لیتے تھے۔

ملعون راجپال نے رنگیلا رسول نامی کتاب لکھی جس سے مسلمانوں میں سخت غیظ و غضب پایا جاتا تھا۔ ایک دن آپ نے ناموس رسالت ﷺ پر تقریر سنی تو حالات سے آگاہی ہوئی۔ یہ سن کر تڑپ اٹھے کہ خبیث راجپال نے اس کے آقا و مولا ﷺ پر کتاب لکھ کر انتہائی درجہ کی توہین کی ہے۔

24 ستمبر 1927ء کی صبح جہنمی راجپال اپنی دکان پر بیٹھا کاروبار میں مصروف تھا کہ غازی خدا بخش اکو جہا آئے اور اس پر تیز دھار چاقو سے حملہ کر کے اسے مضروب کر دیا۔ وہ بد بخت تیزی سے اٹھا اور جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا اور قتل ہونے سے بچ گیا۔

پولیس نے غازی خدا بخش اکو جہا کو زیر دفعہ 307 الف تعزیرات ہند گرفتار کر لیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور سی۔ ایم۔ بی اوگلوی کی عدالت میں مقدمہ سماعت شروع ہوئی۔ غازی خدا بخش اکو جہا نے اپنی جانب سے وکیل صفائی مقرر کرنے سے انکار کر دیا۔

راجپال مستغیث نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا۔

''مجھ پر یہ حملہ کتاب کی اشاعت اور مسلمانوں کے ایجی ٹیشن کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ ملزم خدا بخش مجھے جان سے مار دے گا۔''

''اور کچھ کہنا چاہتے ہو۔'' جج نے پوچھا۔

راجپال بولا۔ ''حملہ کے وقت ملزم نے چلا کر کہا تھا کافر کے بچے! آج تو میرے ہاتھ آیا ہے میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اس پر جج نے غازی خدا بخش اکو جہا سے استفسار کیا تو آپ نے گرجدار آواز میں کہا۔

''میں مسلمان ہوں، ناموس رسالت ﷺ کا تحفظ میرا فرض ہے۔ میں اپنے آقا و مولا ﷺ کی توہین ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔''

پھر لعین راجپال کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اس نے میرے رسول مکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے، اس لیے میں نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن یہ کم بخت اس وقت میرے ہاتھ سے بچ نکلا۔''

اقرار جرم کے بعد غازی خدابخش اکو جہا کو سات سال قید سخت جس میں تین ماہ قید تنہائی بھی شامل تھی، کی سزا سنائی گئی۔ اور میعاد قید کے اختتام پر پانچ پانچ ہزار روپے کی تین ضمانتیں حفظ امن کے لیے داخل کرنے کا حکم دیا۔

غزنوی کا وار

راج پال کو جہنم واصل کرنے کے لیے غازی عبدالعزیز خان کوہاٹ سے لاہور 19 اکتوبر 1927ء کو آیا اور لوگوں سے دریافت کرتے کرتے اس بدذات ناشر کی دکان پر پہنچ گیا۔ اتفاق سے اس وقت راج پال دکان میں موجود نہیں تھا۔ اس کی جگہ اس کے دوست جتندر داس اور سوامی ستیانند بیٹھے تھے۔ غازی موصوف نے سوامی ستیانند کو راج پال سمجھا اور میان سے تلوار نکال کر ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بعد خود ہی چلا کر کہہ دیا کہ میں نے موذی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ میرے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ غازی عبدالعزیز نے عدالت میں یہ بیان دیا:

"میرا نام عبدالعزیز ہے۔ میں غزنی کا رہنے والا ہوں۔ میرے وطن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے سلطان محمود غزنویؒ جیسا مجاہد، مبلغ اور بت شکن پیدا کیا تھا جس نے اس برصغیر پر کم وبیش سترہ حملے کر کے کفر والحاد کا خاتمہ کیا تھا اور اس بت کدہ کو اسلام کی دولت سے مالا مال کیا۔ یہی وہ بت شکن ہے جس کے سامنے سومنات کے پجاریوں نے دولت کے انبار لگا دیئے تھے اور کہا تھا کہ مہاراج یہ ساری دولت لے لیں مگر ہمارے بتوں کو کوئی گزند نہ پہنچائیں۔ لیکن اسلام کے اس فدائی نے بلا جھجک کہا تھا کہ مسلمان بت شکن ہے، بت فروش نہیں۔ یہ کہہ کر اس نے سومنات کے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ اور علامہ اقبالؒ نے اس کے استغنا اور ایمان کامل پر فخر کرتے ہوئے فرمایا:

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

یہی وہ غازی تھا جس نے سنا تھا کہ ملتان میں ایک قرامطہ فرقہ ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہلواتا ہے، لیکن دراصل کافر اور بت پرست ہے۔ ان کی ریاکاری کی انتہا یہ ہے کہ وہ فرقہ نماز تو باقاعدگی سے اور باجماعت پڑھتا ہے لیکن سامنے نعوذ باللہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک فرضی شبیہ بنا کر رکھتا ہے۔ محمود غزنوی یہ اندوہناک رپورٹ ملتے ہی بگولے کی طرح یہاں پہنچا تھا اور اس نے قرامطی داؤد حاکم ملتان کا خاتمہ کر کے وہاں اسلام کا پرچم لہرایا تھا۔ مجھے خواب میں سلطان محمود غزنویؒ نے حکم دیا تھا کہ جاؤ اور اس ملعون کے پرخچے اڑا کر ثوابِ دارین حاصل کرو۔ مجھے افسوس ہے کہ

اصل خبیث کو میں جہنم واصل نہ کر سکا۔"

غازی کا پُرمغز اور عالمانہ خطبہ سن کر ہر مسلمان شخص عش عش کر اٹھا۔ فرنگی حکومت کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایم بی اوگلوی نے قانونی تقاضوں اور کچھ مصالحتوں کی بنا پر عبدالعزیز خان غزنوی کو شہادت کا اعزاز بخشنے کی بجائے صرف چودہ سال قید کی سزا دی۔

راج پال کی غلط فہمی

پے در پے حملوں کی وجہ سے راج پال نے خود کو ہر وقت خطرہ میں محسوس کیا۔ اس کا کاروبار بھی متاثر ہونے لگا۔ اس نے حکومت سے استدعا کی کہ اس کی جان کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پولیس کے دو ہندو سپاہی اور ایک سکھ حوالدار اس کی نگہداشت پر مامور کر دیئے۔

راج پال نے پہرے کی زندگی کو حراست کی زندگی سمجھا۔ چنانچہ وہ لاہور سے دوسرے شہروں میں تفریح کے لیے چلا گیا اور دو چار ماہ کے بعد واپس آ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب معاملہ رفع دفع ہو چکا ہوگا اور اب مسلمانوں کے جذبات سرد ہو چکے ہوں گے۔ اس نے کتب فروشی کا کاروبار پھر شروع کر دیا اور پولیس کی امداد طلب نہ کی۔

غیبی آواز

غازی علم الدین 8 ذیعقد 1366ھ مطابق 4۔ دسمبر 1908ء بروز جمعرات محلّہ چابک سواراں محلّہ سرفروشاں لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا پیدائشی مکان اسی بازار کے مغربی کنارے پر ہے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم تکیہ سادھواں کی مسجد سے اور بازار نوہریاں اندرون اکبری دروازہ بابا کالو کے مکتب سے حاصل کی۔ ان کے والد کا نام میاں طالع مند تھا جو کسب معاش کی خاطر نجار یعنی لکڑی کا کام کرتے تھے ان کا سلسلہ نسب سات پشتوں سے برخوردار (بھائی لہنا سنگھ) سے جا ملتا ہے۔ حضرت برخوردار پہلے سکھ مت کے پیرو تھے۔ شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں انہوں نے مسلمان علماء کی صحبت میں رہ کر اسلام قبول کیا اور دینی تعلیم حاصل کر کے ساری عمر تبلیغ اسلام میں بسر کی۔

غازی صاحب کے والد میاں طالع مند ایک چابک دست فنکار تھے۔ غازی علم الدین یکم جنوری 1928ء کو اپنے والد صاحب کے ساتھ کوہاٹ چلے گئے اور وہیں بازار میں فرنیچر کا کاروبار کرنے لگے۔ مارچ 1929ء میں ان کے بڑے بھائی میاں محمد الدین کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ غازی صاحب نومولود بھتیجی کو دیکھنے کے لیے لاہور آئے۔ انہی دنوں ان کی منگنی ان کے ماموں کی بیٹی سے ہوئی۔

بہار کا موسم تھا۔ 16 اپریل 1929ء بروز ہفتہ وہ اپنے دوستوں کے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ یکا یک ان کے کانوں میں آواز آئی۔

''ہے کوئی جانباز جو حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی ناموس کی حفاظت کرے۔''

غازی صاحب نے فرطِ محبت سے لبریز ہو کر پکارا:

''لبیک یاام المومنینؓ لبیک''

گستاخ کا خاتمہ

غازی علم الدین نے ایک تیز چھرا ہاتھ میں لیا۔ تقریباً ایک بجے کے بعد دوپہر راج پال کی دکان واقع ہسپتال روڈ نزد مزار قطب الدین ایبک لاہور پہنچے۔ اتفاق سے وہ موذی اس وقت دکان میں لیٹا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے للکارا اور کہا: ''اپنے جرم کی معافی مانگو۔ دلآزار کتاب کو فوراً تلف کرنے کا وعدہ کرو اور آئندہ ایسی کمینہ حرکتوں کے کرنے سے توبہ کرو۔ ورنہ مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' راج پال نے غازی علم الدین کے اس انتباہ کو محض گیدڑ بھبکی سمجھا اور یہ خیال کیا کہ یہ ازخود واپس چلا جائے گا۔ اس لیے وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس پر غازی علم الدین نے بھرپور وار کیا کہ وہ بغیر آواز نکالے جہنم رسید ہو گیا۔ اس وقت دکان پر راج پال کے دو ملازم بھگت رام اور کیدار ناتھ بھی موجود تھے جو کتابوں کو ترتیب دے رہے تھے۔ انہوں نے غازی کا اعلان بھی سنا اور حملہ کرتے بھی دیکھا' مگر ان پر ایسی ہیبت طاری ہو گئی کہ وہ بت بن کر کھڑے رہے لیکن اپنے آقا کو بچانے کے لیے ایک قدم بھی نہ بڑھ سکے۔

غازی موصوف وہاں سے وِدیا رتن کے ٹال پر پہنچے۔ نلکا چلا کر اپنے ہاتھوں کو راج پال کے ناپاک لہو سے صاف کیا۔ پانی پی رہے تھے کہ یکا یک راج پال کے قتل کا شور برپا ہو گیا۔ شور و غل سن کر اطمینان سے کھڑے ہو گئے اور با آواز بلند اعلان کیا کہ اس نابکار راج پال کا قاتل میں ہی ہوں اور میں نے اس کا قتل فرطِ عشقِ رسول ﷺ میں کیا ہے۔

اس قتل کی اطلاع کیدار ناتھ نے انار کلی پولیس میں درج کرائی۔ کیدار ناتھ اور بھگت رام کے بیانات عینی گواہان کی حیثیت سے لیے گئے۔ پرمانند اور نانک چند نے غازی علم الدین کو قتل کے اعلان کے وقت پکڑا تھا انہوں نے بھی اپنے بیانات درج کرائے۔ آتما رام دکاندار انار کلی نے بھی بیان دیا کہ میں چاقو وغیرہ بیچتا ہوں۔ علم الدین نے یہ چھرا مجھ سے خریدا تھا۔ میں خون آلود چھرے اور اپنے گاہک علم الدین کو پہچانتا ہوں۔

پولیس نے راج پال کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوایا۔ خون آلود بستر اور چٹائی کا پارسل

بنا کر سر بمہر کیا اور علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں بھیج دیا۔ چونکہ ملزم اقبالی تھا' اس لیے مقدمے کی تفتیش اور چالان میں نہ تو کوئی دقت پیش آئی اور نہ کوئی رکاوٹ۔

اس واقعہ کے بعد سارے شہر کے ہندوؤں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دفعہ 144 نافذ کر کے ہندو مسلم کشیدگی پر قابو پانے کی کوشش کی۔ راج پال کی ارتھی کا ایک جلوس نکالا گیا اور رام باغ نزد بادامی باغ نذرِ آتش کر کے راکھ دریائے راوی میں بہادی گئی۔

سیشن کورٹ کا فیصلہ

اس دور کے دفاتر میں ہندوؤں کی اکثریت تھی' انہوں نے مقدمے کا چالان ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر لوئیس کی عدالت میں پیش کر دیا۔ سول سرجن نے عدالت میں پیش ہو کر بتایا کہ مقتول کی موت پیٹ میں چھرا گھونپنے سے ہوئی۔ زخم کی گہرائی ساڑھے چھ انچ اور چوڑائی پونے چار انچ تھی۔ اس وار سے مقتول کی آنتیں بھی کٹ گئی تھیں۔ لوئیس نے غازی علم الدین پر فرد جرم عائد کر کے بیان لیا اور بغیر صفائی لیے مقدمہ سیشن جج کے سپرد کر دیا۔

اگرچہ سیشن کورٹ میں ایسے مقدمات کی سماعت کے لیے کم از کم ایک سال کے بعد باری آتی ہے لیکن یہ مقدمہ ایک ہفتے بعد ہی سماعت کے لیے پیش کر دیا گیا۔ مسٹر ٹیپ سیشن جج تھا۔ مسٹر سلیم بار ایٹ لاء نے معقول اور مدلل دلائل پیش کیے' لیکن عدالت نے غازی علم الدین پر دفعہ 302 فرد جرم عائد کر کے 22 مئی 1929ء کو پھانسی کی سزا کا حکم سنا دیا۔ اس وقت غازی علم الدین کی عمر 21 سال تھی۔

مسلمانوں نے لاہور میں کئی جلسے منعقد کیے کہ سیشن جج کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی جائے۔ اس کے لیے عوام نے جوش و خروش سے چندہ دیا۔ نامی گرامی مسلمان وکلاء نے فیصلے کی نقل کا بغور مطالعہ کیا اور اپیل دائر کر دی۔

ہائیکورٹ میں

مسٹر محمد علی جناحؒ بیرسٹر ایٹ لاء اُن دنوں بمبئی میں وکالت کرتے تھے۔ انہیں اس مقدمے کے لیے طلب کیا گیا۔ لاہور کے ماہر قانون فرخ حسین بیرسٹر ایٹ لاء نے ان کی معاونت کی۔ مقتول راج پال کی طرف سے جے لال کپور اور سرکار کی طرف سے دیوان رام لال پیش ہوا۔ براڈوے اور جان اسٹون ہائی کورٹ پنجاب نے اپیل کی سماعت کی۔

قائداعظمؒ نے فاضلانہ بحث کی اور کئی ٹھوس دلائل پیش کیے اور عدالت کو بتایا کہ پیغمبر ﷺ کی ذات پر رکیک حملے کرنا اور اس طرح عوام کے مختلف فرقوں میں نفرت پھیلانا زیر دفعہ 135 الف جرم

ہے۔کتاب ''رنگیلا رسول'' انتہائی دلآزار ہے۔ اسے پڑھ کر کوئی بھی مسلمان اپنے پیغمبر ﷺ کی عصمت کا بدلہ لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ملزم کا یہ قتل اشتعال انگیزی پر مبنی ہے' اس لیے ملزم غازی علم الدین کے خلاف زیر دفعہ 302 قتل عمد کی بجائے 308 قتل بوجہ اشتعال کارروائی کی جانی چاہیے اور ملزم کو موت کے بجائے سات سال قید کی سزا کا مستوجب سمجھنا چاہیے۔اس کی زیادہ سے زیادہ سزا دفعہ 304 کے تحت پھانسی کی بجائے دس سال قید ہے۔

15 جولائی 1929ء کو فرنگی ججوں نے فریقین کے وکلاء کے دلائل سننے کے بعد غازی علم الدین کی اپیل خارج کر دی اور سیشن جج کے فیصلے کو برقرار رکھا۔شام کو جب غازی علم الدین کو ہائی کورٹ کا فیصلہ جیل میں سنایا گیا تو انہوں نے مسکرا کر کہا:

شکر! الحمد للہ! میں یہی چاہتا تھا۔ بزدلوں کی طرح قیدی بن کر جیل میں گلنے سڑنے کے بجائے تختۂ دار پر چڑھ کر شفیع المذنبین' رحمت للعالمین' پیغمبر خدا' ہادی برحق' رسالتمآب ﷺ پر اس حقیر سی جان کو قربان کر دینا موجب صد ہزار ابدی سکون و راحت ہے۔خدا میری اس ادنیٰ اور پرخلوص قربانی کو قبول فرمائے۔''

اگرچہ مسلمان فرنگی حکومت کے اس رویے سے مایوس تھے لیکن اس خیال سے کہ حجت پوری کرنا اور آخری دم تک چارہ کرنا اسلامی شعائر میں سے ہے۔انہوں نے پریوی کونسل لندن میں اپیل کرنے کا فیصلہ کیا۔مسلمانوں نے ایک بار پھر جی بھر کر چندہ دیا۔دراصل یہ ایک فرد کی موت کا سوال نہیں تھا بلکہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ سلم کی عزت کا معاملہ تھا۔اس اپیل کا مسودہ قائداعظم محمد علی جناح کی نگرانی میں تیار ہوا لیکن پریوی کونسل لندن نے بھی اپیل نامنظور کر دی اور دفعہ 153 الف کی وضاحت اور دفعہ 304 کے جزو اشتعال انگیز قتل کے معاملے کو گول کر دیا۔انگریزی حکومت ہندوؤں کو خوش کرنا چاہتی تھی۔یہ فیصلہ غازی علم الدین کو سنایا گیا تو انہوں نے کہا:

کاتب تقدیر نے شہادت کا رتبہ پانا میری قسمت میں روز اول سے لکھ دیا ہے۔یقیناً میری قربانی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی ہے۔انشاء اللہ اب مجھے دربار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری دینے سے کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔

غازی علم الدین شہید کے کارنامے پر قادیانیوں کا ردعمل

قادیانی جماعت کے بانی آنجہانی مرزا قادیانی کے بڑے بیٹے اور قادیانی جماعت کے دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین نے غازی علم الدین شہیدؒ کے سنہرے کارنامے پر شدید تنقید کرتے ہوئے

کہا:

''اسی طرح اس قوم کا جس کے جوشیلے آدمی قتل کرتے ہیں' خواہ انبیاء کی توہین کی وجہ سے ہی وہ ایسا کریں' فرض ہے کہ پورے زور کے ساتھ ایسے لوگوں کو دبائے اور ان سے اظہار برات کرے۔ انبیاء کی عزت کی حفاظت قانون شکنی کے ذریعہ نہیں ہوسکتی' وہ نبی بھی کیا نبی ہے جس کی عزت کو بچانے کے لیے خون سے ہاتھ رنگنے پڑیں۔ جس کے بچانے کے لیے اپنا دین تباہ کرنا پڑے۔ یہ سمجھنا کہ محمد رسول اللہ کی عزت کے لیے قتل کرنا جائز ہے' سخت نادانی......

وہ لوگ (غازی علم الدین شہید' ناقل) جو قانون کو ہاتھ میں لیتے ہیں' وہ بھی مجرم ہیں اور اپنی قوم کے دشمن ہیں اور جو ان کی پیٹھ ٹھونکتا ہے' وہ بھی قوم کا دشمن ہے۔ میرے نزدیک تو اگر یہی شخص (راجپال کا) قاتل ہے جو گرفتار ہوا ہے تو اس کا سب سے بڑا خیر خواہ وہی ہوسکتا ہے جو اس کے پاس جاوے اور اسے سمجھائے کہ دنیاوی سزا تو تمہیں اب ملے گی ہی' لیکن قبل اس کے کہ وہ ملے' تمہیں چاہیے' خدا سے صلح کرلو۔ اس کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ اسے بتایا جائے کہ تم سے غلطی ہوئی ہے۔''

(خطبہ جمعہ میاں محمود احمد خلیفہ قادیان مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد 16 نمبر 82 ص 7-8 مورخہ 19 اپریل 1929ء)

اس قبیل کا دوسرا فتنہ پرور شخص وکیل ابوجہل' فخر ابولہب' ترجمان سلمان رشدی بھاری نژاد متنازعہ مصنف وحیدالدین خان' غازی علم الدین شہیدؒ کی توہین وتضحیک کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''اگر ناموس رسول کی حفاظت کا طریقہ یہی ہو جو غازی علم الدین شہیدؒ نے اختیار کیا تو یقیناً یہ مقصد حاصل نہیں ہوا' کیونکہ اس قتل کے بعد شردھانند نے اس ملک کی اکثریت کے درمیان قومی ہیرو کی حیثیت اختیار کرلی۔ ملک کی تاریخ میں ان کو ''شہید'' کا مقام دیا گیا۔ 1947ء میں ہندوستان آزاد ہوا تو راجدھانی دہلی کے ممتاز مقام (چاندنی چوک) پر ان کا بلند وبالا مجسمہ عین شاہراہ پر نصب کردیا گیا وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے کسی عمل کو ناموس رسول کے نام پر بے فائدہ جان دے دینا تو کہہ سکتے ہیں مگر اس کو ناموس رسول کی حفاظت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ یہ قربانی نہیں بلکہ نادانی ہے' جس کا تعلق نہ عقل سے ہے اور نہ اسلام سے۔'' (شتم رسول کا مسئلہ از وحیدالدین خاں ص 71-72)

حال ہی میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے فل بینچ نے قادیانیوں کے خلاف اپنے تاریخ ساز فیصلے میں لکھا:

''کلمہ ایک اقرار نامہ ہے جسے پڑھ کر غیر مسلم اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے' یہ عربی زبان میں ہے اور مسلمانوں کے لیے خاص ہے جو اسے نہ صرف اپنے عقیدہ کے اظہار کے لیے پڑھتے ہیں بلکہ روحانی ترقی کے لیے بھی اکثر اس کا ورد کرتے ہیں۔ کلمہ طیبہ کے معنی ہیں '' خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد (ﷺ) اس کے رسول ہیں۔'' اس کے برعکس قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی (نعوذ باللہ) حضرت محمد ﷺ کا بروز ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی کتاب ''ایک غلطی کا ازالہ'' (اشاعت سوم' ربوہ صفحہ 4) میں لکھا ہے:

O ''سورۃ الفتح کی آیت نمبر 29 کے نزول میں محمد ﷺ کو اللہ کا رسول کہا گیا ہے...... اللہ نے اس کا نام محمد رکھا۔'' (مندرجہ ''روحانی خزائن'' ص 207' جلد 18)

O روزنامہ ''بدر'' (قادیان) کی اشاعت 25 اکتوبر 1906ء میں قاضی ظہور الدین اکمل سابق ایڈیٹر "Review of Religions" کی ایک نظم شائع ہوئی تھی' جس کے ایک بند کا مفہوم اس طرح ہے'' محمد ﷺ پہلے سے زیادہ شان کے ساتھ ہم میں دوبارہ آ گئے ہیں' جو کوئی محمد ﷺ کو ان کی مکمل شان کے ساتھ دیکھنے کا متمنی ہو اسے چاہیے کہ وہ قادیان جائے۔''

''محمدؐ پھر اتر آئے ہیں ہم میں
اور آگے سے بڑھ کر ہیں اپنی شان میں
محمدؐ دیکھنے ہوں جس نے اکمل
غلام احمد کو دیکھے قادیان میں''

یہ نظم مرزا صاحب کو سنائی گئی تو اس نے اس پر مسرت کا اظہار کیا۔ (روزنامہ ''الفضل'' قادیان' 22 اگست 1944ء)

O علاوہ ازیں ''اربعین'' (جلد 4' صفحہ 17) میں اس نے دعویٰ کیا ہے:

''سورج کی کرنوں کی اب برداشت نہیں' اب چاند کی ٹھنڈی روشنی کی ضرورت ہے اور وہ احمد کے رنگ میں ہو کر میں ہوں۔'' (مندرجہ روحانی خزائن'' ص 445-446' جلد 17)

O خطبہ الہامیہ صفحہ 171 مندرجہ ''روحانی خزائن'' ص 259' جلد 16 میں اس نے اعلان کیا:

''جو کوئی میرے اور محمد ﷺ کے مابین فرق کرتا ہے' اس نے نہ تو مجھے دیکھا

ہے نہ جانا ہے۔"

O مرزا غلام احمد نے مزید دعویٰ کیا ہے:

"میں اسم محمد کی تکمیل ہوں یعنی محمدؐ محمد کا ظل ہوں۔" (دیکھئے حاشیہ "حقیقت الوحی" ص76 مندرجہ "روحانی خزائن" جلد22)

O سورۃ الجمعہ (62) کی آیت نمبر3 کے پیش نظر جس میں کہا گیا ہے:

"(وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول' خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے' ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے) میں ہی آخری نبی اور اس کا بروز ہوں اور خدا نے براہین احمدیہ میں میرا نام محمد اور احمد رکھا اور مجھے محمد کی تجسیم بنایا۔" (دیکھئے "ایک غلطی کا ازالہ" شائع شدہ از ربوہ' ص11-10 مندرجہ "روحانی خزائن" ص212' جلد18)

O "میں وہ آئینہ ہوں جس میں سے محمد کی ذات اور نبوت کا عکس جھلکتا ہے۔" ("نزول المسیح" ص48' شائع شدہ قادیان اشاعت1909ء دیکھئے "ایک غلطی کا ازالہ" ص8' مندرجہ "روحانی خزائن" جلد18)

O "اوپر جو کچھ کہا گیا اس کی روشنی میں مسلمانوں میں اس بات پر عمومی اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ جب کوئی احمدی کلمہ طیبہ پڑھتا ہے یا اس کا اظہار کرتا ہے تو وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ مرزا غلام احمد ایسا نبی ہے' جس کی اطاعت واجب ہے اور جو ایسا نہیں کرتا' وہ بے دین ہے' بصورت دیگر وہ خود کو مسلمان کے طور پر پیش کر کے لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ یا تو وہ مسلمانوں کی تضحیک کرتے ہیں یا اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ رسول اکرمﷺ کی تعلیمات' صورت حال کی راہنمائی نہیں کرتیں۔ اس لیے جیسی بھی صورت حال ہو' ارتکاب جرم کو ایک نہ ایک طریقہ سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔"

O مرزا غلام احمد نے نہ صرف یہ کہ اپنی تحریروں میں رسول اکرمﷺ کی عظمت وشان کو گھٹانے کی کوشش کی بلکہ بعض مواقع پر ان کا مذاق بھی اڑایا۔ حاشیہ "تحفہ گولڑویہ" ص165' مندرجہ "روحانی خزائن" ص 263' جلد17 میں مرزا صاحب نے لکھا کہ:

O "پیغمبر اسلام اشاعت دین کو مکمل نہیں کر سکے' میں نے اس کی تکمیل کی۔"

ایک اور کتاب میں کہتا ہے:

O "رسول اکرمﷺ بعض نازل شدہ پیغامات کو نہیں سمجھ سکے اور ان سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوئیں۔" (دیکھئے "ازالہ اوہام" لاہور طبع' ص346)...... (مندرجہ "روحانی خزائن"

ص472-473' جلد3)

اس نے مزید دعویٰ کیا:

O ''رسول اکرم ﷺ تین ہزار معجزے رکھتے تھے۔'' (''تحفہ گولڑویہ'' ص67' مندرجہ ''روحانی خزائن'' ص153' جلد17)

O ''جب کہ میرے پاس دس لاکھ نشانیاں ہیں'' (''براہین احمدیہ'' جلد5' ص56...... ''روحانی خزائن'' ص72' جلد21)

O (نشان' معجزہ' کرامت ایک چیز ہے۔''براہین احمدیہ'' جلد5' ص50' مندرجہ ''روحانی خزائن'' ص63' جلد21)

مزید یہ کہ:

O ''رسول اکرم ﷺ نصاریٰ کا تیار کردہ پنیر کھاتے تھے جس میں وہ سور کی چربی ملاتے تھے۔'' (''الفضل'' قادیان' 22فروری 1924ء)

مرزا بشیر احمد نے اپنی تصنیف ''کلمۃ الفصل'' (صفحہ 113) میں لکھا:

O ''مسیح موعود کو تو تب نبوت ملی جب اس نے نبوت محمدیہ ﷺ کے تمام کمالات کو حاصل کر لیا اور اس قابل ہو گیا کہ ظلی نبی کہلائے' پس ظلی نبوت نے مسیح موعود کے قدم کو پیچھے نہیں ہٹایا بلکہ آگے بڑھایا اور اس قدر بڑھایا کہ نبی کریمؐ کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کیا۔''

اس طرح اور بہت سی تحریریں موجود ہیں لیکن ہم اس ریکارڈ کو مزید گراں بار نہیں کرنا چاہتے۔

''ہر مسلمان کا بنیادی عقیدہ ہے کہ وہ ہر نبی کو مانتا اور اس کا احترام کرتا ہے۔ اس لیے اگر نبی کی شان کے خلاف کچھ کہا جائے تو اس سے مسلمان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی' جس سے وہ قانون شکنی پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ اس کا انحصار جذبات پر ہونے والے حملے کی سنگینی پر ہے۔ ہائی کورٹ کے فاضل جج نے مرزائیوں کی کتابوں سے بہت سے حوالے نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ مرزا غلام احمد نے دوسرے انبیائے کرام خصوصاً حضرت (عیسیٰ علیہ السلام) کی بھی بڑی توہین کی اور ان کی شان گھٹائی۔ حضرت عیسیٰ کی جگہ وہ خود لینا چاہتا تھا۔ ہم اس سارے مواد کو نقل کرنا ضروری نہیں سمجھتے' صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ مرزا غلام احمد ایک جگہ رقمطراز ہے:

O ''جو معجزات دوسرے نبیوں کو انفرادی طور پر دیے گئے تھے' وہ سب رسول اکرم ﷺ کو عطا کیے گئے' پھر وہ سارے معجزے مجھے بخشے گئے کیونکہ میں ان کا بروز ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے نام آدم' ابراہیم' موسیٰ' نوح' داؤد' یوسف' یونس' سلیمان اور عیسیٰ مسیح

ہیں۔"(''ملفوظات''' جلد سوم' ص 270' شائع شدہ ربوہ)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں لکھتا ہے:

O ''حضرت مسیح کا خاندان بھی نہایت پاک اور مطہر ہے۔ تین نانیاں اور دادیاں آپ کی زنا کار اور کسبی عورتیں تھیں جن کے خون سے آپ کا وجود ظہور پذیر ہوا۔" (''ضمیمہ انجام آتھم'' حاشیہ 7...... (مندرجہ ''روحانی خزائن''' ص 291' جلد 11)

O ''اس کے برعکس اللہ کی پاک کتاب (قرآن حکیم) حضرت عیسیٰ' ان کی والدہ اور خاندان کی بڑائی بیان کرتی ہے۔ دیکھئے سورۂ آل عمران (3) کی آیات 33 تا 37' 45 تا 47' سورۂ مریم (19) کی آیات 16 تا 32) کیا کوئی مسلمان قرآن کے خلاف کچھ کہنے کی جسارت کر سکتا ہے اور جو ایسی حماقت کرے' کیا وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ ایسی صورت میں مرزا غلام احمد اور اس کے پیروکار کیسے مسلمان ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مرزا غلام احمد پر اسی کی مذکورہ بالا تحریروں کی بنا پر توہین مذہب ایکٹ مجریہ 1679ء کے تحت عیسائیت کی توہین کے جرم میں کسی انگریزی عدالت میں ملزم قرار دے کر سزا دی جا سکتی تھی' مگر ایسا نہیں کیا گیا۔''

O ''جہاں تک رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی کا تعلق ہے' مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے:

> ''ہر مسلمان کے لیے جس کا ایمان پختہ ہو' لازم ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ اپنے بچوں' خاندان' والدین اور دنیا کی ہر محبوب ترین شے سے بڑھ کر پیار کرے۔'' (''صحیح بخاری''' ''کتاب الایمان''' ''باب حب الرسول من الایمان'')

کیا ایسی صورت میں کوئی' کسی مسلمان کو مورد الزام ٹھہرا سکتا ہے۔ اگر وہ ایسا توہین آمیز مواد جیسا کہ مرزا قادیانی نے تخلیق کیا ہے سننے' پڑھنے یا دیکھنے کے بعد اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے؟''

O ''ہمیں اس پس منظر میں احمدیوں کے صدر سالہ جشن کی تقریبات کے موقع پر احمدیوں کے اعلانیہ رویہ کا تصور کرنا چاہیے اور اس ردعمل کے بارے میں سوچنا چاہیے' جس کا اظہار مسلمانوں کی طرف سے ہو سکتا تھا۔ اس لیے اگر کسی احمدی کو انتظامیہ کی طرف سے یا قانوناً شعائر اسلام کا اعلانیہ اظہار کرنے یا انہیں پڑھنے کی اجازت دے دی جائے تو یہ اقدام اس کی شکل میں ایک اور ''رشدی'' تخلیق کرنے کے مترادف ہوگا۔ کیا اس صورت میں انتظامیہ اس کی جان' مال اور آزادی کے تحفظ کی ضمانت دے سکتی ہے اور اگر دے سکتی ہے تو کس قیمت پر؟ مزید برآں اگر گلیوں یا جائے عام پر جلوس نکالنے یا جلسہ کرنے کی اجازت دی جائے تو یہ خانہ جنگی کی اجازت دینے

کے برابر ہے۔ یہ محض قیاس آرائی نہیں' حقیقتاً ماضی میں بارہا ایسا ہو چکا ہے اور بھاری جانی و مالی نقصان کے بعد اس پر قابو پایا گیا (تفصیلات کے لیے منیر رپورٹ دیکھی جا سکتی ہے) ردعمل یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی احمدی یا قادیانی سرعام کسی بلے کارڈ' بیج یا پوسٹر پر کلمہ کی نمائش کرتا ہے یا دیوار یا نمائش دروازوں یا جھنڈیوں پر لکھتا ہے' یا دوسرے شعائر اسلامی کا استعمال کرتا یا انہیں پڑھتا ہے تو یہ اعلانیہ رسول اکرم ﷺ کے نام نامی کی بے حرمتی اور دوسرے انبیاء کرام کے اسمائے گرامی کی توہین کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب کا مرتبہ اونچا کرنے کے مترادف ہے جس سے مسلمانوں کا مشتعل ہونا اور طیش میں آنا ایک فطری بات ہے اور یہ چیز امن عامہ کو خراب کرنے کا موجب بن سکتی ہے' جس کے نتیجہ میں جان و مال کا نقصان ہو سکتا ہے۔"

جناب جسٹس عبدالقدیر چودھری
جناب جسٹس ولی محمد خاں
جناب جسٹس محمد افضل لون
جناب جسٹس سلیم اختر

(S.C.M.R August 1993)

پیر سیال کا خیال

اس فیصلے کے بعد وہ انتہائی خوش وخرم رہنے لگے۔ 14 اکتوبر 1929ء کو صبح سویرے اس کو میانوالی ڈسٹرکٹ جیل میں منتقل کیا گیا۔ وہاں کافی نامی گرامی لوگ ملاقات اور زیارت کے لیے حاضر ہوتے رہے۔ سجادہ نشین سیال شریف نے بھی ملاقات کی۔ پیر صاحب غازی کے جمال وجلال سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ کوئی خاص بات تو نہ کر سکے' البتہ سورہ یوسف پڑھنے لگ گئے۔ پیر صاحب ایک اچھے قاری اور حافظ تھے لیکن سورہ یوسف کے پڑھنے کا یارا نہ پا سکے اور وفور جذبات سے بار بار رکنے لگے۔ اس پر غازی علم الدین نے حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا کہ آپ بسم اللہ شریف پڑھ کر ایک دفعہ پھر سے شروع کریں۔ پیر صاحب نے دوبارہ تلاوت کا آغاز کیا لیکن اس دفعہ بھی روانی نہیں تھی۔ اکثر گلوگیر ہو کر رک جاتے اور کسی اور عالم میں پہنچ جاتے۔ غازی علم الدین جو قرآن شریف نہیں پڑھے ہوئے تھے اور سورۂ یوسف پہلے ہرگز نہیں آتی تھی' پیر صاحب کو صحیح لقمے دیتے رہے اور سورۂ یوسف پڑھنے میں پوری پوری مدد کی۔ پیر صاحب ملاقات کر کے باہر آئے تو فرط حیرت و استعجاب سے بول نہیں سکتے تھے۔ صرف اتنا ہی فرمایا "میں علم الدین کے لبادے میں کوئی اور ہستی پاتا ہوں۔ کون کہتا ہے کہ غازی علم

الدین ان پڑھ اور جاہل ہیں۔ انہیں علم لدنی حاصل ہے اور وہ کائنات کے اسرار و رموز سے واقف ہیں۔''

وارڈن کا انکشاف

وارڈن جیل نواب دین کا بیان ہے کہ غازی علم الدین کو 31 اکتوبر 1929ء کو تختۂ دار پر چڑھانا تھا اور 31/30 کی درمیانی شب کو میں ان کے کمرے کا نگراں تھا۔ غازی نے وہ ساری رات سجدوں اور تلاوت میں گزار دی۔ صبح کے چار بجے میں نے دیکھا کہ کوٹھری بدستور مقفل ہے۔ لیکن غازی اندر موجود نہیں ہیں۔ میں پریشان ہو گیا کہ انہیں اس کوٹھڑی سے کوئی نکال کر لے گیا ہے اور اب میں حکام جیل کو کیا جواب دوں گا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اس امر سے مطلع کیا اور کہا کہ اگر کوئی سازش ہوئی ہے تو غازی کہیں دور نہیں جا سکتے کیونکہ ابھی ابھی وہ سربسجود تھے۔ میں جونہی ایک چکر لگا کر آیا تو انہیں غائب پایا۔ اس پر سب نے اندر غور سے جھانکا لیکن کوٹھری خالی تھی۔ ہم انہیں ادھر ادھر باہر تلاش کر رہے تھے کہ یکا یک ان کا کمرہ روشنی سے منور ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ وہ مصلے پر بیٹھے ہیں' ایک نورانی صورت بزرگ ان کے سر پر ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ اب ہم نے جونہی اندر جھانکا تو بزرگ غائب تھے اور غازی علم الدین تسبیح پڑھ رہے تھے۔

جمعرات 26 جمادی الثانی 1348ء (31 اکتوبر 1929ء) کو مجسٹریٹ نے غازی صاحب سے آخری خواہش دریافت کی۔ انہوں نے کہا ''صرف دو رکعت نمازِ شکر ادا کرنے کی اجازت دی جائے۔''

انہوں نے دو رکعت نفل پڑھے اور کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے تختۂ دار پر چڑھ گئے۔ ان کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے گئے۔ سر پر ٹوپ چڑھا دیا گیا اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ مگر انہوں نے کہا: ''اے ناوانو! تم یہ کیا کر رہے ہو۔ وہ دیکھو میری روح کے استقبال کے لیے تو سینکڑوں فرشتے آئے ہوئے ہیں۔ پروانۂ شمع رسالت ﷺ کو تختۂ دار پر کھینچ کر واصل باللہ کر دیا گیا:

ایک پیر غلام دستگیر صاحب نے ان کی تاریخ شہادت یوں نکالی۔

برائے سال وفاتش بگفت ہاتفِ غیب
شہیدِ عشقِ محمدؐ کبیر علم الدین

ترجمہ: تاریخ شہادت کے لیے غیب سے آواز آئی کہ حضرت محمد مصطفی ﷺ سے محبت کرنے والے شہیدوں میں علم الدین کا رتبہ بہت بڑا ہے۔

گورنر کی سازش

ناعاقبت اندیش گورنر نے فنافی الرسول غازی کو ایک مردہ و بے بس قوم کا فرد سمجھ کر ان کی پاک میت کو قیدیوں کے قبرستان میں ایک حیوان کی طرح کسی گڑھے میں دبا دیا۔ جنازہ تو درکنار کفن تک نہیں دیا گیا۔ ان کی میت کو دبایا جا رہا تھا کہ پاس کھڑے ہوئے ایک نمبردار قیدی نے دورد شریف اور کلمہ شہادت پڑھ کر اپنی چادر غازی علم الدین پر ڈال دی۔ جونہی یہ خبر لاہور میں پہنچی۔ پوری مسلمان قوم گھروں سے باہر نکل آئی اور کاروبار بند کر دیا۔ فدائیانِ اسلام شہید کی میت حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ 4 نومبر 1929ء کو مسلمانوں کا ایک وفد ڈی مونٹ مورنسی گورنر پنجاب سے ملا اور اپنا مطالبہ پیش کیا۔ گورنر نے سب سے پہلا اور اہم سوال یہ کیا' اگر نعش کے آنے پر لاہور میں ہندو مسلم فساد ہو گیا تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا:

علامہ اقبالؒ نے جھٹ کہا: اگر کوئی ایسی بات ہوگئی تو آپ میری گردن اڑا دیجئے گا۔ اس کے بعد علامہ کی پرنم آنکھوں سے جلال برسنے لگا۔ گورنر نے چند شرائط پیش کرتے ہوئے میت کو مسلمانوں کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا۔

سفر آخرت

13 نومبر 1929 کو مسلمانوں کا ایک وفد میانوالی پہنچا۔ دوسرے دن علی الصبح شہید کی نعش کو گڑھے سے نکال کر بصد احترام ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لایا گیا۔ وہاں ایک صندوق میں بند کیا گیا۔ یہ صندوق سید مراتب علی شاہ گیلانی نے بنوایا تھا۔ اس کے اندر جست لگا ہوا تھا اور جست پر روئی کی دبیز تہہ تھی۔ سرہانے نرم و ملائم تکیے رکھے ہوئے تھے۔ جن لوگوں نے شہید کی میت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کا بیان ہے کہ دو ہفتے گزر جانے کے باوجود میت مبارک میں ذرا بھر تعفن نہیں تھا۔ جسم صحیح سالم تھا۔ چہرے پر جلال و جمال کا امتزاج تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ گڑھے سے ایک مسحور کن خوشبو آ رہی تھی۔ بہرحال میت مبارک کو بذریعہ سپیشل ٹرین 14 نومبر 1929ء کو 5 بج کر 35 منٹ پر لاہور چھاؤنی سے ذرا پرے نہر کے پل کے پاس اتارا گیا۔ محکمہ جیل نے وہ صندوق جس میں حرمتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا شیدائی استراحت فرما تھا' مسلم لیگ کے نمائندوں سر محمد شفیع اور علامہ محمد اقبالؒ کے حوالے کر کے رسید لی۔

سید حبیب مدیر و مالک اخبار سیاست ایک جید عالم اور مسلمانوں کے مقبول رہنما تھے۔ مدیر کے آنے پر ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ نے پوچھا کہ شہید کی نمازِ جنازہ پڑھانے کا شرف کسے حاصل ہونا چاہیے۔

سید حبیب نے کہا کہ یہ شہید کے والد بزرگوار میاں طالع مند کا حق ہے۔میاں طالع مند نے کہا اگر یہ حق مجھے حاصل ہے تو میں اسے علامہ اقبالؒ کو تفویض کرتا ہوں۔ڈاکٹر صاحب نے سید حبیب کے مشورے سے سن رسیدہ اور عالم بے بدل مولانا سید دیدار علی شاہ الوری کا نام تجویز کیا لیکن وہ اس وقت تک تشریف نہیں لا سکے تھے چنانچہ ان کے بجائے قاری محمد شمس الدین خطیب مسجد وزیر خان نے پہلی نماز جنازہ پڑھائی۔دوسری نمازِ جنازہ سید محمد دیدار علی شاہ نے تیسری سید احمد شاہ اور باقی نمازیں مختلف علمائے کرام نے پڑھا کر فرض کفایہ ادا کیا۔غازی علم الدین شہید کے جنازے میں تقریباً چھ لاکھ مسلمان شریک تھے اور جنازے کا جلوس تقریباً ساڑھے پانچ میل لمبا تھا۔

مولانا سید دیدار علی شاہ الوری اور علامہ سر محمد اقبالؒ نے میت کو اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارا۔لوگوں نے فرطِ عقیدت سے قبر کے اندر اتنے پھول پھینکے کہ میت ان میں چھپ گئی۔اس کے بعد اینٹوں سے تعویز کو بند کیا گیا اور کلمہ شہادت و کلمہ تمجید پڑھ کر قبر پر مٹی ڈالی گئی۔

”جو لوگ خدا کی راہ میں مارے جاتے ہیں انہیں مردہ مت کہو وہ تو زندہ ہیں لیکن تمہیں خبر نہیں ہے۔“

(القرآن الحکیم)



وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

١٢٩٣

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا

غازی عبدالقیوم شہید

قاری فیوض الرحمٰن

اللہ کے رسول ﷺ کی محبت عین ایمان ہے مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن اللہ کے رسولؐ کی شانِ اقدس میں ادنیٰ سی گستاخی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ آج تک جس شخص نے بھی ادنیٰ گستاخی کی اُسے انہوں نے معاف نہیں کیا اور اس شخص کو کیفر کردار تک پہنچا کر ہی چھوڑا۔ لاہور کے ایک ہندو راجپال نے ایک گستاخانہ کتاب ''رنگیلا رسول'' لکھی تو اس وقت لاہور ہی کے ایک غیرت مند نوجوان غازی علم الدین آگے بڑھے اور اس ہندو کو اس کی گستاخی کا مزہ چکھا دیا۔ راجپال کو قتل کرنے کے ''جرم'' میں اس عاشقِ رسول ﷺ کو عدالت عالیہ سے سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ انہوں نے اللہ کے رسولؐ کی عزت و حرمت پر جان دے کر ابدی زندگی حاصل کر لی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

غازی علم الدین شہیدؒ کی محبت اور زبانوں پر اس مردِ مجاہد کے تذکرے ہیں لیکن غازی عبدالقیوم کا کارنامہ عوام و خواص کی نظروں سے اوجھل ہے، ان کے نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ آج کی اس نشست میں ہم ''غازی عبدالقیوم شہیدؒ'' کا تذکرہ کرتے ہیں۔

نام	....	عبدالقیوم خان
والد کا نام	....	عبداللہ خانؒ
قوم	....	پٹھان
ساکن	....	غازی، ضلع ہزارہ
تاریخ پیدائش	....	12-1911ء

ابتدائی زندگی و تعلیم:

غازی عبدالقیوم خان کو بچپن ہی سے مذہبی تعلیم کا شوق تھا۔ چھٹی جماعت پاس کر کے گاؤں کے علمائے کرام سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اکثر قرآنِ مجید کی تلاوت کرتے رہتے۔ سکول چھوڑ کر قرآن مجید کی تعلیم کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے، صوم و صلوٰۃ کی آخری وقت تک پوری پابندی کرتے رہے۔

1932ء میں ان کے والد عبداللہ خان صاحب انتقال کر گئے۔ ان کی چھ بہنیں تھیں جو کہ اچھے گھرانوں میں بیاہی گئیں، ایک بھائی جوان سے بڑے ہیں، ان کا نام ہمایوں خان ہے جو محکمہ امداد باہمی میں بحیثیت ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ ملازمت کر کے ریٹائر ہو چکے ہیں۔

جب ان کی عمر 21-22 سال کی ہوئی تو 1934ء میں ان کی شادی کرا دی گئی۔ شادی کے چند ماہ بعد ان کو کراچی جانے کا شوق پیدا ہوا، وجہ یہ تھی کہ ان کے حقیقی چچا رحمت اللہ خان وہاں پہلے سے مقیم تھے اور وکٹوریہ گاڑیوں کا کاروبار کرتے تھے۔ چنانچہ یہ کراچی چلے گئے اور اپنے چچا کے ہاں ٹھہرے وہاں بھی ان کا زیادہ تر وقت صدر کی مسجد میں تلاوت قرآن، ذکر اللہ اور نوافل وغیرہ عبادات میں گزرتا تھا۔ اسی دوران انہوں نے مسجد میں چسپاں ایک اشتہار پڑھا، واقعات پڑھ سن کر ان کو جوش آ گیا، دوسرے ہی دن بازار سے ایک چاقو خریدا اور نتھو رام ہندو کی آئندہ پیشی کا انتظار کرنے لگے۔

نتھو رام بدانجام کا حشر:

"روزگارِ فقیر" کے مؤلف فقیر سید وحید الدین صاحب اس واقعہ کی پوری تفصیل ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

یہ 1933ء کے اوائل کا ذکر ہے، جب سندھ صوبہ بمبئی میں شامل تھا، ان دنوں آریہ سماج حیدرآباد (سندھ) کے سیکرٹری نتھو رام نے "ہسٹری آف اسلام" کے نام کی ایک کتاب شائع کی، جس میں آقائے دوجہاں، سرکارِ دوعالم ﷺ کی شانِ اقدس میں سخت دریدہ دہنی کا مظاہرہ کیا گیا، مسلمانوں میں اس کتاب کی اشاعت کے سبب بڑا اضطراب پیدا ہوا، جس سے متاثر ہو کر انگریزی حکومت نے

کتاب کو ضبط کیا اور نتھو رام پر عدالت میں مقدمہ چلایا گیا' جہاں اس پر معمولی سا جرمانہ ہوا اور ایک سال قید کی سزا سنائی گئی۔ عدل و انصاف کی اس نرمی نے نتھو رام کا حوصلہ بڑھا دیا اور اس نے وی ایم فیرس جوڈیشل کمشنر کے یہاں ماتحت عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی۔ کمشنر کی عدالت نے اس گندہ دہن' شاتم رسول کی ضمانت منظور کر لی۔ اس سے مسلمانوں کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ بہت مضطرب اور فکر مند تھے کہ توہین رسولؐ کے اس فتنے کا سدباب آخر کس طرح کیا جائے۔ ہزارے کا رہنے والا عبدالقیوم نام کا ایک نوجوان تھا جو کراچی میں وکٹوریہ گاڑی چلاتا تھا۔ جونا مارکیٹ کی کسی مسجد میں اس نے اس واقعہ کی تفصیل سنی اور یہ معلوم کر کے کہ ایک ہندو نے حضور سرور کائنات ﷺ کی توہین کی ہے' اس کے غم و اضطراب اور اندوہ و ملال کی کوئی حد نہ رہی۔ ستمبر 1934ء کا واقعہ ہے کہ مقدمہ اہانت رسولؐ کے ملزم نتھو رام کی اپیل کراچی کی عدالت میں سنی جا رہی تھی' عدالت دو انگریز ججوں کے بنچ پر مشتمل تھی۔ عدالت کا کمرہ وکیلوں اور شہریوں سے بھرا ہوا تھا۔ غازی عبدالقیوم نہایت اطمینان کے ساتھ دوسرے تماشائیوں کے ساتھ وکلاء کی قطار کے پیچھے نتھو رام کی برابر والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ عین مقدمے کی ساعت کے دوران وہ اپنا تیز دھار چاقو لے کر نتھو رام پر ٹوٹ پڑا اور اس کی گردن پر دو بھرپور وار کیے۔ نتھو رام چاقو کے زخم کھا کر زور سے چیخا اور زمین پر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ غازی عبدالقیوم نے پولیس کی گرفت سے بچنے اور فرار ہونے کی ذرہ برابر کوشش نہیں کی۔ اس نے نہایت ہنسی خوشی کے ساتھ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ انگریز جج نے ڈائس سے اتر کر اس سے پوچھا:

تم نے اس شخص کو کیوں قتل کیا؟

غازی عبدالقیوم نے عدالت میں آویزاں جارج پنجم کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ تصویر تمہارے بادشاہ کی ہے۔ کیا تم اپنے بادشاہ کی توہین کرنے والے کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دو گے؟ اس ہندو نے میرے آقا اور شہنشاہ کی شان میں گستاخی کی ہے جسے میری غیرت برداشت نہیں کر سکی۔

غازی عبدالقیوم پر مقدمہ چلا۔ اس نے اقبال جرم کیا۔ آخر کار سیشن جج نے اسے سزائے موت کا حکم سنایا۔ غازی عبدالقیوم نے فیصلہ سن کر کہا:

''جج صاحب! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے موت کی سزا دی۔ یہ ایک جان کس گنتی میں ہے' اگر میرے پاس ایک لاکھ جانیں بھی ہوتیں' تو ناموس رسولؐ پر نچھاور کر دیتا۔'' اس فیصلے کے خلاف ہائیکورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی۔ دیندار مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ غازی عبدالقیوم کا قانونی دفاع کرنے کے لیے سامنے آ گیا۔ سید محمد اسلم بار ایٹ لا کو عبدالقیوم کی پیروی کی سعادت حاصل ہوئی'

لیکن اس مردِ مجاہد (عبدالقیوم) نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے قانونی مشیر پر واضح کر دیا کہ میں نے ماتحت عدالت میں جو اقبالی بیان دیا ہے' اس کے خلاف کچھ کہہ کر اپنی عاقبت خراب نہیں کروں گا۔ سید محمد اسلم نے مقدمے کی تیاری جاری رکھی اور شہادتوں کے سلسلے میں علامہ اقبال' مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا ظفر علی خاں اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے ملک کے ممتاز علماء کو بطور گواہ طلب کرانے کی درخواست کی تاکہ وہ اسلامی نقطۂ نظر واضح کر سکیں' لیکن عدالت نے یہ درخواست مسترد کر دی۔ مقدمہ صفائی کی ساری بنیاد اس نکتے پر رکھی گئی تھی کہ:

''یہ ایک مسلمان کا ایمان و عقیدہ ہے کہ اگر کوئی شخص ناموسِ رسولؐ پر حملہ کرے' تو وہ اسے موت کے گھاٹ اتار دے۔''

اپیل کی سماعت جسٹس دادیبا مہتہ (Dadiba Mehta) اور 9 ارکانِ جیوری کے سامنے شروع ہوئی۔ جیوری چھ انگریزوں' دو پارسیوں اور ایک گوانی عیسائی ممبر پر مشتمل تھی۔ عدالت کے باہر کم و بیش 25 ہزار مسلمانوں کا ایک بڑا ہجوم فیصلے کا منتظر تھا۔ ایڈووکیٹ جنرل کے دلائل کے بعد غازی عبدالقیوم کے پیروکار سید محمد اسلم نے صفائی کا مؤقف پیش کیا۔ انہوں نے مقدمے کے بنیادی نکات اور اقدامِ قتل کے محرکات پر تین گھنٹے تک مدلل بحث کی۔ ان کی تقریر کے بعض حصے اس قدر اہم تھے کہ انہیں قانون و انصاف کی تاریخ میں ہمیشہ زریں حروف میں لکھا جائے گا۔

انہوں نے ''اشتعال'' کے قانونی مفہوم کو بیان کرتے ہوئے یہ نکتہ پیش کیا: ''سوال یہ نہیں ہے کہ عبدالقیوم کا اقدام ملک کے قانون کے خلاف ہے۔ سوال یہ ہے کہ عبدالقیوم نے یہ اقدام انتہائی اشتعال کے عالم میں کیا ہے' تو کیوں نہ اسے وہ کم سے کم سزا دی جائے جس کی اجازت دفعہ 302 کے تحت قانون نے دے رکھی ہے۔ اگر موجودہ قانون زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے یا کسی عورت کے معاملے میں قاتل کو ''اشتعال'' کی رعایت دیتا ہے تو رعایت کا یہ اصول عبدالقیوم کے مقدمے میں کیوں قابلِ قبول نہیں ہے جب کہ ایک مسلمان کے لیے ناموسِ رسولؐ پر حملے سے زیادہ اور کوئی اشتعال انگیزی نہیں ہو سکتی۔''

وکیل صفائی کی تقریر کے دوران میں جج نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ کیا آپ کے اس اظہارِ خیال سے فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ نہیں ہوگا؟ سید محمد اسلم نے اس موقع پر جواب دیا:

''جنابِ والا! مسلمان' حکومت اور ہندو اکثریت کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے ہیں کہ ان کے لیے رسول اللہ کی محبت کیا حیثیت رکھتی ہے اور اس بارے میں مسلمانوں کے جذبات کیا ہیں' مگر ان دونوں نے ذرا توجہ نہیں دی۔ اب مجھے عدالت میں یہ واضح کرنے کا موقع مل رہا ہے کہ جب تک ایک مسلمان بھی زندہ ہے' وہ ناموسِ رسالتؐ کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز اور قوت کو ختم کر کے رہے گا۔ اس

معاملے میں مسلمان کو تعزیراتِ ہند کی پرواہے نہ پھانسی کے پھندے کی۔" غازی عبدالقیوم کے پیروکار سید محمد اسلم نے اقدام قتل کے لیے اشتعال کے مفہوم کی اہمیت پر جو قانونی نکتہ پیش کیا تھا اگر وہ تسلیم کرلیا جاتا تو ناموسِ رسالتؐ پر حملہ کرنے کی مذموم تحریک ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی اور آئندہ کوئی اس جسارت کا تصور بھی نہ کرسکتا۔ لیکن عدالت عالیہ نے یہ اپیل خارج کردی۔ غازی عبدالقیوم کے لیے سزائے موت بحال رہی۔ پُرجوش اور مضطرب مسلمانوں کے لیے یہ وقت بڑی آزمائش کا تھا۔ بالآخر فروری 1936ء میں کراچی کے مسلمانوں نے ایک وفد حکیم الامت علامہ اقبال کی خدمت میں لاہور بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وفد جس میں مولوی ثناء اللہ، عبدالخالق اور حاجی عبدالعزیز شامل تھے، لاہور پہنچا اور میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر اس مقدمے کی روداد تفصیل کے ساتھ سنائی۔ اس کے بعد عرض کیا کہ آپ وائسرائے سے ملاقات کریں۔ اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لائیں اور انہیں اس پر آمادہ کریں کہ غازی عبدالقیوم کی سزائے موت عمر قید میں بدل دی جائے۔ وفد نے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ نے سعی و توجہ فرمائی تو پوری توقع ہے کہ غازی عبدالقیوم کی جانب سے رحم کی اپیل حکومت ہند ضرور منظور کرلے گی۔"

رحم کی اپیل پر علامہ اقبال کا جواب:

علامہ وفد کی یہ گفتگو سن کر دس بارہ منٹ تک بالکل خاموش رہے اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ وفد کے ارکان منتظر اور مضطرب تھے کہ دیکھیے علامہ کیا فرماتے ہیں۔ توقع یہی تھی کہ جواب اثبات میں ملے گا کہ ایک عاشق رسولؐ کا معاملہ دوسرے عاشق رسولؐ کے سامنے پیش ہے۔ اس سکوت کو پھر علامہ اقبالؒ ہی کی آواز نے توڑا۔ انہوں نے فرمایا: "کیا عبدالقیوم کمزور پڑ گیا ہے؟" ارکانِ وفد نے کہا: "نہیں اس نے تو ہر عدالت میں اپنے اقدام کا اقبال اور اعتراف کیا ہے۔ اس نے نہ تو بیان تبدیل کیا اور نہ لاگ لپیٹ اور ایچ پیچ کی کوئی بات کہی۔ وہ تو کھلے خزانے کہتا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے۔ مجھے پھانسی کے پھندے سے بچانے کی کوشش مت کرو۔"

وفد کی اس گفتگو کو سن کر علامہ کا چہرہ تمتما گیا۔ انہوں نے برہمی کے لہجے میں فرمایا: "جب وہ کہہ رہا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے، تو میں اس کے اجر و ثواب کی راہ میں کیسے حائل ہو سکتا ہوں؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ایسے مسلمان کے لیے وائسرائے کی خوشامد کروں، جو زندہ رہا تو غازی ہے اور مر گیا تو شہید ہے۔"

علامہ کے لہجے میں اس قدر تیزی تھی کہ وفد کے ارکان اس سلسلے میں پھر کچھ اور کہنے کی جرأت

نہ کر سکے۔ وفد کراچی واپس ہو گیا۔

غازی عبدالقیوم کو جس دن پھانسی دی گئی۔ کراچی کی تاریخ میں وہ دن مسلمانوں کے جوش و اضطراب کا یادگار دن تھا۔ دلوں میں یہ جذبہ موجزن تھا کہ کاش، یہ شہادت ہمیں میسر آتی۔

لاہور میں غازی علم الدین اور کراچی میں غازی عبدالقیوم کے ان واقعات کا علامہ اقبال نے بہت زیادہ اثر قبول کیا تھا اور اپنے اس قلبی تاثر کو تین شعروں میں بیان فرما دیا۔ یہ اشعار ''لاہور اور کراچی'' کے عنوان سے ''ضرب کلیم'' میں شائع ہو چکے ہیں مگر غازی عبدالقیوم کے لیے رحم کی درخواست کے اس واقعہ کی روشنی میں ان اشعار کا مفہوم کچھ اور زیادہ ابھرتا ہے۔

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالم معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مرد مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرف لا تدع مع اللہ الھا اخر

لاکھوں کی تعداد میں مسلمانوں نے وقتِ جنازہ جلوس نکالے۔ لاکھوں نے ان کے نماز جنازہ میں شرکت کی، ناموسِ رسول ﷺ پر اپنی جان نچھاور کرنے والے اس شہید کو بڑی عزت و تکریم کے ساتھ میوہ شاہ کے علاقہ قبرستان میں ایک خاص چار دیواری کے اندر دفن کیا گیا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

غازی عبدالقیوم کا خاندان:

ان کے بڑے بھائی کے لڑکے محمد سعید واہ فیکٹری میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں۔ غازی عبدالقیوم کے ایک بھانجے پاکستان آرمی میں میجر ہیں جبکہ ایک دوسرے بھانجے لیفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر حق نواز خان حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں اور اب غازی میں پریکٹس کرتے ہیں، ماشاء اللہ بڑے دین دار، صوم و صلوۃ کے پابند اور متشرع ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس خاندان پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے اور ان کے طفیل ہمارے اوپر بھی رحم فرمائے، ہمیں بھی غازی عبدالقیوم خان شہیدؒ کی طرح ناموسِ رسالت پر مر مٹنے والا بنائے۔ ''آمین یا الٰہ العالمین''



غازی مرید حسین شہیدؒ

منیر نوابی

آپ کا اسم گرامی مرید حسین' ایم ایچ اور اسیر تخلص کرتے تھے۔ 1915ء میں بھلہ شریف تحصیل چکوال کے معزز کہوٹ قریش گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام نامی عبداللہ خان اور والدہ ماجدہ کا اسم مبارک غلام عائشہ تھا۔ چوہدری عبداللہ بھلہ کے نمبردار اور باوقار بزرگ تھے۔ بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ نے اکلوتے فرزند سے نوازا تھا۔ اس لیے اپنی آنکھوں کے نور اور دل کے سرور کی بڑی محبت اور شفقت سے پرورش کی۔ مرید حسین ابھی پانچ برس کے تھے کہ والد بزرگوار کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ والدہ بڑی جہاندیدہ اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ اس لیے اپنے مرحوم سرتاج کی یادگار اکلوتے اور لاڈلے بیٹے کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دی۔

قرآن حکیم اور دوسری دینی کتب کی تدریس کے لیے سید محمد شاہ صاحب خطیب و امام مسجد جامع بھلہ شریف کی خدمات حاصل کی گئیں۔ عام تعلیم کے لیے آپ کو قریبی قصبہ کریالہ کے اینگلو سنسکرت مڈل سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ آپ شروع سے ہی ذہین اور محنتی تھے۔ مڈل اچھے نمبروں پر پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول چکوال میں زیر تعلیم رہے۔ 31-1930ء میں میٹرک میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ گو اعلیٰ تعلیم کا شوق اور وسائل رکھتے تھے لیکن گھر کی ذمہ داری اور گاؤں کی نمبرداری کے بوجھ سے مجبور ہو کر سلسلہ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔

خاندانی شرافت' دینی تعلیم اور نیک سیرت والدہ کی تربیت نے آپ کو اسلام کا سچا شیدائی بنا

دیا۔ مذہب سے گہرے لگاؤ کا ہی اثر تھا کہ کسی انسان کو دکھی دیکھتے تو بے قرار ہو جاتے۔ ہندوؤں کی ستم ظریفی اور مسلمانوں کی زبوں حالی نے آپ کو خدمت خلق کے کاموں کی طرف مائل کر دیا۔ زندگی کی بے ثباتی اور خدمتِ خلق کی اہمیت کا اظہار ایک شعر میں یوں کرتے ہیں۔

زندگی اس دارِ فانی کی مگر کچھ بھی نہیں
خدمت خلقِ خدا نہ کی اگر کچھ بھی نہیں!

تعلیم سے فارغ ہونے اور نمبرداری کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد خاموشی سے عوامی فلاح و بہبود اور خدمتِ خلقِ خدا میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ غلامی کا دور تھا۔ نمبرداروں سے حکومتِ برطانیہ کے کارندے جو سلوک روا رکھتے اور توقعات وابستہ کرتے تھے' مرید حسین جیسا غیور مردِ مومن اسے کب برداشت کر سکتا تھا۔ ویسے بھی آپ کی نیک طبیعت دنیاوی نمود و نمائش سے نفور تھی۔ جلد ہی نمبرداری سسٹم کی خرابیوں سے باخبر ہو گئے اور اس جنجال اور غلامی کے جوئے سے گلو خلاصی کرا لی۔ یک سُو ہو کر اصلاح قوم اور فلاح ملتِ اسلامیہ میں مصروف ہو گئے۔ آپ کے ماموں ماسٹر غلام سرور صاحب اور چچا زاد بھائی چودھری خیر مہدی صاحب کا بیان ہے کہ غازی صاحب صوم وصلوۃ کے سختی سے پابند اور ہمیشہ باوضو رہنے کے عادی تھے۔ نماز باجماعت کی پابندی کی یہ حالت تھی کہ اللہ اکبر کی آواز کان میں پڑتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے اور خانہ خدا میں پہنچ جاتے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کھانا کھا رہے ہیں اور اذان کی آواز سن کر کھانا وہیں چھوڑ دیا اور مسجد پہنچ گئے۔

بھلہ سے چکوال صرف پانچ میل دور ہے آپ اکثر چکوال جاتے رہتے۔ وہیں علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کی مشہور خاکسار تحریک کی عسکریت سے متاثر ہوئے اور خاکسار بن گئے لیکن آپ کی عشقِ رسالت ﷺ میں ڈوبی ہوئی روح کو کما حقہ' سکون میسر نہ آیا۔ روحانیت کی پیاس آپ کو حضرت پیر خواجہ عبدالعزیز صاحب چشتی چاچڑ شریف ضلع سرگودھا کے پاس لے گئی۔ خواجہ چاچڑوی ؒ (پیر صاحب سیال شریف کے مرید) کے دست حق پرستِ پر بیعت کر کے ان کے حلقۂ مریداں میں شامل ہو گئے۔

غازی صاحب کے ہاں مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے اخبار ''زمیندار'' کا مطالعہ معمول تھا۔ آپ آریہ سماج اور دوسری ہندو تحریکوں' پارٹیوں اور انجمنوں کی اسلام دشمنی کی خبریں اکثر پڑھتے اور دل ہی دل میں کڑھتے رہتے۔ ادھر بھلہ اور کریالہ کے متمول ہندوؤں کی چیرہ دستیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی غیرت مند طبیعت' متعصب اور دریدہ دہن ہندو بنیوں سے سخت متنفر ہو گئی۔ یہ نفرت یہاں تک بڑھی کہ آپ نے راج پال لاہوری اور نتھو رام سندھی کی شانِ رسالت ﷺ میں گستاخیوں کے بعد ہندوؤں سے ہر قسم کا تعلق منقطع کر لیا۔ حتیٰ کہ ان کی بسوں میں سفر کرنا بھی چھوڑ دیا'

اور جہاں بھی جانا ہوتا' پیدل جاتے۔ اسی طرح اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر مسلمانوں کی اپنی دکانیں کھلوادیں اور مقامی مسلمانوں کی ایک انجمن بنا کر ہندوؤں کا معاشرتی بائیکاٹ کر دیا۔ اس پر ہندوؤں نے جن میں بھائی پر مانند (کریالہ) جیسے بڑے بڑے سیاسی لیڈر بھی شامل تھے' سرکاری دباؤ ڈلوا کر غازی صاحب کو رام کرنے کی کوششیں کیں۔ لیکن غازی صاحب نے نہ ڈرنا تھا نہ ڈرے۔ تحریک کو جاری رکھا اور اس طرح قیام پاکستان سے بہت پہلے بھلہ کریالہ میں پاکستان بنادیا!

1935ء میں بیس 20 سالہ مرید حسین کی شادی محترمہ امیر بانو (متوفی 1943ء) ہمشیرہ چودھری خیر مہدی نمبردار بھلہ سے انجام پائی۔ شادی کے چند روز بعد آپ کو خواب میں جناب سرورِ کونین ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی' جس کا ذکر آپ نے بعد میں اپنے پنجابی کلام میں بھی کیا۔ اس دیدار نے پاک دل وپاکباز مرید حسین کی زندگی میں عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ آپ حضور پاک ﷺ کے فراق میں ہر گھڑی بے چین و بیقرار رہنے لگے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کے الفاظ میں آپ کی یہ کیفیت تھی کہ:

من فارغم از ہر دو جہاں مرا عشق تو بس است

یا یوں سمجھئے کہ حضرت بابا شاہ مراد خانپوری (وفات 1702ء) کی زبان فیض ترجمان میں ۔

عجب توئی کہ ترا حسن بے نظیر آمد
عجب منم کہ مرا عشق در خمیر آمد

کا راگ الاپتے اور کبھی یوں کہتے ۔

جان من از عشق تو!
من در جہاں دیوانہ ام

ادھر آپ کی حالت یہ تھی کہ بقول ولی دکنی ۔

اے نور جان و دیدہ تیرے انتظار میں
مدت ہوئی پلک سوں پلک آشنا نہیں!

ادھر قدرت خداوندی نے آپ کے عشق کی آزمائش کا سامان پیدا کر دیا۔ 1936ء کی بات ہے کہ ایک روز چکوال میں آپ نے روزنامہ ''زمیندار'' میں ''پلول کا گدھا'' کے عنوان سے ایک المناک خبر پڑھی۔ سچے عاشق رسول ﷺ تھے' تن بدن میں آگ لگ گئی اور کیوں نہ لگتی۔ کوئی بھی مسلمان ایسی گستاخی کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ شفاخانہ حیوانات پلول ضلع گوڑ گانواں کے انچارج ڈاکٹر رام گوپال لعین نے انسانیت کے محسن اعظم کی شان میں شرمناک دریدہ دہنی و

گستاخی کرتے ہوئے اپنے شفاخانے کے ایک گدھے کا نام سرورِ کونین ﷺ کے نام نامی اسم گرامی پر رکھنے کی جسارت کر رکھی ہے۔

ہندوستان بھر میں جس جس کلمہ گو نے یہ خبر پڑھی یا سنی اس کا خون کھول اٹھا۔ مسلمانوں کے وہ زخم جو سوامی شردھانند، راج پال لاہوری اور نتھو رام سندھی نے پیغمبر اسلام ﷺ کی شان اقدس میں گستاخیاں کر کے 1933,1929,1926ء میں لگائے تھے ہرے ہو گئے۔ اخبارات میں احتجاجی بیانات کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن سرکار برطانیہ پر صرف اتنا اثر ہوا کہ اس گستاخ زمانہ ڈاکٹر کو پلول سے ہندوؤں کے قصبہ نارنوند ضلع حصار تبدیل کر دیا۔ مسلمانوں کے دل فگار اور آنکھیں اشکبار تھیں۔ وہ اپنا رنج والم کس سے بیان کرتے۔ ہندو اور فرنگی سامراج نے مسلم آزاری اپنا وطیرہ بنا رکھا تھا۔ رہ رہ کر ان کو غازی عبدالرشید، غازی علم دین لاہوری اور کراچی کے غازی عبدالقیوم کی یاد آنے لگی۔ مسلمانوں کی دلآزاری کی مذکورہ خبر پڑھ کر عاشق رسولؐ مرید حسین کی حالت کیا تھی، اس کے کماحقہٗ بیان سے زبانِ قلم قاصر ہے۔ اتنا جانتے ہیں کہ آپ پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہاں کیا کیا راز و نیاز کی باتیں ہوئیں، پیر چاچڑ، مرید بھلہ اور منشی تقدیر کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ صاحبزادہ محمد یعقوب صاحب (موجودہ گدی نشین چاچڑ شریف) نے راقم الحروف کو بتایا ہے کہ مرید حسین حضرت خواجہ صاحبؒ کو مل کر باہر نکلے تو آنسو پونچھ رہے تھے۔ ہم نے ان سے بہتیرا پوچھا لیکن انہوں نے کچھ نہ بتایا اور چاچڑ شریف سے تشریف لے گئے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، رام گوپال مسلمانوں کے شدید احتجاج کی وجہ سے پلول سے نارنوند تبدیل کیا جا چکا تھا۔ آپ اپنے مرشد سے ملتے اور پھرتے پھراتے غریب الوطنی اور بے سروسامانی کے عالم میں سفر کی مشکلات کا مقابلہ کرتے منزل پر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر رام گوپال ہٹا کٹا اور قد آور تھا۔ آپ دبلے پتلے اور نحیف ونزار لیکن عشق رسالتؐ اور جذبہ ایمانی سے انتہائی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رام گوپال کو للکارا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی، ہسپتال کا عملہ اور اس کے بیوی بچے بھی اسے بچانے کے لیے لپکے لیکن آپ نے جان ہتھیلی پر رکھ کر نعرۂ تکبیر بلند کیا اور کہا او موذی اٹھ! "اج محمد دا پروانہ آ گیا ای" یہ کہتے ہوئے چھوٹے سے خنجر کے ایک ہی وار سے محبوب خدا کے دشمنِ ناپاک کو واصل جہنم کر دیا۔ یہ 8 اگست 1936ء کا واقعہ ہے، اس دن آپ مسلمانوں کی نظر میں مرید حسین سے غازی مرید حسین بن گئے۔

رام گوپال کو جہنم رسید کرنے کے بعد آپ نے اپنے آپ کو خود ہی گرفتاری کے لیے پیش کر دیا البتہ اس کے لیے ایک شرط رکھی اور وہ یہ تھی کہ کوئی کافر ان کے قریب نہ آئے چنانچہ نارنوند میں

متعین ایس ایچ او چودھری احمد شاہ کھوٹ (والد بزرگوار چودھری محمد افضل کھوٹ) سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج چکوال دحال سی ایس پی آفیسر و چیف کمشنر رائے شماری حکومت پاکستان نے آپ کو ہتھکڑی پہنائی اور ڈسٹرکٹ جیل حصار بھیج دیئے گئے۔ اخبارات میں پورے ہندوستان کے ہندو پریس نے اس واقعہ کو خوب اچھالا جبکہ پلول کے واقعہ پر اسے سانپ سونگھ گیا تھا!

سرکاری مشینری جو مسلمانانِ ہند کے معاملے میں انتہائی بے حس و حرکت ثابت ہوئی تھی تیزی سے حرکت میں آ گئی۔ حصار میں آپ پر مقدمہ چلایا گیا۔ جلال الدین قریشی بیرسٹرایٹ لاء اور دوسرے متعدد مسلمان وکلاء نے غازی صاحب کی طرف سے مقدمے کی بلافیس وکالت کی۔ قانونی موشگافیوں سے فائدہ اٹھا کر آپ باآسانی بچ سکتے تھے لیکن آپ رسول پاکؐ کے سچے عاشق تھے۔ جھوٹ بول کر جان بچانا شیوۂ مردانگی کے خلاف اور عشقِ رسالت ﷺ کی توہین سمجھتے تھے۔ اس لیے ہر موقع پر رام گوپال کے قتل کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا۔ نتیجۃً آپ کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔

چودھری خیر مہدی صاحب اور دوسرے عزیزوں نے ہائی کورٹ لاہور میں اپیل دائر کی لیکن آپ کے اعتراف قتل کی وجہ سے سیشن کورٹ کا فیصلہ بحال رہا۔

شہادت کا دن مقرر ہونے پر آپ کو اپنے آبائی ضلع جہلم کی جیل میں لایا گیا۔ یہاں ایک غیر مسلم قیدی آپ سے اس قدر متاثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا۔ غازی صاحب نے اس نومسلم کا نام غلام رسول رکھا۔ غلام رسول کو بھی سزائے موت کا حکم ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے وصیت کی کہ اس کی میت جہلم کے مشہور احراری جناب عبداللطیف کے سپرد کی جائے اور وہ اسلامی طریقہ سے اسے جنازہ پڑھ کر جہلم کے قبرستان میں دفنا دیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

شمع محمدی کے پروانے غازی مرید حسین کا یوم شہادت بھی قریب آ گیا۔ آپ جام شہادت نوش کر کے سردار دو جہاں اور فخر کون و مکاں کے حضور حاضری دینے کے لیے بے تاب تھے۔ آخر خدا خدا کر کے 18 رجب المرجب مطابق 24 ستمبر 1937ء جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ صبح کے نو بج رہے تھے کہ عبداللہ کا نورِ نظر اور غلام عائشہ کا لختِ جگر مسکراتا ہوا تختہ دار پر نمودار ہو کر ناموسِ رسالت مآب ﷺ پر قربان ہو گیا۔ شہادت کے قریب آپ کی آخری آرزو کیا تھی؟ آپ ہی کے ایک شعر میں ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:۔

یا الٰہی اس اسیر خستہ جان کو دار پر
خواہش دیدار احمد ﷺ کے دگر کچھ بھی نہیں

شہادت کے بعد تختہ دار پر چڑھانے والوں نے آپ کے لواحقین کو بتایا کہ غازی صاحب

شہادت کے وقت بڑے مطمئن اور مسرور نظر آتے تھے۔ کلمہ شہادت اور درود شریف کا ورد کر رہے تھے کہ آپ کو چپ ہونے کے لیے کہا گیا لیکن آپ نے فرمایا:

''میں اپنا کام کر رہا ہوں' آپ اپنا کام کریں۔''

چنانچہ غازی درود و سلام پڑھتے ہوئے دیکھتے ہی دیکھتے جام شہادت نوش کر کے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

الحاج چودھری حاجی خان صاحب نمبردار ساکن کھوتھیاں (سلطان آباد) تحصیل چکوال جو اس زمانے میں جہلم کچہری کے عرائض نویس تھے' کا بیان ہے کہ جہلم شہر میں مسلمانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ شہر کے علاوہ دور دراز کے دیہات وقصبات سے بھی مسلمان جوق در جوق آئے اور آپ کے جنازے میں شرکت کی۔

جہلم سے بھلہ کریالہ تقریباً بہتر میل ہے۔ اس طویل راستے پر سڑک کے کنارے متعدد مقامات پر فرزندان توحید اور جان نثارانِ رسالت ﷺ نے عاشق خیر الوریٰ پر عقیدت کے پھول نچھاور کیے۔ جہلم کے علاوہ دینہ' سوہاوہ' کھوتھیاں اور بھلہ شریف میں نماز جنازہ پڑھی گئی۔ بھلہ میں جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد شمار سے باہر تھی۔ آخر کار بعد نماز جمعہ تقریباً چار بجے آپ کو بھلہ شریف کے نزدیک ''غازی محل'' میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ حضور ﷺ کے شیدائی نے آپ پر قربان ہو کر عشق کا حق ادا کر دیا۔ اور زندہ جاوید ہو گئے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

غازی محل بھلہ شریف میں ہر سال 18 رجب المرجب کو آپ کا یوم شہادت بڑی عقیدت و احترام سے منایا جاتا ہے۔



غازی مرید حسین شہید

عبداللہ

اس دنیا میں ایسے خوش نصیب ہمیشہ سے موجود رہے ہیں اور آئندہ بھی قیامت تک رہیں گے جن کے دل میں سرکارِ دوعالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی محبت کے سوا اور کسی چیز کا گزر ممکن نہیں ہوتا۔ دنیائے رنگ و بو کی نیرنگیاں' جینے کی بے تاب تمنائیں' بیوی بچے' ماں باپ' عزیز و اقارب' مال و دولت اور خود نعمتِ حیات جیسی دل کش چیزیں ان کے عشق کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتیں۔ اور وہ جذبۂ عشق و مستی سے سرشار ناموسِ مصطفیٰ ﷺ پر قربان ہو کر شہادت کی اعلیٰ ترین سعادت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

انہی میں سے ایک خوش نصیب عاشق رسول کا اسم گرامی مرید حسین ہے۔ موصوف موضع بھلہ کریالہ (چکوال) کے رہنے والے تھے۔ ابھی وہ پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے انہیں گاؤں کی مسجد اور مڈل سکول میں داخل کرا دیا۔ قرآن مجید ناظرہ کی تعلیم سید محمد شاہ صاحب سے حاصل کی۔ 31-1930ء میں میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول چکوال سے اول درجہ میں پاس کیا۔ بڑے تیز اور ذہین طالب علم تھے۔ گھریلو ذمہ داریوں کے علاوہ نمبرداری کے فرائض بھی آن پڑنے سے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بعد میں انہوں نے نمبرداری بھی چھوڑ دی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی کشمکش کی وجہ سے تحریکِ بیداری میں سرگرم حصہ لینا شروع کر دیا۔

مرید حسین، غازی علم الدین شہید اور غازی عبدالقیوم شہید کے کارناموں سے متاثر تھے۔ ایک ہندو راج پال کو ''رنگیلا رسول'' کے عنوان سے ایک گستاخانہ کتاب لکھنے کی وجہ سے غازی علم الدین نے جہنم رسید کر دیا تھا۔ ایک ہندو نتھو رام نے بھی ''ہسٹری آف اسلام'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخیاں کیں۔ اس پر غازی عبدالقیوم شہید نے اسے کراچی کی ایک عدالت میں واصل جہنم کیا۔ موت کی سزا سن کر انہوں نے جج سے کہا۔ یہ جان کس گنتی میں ہے۔ اگر میری ایک لاکھ جانیں بھی ہوتیں تو میں ناموسِ رسالت ﷺ پر نچھاور کر دیتا۔

مرید حسین مولانا ظفر علی خان کا اخبار ''زمیندار بھی پڑھا کرتے تھے'' جس سے وہ ہندو مسلم کشمکش کے واقعات سے باخبر رہتے تھے۔ چنانچہ سیاسی شعور اور دینی لگاؤ کی وجہ سے وہ مشہور خاکسار تحریک میں شامل ہو گئے جس کے راہنما علامہ عنایت اللہ مشرقی تھے۔ مرید حسین، ہندوؤں سے ان کی اسلام دشمنی کی وجہ سے متنفر تو تھے ہی لیکن رسول اکرم ﷺ سے ان دو ہندوؤں کے گستاخانہ رویے کے سبب ان کے دل میں نفرت کی آگ بہت زیادہ بھڑک اٹھی تھی۔ اسی بناء پر انہوں نے ہندوؤں کی بسوں پر سفر کرنا ترک کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے قلب ونظر کے سکون کے لیے ایک مرشد کامل کی تلاش میں نکلے۔ آخر ایک بزرگ حضرت خواجہ محمد عبدالعزیز کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی۔ مرید حسین پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے۔ ماں نے بچپن ہی میں ان کی منگنی چچازاد بہن امیر بانو سے کر دی تھی۔ اور بیٹے کی شادی کی پُرمسرت تقریب دیکھنے کے لیے 1935ء میں ان کی شادی کر ڈالی۔

مرید حسین پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ ان کے دل میں سرورِ کونین ﷺ کی بے پناہ محبت موجزن تھی۔ اس کے نتیجے میں ایک رات خواب میں انہیں سرکارِ دو عالم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضور پاک ﷺ نے حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس مرید کو ایک گستاخِ زمانہ کافر کا حلیہ دکھایا جسے انہوں نے ڈائری میں اچھی طرح نوٹ کر لیا۔ اس واقعہ کے بعد ان کے دل میں زبردست انقلاب آ گیا اور وہ ماہی بے آب کی طرح بے تاب رہنے لگے۔ ایک روز ایک دعوت میں مدعو تھے۔ ابھی چند ہی لقمے کھائے تھے کہ محلّے کی مسجد میں اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔ مرید حسین ہاتھ کا لقمہ وہیں چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میزبان نے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ بولے۔ نماز پڑھنے مسجد کو جا رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ ''یہ سفر تو بڑا طویل اور کٹھن ہے۔'' مرید حسین نے جواب دیا۔ ''اسی لیے میں نے بھی جلدی شروع کیا ہے''

آخر کار قدرت نے اس عاشقِ صادق کو امتحان کا موقع فراہم کر دیا۔ ایک دن ''زمیندار'' اخبار میں ایک خبر ''پلول کا گدھا'' کے عنوان سے شائع ہوئی کہ ہندوستان کے ایک قصبہ پلول ضلع گوڑگانواں کے ایک ہندو رام گوپال نے جو شفاخانہ حیوانات میں ڈاکٹر ہے، ہسپتال کے ایک گدھے کا

نام محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی پر رکھا ہوا ہے۔ (نعوذ باللہ) اس بدذات کی اس شرمناک جسارت کی خبر پورے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی اور مسلمانوں نے آگ بگولہ ہو کر صدائے احتجاج بلند کی۔ جب فساد امن کا خطرہ بڑھا تو مصلحتاً اس ڈاکٹر کا تبادلہ وہاں سے ضلع حصار کے قصبہ نارنوند میں کر دیا گیا۔ مرید حسین پہلے ہی راج پال، نتھو رام اور دوسرے متعصب ہندوؤں کی حرکتوں سے رنجیدہ خاطر رہتے تھے کہ ڈاکٹر رام گوپال کی اس قبیح حرکت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ آپ کی تمام سوچیں اسی ایک نقطہ پر مرکوز ہو گئیں۔ انہوں نے اصرار کر کے ماں سے رخصت کی اجازت لی کہ وہ ایک اہم کام پر جا رہے ہیں۔ بھیرہ پہنچ کر بھائی کو خط لکھا کہ میں ایک ضروری کام پر جا رہا ہوں اس لیے سب کچھ اللہ اور تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ بھیرہ ہی سے ایک دو دھارا خنجر خریدا اور چاچڑ شریف میں اپنے مرشد کے ہاں گئے۔ عرض مدعا کیا، راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ رخصت کے وقت پیر نے مرید کو گلے سے لگایا اور اس کے دل بسمل کی دھڑکنوں کو سنا اور دعا کے طور پر کہا: ''بسلامت روی و باز آئی''

راستے میں مرید حسین پشاور سے رسالپور میں ایک دوست کے پاس آئے، جہاں انہوں نے اپنے کپڑے دھلائی کے لیے دیئے۔ جب کپڑے دھل کر آئے تو انہوں نے پہننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ''یہ کسی ہندو نے دھوئے ہیں۔ ان سے بدبو آ رہی ہے۔ تحقیق پر یہ بات درست ثابت ہوئی، اور اہل نظر نے کہا کہ یہ اس مرد مومن کی صفائی باطن کی دلیل ہے جسے کرامت بھی کہا جا سکتا ہے۔

رسالپور سے واپس گھر پہنچے۔ وہ ایک فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ اس مقام پر کھڑے تھے جہاں ایک طرف بیوہ ماں کی شفقت، وفا شعار بیوی کی محبت، برادری کے بندھن، دنیاوی مصلحتیں، سینکڑوں کنال زمین، لہلہاتے کھیت اور تیار فصلیں تھیں۔ اور دوسری طرف عشق رسول ﷺ کا امتحان تھا۔ عقل سوچتی رہ گئی مگر عشق نے امتحان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ آپ سیدھے چکوال گئے اور ڈاک خانہ سے اپنی جمع شدہ رقم میں سے سات سو روپے نکلوائے (اس زمانہ کے سات سو روپے آج کل کے ستر ہزار سے بھی زیادہ تھے) اور کسی کو بتائے بغیر اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔

چکوال سے آپ پہلے لاہور داتا کی نگری پہنچے، پھر سیدھے دہلی چلے گئے۔ وہاں سے حصار گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر رام گوپال ایک ماہ کی چھٹی پر پشاور چلا گیا ہے۔ آپ پھرتے پھراتے واپس پشاور پہنچ گئے لیکن ڈاکٹر پشاور سے نارنوند جا چکا تھا۔ آپ اس کے تعاقب میں 6 اگست 1936ء کو دوبارہ حصار پہنچ گئے۔ پوچھتے پوچھتے آپ اس ہسپتال جا پہنچے جہاں وہ گستاخ زمانہ رام گوپال متعین تھا۔ اُسے غور سے دیکھا اور مخبر صادق ﷺ کے بتائے ہوئے حلیے کو ڈائری میں دیکھا۔ اسے ہو بہو درست پا کر دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ ڈاکٹر کی رہائش گاہ دیکھی، حالات کا جائزہ لیا۔ پھر کسی

مسلمان کا گھر تلاش کیا۔ ایک مسافر کی حیثیت سے نماز ظہر ادا کی' اور بارگاہ رب العزت میں یہ دعا مانگی:

''میرے اللہ تیرے اس نحیف و نزار اور ناچیز بندے کو اپنے آبائی وطن سے سینکڑوں میل دُور کافروں کی بستی نارنوند میں تیرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جس مقصد کے لیے کھینچ لائی ہے' اس میں کامیابی و کامرانی عطا فرما۔''

اگست کا مہینہ تھا۔ شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر کی رہائش گاہ ہسپتال سے ملحق تھی۔ صحن میں قدم رکھا تو سامنے درختوں کے گھنے سائے میں وہ ملعون سو رہا تھا جس نے کروڑوں مسلمانوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ قریب ہی دوسری چارپائی پر اس کی بیوی کشیدہ کاری میں مصروف تھی۔ بچے کچھ جاگ رہے تھے کچھ سوئے ہوئے تھے۔ ہسپتال کا عملہ سب کا سب ہندو تھا اور وہ بھی زیادہ دور نہ تھا۔

مرید حسین نے جان ہتھیلی پر رکھ کر بے خوف و خطر نعرہ لگایا۔ ''اللہ اکبر'' پھر ملعون کو مخاطب کر کے پکارا۔ ''او گستاخ زمانہ کافر اُٹھ۔ آج محمد کا پروانہ آ ہی گیا ہے۔'' بیوی نے بھی شوہر سے کہا۔ ''رام گوپالا۔ اٹھ کوئی مُسلہ آ گیا ہے۔ رام گوپال آنکھیں ملتا اور دھوتی سنبھالتا اٹھا۔ بیوی اور نوکر چاکر مرید حسین کو پکڑنے کے لیے لپکے مگر انہوں نے آن کی آن میں خنجر موذی کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ وہ دھڑام سے ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا۔ انہوں نے خنجر قریبی تالاب میں پھینک دیا اور خود بھی اس میں چھلانگ لگا کر تیرنے لگے۔

پولیس کی جمعیت نے تالاب کو گھیرے میں لے لیا۔ غازی مرید حسین نے پوچھا۔ ''تم میں کوئی مسلمان ہے؟'' اتفاق سے مقامی تھانیدار مسٹر احمد شاہ کھوٹ تھا۔ اس نے کہا: ''میں مسلمان ہوں۔'' مرید حسین تالاب سے باہر آئے اور خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرتے ہوئے کہا ''میرا نام عاشقِ رسولؐ '' ہے۔ میں نے ہی اس ڈاکو قتل کیا ہے' جس نے کروڑوں مسلمانوں کے دلوں پر ڈاکہ ڈال کر ان کا امن و سکون لوٹ لیا تھا۔

اخبارات سے اطلاع پاتے ہی غازی صاحب کی والدہ' بھائی اور چودھری محمد بخش حصار پہنچے۔ پھر 12 اگست 1936ء کی صبح کو حصار ڈسٹرکٹ جیل میں غازی صاحب سے ملاقات کی۔ غازی صاحب نے انہیں دیکھتے ہی کہا: ''آپ کو مبارک ہو۔ وہ اہم کام جس کا میں ذکر کیا کرتا تھا' وہ خدا کے فضل و کرم سے ہو گیا ہے۔

مقدمے کی پیروی کے لیے ان کے بھائی لاہور سے حصار کے ایک مشہور وکیل بیرسٹر جلال الدین قریشی کے نام زمیندار اخبار کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان کے فرزند اختر علی خان کا ایک خط لے گئے تھے۔ اس کے ذکر پر غازی صاحب نے کہا۔ ''مجھے وکیل کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا وکیل تو اللہ تعالیٰ

ہے۔'' قریشی صاحب سے وکالت کی گفتگو ہو رہی تھی' جو غالباً اپنی انتخابی مصروفیات کی وجہ سے مقدمہ کی پیروی کے لیے تیار نہ تھے۔ اتنے میں ایک بزرگ صورت مولوی صاحب تشریف لائے۔ قریشی صاحب نے تعارف کراتے ہوئے کہا: مولانا یہ لوگ چکوال سے آئے ہیں اور ''بدقسمت'' ملزم کے لواحقین ہیں جس نے ڈاکٹر رام گوپال کو نارنوند میں قتل کر دیا ہے۔ یہ سن کر مولوی صاحب سخت جلال میں آ گئے۔ اور کہا ''جلال الدین صاحب بدقسمت آپ ہیں' بدقسمت میں ہوں' بدقسمت ہمارا سارا علاقہ ہے۔ بدقسمت ہندوستان کے کروڑوں مسلمان ہیں کہ جن کی موجودگی میں گستاخ زمانہ رام گوپال دندناتا پھرتا رہا۔ بدقسمت اور بے غیرت تو ہم ہیں۔ ان کی خوش قسمتی میں کسے کلام ہوسکتا ہے جن کے نامور فرزند نے یہاں سے سینکڑوں میل دور علاقہ چکوال سے آ کر ناموس رسالت کی حفاظت کا حق ادا کر دیا ہے۔ کیا یہ ہر مسلمان کا فرض نہیں کہ وہ حبیب کبریا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والے کو حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالے؟''

قریشی صاحب نے مولوی صاحب کے چلے جانے کے بعد بتایا کہ وہ سرسہ کے ممتاز عالم دین تھے جو انتخاب کے سلسلے میں ان سے بات چیت کرنے آئے تھے۔ مولوی صاحب کی اس سرزنش اور ڈانٹ کا یہ نتیجہ نکلا کہ قریشی صاحب نے بلا معاوضہ مقدمے کی پیروی کا ذمہ لے لیا۔ ان کے علاوہ پانچ دوسرے وکیلوں نے بھی کہا کہ وہ بھی بلا معاوضہ ان کی مدد کریں گے۔

حصار کی ضلع کچہری میں مقدمے کی سماعت ایک مجسٹریٹ پنڈت لکشمی دت کے ہاں شروع ہوئی لیکن ابتدائی سماعت کے بعد اس نے جلد ہی مقدمہ سیشن سپرد کر دیا۔ ایک روز کارروائی جاری تھی کہ مرید حسین نے کہا کہ ظہر کی نماز کے لیے مصلے اور پانی کا بندوبست کیا جائے۔ جج نے کہا یہ عدالت ہے: مرید حسین نے کہا ''میں خالق کائنات کی عدالت میں حاضری دینا چاہتا ہوں'' چنانچہ ان کی بات مان لی گئی اور عین عدالت میں انہوں نے نماز گزاری اور آئندہ اس کا انتظام خود بخود کر دیا جاتا رہا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوتے تو کارروائی دوبارہ شروع کر دی جاتی۔ تین دن کی سماعت کے بعد چوتھے دن فیصلہ سناتے ہوئے جج نے کہا۔ ''میں تمہیں سزائے موت دیتا ہوں۔'' لیکن ایک درخواست کے نتیجے میں مقدمے کی دوبارہ سماعت کی گئی مگر سزائے موت برقرار رہی۔ اس پر ہائی کورٹ میں اپیل کی سماعت کی گئی' اس نے بھی اپیل خارج کر کے سزائے موت بحال رکھی۔

جیل کی جس کوٹھڑی میں غازی صاحب تھے ان کے ساتھ والی کوٹھڑی میں قتل کا ایک ہندو مجرم قید تھا۔ وہ غازی صاحب کی عبادت گزاری' شرافت اور بے باکی سے متاثر تھا۔ ایک دن دیکھا کہ غازی صاحب کا کمرہ نور سے منور ہے۔ وہ حیران اور ششدر ہو کر بولا۔ میری بھی کچھ راہنمائی کریں کہ

میں آپ کا پڑوسی ہوں۔ غازی صاحب نے کہا تیری راہنمائی تب ہو سکتی ہے کہ تُو مسلمان ہو جائے۔ ہندو قیدی نے کہا۔ میں روشنی کا طالب ہوں۔ آپ جو چاہیں کریں۔ غازی صاحب کے کہنے پر ہندو نے کلمہ طیبہ پڑھ کر خدا کا پسندیدہ دین اسلام قبول کر لیا۔ غازی صاحب نے اس کا نام ''غلام رسول'' رکھا۔

آخری ملاقات پر ماں نے بیٹے سے کہا کہ پھانسی کا پھندا وہ خود اپنے گلے میں ڈالے' کوئی بھنگی وغیرہ نہ ڈالے۔ غازی صاحب نے کہا ''ماں جی۔ ٹھیک ہے! آخر خدا خدا کر کے 24 ستمبر 1937ء بمطابق 18 رجب 1356ء جمعۃ المبارک کی وہ صبح آ پہنچی' غازی مرید حسین جس کا انتظار بڑی بے تابی سے ایک مدت سے کر رہے تھے۔ جیل سے باہر عاشقِ رسولؐ کے عاشقوں کا ایک جم غفیر جمع تھا اور جیل کے اندر پروانہ رسالتؐ 'شمع رسالتؐ' پر جل مرنے کو بے تاب۔ جب شہادت کا وقت آیا تو آپ درود شریف پڑھ رہے تھے۔ ڈپٹی مجسٹریٹ نے کہا ''زبان کو حرکت نہ دیں۔'' انہوں نے کہا میں اپنا کام کر رہا ہوں' آپ اپنا کام کریں۔ کہتے ہیں کہ ایک خفیف سے جھٹکے اور یادگار مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہی دیکھتے آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ عشق کی ایک ہی جست سے طویل سفر لمحوں میں طے ہو گیا اور غازی مرید حسین اگلی دنیا میں شہیدوں کی صفوں میں جا ملے اور حیاتِ دوام اور رضائے حق کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔

؎ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را



واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

غازی میاں محمد شہیدؒ

ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی

ضلع چکوال کی سرزمین اس لحاظ سے بڑی خوش قسمت ہے کہ اس صدی کے ربع اوّل میں اس نے دو عظیم جان نثارانِ رسول ﷺ پیدا کیے۔ پہلا عاشق رسول ﷺ غازی مرید حسین شہید ہے' جس نے 8 اگست 1936ء کو ایک کمینہ خصلت گستاخ رسولؐ رام گوپال کو اس کے انجام تک پہنچایا' اور دوسرا فدائی مصطفیٰ ﷺ غازی میاں محمد شہید ہے جس نے چرن داس نامی ایک مردود ڈوگرے سپاہی کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ حرمت رسولؐ پر قربان ہونے والے ان دونوں خوش قسمتوں کو شہادت کا عظیم رتبہ حاصل ہوا۔ آج اس مبارک صحبت میں ثانی الذکر (غازی میاں شہیدؒ) کا ذکر جمیل مقصود ہے۔

میاں محمد 1915ء میں قصبہ تلہ گنگ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام نامی صوبیدار غلام محمد تھا' جو اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم چھڑی تو صوبیدار غلام محمد کو اپنی پلٹن کے ساتھ ملک سے باہر جانا پڑا۔ اسی دوران میاں محمد پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد عراق میں تھے۔ بیٹے کی ولادت کی خبر سنی تو جی چاہا کہ فوراً اُڑ کر تلہ گنگ پہنچیں اور نومولود کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں' کیونکہ یہ بچہ شادی کے سات سال بعد بڑی دعاؤں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ لیکن اللہ کا کرنا صوبیدار غلام محمد 1919ء تک جنگ کے اختتام تک وطن واپس نہ آسکے۔ اس عرصہ میں وہ اپنی پلٹن کے ساتھ عراق' شام' فلسطین اور استنبول وغیرہ میں فوجی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

میاں محمد پانچ سال کے تھے کہ ان کے والد ماجد گھر لوٹے اور پہلی بار اپنے جگر گوشہ کو دیکھا۔

بار بار گود میں اٹھاتے اور پیار کرتے۔ پھر چند روز بعد انہیں پرائمری سکول میں داخل کرا دیا۔ پرائمری کے بعد وہ ہائی سکول میں داخل ہو گئے' لیکن ساتویں جماعت تک پڑھنے کے بعد ان کا جی تعلیم سے اچاٹ ہو گیا۔ 15 سال کے ہوئے تو ڈرائیوری سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازم ہو گئے اور تلہ گنگ سے میانوالی جانے والی ایک بس چلانے لگے' لیکن بہت جلد اس سے بھی جی بھر گیا۔ 1931ء میں کوئٹہ چلے گئے اور ایک ٹھیکیدار کے ساتھ بطور منشی کام کرنے لگے۔ یہ کام بھی پسند نہ آیا تو 1932ء میں گاؤں واپس آ گئے۔ 1933ء میں انڈین نیوی میں بھرتی ہو گئے۔ اسی ملازمت کے دوران پھوپھی زاد بہن ''نیک اختر'' کے ساتھ ان کی شادی ہو گئی۔ انڈین نیوی میں نوکری کرتے ابھی بمشکل ڈیڑھ برس ہی گزرا تھا کہ کھیل کے دوران ایک ساتھی کی بدکلامی کی وجہ سے بگڑ گئے اور ہاکی سے اسے پیٹ ڈالا۔ آرمی ایکٹ کے تحت مقدمہ چلا اور وہ ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے۔

2 جنوری 1935ء کو وہ بلوچ رجمنٹ میں بطور سپاہی بھرتی ہوئے اور ابتدائی ٹریننگ کراچی میں مکمل کرنے کے بعد اسی سال اکتوبر میں مدراس چھاؤنی بھیج دیئے گئے۔ اصل میں یہی وہ جگہ تھی جہاں قدرت نے ان سے ایک غیر معمولی کام لینا تھا اور جس کے لیے وہ مختلف مقامات پر پھرتے پھراتے بالآخر یہاں پہنچے تھے۔

میاں محمد کو بچپن ہی سے آنحضورﷺ کی ذات گرامی سے والہانہ لگاؤ تھا' انہیں بہت سی نعتیں یاد تھیں' جنہیں وہ اکثر تنہائی میں یار دوستوں میں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ وہ بڑے خوبصورت جوان تھے اور ہمیشہ نفیس اور عمدہ لباس زیب تن کیے رہتے۔ ان کو دیکھنے والوں نے ان کا حلیہ کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔ لمبا قد' دلکش خدوخال' سرخ و سپید رنگ' باریک ہونٹ' گھنی بھویں' ناک معیارِ حسن کے عین مطابق' پیشانی چوڑی' آنکھیں چمکدار' خوبصورت سی چھوٹی داڑھی اور خاص ادا کی مونچھیں جن سے مردانہ وجاہت ٹپکتی تھی۔ سر پر کلاہ اور خوبصورت پگڑی۔ غرض پیکرِ حسن تھے۔

16 مئی 1937ء کی شب کا ابھی آغاز ہوا تھا۔ مدراس چھاؤنی میں ڈیوٹی سے فارغ فوجی سپاہی مختلف گروپوں میں بیٹھے' خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ انہی میں ایک طرف چند مسلمان نعت رسول کریم ﷺ سننے میں محو تھے۔ اتفاق سے جو شخص نعت شریف سنا رہا تھا' وہ ایک ہندو تھا' یہ بڑی خوش الحانی اور عقیدت مندی کے ساتھ نعت سرا تھا۔ قریب ہی ایک ہندو ڈوگرے سپاہی نے جب ایک ہندو کو اس طرح عقیدت مندی کے ساتھ نعت پڑھتے سنا تو وہ مارے تعصب کے جل کر کباب ہو گیا۔ اس نے باآواز بلند آنحضورﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کرتے ہوئے نعت پڑھنے والے ہندو سے مخاطب ہو کر کہا:

''محمدؐ کو...... کر۔ کسی اور کا ذکر کرو۔ تُو کیسا ہندو ہے۔ تُو تو ہندو دھرم کا مجرم ہے۔ تیرا پاپ معاف نہیں کیا جا سکتا۔''

مسلمان سپاہیوں نے ڈوگرہ سپاہی کی یہ بدزبانی سنی، تو صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئے، لیکن میاں محمد اپنے آقا کی شان میں یہ گستاخی سن کر تڑپ اٹھے اور ڈوگرہ سپاہی سے کہا: تیرے ہم مذہب کو یہ سعادت نصیب ہوئی ہے کہ وہ حضور محمد ﷺ کے نامِ مبارک سے اطمینانِ قلبی حاصل کرے، اس لیے وہ گا کر سرکار ﷺ کی نعت پڑھ رہا ہے، تجھے اپنے خبث باطن کی وجہ سے یہ بات پسند نہیں، تو تُو یہاں سے چلا جا۔ خبردار آئندہ ایسی بکواس نہ کرنا۔''

یہ سن کر ڈوگرہ سپاہی بولا: ''میں تو بار بار ایسا ہی کہوں گا۔ تم سے جو ہو سکتا ہے، کر لو۔'' یہ بیہودہ جواب سن کر میاں محمد کا خون کھول اٹھا۔ ایک ہندو ڈوگرے نے ان کی حمیتِ ایمانی کو للکارا تھا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا: ''آئندہ اپنی ناپاک زبان سے ہمارے نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کا جملہ کہنے کی جرأت نہ کرنا، ورنہ یہ بدتمیزی تجھے بہت جلد ذلت ناک موت سے دوچار کر دے گی۔''

بدقسمت ڈوگرے سپاہی نے پھر ویسا ہی تکلیف دہ جواب دیا اور کہا ''مجھے ایسی گستاخی سے روکنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔'' یہ سن کر میاں محمد سیدھے اپنے حوالدار کے پاس گئے، یہ بھی ہندو تھا۔ آپ نے اس سے تمام واقعہ بیان کیا اور کہا اگر چرن داس (ہندو ڈوگرہ) نے برسرِ عام معافی نہ مانگی، تو اپنی زندگی سے کھیلنا مجھ پر فرض ہو جاتا ہے۔

ہندو حوالدار نے اس نازک مسئلے پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ صرف یہی کہا کہ میں چرن داس کو سمجھا دوں گا۔

میاں محمد حوالدار کی یہ سرد مہری دیکھ کر سیدھے اپنی بیرک میں پہنچے۔ اب وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کر چکے تھے۔ انہوں نے نماز عشاء ادا کی اور پھر سجدے میں جا کر گڑگڑاتے ہوئے دعا کی: ''میرے اللہ! میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ تیرے محبوب کی شان میں گستاخی کرنے والے کا کام تمام کر دوں۔ یا اللہ! مجھے حوصلہ عطا فرما۔ ثابت قدم رکھ۔ مجھے بھی اپنے محبوب کے عاشقوں میں شامل کر لے۔ میری قربانی منظور فرما لے۔''

نماز سے فارغ ہو کر میاں محمد گارڈ روم گئے۔ اپنی رائفل نکالی۔ میگزین لوڈ کیا اور باہر نکلتے ہی چرن داس کو للکار کر کہا: کم بخت اب بتا، نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے پر، میں باز پرس کا حق رکھتا ہوں یا نہیں۔''

یہ سن کر شاتمِ رسولؐ چرن داس۔ نے بھی جو بندوق اٹھائے ڈیوٹی دے رہا تھا' پوزیشن سنبھالی اور رائفل کا رخ میاں محمد کی طرف موڑا' لیکن اگلے ہی لمحے ناموسِ رسالت ﷺ کے شیدائی کی گولی چرن داس کو ڈھیر کر چکی تھی۔ رائفل کی دس گولیاں اس کے جسم سے پار کرنے کے بعد غازی میاں محمد نے سنگین کی نوک سے اس کے منہ پر پے در پے وار کیے۔ سنگین سے وار کرتے ہوئے وہ کہتے جاتے تھے:
اس ناپاک منہ سے تو نے میرے پیارے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی کی تھی۔

جب غازی کو مردود چرن داس کے جہنم واصل ہونے کا یقین ہوگیا' تو انہوں نے اپنے ہاتھ سے خطرے کی گھنٹی بجائی اور بگلر سے کہا کہ وہ مسلسل بگل بجائے۔ جب سب پلٹن جمع ہوگئی تو غازی نے کمانڈنگ افسر سے کہا کہ کسی مسلمان افسر کو بھجوا تاکہ میں رائفل پھینک کر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردوں۔ آپ کی گرفتاری کے لیے آپ ہی کے علاقے کے ایک مسلمان جمعدار عباس خاں کو بھیجا گیا۔ گرفتاری کے بعد انگریز کمانڈنگ افسر نے غازی موصوف سے پوچھا: آپ نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے جواب دیا: چرن داس نے ہمارے رسول اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی اور بدکلامی کی تھی۔ میں نے اس کو روکا' لیکن وہ باز نہ آیا۔ میں نے اس کو ہلاک کر دیا۔ اب آپ قانونی تقاضے پورے کریں۔''

اگلے روز 17 مئی 1937ء کو غازی میاں محمد کو مقدمے کی تفتیش کے لیے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ ابھی آپ دس دن پولیس کی حراست میں رہے تھے کہ کمانڈر انچیف (جی ایچ کیو دہلی) کا حکم آیا کہ میاں محمد پر فوجی قانون کے تحت مقدمہ چلایا جائے۔ غالباً حکام کو خدشہ تھا کہ شاید سول عدالت میں مقدمہ کا فیصلہ حکومت کی منشا کے خلاف ہو۔

فوجی حکام کی خواہش تھی کہ مقدمے کے فیصلے تک غازی صاحب کے والدین کو کوئی اطلاع نہ دی جائے' لیکن صوبیدار ملک غلام محمد کو کسی طرح فوجی حکام کی اس سازش کی اطلاع ہوگئی اور وہ فوراً مدراس پہنچ گئے۔ عدالتی چارہ جوئی اور مقدمے کے پیچیدگیوں سے نپٹنے کے لیے مدراس کے معروف مسلمان ایڈووکیٹ سید نور حسین شاہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ نور حسین شاہ نے قانون کا امتحان لندن سے پاس کیا تھا اور ایک عرصہ تک وہیں پریکٹس بھی کی تھی' انہوں نے بڑی دیانتداری اور فرض شناسی سے اس عظیم کام کا آغاز کیا' لیکن کیس ابھی ابتدائی مراحل میں تھا کہ کسی سنگ دل نے محافظ کی موجودگی میں ایڈووکیٹ موصوف کو چھرا گھونپ دیا۔ زخم کاری اور مہلک تھا' جس سے وہ رحلت کر گئے۔

ان کے بعد یہ مقدمہ اصغر علی ایڈووکیٹ نے اپنے ہاتھ میں لیا' یہ بھی لندن کے تعلیم یافتہ تھے' انہوں نے بھی بڑی جانفشانی اور لگن کے ساتھ کیس کی تیاری میں حصہ لیا اور پیشیوں کے معاوضہ میں کبھی کسی رقم کا مطالبہ نہ کیا۔ فوجی حکام چاہتے تھے کہ غازی صاحب کو ذہنی مریض قرار دے کر سزا دی جائے

تاکہ کیس کو مذہبی رنگ بھی نہ ملے اور ہندو بھی خوش ہو جائیں۔ اس مقصد کے تحت غازی صاحب کو گورنمنٹ مینٹل ہسپتال مدراس میں داخل کر دیا گیا۔ ایک ماہ بعد ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ میں نے پورا مہینہ میاں محمد کو اپنی خصوصی نگرانی میں رکھا ہے' نفسیاتی جائزہ بھی لیا ہے' کئی بار چھپ کر بھی معائنہ کیا ہے۔ لیکن اس عرصہ میں ایک بار بھی میں نے انہیں فکرمند یا کسی سوچ میں گم نہیں پایا (جیسا کہ پاگل اکثر گم سم رہتے ہیں) ایک ماہ میں ان کا وزن بھی بڑھ گیا ہے' اگر ان کو یہ فکر ہوتی کہ قتل کے مقدمہ میں میرا کیا حشر ہوگا' تو ان کا وزن کم ہو جاتا۔ یہ کسی غم و فکر میں مبتلا نہیں۔ جب چرن داس ایک ہی گولی لگنے سے مر گیا تھا تو پھر ساری گولیاں چلانے اور سنگین سے پے بہ پے زخم لگانے کی ضرورت نہ تھی' اور ایسی حالت میں جبکہ کوئی دیکھنے والا بھی نہ تھا۔ یہ آسانی سے فرار بھی ہو سکتے تھے' لیکن ایسا نہیں کیا گیا' میرا میڈیکل تجزیہ یہی بتاتا ہے کہ میاں محمد نے قتل کا ارتکاب مذہبی جذبات برانگیختہ ہونے کی وجہ سے کیا ہے۔

16 اگست کو غازی صاحب کا جنرل کورٹ مارشل شروع ہوا۔ پانچ دن کارروائی ہوتی رہی۔ کل اٹھارہ گواہوں کے بیانات قلمبند ہوئے۔ تین ڈاکٹروں کی شہادت بھی ریکارڈ پر آئی۔ جرح کے دوران انہوں نے یہ متفقہ موقف اختیار کیا کہ غازی محمد نے جو کچھ کیا ہے' ہماری رائے میں وقوعہ کے وقت وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکا۔ لیکن غازی صاحب اپنے ابتدائی بیان پر ڈٹے رہے اور کہا: میں نے جو کچھ کیا ہے' خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ یہی میرا فرض تھا۔ چرن داس نے میرے آقا و مولیٰ ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کی تھی۔"

کورٹ مارشل کے دوران ان کے وکیل نے رائے دی کہ وہ یہ بیان دیں کہ میں نے گولی اپنی جان بچانے کی غرض سے چلائی تھی' کیونکہ چرن داس بھی مجھ پر حملہ کرنا چاہتا تھا' لیکن غازی نے سختی کے ساتھ اس تجویز کو مسترد کر دیا اور کہا کہ میری ایک جان تو کیا' ایسی ہزاروں جانیں بھی ہوں' تو سرکارِ دو عالم ﷺ کی حرمت پر نچھاور کر دوں۔

میرے ہزار دل ہوں تصدق حضور ﷺ پر
میری ہزار جان ہو قربانِ مصطفیٰ ﷺ

23 ستمبر 1937ء کو پلٹن میں غازی میاں محمد کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا' جس کا جواب غازی نے مسکرا کر دیا۔

محمد ﷺ کی محبت دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

5 اکتوبر 1937ء کو وائسرائے ہند کے پاس اپیل کی گئی' جو مسترد ہو گئی۔ پھر پریوی کونسل لندن میں اپیل دائر کی گئی جو مختصر سماعت کے بعد رد کر دی گئی۔ اپیلیں مسترد ہو جانے کے بعد فوجی حکام نے 12 اپریل 1938ء کو سزا پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا۔ ادھر حراست میں غازی کا معمول تھا کہ نماز کے علاوہ ہمہ وقت قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول رہتے۔ اس دوران رمضان شریف کا مہینہ آیا' جو انہوں نے جاگ کر گزارا۔ وہ رات دن نوافل اور درود شریف پڑھتے۔ عید کے روز غازی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ عید کی نماز عید گاہ میں مسلمانوں کے ساتھ پڑھنا چاہتے ہیں۔ بڑی رد و قدح کے بعد جیل کے چند غیرت مند مسلمان فوجی افسروں کی ضمانت پر حکام نے اس کی اجازت دی۔ غازی کی سزائے موت کی خبر اب تک پورے ہندوستان میں مشہور ہو چکی تھی' حکام نے بہت کوشش کی کہ نماز عید کے موقع پر مسلمانوں کو غازی کی آمد کا علم نہ ہو' لیکن عید گاہ میں موجود نمازیوں کو اس کا علم ہو گیا۔ نقصِ امن کا خطرہ پیدا ہونے لگا تو غازی موصوف کھڑے ہو گئے اور مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''پیارے بھائیو! اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرو۔ آپس میں بھائیوں کی طرح اور پُرامن رہو۔ میں پیارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ مجھ میں اس کے سوا کوئی خوبی نہیں کہ میرے ہاتھوں سے شانِ رسولؐ پر ناروا حملہ کرنے والے ایک مردود کو قرار واقعی سزا ملی ہے۔ تاجدارِ مدینہؐ کی شان میں ذرا سی توہین بھی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ آئندہ بھی کسی گستاخ نے یہ حرکت کی تو ناموس رسالت ﷺ پر فدا ہونے کے لیے ہزاروں جان نثار مقتل کی طرف بڑھیں گے۔ تمام بھائی دعا کریں کہ اللہ کریم راضی ہو' اور بارگاہِ رسالت ﷺ میں مجھ ناچیز کی جان جیسی یہ حقیر قربانی قبول ہو جائے۔''

آخری تحریر:

شہادت سے چار روز قبل (7 اپریل 1938ء) کو غازی میاں محمد نے اپنے حقیقی بھائی ملک نور محمد کو ایک خط لکھا' اس میں بعض وصیتیں بھی لکھیں۔ آپ نے لکھا: خداوند کریم کی رضا پر راضی رہنا۔ ہر حال میں صبر کرنا۔ کسی پر تمہارا غم ظاہر نہ ہو۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرا دل اس قدر خوش ہے کہ جس کا اندازہ کوئی دوسرا آدمی نہیں کر سکتا' میری دلی آرزو یہی تھی' جو اللہ کریم نے پوری کر دی۔ میں گناہ کے سمندر میں غرق تھا کہ میرے مالک نے اپنی رحمت کے دروازے کھول دیئے۔ اس مالک کی مہربانی کا ہزار ہزار شکریہ۔ (پھر اپنی اہلیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا) بندہ کی عیال (بیوی) کو واضح ہو کہ میں آپ سے نہایت خوش اور راضی ہوں۔ تم نے کبھی کوئی ایسی غلطی نہیں کی' جس کے لیے تمہیں معافی کا خواستگار رہنا

پڑے۔ میری شہادت پر بجائے رونے دھونے کے اپنے رب کو یاد کرنا۔ نماز پڑھنا۔ اپنے رب کی بندگی کرنا اور میرے لیے بخشش کی دعا کرنا۔

تختہ دار پر

پھانسی کے انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے 3/10 بلوچ رجمنٹ کا ایک افسر کراچی سے مدراس پہنچا۔ اس نے غازی صاحب سے پوچھا' کوئی آخری خواہش ہو تو بتاؤ۔ فرمایا: ساقی کوثر کے ہاتھوں سے جام پی کر سیراب ہونا چاہتا ہوں۔

غازی صاحب کا باڈی گارڈ دستہ چھ سپاہیوں' ایک انگریز افسر اور بیرے پر مشتمل تھا جن لوگوں نے آخری وقت آپ کی زیارت کی' ان کا کہنا ہے کہ چہرے پر سرور کی تازگی اور آنکھوں میں خمار کی چمک پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی تھی۔ والدین سے آخری ملاقات میں ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ والدہ اپنے تیئس سالہ جواں سال بیٹے کا دیوانہ وار کبھی سر چومتیں' کبھی منہ' والد نے بہ ہزار مشکل اپنے آپ کو سنبھالے رکھا' اسی رات 11 اپریل کو انہیں مدراس سول جیل لے جایا گیا۔ رات بھر آپ عبادت میں مشغول رہے۔ تہجد کے بعد غسل فرمایا۔ سفید لباس زیب تن کیا۔ نماز فجر ادا کی۔ پھر آپ کو تختہ دار کی طرف لے جایا گیا۔ تختہ دار پر کھڑے ہوتے ہی آپ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ پھر مدینہ منورہ کی طرف رخ کر کے فرمایا: سرکار ﷺ میں حاضر ہوں۔ پھانسی کا پھندہ آپ کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ تختہ دار کھینچ دیا گیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ کے چہرہ پر برستا ہوا نور کچھ اور فزوں ہوگیا۔ فضا کی عطر بیزی کچھ اور بڑھ گئی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے کہا: بے قرار روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

اگلے ہی لمحے ساقی کوثر کا دیوانہ حوض کوثر کے کنارے اپنی پیاس بجھا رہا تھا۔ یہ 12 اپریل 1938ء کی صبح تھی۔ وقت پانچ بج کر پینتالیس منٹ۔



غازی میاں محمد شہیدؒ

عبداللہ

غازی میاں محمد شہید، رسولِ اکرم ﷺ کے ایک عاشق صادق کا نام ہے جس کی خوش نصیبی پوری ملت اسلامیہ کے لیے باعث فخر و مسرت ہے۔ موصوف کا دل سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے پوری طرح سرشار تھا۔ اسی جذبۂ محبت، حسن نیت اور حسن عمل کے طفیل کارسازِ مطلق نے اسے ناموس مصطفےٰ ﷺ پر قربان ہو جانے کی توفیق بخشی اور وہ نقد جاں کی قربانی دے کر شہادت کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچا۔ "میاں محمد" کے نام نامی کو ایک طرف سے غازی اور دوسری طرف سے شہید کے اعزازات نے گھیر رکھا ہے۔ یعنی وہ نہ صرف حق و باطل کے معرکے میں فتح یاب ہوا بلکہ حیاتِ دوام کے عالی منصب پر بھی فائز ہوا۔ اسلام میں یہی دو بڑے اعزازات ہیں جو بڑے فخر و ناز سے مجاہدینِ اسلام کو دیئے جاتے ہیں۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں لڑ کر فتح حاصل کرنے والے کو غازی اور معرکے میں کام آنے والے کو شہید کہتے ہیں۔ یہ دونوں اعزاز کسی خوش بخت اللہ والے ہی کے نصیب میں آتے ہیں۔

میاں محمد نے جب ایک گستاخ رسولؐ کی چرب زبانی کی اذیت ناک خبر سنی تو اس کی دینی اور ملی غیرت جوش میں آ گئی۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ اور ماہی بے آب کی طرح بے تاب رہنے لگا کہ کب اس دشمن رسولؐ کا کام تمام کرے اور کب اپنے دل کی بھڑاس نکالے۔ وہ اس کے کھوج میں نکل پڑا۔ آخر

جویندہ یابندہ کے تحت اس نے اس ملعون کو ڈھونڈ نکالا اور اپنی خواہش کے مطابق اسے جہنم رسید کر کے غازی کہلایا۔ پھر ہنستے کھیلتے تختۂ دار پر چڑھ کر شہادت کا عظیم مرتبہ حاصل کیا۔ یہ منزل بڑی کٹھن، طویل اور دشوار گزار ہے مگر عاشقانِ صادق اسے کھیل سمجھ کر آتشِ نمرود میں کود پڑتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک شہادت کا مقام نبیینؑ اور صدیقین کے بعد تیسرے درجے پر آتا ہے جو پوری ملت کے لیے مایۂ افتخار سمجھا جاتا ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

شمع رسالت ﷺ پر قربان ہونے والا یہ پروانہ فوجی تھا۔ اس کا تعلق 3/10 بلوچ رجمنٹ سے تھا۔ اس کے والد صوبیدار غلام محمد پنشنر تھے۔ وہ اعوان برادری کے چشم و چراغ تھے۔ قصبہ تلہ گنگ ضلع اٹک جیسے مردم خیز خطے میں پیدا ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر ان کی عمر پانچ برس تھی۔ ابتدائی تعلیم ساتویں جماعت تک گاؤں ہی کے سکول میں حاصل کی۔ پھر تعلیم سے جی اچاٹ ہو گیا۔ جوان ہوئے تو ڈرائیوری کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن اس میں بھی جی نہ لگا۔ 1931ء میں کوئٹہ چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ ایک ٹھیکیدار کے منشی رہے۔ لیکن یہ ماحول بھی پسند نہ آیا۔ 1933ء میں انڈین نیوی میں بھرتی ہو گئے۔ اسی ملازمت کے دوران سترہ سال کی عمر میں رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئے۔ نیوی کی ملازمت بمشکل ڈیڑھ سال ہوئی تھی کہ کھیل کے دوران کسی ساتھی کی بدکلامی پر بگڑ گئے اور اسے ہاکی سے پیٹ ڈالا۔ آرمی ایکٹ کے مطابق مقدمہ چلا۔ تین سال قید بامشقت کی سزا ہوئی اور ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے۔ اس کے بعد ایک سال گھر رہے، پھر اپنے والد کے مشورے سے 2 جنوری 1935ء کو بلوچ رجمنٹ میں سپاہی بھرتی ہو گئے۔ ابتدائی فوجی تربیت کراچی میں مکمل کی اور اسی سال مدراس بھیج دیئے گئے۔ وہاں پر سینٹ تھامس ماؤنٹ کے نام سے مشہور چھاؤنی میں مقیم 3/10 بلوچ رجمنٹ سے جا ملے۔

کراچی میں تربیت کے عرصہ کے دوران قدرت نے ان سے جو کام لینا تھا۔ اس کی ایک جھلک انہیں دکھا دی تاکہ مستقبل میں پیش آنے والی کٹھن منزل کی سمت متعین ہو سکے۔ 16 مارچ 1935ء کو جب کراچی کی سرزمین شہیدوں کے لہو سے لالہ زار بنی تو میاں محمد نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہی نہیں بلکہ حرمت رسول مقبول ﷺ پر قربان ہونے والوں کی عزت افزائی کا بھی بھرپور نظارہ کیا۔ غازی عبدالقیوم شہید نے 20 ستمبر 1934ء کو اپنی وفاؤں کا پہلا روشن اور زریں باب کراچی میں رقم کیا۔ نبی کریم ﷺ کی حرمت پر قربان ہو جانے کی راہ میں غازی عبدالقیوم مسلمانان ہند کے

دلوں کی دھڑکن بنا ہوا تھا۔ کراچی میں چھ ماہ کے قیام کے دوران وہ اس واقعہ سے بے حد متاثر ہوئے۔ کیونکہ وہ ایک ہی منزل کے راہی تھے۔ اور ان میں مقصد کی یکسانی اور ذہنی ہم آہنگی بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ ان کے ہم سفر مرید حسین شہید بھی تھے جو ناموسِ رسالت ﷺ پر قربان ہوئے۔ اس عاشقِ رسول ﷺ کی داستان شہادت ان کے ایک دوست، ملازمت کے ساتھی اور منہ بولے بھائی صوبیدار اللہ دتہ نے سنائی۔ مرید حسین 8 اگست 1936ء کو واصل بحق ہوئے۔ صوبیدار مذکور ''جنگا'' کے رہنے والے تھے۔ یہ گاؤں مرید حسین کے مسکن سے ڈیڑھ میل دور تھا۔ یاد رہے کہ یہ علاقہ تلہ گنگ سے چند کوس کے فاصلے پر ہے۔

16 مئی 1937ء کا سورج بھی عام دنوں کی طرح طلوع ہوا۔ لیکن یہ میاں محمد کے لیے کڑے امتحان کا دن ثابت ہوا۔ شام کے چھ بجے ایک ایسے واقعہ کی بنیاد پڑی جو میاں محمد کو حیاتِ ابدی دلانے کے ساتھ ساتھ پوری ملت اسلامیہ کا محبوب بن گیا۔ اچانک اس کی امیدوں کے چراغ جل اٹھے، اور ناموس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہونے کی سعادت بخشنے والا مبارک لمحہ آن پہنچا۔ خوش پوش میاں محمد کی قسمت یوں جاگی کہ وہ سینٹ تھامس ماؤنٹ چھاؤنی کی کوارٹر گارڈ پر کھڑے ڈیوٹی دے رہے تھے۔ قلعے میں بیٹھے ہوئے مختلف عقائد و مذاہب کے فوجی خوش گپیوں میں محو تھے۔ ان میں دو ہندو ڈوگرے اور مسلمان سپاہی بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ہوا یہ کہ ایک ہندو ڈوگرے نے کوئی نعتیہ غزل بلند آواز میں ترنم سے پڑھنا شروع کی۔ وہ خوش الحان تو تھا ہی، لہجے میں مٹھاس اور عقیدت کا رنگ بھی دلچسپی کا سامان پیدا کر گیا۔ مسلمان فوجی اپنی اپنی جگہوں سے کھسک کر اس کے گرد آ کر بیٹھ گئے۔ اس نعت کا آخری مصرع تھا ''واہ واہ پیارے محمدؐ'' ہندو نعت گو بارگاہِ رسالت مابؐ میں اپنا نذرانہ عقیدت کچھ اس والہانہ انداز میں پیش کر رہا تھا کہ جوش مسرت سے مسلمانوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ جونہی محمدؐ عربی کا اسم مبارک مذکور کے منہ سے نکلا دوسرا ڈوگرہ سپاہی جل بھن کر رہ گیا۔ اس نے غلیظ الفاظ میں اپنے ساتھی کو تنبیہ کی اور کہا۔ (نعوذ باللہ) ''......محمدؐ کو......کرد......کسی اور کا نام لو......تُو ہندو دھرم کا مجرم ہے اور تیرا یہ پاپ ہرگز برداشت نہیں کیا جا سکتا۔''

یہ تمام کارروائی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے شیدائیوں کے سامنے ہوئی جس سے ان کے دلوں میں کافی ہلچل پیدا ہو گئی۔ ان میں میاں محمد بھی شامل تھا۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں گستاخ ڈوگرے کہا کہ تُو نے ہمارے نبی ﷺ کی شان میں جو کچھ کہا ہے، وہ درست نہیں۔ اس شخص کو جو تمہارا ساتھی اور ہم مذہب ہے، یہ سعادت نصیب ہوئی ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے نام مبارک سے اطمینان قلب حاصل کرے۔ اسے یہ نام نامی اچھا لگا ہے اور اسی لیے اس نے یہ نعت پڑھی۔ اگر تمہیں بدباطنی

کے باعث یہ پسند نہیں تو خاموش رہ یا یہاں سے اٹھ کر چلا جا۔ اور خبردار جو آئندہ کبھی اس قسم کی بکواس کی، ورنہ زبان کھینچ لوں گا۔

اس مردود نے بڑی ڈھٹائی سے کہا: ''میں ایسا ہی کروں گا، مجھ سے جواب طلبی کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ میں جو چاہوں کہتا پھروں۔ تمہیں اس سے کیا؟'' یہ بیہودہ جواب سن کر میاں محمد کا خون کھول اٹھا۔ غیرت دینی جوش مارنے لگی، وہ کچھ دیر صبر کیے رہا اور گہری سوچ بچار میں ڈوب گیا۔ اس وقفے میں اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ...... ایک مشکل اور کٹھن فیصلہ کر لیا اور سوال و جواب کی تکرار سے ہٹ کر اسے دوبارہ تنبیہ کی۔ ''اپنی ناپاک زبان سے ہمارے نبیؐ کی شان میں آئندہ کے لیے گستاخانہ جملے کہنے کی جرأت نہ کرنا، ورنہ یہ بدتمیزی بہت جلد تجھے ذلت ناک موت سے دوچار کر دے گی۔''

بدکلام ڈوگرے سپاہی نے دوبارہ یہی جواب دیا: ''مجھے اس سے روکنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔'' حضرت میاں محمد کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''اچھا میں تمہیں جلد ہی بتا دوں گا کہ میرا حق ہے یا نہیں۔''

میاں محمد کی ڈیوٹی چھ بجے شام سے شروع ہو کر آٹھ بجے ختم ہوئی۔ اس دوران وہ ایک اہم فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن اتمام حجت کی خاطر اسے ابھی ایک اور مرحلہ طے کرنا تھا۔ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر وہ سیدھا اپنے حوالدار کے پاس گیا اور تمام واقعہ تفصیل سے اسے کہہ سنایا۔ ساتھ ہی اپنے جذبات کا اظہار بھی کر دیا کہ وہ اگر برسرعام معافی کا خواستگار نہ ہوا اور تحریری توبہ نامہ لکھ کر نہ دیا تو پھر میرے لیے جان پر کھیل جانا فرض ہو جائے گا۔ حوالدار نے اس نازک مسئلہ پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور صرف اتنا کہا کہ وہ اسے سمجھا دے گا لیکن اسے معافی مانگنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

شکایت پر جب کوئی شنوائی نہ ہوئی تو میاں محمد گم سم اپنی بیرک میں پہنچا۔ وردی تبدیل کی اور سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ موصوف نے نماز عشاء ادا کی۔ کچھ مزید نوافل بھی پڑھے۔ وہ ایک اہم فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ عقل مات کھا گئی اور عشق بازی لے گیا۔ نماز کے بعد غازی صاحب نے بارگاہِ رب العزت میں یوں دعا مانگی:

''اے میرے خالق و مالک! میں نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ تیرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہرزہ سرائی کرنے والے لعین کا کام تمام کر دوں۔ میں اس ملعون سے انتقام لینے کی خاطر پیچ و تاب کھا رہا ہوں۔ تُو مسبب الاسباب ہے۔ اپنے اس حقیر بندے کو حوصلہ اور استحکام عطا فرما۔ خدایا! اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت و تقدس پر جان لڑانے کی توفیق بخش اور میری قربانی منظور بھی فرما لے۔''

نماز اور دعا سے فراغت کے بعد میاں محمد چپکے سے کوارٹر گارڈ جا پہنچا، جہاں رسول پاک صلی

اللہ علیہ وسلم کی شانِ مبارک میں گستاخی کرنے والا کمینہ فطرت ڈوگرہ سپاہی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ میاں محمد اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گارڈ روم میں داخل ہوا۔ اپنی رائفل نکال کر میگزین لوڈ کی اور جھٹ باہر نکل کر اس بدفطرت سپاہی کو یوں للکارا:

''ارے کم بخت...... اب بتا کہ میرے نبیؐ کی شان میں توہین کا مرتکب ہونے پر میں تم سے باز پرس کا حق رکھتا ہوں یا نہیں؟''

یہ سنتے ہی ڈیوٹی پر متعین شاتمِ رسولؐ نے بھی پوزیشن سنبھال لی اور رائفل کا رخ میاں محمد کی طرف کر دیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ناموسِ رسالت ﷺ کے فدائی کی گولی ہندو ڈوگرے کو ڈھیر کر چکی تھی۔ میاں محمد رائفل کی دس گولیاں اس کے جسم سے پار کرنے کے بعد اس کے چہرے پر سنگین سے ضربیں لگاتا رہا۔ نبی اکرم ﷺ کی ذات پاک پر حرف گیری کرنے والی گستاخ زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی مومن مجاہد کی تسکین نہیں ہوئی تھی۔ وہ سنگین کی نوک اس ذلیل کے منہ پر مارتا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا:

''بے غیرت۔ اس ناپاک اور گندی زبان سے تُو نے میرے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بکواس کی تھی۔ جی چاہتا ہے کہ تیرا پلید جسم کتوں اور کووں سے نچوا ڈالوں۔''

ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق مردے کے چہرے پر کل پانچ ضربیں لگیں جن میں سے ایک زخم چودہ انچ گہرا تھا۔

فائرنگ کی آواز سے پوری یونٹ میں کھلبلی مچ گئی۔ فائرنگ ختم ہوتے ہی ایک بگلر دوڑتا آیا جو خوف سے کانپ رہا تھا۔ جب غازی صاحب نے مردود کے جہنم واصل ہونے کا یقین کر لیا تو خطرے کی گھنٹی انہوں نے خود بجائی اور بگلر کو مسلسل بگل بجاتے رہنے کا کہا۔ خطرے کے الارم اور بگل بجنے پر پوری پلٹن جمع ہو گئی۔ ایک آدمی نے پوچھا: ''قلعے میں فائر کس نے اور کیوں کیا ہے؟''

غازی صاحب نے جواب دیا ''میں ہوں سپاہی میاں محمد نمبر 15305'' وہ شخص پھر پکارا: ''کمانڈنگ صاحب کا حکم ہے' رائفل اندر رکھ کر باہر آ جاؤ'' غازی صاحب نے مطالبہ کیا کہ کسی مسلمان افسر کو بھیجا جائے۔ اس شخص نے تیسری مرتبہ کہا: کمانڈنگ افسر حکم دے رہے ہیں کہ باہر آ جاؤ۔ تمہاری گرفتاری کے لیے ایک مسلمان افسر منتظر کھڑا ہے۔ چنانچہ غازی صاحب نے باہر آ کر خود کو جمعدار ایڈجوٹنٹ عباس خان' جو ڈھوک ٹاہلیاں تلہ گنگ کے رہنے والے تھے' کے حوالے کر دیا۔

غازی صاحب کو پوری پلٹن کے سامنے لا کر انگریز کمانڈنگ افسر نے پوچھا: ''تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ چرن داس نام کے مقتول ڈوگرے نے ہمارے رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور بدکلامی کی تھی۔ میں نے اسے روکا۔ وہ باز نہ آیا' چنانچہ میں نے اسے ہلاک کردیا۔ اب آپ کا جیسے جی چاہے' قانونی تقاضے پورے کریں۔ اس پر خودسی' او نے تاکید کی...... میاں ذرا سوچ کر بات کرو' ہوش میں آؤ' تمہارے ابتدائی بیان قلم بند ہو رہے ہیں' ان میں ردوبدل ممکن نہ ہوسکے گا۔ غازی صاحب نے جواب دیا میں بالکل ہوش میں ہوں۔ جو کچھ میں نے کیا ہے' سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ میرا ایک ایک حرف صداقت پر مبنی ہے۔ میں نے حوالدار صاحب سے بھی اس کے گستاخانہ رویّے کی شکایت کی تھی لیکن کوئی مثبت جواب نہ ملا۔ اس کے بعد میرے سامنے صرف دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ دولت ایمان سے محروم ہو کر بے غیرتی اور بزدلی کی زندگی قبول کرلوں' نہیں تو اس سے انتقام لوں۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ مجھے اپنی کامیابی پر بے انتہا خوشی ہے۔ اگر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو جائیں اور تمام دنیا بگڑ بیٹھے' مجھے کوئی غم نہیں۔ مجھے اپنے کیے پر کوئی پچھتاوا نہیں۔ مجھے اپنے مقدر پر ناز ہے۔''

کمانڈنگ افسر غازی کے اس بیان پر مطمئن نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید نشے کی حالت میں ایسا کیا گیا ہو۔ انہیں ڈاکٹری معائنے کے لیے بھیجا گیا۔ ڈاکٹر کرنل نور احمد صاحب تھے۔ انہوں نے اسلامی جذبۂ اخوت کی بنا پر کہا کہ آپ سوچ سمجھ کر بیان دیں۔ سابقہ بیان تبدیل ہوسکتا ہے لیکن یہ بیان جو آپ دیں گے فیصلہ کن ہوگا۔ غازی موصوف نے کہا: ڈاکٹر صاحب آپ کا خیال ہوگا کہ اگر میں بیان تبدیل کرلوں تو شاید میری جان بچ جائے گی لیکن میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تو ایک جان ہے۔ اگر ہزار جانیں بھی ہوتیں تو میں اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے غلاموں کی عزت پر قربان کردیتا۔''

وقوعے کی شب غازی صاحب اپنے فوجی افسروں کی کڑی نگرانی میں رہے۔ 17 مئی 1937ء کو انہیں مقدمے کی تفتیش کے لیے حوالۂ پولیس کردیا گیا۔ لیکن دس دن کے بعد 27 مئی کو انہیں واپس یونٹ میں لایا گیا تاکہ فوجی قانون کے تحت ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ اس کی وجہ اس شک پر مبنی تھی کہ شاید سول عدالت مقدمۂ قتل کا فیصلہ انگریزی حکومت کی منشاء کے مطابق نہ کرے۔

یونٹ نے قتل کی اس واردات کی اطلاع غازی صاحب کے والدین کو نہ دینے کا فیصلہ کیا اور عہدیداروں کو سختی سے منع کیا کہ وہ اس ہدایت پر عمل کریں۔ لیکن دندہ شاہ بلاول کے ایک جرأت مند مسلمان سید صدرالدین نے جو کوارٹر ماسٹر حوالدار تھے' صوبیدار (ریٹائرڈ) ملک غلام محمد کو واقعہ کی اطلاع کردی اور وہ 26 مئی کو مدراس پہنچ گئے۔ انہیں پلٹن میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ چنانچہ وہ ایک مسلمان پوسٹ ماسٹر سید سیف علی شاہ کے ہاں مقیم ہوئے۔ مقدمے کی پیروی کے لیے ایک مقامی مسلمان ایڈووکیٹ سید نور حسین شاہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ انہوں نے ابتدائی سماعت میں بڑے

وزنی قانونی نکات کی نشاندہی کی۔لیکن بدبختی سے ذاتی رنجش کی بنا پر کسی بدباطن نے ان کو قتل کر دیا۔اس کے بعد یہ مقدمہ معروف قانون دان اصغر علی صاحب ایڈووکیٹ کے سپرد کر دیا گیا' جنھوں نے بلا معاوضہ پیروی کا بیڑہ اٹھایا۔فوجی قانون کے مطابق 31 مئی سے 6 جون 1937ء تک انکوائری ہوتی رہی۔

19 جون کو گورنمنٹ مینٹل ہسپتال مدراس کے سپرنٹنڈنٹ نے غازی صاحب کا معائنہ کیا۔ ان کی سفارش پر انہیں 25 جون سے 24 جولائی تک مینٹل ہسپتال میں رکھا گیا۔ہسپتال میں داخلے کے وقت ان کا وزن 133 پونڈ تھا۔وہاں سے فارغ ہونے پر وزن کم ہونے کی بجائے ایک پونڈ بڑھ گیا۔ طبی معائنے کے بعد غازی صاحب کا جنرل کورٹ مارشل 16 اگست سے 20 اگست تک جاری رہا۔کل اٹھارہ گواہوں کے بیانات قلمبند ہوئے۔تین ڈاکٹروں کی شہادت بھی ریکارڈ پر آئی۔غازی صاحب نے کوئی وکیلانہ رائے یا مشورہ قبول نہ کیا۔انہوں نے کہا میں اپنی جان بچانے کے لیے اس واقعے کو کوئی دوسرا رنگ نہیں دینا چاہتا۔ بلا عذر و معذرت جان حاضر ہے۔حسب ضابطہ کورٹ مارشل کے فیصلے کی توثیق کے لیے کاغذات انڈین آرمی کے کمانڈر ان چیف کے پاس بھیج دیئے گئے جو ان دونوں موسم گرما کے سبب شملہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔حسب توقع کمانڈر ان چیف نے سزا کی منظوری دے کر کاغذات واپس کر دیئے۔23 ستمبر کو فوجی رواج کے مطابق پلٹن میں غازی میاں محمد کو سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

غازی صاحب کے والد صوبیدار پنشنر غلام محمد نے 5 اکتوبر 1937ء کو وائسرائے ہند کے پاس دہلی میں اپیل کی' جو مسترد کر دی گئی۔اسی وقت لاہور ہائی کورٹ کے مشہور مسلمان وکیل ڈاکٹر شیخ محمد عالم کی وساطت سے ٹی ایل ولسن کمپنی کو لکھا گیا کہ وہ پریوی کونسل لندن میں اپیل دائر کریں۔اپیل دائر کی گئی مگر اسے بھی نامنظور کر دیا گیا۔

آخر کار 12 اپریل 1938ء کے دن آپ کو پھانسی دینے کا فیصلہ کیا گیا۔11 اور 12 اپریل کی درمیانی شب کو جیل کی کوٹھڑی میں غازی میاں محمد اپنے والد اور پلٹن کے مولوی صاحب کے ساتھ تلاوت قرآن حکیم میں مشغول رہے۔12 اپریل 1938ء کو انہوں نے علی الصبح غسل کر کے سفید لباس زیب تن کیا۔نماز فجر ادا کی۔سر پر کلاہ باندھ کے اپنی پگڑی والد صاحب کے سپرد کی۔پھر سرکاری طور پر ان کا ایک فوٹو لیا گیا۔وہ بالکل ہشاش بشاش عالم میں تھے۔وہ پہلے اپنے والد سے بغل گیر ہوئے' پھر مولوی صاحب سے گلے ملے۔ان کے والد آخری وقت تک وہاں موجود رہے بلکہ کنٹوپ بھی انہوں نے خود ہی بیٹے کو پہنایا تھا۔وہ کلمہ شریف اور درود شریف کا ورد کرتے رہے۔غازی صاحب شان و شوکت سے چل کر تختۂ دار پر جا کھڑے ہوئے۔نعرۂ تکبیر بلند کیا۔چہرہ اٹھا کر ایک بار مدینہ منورہ کی

طرف دیکھا پھر بڑی عقیدت سے سر جھکا لیا۔کلمہ شہادت کا ورد کرتے ہوئے پھانسی کا پھندا اپنے والد سے پکڑا اور دو بار چوم کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔تھوڑی دیر بعد تختہ کھینچ دیا گیا۔فضا اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی۔آپ کے چہرے سے نور برستا تھا اور ماحول خوشبو سے معطر ہو گیا۔عاشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی سرخروئی کے ساتھ اپنی منزل اور گوہر مراد حاصل کر لیا۔عارضی اور فانی دنیا کی زندگی دے کر انہوں نے اپنے رب سے دوامی زندگی لے لی اور یہ کامیابی عظیم کامیابی ہے جو کسی عاشق خدا اور عاشق رسول ہی کو مل سکتی ہے۔

یہ واقعہ بروز منگل 10 صفر المظفر 1357ھ مطابق 12 اپریل 1938ء صبح ٹھیک پانچ بج کر پینتالیس منٹ پر پیش آیا۔اس عاشق رسول کا چہرہ ہشاش بشاش تھا۔وہ تختۂ دار پر تڑپے نہ گردن لٹکی۔ باہیں ذرا سی کھلی تھیں...... جانے...... کیوں؟ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے آپ کی شہادت کی تصدیق کی۔ پھر نعش ورثاء کے سپرد کر دی گئی۔شہادت کے وقت کھلتی ہوئی سفید رنگت والے اس خوبصورت جوان غازی میاں محمد شہید کی عمر صرف تئیس (23) برس تھی۔

فسادِ امن کے خطرے کے پیش نظر غازی صاحب کی نعش وطن لانے کی اجازت نہ دی گئی۔ آخر انہیں مدراس (بھارت) سنٹرل ریلوے سٹیشن سے تین میل دور ایک بڑے قبرستان میں معروف ولی اللہ حضرت پیر ساویؒ کے مقبرہ اور مسجد کے درمیان مقبرہ کی بائیں جانب سپرد خاک کر دیا گیا۔قبر کے ساتھ نصب شدہ پتھر پر قرآن پاک کی ایک آیت کے ساتھ یہ عبارت اور قطعہ شہادت لکھا ہے:

قطعہ شہادت میاں محمد صاحب مرحوم سابق سپاہی 3/10 بلوچ رجمنٹ فرزند غلام محمد صوبیدار بمقام تلہ گنگ ضلع کیملپور (پنجاب)۔

تاریخ وفات: 10 صفر المظفر 1357ھ بمطابق 12 اپریل 1938ء

اے یادگار عزتِ ناموسِ مصطفیٰؐ
کیا خوب انتخاب تھا تیری حیات کا
بدلہ لیا ہے دشمن احمدؐ کا تو نے خوب
منظور کر چکا ہے شہادت تری خدا

غازی میاں محمد شہید نے خدا اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ایک اعلیٰ ترین مقصدِ حیات اور فوزِ عظیم کی خاطر اپنی دنیا، دنیا کے علائق اور نقد جاں ناموس رسالتؐ پر وار دی۔اس لیے انہیں دنیا سے اٹھ جانے یا موت کی آغوش میں چلے جانے کا ذرا بھی ملال نہیں ہوا بلکہ انہوں نے ہنسی خوشی یہ منزل کامیابی سے طے کر لی۔یہی وجہ تھی کہ شاتم رسولؐ کا کام تمام کیے بغیر چین سے نہ بیٹھ

سکے۔قید کے دوران بالکل مطمئن اور ہشاش بشاش رہے۔قید کے دوران غم سے ان کا وزن کم ہونے کی بجائے 2 پونڈ بڑھ گیا۔ وکیلانہ مشورے قبول کر کے اپنا بیان نہیں بدلا۔شہادت کے لیے تختۂ دار پر ہنسی خوشی چڑھے جیسے یہ کوئی کھیل ہو۔

وصال کے بعد چہرہ پُر نور' اور ماحول معطر تھا۔ بارہا ان کی قبر سے تلاوت قرآن پاک کی آوازیں سنی گئیں۔

غازی صاحب عین جوانی میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے۔ابھی اللہ تعالیٰ نے اولاد عطا نہیں کی تھی کہ شاتم رسول کو واصل جہنم کرنے کا اعزاز پا گئے۔ غازی صاحب کی وصیت اور خواہش کے مطابق ان خاتون محترمہ کا نکاح غازی صاحب کے برادر عزیز ملک نور محمد سے کر دیا گیا۔ یہ صالح اور نیک خاتون بھی انہی پاک صاف جذبوں کی تصویر اور تفسیر ہیں۔اللہ تعالیٰ نے چار بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا۔ ایک صاحبزادے لیفٹننٹ کرنل ملک محمد اعجاز (آرٹلری) آج کل پی اے ڈائریکٹریٹ جی ایچ کیو راولپنڈی میں تعینات ہیں۔ملک نور محمد صاحب جی ایچ کیو سے سینئر ایڈمنسٹریٹو آفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ وہ غازی ملک میاں محمد شہید کی روحانی کیفیات کے حقیقی وارث ہیں۔

رب کریم' ملک میاں محمد' ان کے لواحقین اور ان کے مداحوں کو دنیا و آخرت کی بھلائی عطا فرمائے۔آمین

✿......✿......✿



غازی عبدالرشید شہید

سردار علی صابری

جمعرات 23 دسمبر 1926ء کو دلی کے ایک خوشنویس قاضی عبدالرشیدؒ نے غیرتِ اسلامی کے جذبے سے سرشار ہو کر فتنۂ ارتداد (شدھی) کے بانی اور غلامانِ بارگاہِ رسالت کے شاتم سوامی شردھانند کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اس سعادتِ عظمیٰ کے صلے میں پھانسی کے تختے پر حیاتِ ابدی حاصل کی تھی۔

ہماری نئی نسلیں اب اس غریب کاتب کو بھولتی جا رہی ہیں جس نے شاہِ بطحا کی ناموس پر قربان ہو کر اپنے ایمانِ کامل کا ثبوت دیا تھا۔

شردھانند، جالندھر (مشرقی پنجاب) کا رہنے والا تھا۔ اصلی نام لالہ منشی رام تھا۔ آریہ سماج کا بہت پُرجوش و باعمل کارکن تھا۔ دیانند اینگلو ویدک کالج لاہور کے انتظامی معاملات میں پرنسپل ہنس راج سے اختلاف ہوا تو ڈی اے وی کالج کے مقابلہ میں ہردوار کے قریب موضع کانگڑی میں ایک گروکل قائم کر ڈالا، جسے آج بھی شمالی ہند میں آریہ سماج کے ایک اہم تعلیمی و تبلیغی مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔

شردھانند نے عرصہ سے دلی میں سکونت اختیار کر رکھی تھی اور یہیں سے اس نے شدھی کی آگ بھڑکانے کے لیے اُردو میں روزنامہ ''تیج'' اور اس کے بیٹے نے ہندی میں روزنامہ ''ارجن'' جاری کیا۔

لمبا قد تھا، گندمی رنگ، داڑھی مونچھ صاف، سر منڈا ہوا، بڑی بڑی آنکھیں، آواز بہت بلند،

سادھوؤں کا رنگین لباس۔ قتل کے وقت عمر پینسٹھ (65) سال کے لگ بھگ ہوگی۔ میرے سامنے شردھانند کی زندگی کے تین روپ ہیں۔ پہلا روپ میں نے خود نہیں دیکھا۔ سُنا اور اخبارات میں پڑھا ہے۔ دوسرے دو روپ اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔

پہلا روپ ''قوم پروری'' کا روپ ہے۔ 1919ء میں جب آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس پنڈت موتی لال نہرو کی زیرِ صدارت امرتسر میں منعقد ہوئے تو شردھانند مجلس استقبالیہ کا چیئر مین تھا۔ اس نے اپنے خطبۂ صدارت میں ترکوں کے مصائب سے گہری ہمدردی ظاہر کی تھی اور خلافت کی بحالی کے لیے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا تھا۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جھندواڑہ (سی۔پی) جیل سے رہا ہو کر جب کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے سیدھے امرتسر پہنچے تو اس منظر کو دیکھنے والے بہت لوگ زندہ ہیں کہ مجلس استقبالیہ کے صدر شردھانند بڑی بے تابی سے کانگریسی پنڈال میں دوڑ کر علی برادران سے بغل گیر ہوئے تھے اور اسے ہندو مسلم اتحاد کا ناقابل شکست مظاہرہ بتایا تھا۔

شردھانند کا جو دوسرا روپ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا' وہ غالباً 1922ء کا ابتدائی حصہ تھا۔ مولانا محمد علی کے اخبار ''ہمدرد'' میں اعلان ہوا۔ شہر میں پوسٹر لگائے گئے کہ جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کے بعد ''شری سوامی شردھانند جی مہاراج'' ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر مسلمانوں سے خطاب فرمائیں گے۔

دلی کی جامع مسجد...... دُنیائے اسلام کی ایک حسین ترین ومقبول ترین عبادت گاہ...... میں ایک ہندو سنیاسی کی تقریر...... بات تو انوکھی سی تھی۔ مگر وہ زمانہ تحریک خلافت کے شباب کا تھا۔ اگرچہ ہندوؤں کے دلوں میں اس وقت بھی مسلمانوں کے خلاف بغض ونفرت کی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں۔ مگر صاف دل مسلمانوں کو اپنے ''ہندو بھائیوں'' کے خلوص پر بہت اعتماد تھا۔ جامع مسجد میں یوں تو ہر جمعہ کو بالعموم نو دس ہزار مسلمان شریکِ نماز ہوتے ہیں لیکن آج کے جمعہ کا پوچھنا ہی کیا۔ جمعۃ الوداع کا ہلکا سا نقشہ نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ عظیم الشان صحن کے علاوہ ساری صحنچیاں' برجیاں اور چھتیں لوگوں سے پٹی پڑی تھیں۔ تینوں بڑے دروازوں کے باہر بھی لوگوں کے ٹھٹ لگے تھے۔

نماز ختم ہوتے ہی مولانا محمد علی نے شردھانند کی آمد کا اعلان کیا۔ تھوڑی دیر بعد پُرجوش نعروں اور خلافتی رضا کاروں کے جلو میں شردھانند عالم اسلام کی اس مایہ ناز مسجد میں داخل ہوا۔

مسجد کے پیش طاق یا درمیانی در کے سنگ' سنگ باسی کا شاندار مکبر سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور کی صناعی کا بہت دلکش نمونہ ہے۔ مولانا محمد علی کے ساتھ شردھانند اس بلند و بالا مکبر پر براجمان ہوا۔ مولانا کی مختصر تعارفی تقریر کے بعد اس مکبر سے جہاں ہمیشہ تکبیر کی آوازیں گونجتی تھیں' تاریخ میں پہلی

مرتبہ ایک ہندو سادھو کی آواز تقریر بن کر گونجی۔ میں اس وقت حوض کے آخری مشرقی کنارے پر تھا۔ شردھانند کی تقریر اصول و غایت کے اعتبار سے جیسی کچھ بھی ہو لیکن منافقت کا شاہکار ضرور تھی۔ شردھانند نے دل کا بھید چھپانے میں کمال کر دیا۔ اس کے ہر لفظ سے مترشح ہوتا تھا کہ اسے مسلمانوں سے بے پناہ محبت ہے اور وہ ہندو مسلم اتحاد کو آزادی کی کنجی سمجھتا ہے۔ یہ بات کسی کے وہم و گمان میں نہ آ سکتی تھی کہ ہندو مسلم اتحاد کا یہی پرچارک سادھو صرف چند ماہ بعد اسلام اور مسلمان کا سب سے بڑا دشمن بن کر میدان میں آئے گا اور ہندوستان سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کے لیے شدھی اور سنگھٹن جیسی خطرناک تحریکیں جاری کرے گا۔

شردھانند کا جو تیسرا روپ میرے سامنے آیا وہ بہت ہی اشتعال انگیز' گھناؤنا اور قابلِ نفرت تھا۔ غالباً 1923ء کے آغاز میں اس کو دفعہ 124 الف کے تحت قیدِ سخت کی سزا ہوئی تھی لیکن وہ معافی مانگ کر جیل سے رہا ہو گیا اور اس نے انگریز حکام کو خوش کرنے اور کچھ متعصب ہندوؤں کے جذبۂ اسلام دشمنی کو تسکین دینے کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز تحریروں اور تقریروں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ شردھانند نے جیل سے رہا ہونے کے بعد روزنامہ ''تیج'' کے ایک مضمون میں اسلام پر جو پہلا حملہ کیا تھا' اس کے نجس الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں۔

تحریکِ ترکِ موالات دم توڑ رہی تھی۔ گاندھی ایک دو ماہ بعد ضلع گورکھ پور کے ایک چھوٹے سے گمنام گاؤں چورا چوری کے معمولی سے واقعہ کو آڑ بنا کر تحریکِ ترکِ موالات کا گلا گھونٹنے والے تھے تاکہ مسلمانوں کے روز افزوں اثر و رسوخ سے کانگریس اور ہندوستان کی سیاست کو محفوظ کیا جائے۔ چنانچہ بڑے بڑے ہندو لیڈروں کے عملی اشتراک' اشیرباد اور بھاری سرمائے سے مسلمانوں کے خلاف شُدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کی گئیں۔ شُدھی کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو جو ہندوؤں کے بیان کے مطابق ہندو نسل سے تعلق رکھتے ہیں' اسلام سے منحرف کر کے دوبارہ ہندو بنا لیا جائے اور سنگھٹن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا وجود ختم کرنے کے لیے نہ صرف مختلف مکاتبِ فکر کے ہندوؤں بلکہ سکھوں اور بودھوں کو بھی عظیم تر ہندو قومیت کے نام پر متحد کیا جائے اور جارحانہ حملوں کے لیے فوجی لائنوں پر مسلح دستے مرتب کیے جائیں۔

یو۔ پی کے بعض اضلاع میں کئی لاکھ کم تعلیم یافتہ مسلمان راجپوت آباد تھے جنہیں ملکانہ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ شُدھی کا پہلا سخت حملہ انہی علاقوں پر ہوا۔ ملکانہ راجپوتوں کو دین اسلام سے منحرف کرنے کے لیے لالچ اور تشدد کے سارے حربے استعمال کیے گئے۔ تھوڑے بہت غریب راجپوتوں کا ایمان روپیہ کی طاقت سے خرید ا گیا اور جو لوگ اسلام کا دامن چھوڑنے کو تیار نہ ہوئے' ان

کے گھروں کو لوٹا اور جلایا گیا اور ان کی ناموس پر حملے کیے گئے۔

شدھی کے خطرناک فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے تمام قابل ذکر علما و مشائخ اور اکابر و مشاہیر نے جس اتحاد اور عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا' اسے اسلامی ہند کی تاریخ ہمیشہ فخر سے یاد رکھے گی۔ شدھی اور سنگھٹن کا سلسلہ اگر سنجیدہ مباحث اور علمی دلائل تک محدود رہتا تب بھی غنیمت تھا' لیکن شردھانند اور اس کے آریہ سماجی بھگتوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غلیظ گالیوں' بہتان تراشیوں اور انتہائی اشتعال انگیزیوں کو اپنا مستقل شعار بنالیا۔ روزنامہ ''تیج'' دہلی میں شردھانند کے قلم سے اسلام اور مسلمانوں کو گالیاں دی جاتی تھیں اور قرآن مجید کی آیتوں کا مذاق فحش الفاظ میں اُڑایا جاتا تھا۔ ہندی اخبار ''ارجن'' میں ہندوؤں کو مشتعل کرنے کے لیے عہد سابق کے مسلم سلاطین کے فرضی مظالم کی کہانیاں بہت بڑھا چڑھا کر شائع کی جاتی تھیں اور کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا جب ہندو عورتوں کے اغوا اور مسلمانوں کے ہاتھوں ان کے بے عزت کیے جانے کے دو چار جھوٹے قصے درج نہ کیے جاتے ہوں۔ ایک آریہ سماجی نے قرآن مجید کا جواب لکھنا شروع کیا۔ شردھانند کی اشیرباد سے ایک اخبار ''گروگھنٹال'' جاری کیا گیا تھا جس کا مقصد مسلمانوں اور ان کے مقدس رہنماؤں کو (جن میں اولیاء کرام بھی شامل تھے) انتہائی شرمناک الفاظ میں گالیاں دینا تھا۔

شردھانند کے ایک چیلے نے ''جزپٹ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں حضور سرکارِ دو عالم ﷺ اور دیگر انبیائے کرام' خاص کر حضرت ابراہیم خلیل اللہ' حضرت لوط' حضرت ایوب' حضرت اسحاق علیہم السلام کی شان میں اس قدر سخت گستاخیاں بالکل عریاں الفاظ میں کی گئی تھیں کہ اس خباثت کا تصور بھی مشکل ہے۔ ''جزپٹ'' میرے دفتر ''ریاست'' میں ریویو کے لیے آئی تھی اور دل پر پتھر رکھ کر اسے ایک نظر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

شردھانند کا کلیجہ اس قدر سخت اشتعال انگیزیوں پر بھی ٹھنڈا نہ ہوا اور اس نے خاندانِ مغلیہ کی بیگناہ شہزادیوں کے خلاف فحش ڈرامے لکھنے کی تحریک سارے ملک میں شروع کردی۔ چنانچہ اس نوعیت کے کئی ڈرامے اردو ہندی میں لکھے گئے۔ شہزادی زینت آرا بیگم کے متعلق ایک ڈرامہ اخبار ''ریاست'' میں میری نظر سے گزرا ہے جس میں اس پاک دامن شہزادی کو انتہائی بدچلن عورت کے روپ میں پیش کیا گیا تھا۔ بعد میں جب آریہ سماجیوں نے اس ناپاک ڈرامے کو سٹیج پر پیش کرنے کی کوشش کی تو کئی شہروں میں ہنگامے بھی ہوئے۔

مسلمانوں کے سینے میں بھی دل تھا۔ وہ غلامانِ بارگاہِ رسالت کی شانِ اقدس و اعلیٰ میں شرمناک گستاخیاں' انبیائے کرام پر پُرخباثت حملے' قرآن مجید کی آیتوں کا مذاق اور بے گناہ مغل

شہزادیوں کے خلاف فحش ڈرامے جو سب کچھ شردھانند کی قیادت میں شردھانند کے اشارے سے ہو رہا تھا، کب تک برداشت کرتے۔ ضبط و صبر کی آخر حد ہوتی ہے جس سے آگے بڑھنے کا نام بے غیرتی ہے۔ قاضی عبدالرشید مرحوم پیشہ کے لحاظ سے خوش نویس تھے۔ لمبا قد، چھریرا جسم، گندمی رنگ، لمبا چہرہ، کرتہ پاجامہ، ترکی ٹوپی، یہ ان کی عام پوشاک تھی۔ شردھانند کے زمانہ قتل کے قریب اخبار ''ریاست'' میں فرائض کتابت انجام دیتے تھے۔ دفتر کوچہ بلاقی بیگم دہلی میں تھا۔ گلی میں دروازہ اور سپلینڈ روڈ کے سامنے برآمدہ۔ قیدِ علائق سے آزاد ہونے کے باعث میں ''ریاست'' کے دفتر ہی میں دن رات رہتا تھا۔ قاضی صاحب کی نشست میری میز کے قریب تھی۔ دفتر میں آریہ سماجیوں کے جو اخبارات و رسائل اور دیگر پمفلٹ اور ڈرامے وغیرہ تبادلہ و ریویو کی غرض سے دفتر میں آتے رہتے تھے، وہ بہت غور و سنجیدگی سے پڑھتے رہتے تھے۔ نماز کے بہت پابند تھے۔ دفتر کے اوقات میں ظہر و عصر کی نمازیں ہمیشہ دریبہ کی مسجد میں جماعت سے ادا کرتے تھے اور آریہ سماجیوں کی نجس و ناپاک حرکتوں سے ان کے جذبات بے انتہا مجروح ہو چکے تھے۔

واقعہ قتل سے تین چار دن پیشتر قاضی عبدالرشید مرحوم بہت گم سُم رہتے تھے۔ کام میں دل نہ لگتا تھا۔ جب تک جی چاہتا کتابت کرتے اور جب چاہتے تو برآمدے میں بچھے ہوئے کھرے پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ ریاست کے پروپرائٹر سردار دیوان سنگھ ان دنوں نابھہ کے معزول آنجہانی مہاراجہ پردھن سنگھ کے کسی سیاسی و ذاتی کام سے دو ہفتوں کے لیے شملہ گئے ہوئے تھے، دفتر کے انتظامات درست رکھنے اور اخبار کو بروقت نکالنے کی ساری ذمہ داری میرے اور سردار بجن سنگھ مینجر کے ذمے تھی۔ قاضی عبدالرشید مرحوم کو میں نے ان کی بے توجہی پر ایک دو مرتبہ ٹوکا لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔

جمعرات (23 دسمبر) کو اخبار کی آخری کاپی پریس بھیجنے کے لیے جوڑی جا رہی تھی۔ دفتر کا وقت نو بجے مقرر تھا۔ دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور منشی قاضی عبدالرشید کا پتہ نہ تھا۔ چند اشتہاروں کے چربے اور مسودے انہی کے پاس تھے۔ قاضی صاحب کے اس قدر دیر سے آنے پر ہیڈ کاتب منشی نذیر حسین میرٹھی نے اعتراض کیا تو جھلا کر جواب دیا۔ ''چولہے میں گئی تمہاری کاپی'' یہ کہہ کر کام کرنے کے بجائے برآمدے میں پلنگ پر لیٹ رہے۔ میں نے اعتراض کیا۔ کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے سردار بجن سنگھ مینجر سے شکایت کی۔ ان کے اصرار پر برہم ہو گئے۔ بولے: ''مجھے نوکری کی پروا نہیں، لکھ دو اپنے سردار کو، میں کام نہیں کرتا۔'' یہ کہہ کر پلنگ سے اٹھے، قلمدان بغل میں دبایا اور چل دیئے۔ چار پانچ بجے سہ پہر کے درمیان دریبہ کے ہندو علاقے میں سنسنی اور بے چینی سی محسوس ہوئی۔ سامنے سڑک پر ایک دو زخمی بھی گزرے۔ اس زمانے میں خبر رسانی کے ذرائع بہت محدود تھے۔ شہر میں

ٹیلی فون تک کم تعداد میں تھے۔ ساڑھے پانچ چھ بجے شام کے درمیان روزنامہ ''تیج'' کا ضمیمہ شائع ہوا جس میں شردھانند کے قتل کی تفصیلات کے ساتھ قاضی عبدالرشید کی تصویر بھی تھی' کہ ہتھکڑیاں پہنے پولیس کی حراست میں کھڑے تھے اور جسم پر چادر ہے۔ تفصیلات سے معلوم ہوا کہ قاضی صاحب مرحوم اسی چادر میں پستول چھپا کر شردھانند کے دفتر گئے تھے اور اسے گولی کا نشانہ بنادیا تھا۔

قاضی صاحب نے عدالت میں اقبالِ جرم کیا۔ 15 مارچ 1926ء کو سیشن کورٹ سے پھانسی کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ سیف الدین کچلو نے سیشن کورٹ میں کسی معاوضہ کے بغیر پیروی کرنے کے علاوہ لاہور ہائیکورٹ میں اپیل بھی دائر کی مگر مسترد ہوگئی اور جولائی 1927ء کے آخری ہفتے یا اگست کے اوائل میں غازی عبدالرشید نے دلی سنٹرل جیل میں پھانسی کے تختے پر جام شہادت نوش کیا۔

پھانسی کے دن سنٹرل جیل کے سامنے مسلمانوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ ہزاروں بُرقع پوش عورتوں کے علاوہ بہت سے بچے بھی غیرتِ اسلامی کے جذبہ سے مخمور ہو کر گھروں سے باہر نکل پڑے تھے۔ لاش کو جیل کے اندر ہی غسل وکفن دیا گیا اور حکام نے جیل کے احاطے ہی میں دفن کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن عمائدِ شہر کے شدید اصرار پر شہید عبدالرشید کے وارثوں کو اس شرط پر لاش دینے کا فیصلہ کیا گیا کہ جنازہ کا جلوس نہیں نکالا جائے گا اور اسے جیل کے سامنے والے قبرستان میں نذرِ لحد کر دیا جائے گا' لیکن جیل کا پھاٹک کھلتے ہی جب عاشقِ رسول کا جنازہ باہر نکلا تو مسلمانوں کا زبردست ہجوم اللہ اکبر اور یارسول اللہ کے نعرے لگاتا ہوا دیوانہ وار ٹوٹ پڑا۔ جنازے کو حکام سے چھین لیا اور سامنے قبرستان لے جانے کے بجائے جامع مسجد روانہ ہوگیا۔

نعرۂ تکبیر کی معجزہ نما اثر انگیزی کا یہ کرشمہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ خونی دروازے کے سامنے مسلح پولیس کے کئی سو آدمیوں نے صف بندی کر کے راستہ روک دیا تھا۔ جابجا گورا فوج کے جوان متعین تھے لیکن مسلمانوں کا ہجوم عاشقِ رسول عبدالرشید کے جنازے کو لے کر خونی دروازے کے سامنے پہنچا اور اللہ اکبر کا نعرہ لگایا تو اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے کہ پولیس کے مسلح جوانوں کی صف کائی کی طرح پھٹ گئی۔ گورا فوج کے جوان سنگینیں تانے کھڑے رہے اور جنازے کا جلوس اس صفائی سے آگے بڑھا کہ جیسے صابن سے تار نکلتا ہے۔ مسلح پولیس نے کئی بار راستہ روکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ ناموسِ رسول پر جان دینے والے عبدالرشید کی نمازِ جنازہ جامع مسجد میں پچاس ساٹھ ہزار مسلمانوں نے پڑھی (اس وقت دلی کی پوری آبادی تین لاکھ کے قریب تھی) نماز کے بعد شہر کے ممتاز مسلمانوں کی رائے تھی کہ لاش کو جیل کے سامنے والے قبرستان میں پہنچا دیا جائے جہاں قبر پہلے سے تیار تھی اور شہدا کے ورثاء متعلقہ حکام سے لاش کی واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے لیکن غازی انوارالحسن مرحوم (جو پہلے

کانگریسی تھے بعد میں انہوں نے دلی میں مسلم لیگ کے ایک باثر رہنما کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ افسوس ہے کہ چند سال پیشتر ان کا انتقال لاہور میں ہوگیا) کی قیادت میں پُر جوش طبقے نے جنازے کو حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی کی درگاہ مبارک میں دفن کرنے کا فیصلہ کیا جو جامع مسجد سے کم و بیش تین میل دور ہے۔ دلی کے مستقل کوتوال شہر دیوی دیال نے ان دنوں رخصت لے رکھی تھی۔ شیخ نذیر الحق قائم مقامی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ کئی گھنٹوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد مسلح پولیس نے گورا فوج کی مدد سے جنازے پر نمازِ مغرب سے پیشتر قطب روڈ کے پُل پر اس وقت قبضہ کرلیا جبکہ مسلمان حضور خواجہ باقی باللہ کی درگاہ مبارک کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جنازہ قبرستان میں مرحوم کے ورثاء کے حوالے کیا گیا۔ عاشقِ رسول عبدالرشیدؒ کو ان کی ابدی خوابگاہ کی نذر کردیا گیا۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللّٰھم صلِّ علیٰ محمدٍ وعلیٰ آلِ محمدٍ

کما صلّیتَ علیٰ ابراھیمَ وعلیٰ آلِ ابراھیمَ

انّک حمیدٌ مجیدٌ

اللّٰھم بارِک علیٰ محمدٍ وعلیٰ آلِ محمدٍ

کما بارکتَ علیٰ ابراھیمَ وعلیٰ آلِ ابراھیمَ

انّک حمیدٌ مجیدٌ

غازی عبداللہ شہیدؒ

ڈاکٹر محمد اختر چیمہ

بلاشک وتردید حضرت محمد مصطفیٰ' احمد مجتبیٰ' نور مجسم' حضور اکرم' سید المرسلین' خاتم النبیین' تاجدار مدینہ' سرور سینہ' حبیب کردگار' مولائے غمگسار' طٰہٰ ویٰسین' مزمل ومدثر' اقدس واکمل' اطیب واطہر صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہ وازواجہ وسلم مقصود و مدعائے کائنات ہیں۔ روزِ ازل ہی سے خداوند قدوس نے آنحضرت ﷺ کو علوِ مراتب' ارفع درجات' اعلیٰ مقامات اور عمدہ کمالات سے سرفراز فرمادیا۔ حضرت باوا آدم علیہ السلام کو بھی **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کے صدقے معافی ملی۔ طلوعِ اسلام سے لے کر آج تک شمعِ رسالت کے پروانوں اور ختمی مرتبت کے دیوانوں کی کوئی کمی نہیں رہی ہے۔ لیکن تواریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ سینکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں عاشقانِ رسولؐ ومحبانِ نبی ﷺ ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے وقتاً فوقتاً کافران ومشرکان وگستاخان وبے ادبانِ نبی آخر الزمان ﷺ کو کیفرِ کردار تک پہنچایا اور ناموسِ رسالت ﷺ کا تحفظ کیا۔

بقول ایم۔ اے حکیم ایڈووکیٹ: ''جہاں اور جب کبھی بھی کسی مردود ازلی نے حضور نبی کریم ﷺ کی ذاتِ والاصفات کے بارے میں کسی گستاخی یا بے ادبی کی جسارت کی تو وہیں اس نورِ مجسم ﷺ کا کوئی پروانہ اٹھا اور اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اس بدطینت کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر دربارِ مصطفوی ﷺ میں سرخرو اور دولت دین ودنیا سے مالا مال ہوا۔ اسی قسم کے بیسیوں واقعات ماضی کے صفحات پر موجود ہیں۔ آج منجملہ ان کے ایک ایسا ہی واقعہ بیان کیا جاتا ہے جواب تک کہیں

مطبوعہ مواد کی شکل میں پیش نہیں ہوسکا۔''

پروفیسر افضل حسین علوی کی روایت کے مطابق: ''برصغیر میں انگریزی عملداری کے آخری زمانے میں جن عاشقان و محبانِ حبیب خدا نے جان کی بازی لگا کر ناموسِ رسالت کا تحفظ کیا اور جریدۂ عالم پر اپنی سرفروشی کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے' ان میں دو غازیوں' غازی علم الدین شہید اور غازی عبدالقیوم کو بڑی ہی شہرت نصیب ہوئی۔ خصوصاً غازی علم الدین کو جو شہرتِ دوام ملی' پاک و ہند میں شاید ہی کوئی مسلمان اس سے بے خبر ہو۔ مگر ایک نام ایسا ہے جس کا ناموسِ رسالت کے تحفظ کے سلسلے میں کارنامہ تو بہت بڑا ہے' لیکن بہت ہی کم لوگ اس عظیم عاشق رسول ﷺ کے نام اور کام سے واقف ہیں۔ یہ جاں نثارِ ناموسِ رسالتؐ صوفی عبداللہ تھے۔''

غازی صوفی عبداللہ کا تعلق جولاہا قوم سے تھا اور وہ موضع پٹی تحصیل و ضلع قصور کا رہنے والا تھا۔ مولانا سید امین الحق صاحب ڈویژنل خطیب اوقاف نے ایک دفعہ دورانِ گفتگو پروفیسر علوی صاحب کے سامنے غازی عبداللہ کا آنکھوں دیکھا حلیہ اس طرح بیان کیا کہ ''اس کا چہرہ خوبصورت' رنگ گورا اور بھری بھری سیاہ داڑھی تھی جو نہایت ہی بھلی لگتی تھی۔ جس وقت اسے باعث صد افتخار مہم کے لیے پروانہ ماموریت ملا تو عمر تیس بتیس سے متجاوز نہ تھی۔ گویا ایک لحاظ سے عین عالم شباب تھا جب غازی عبداللہ کو اس امر ناگزیر پر مامور فرمایا گیا۔'' چک نمبر 24 تھانہ خانقاہ ڈوگراں تحصیل و ضلع شیخوپورہ میں اس کا پیر خانہ تھا۔ اور مذکورہ چک کی ملحقہ آبادی چک نمبر 24 چھوٹی میں حرماں نصیب و بدبخت و بدطینت و بدباطن مسلمان جٹ نور محمد کاہلوں رہتا تھا جو قریب کے ایک گاؤں موضع ہرنالہ کی ایک عورت کے دامِ فریب میں پھنس کر دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا تھا اور پھر حضرت امام الانبیاء رحمتہ للعالمین ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی و اہانت کرتا اور مغلظات بکتا رہتا تھا۔ ہادیٔ برحق فخر موجودات ﷺ نے خود غازی عبداللہ کو بذریعہ خواب و بوسیلہ رؤیا اپنے شاتم و گستاخ کو ختم کرنے کا امر فرمایا۔ اس شخص کی سعادت مندی و خوش قسمتی کے کیا کہنے' جسے اس عظیم کار خیر کے لیے حضرت رسول خدا سرور کائنات ﷺ نے خود منتخب فرمایا ہو۔

پھر پروفیسر علوی لکھتے ہیں: ''میرے اپنے ناقص علم کی حد تک سلطان نور الدین زنگی کے بعد صوفی عبداللہ شاید وہ دوسری خوش نصیب ہستی ہے جسے خود رسولِ کریم ﷺ نے اپنے شاتم کو واصلِ جہنم کرنے کے لیے مامور فرمایا۔ یہ الگ بات ہے کہ زنگی ایک صاحب شوکت و حشمت بادشاہ تھے اور عبداللہ ایک فقیر اور درویش جو کپڑا بُن کر اپنی گزران کرتے تھے۔ صوفی عبداللہ بے شک پیشے کے لحاظ سے ایک معمولی جولاہے تھے مگر دنیائے صدق و صفا میں جس سکے کا ...تک ہے' اس سے صوفی عبداللہ کا دامن بھی

یقیناً اتنا ہی مالا مال تھا جتنا صدیوں پہلے بادشاہِ وقت نور الدین زنگی کا۔ چنانچہ حضور رسالت مآب ﷺ کی ایک ہی نظرِ التفات نے ایک فقیر بے نوا کو شاہِ جم جاہ کے برابر لا کھڑا کیا۔ جس طرح خواب میں سلطان نور الدین زنگی کو ارشاد فرمایا گیا تھا: ''زنگی دیکھو دو کتے سرنگ کھود کر میری قبر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جلد مدینے پہنچو اور ان کتوں کی خبر لو۔'' صدیوں بعد تقریباً ایسے ہی کام کے لیے پورے برصغیر کے مسلمانوں میں سے ایک فقیر بے نوا کو چنا گیا اور خواب میں اسے بارگاہِ رسالت مآب سے فرمان عائد کیا گیا کہ عبداللہ جاؤ' فلاں گاؤں پہنچو اور میرے شاتم کی خبر لو۔ سچ ہے کہ۔

جس شخص کو مرکز الطاف بنا لیں
حق ہے کہ وہی شخص مقدر کا دھنی ہے

ہمارے ہر دو مآخذ میں چونکہ بعض معاملات میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مقامات سے الگ الگ منقولات و واقعات کو نقل کر دیا جائے' تا کہ قارئین و شائقین کے لیے اصل حقائق سے زیادہ واقفیت و آگاہی کا سامان میسر ہو جائے۔

ایم۔ اے حکیم ایڈووکیٹ نے اس گستاخ رسول کی داستانِ ارتداد اور غازی عبداللہ کے اس کو مکافاتِ عمل تک پہنچانے کو سادے لفظوں میں اس طرح بیان کیا ہے:

1938ء میں رونما ہونے والا یہ واقعہ و سانحہ ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں سے تعلق رکھتا ہے جو چک نمبر 24 چھوٹی کے نام سے موسوم ہے۔ وہاں کے ساکن مذکورہ مردود مسمی نور محمد جٹ کا ہلوں کے ایک شادی شدہ مسلمان عورت سے ناجائز تعلقات استوار ہو گئے جو قریب کے ایک موضع ہرنالہ کی رہنے والی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے اور کوشاں رہنے لگے کہ کسی طرح ان کی آپس میں شادی ہو جائے۔ لیکن عورت چونکہ پہلے ہی شادی شدہ تھی' اس لیے انہوں نے مشورہ کیا کہ اگر اسلام سے منہ موڑ لیں اور عیسائیت اختیار کر لیں تو یہ مرحلہ طے ہو سکتا ہے چنانچہ انہوں نے سانگلہ ہل جا کر ایک عیسائی پادری کے ہاتھوں عیسائیت و مسیحیت اختیار کر لی۔ مگر پھر بھی ان کی خواہش کے مطابق مسئلہ حل نہ ہوا تو بالآخر دونوں بھاگ کر امرتسر چلے گئے اور سکھ مذہب میں داخل ہو گئے۔ بدقماش نور محمد نے اپنا نام چنچل سنگھ اور بدکار عورت نے دلجیت کور رکھ لیا اور کچھ عرصہ امرتسر میں قیام کر کے مذہب کے قواعد و ضوابط کی تھوڑی بہت واقفیت حاصل کر لی۔ بعد ازاں چک نمبر 24 چھوٹی میں آ کر آباد ہو گئے۔ جہاں بیشتر آبادی سکھوں کی تھی۔ سکھ ان کو ہمیشہ مشکوک نظروں سے دیکھتے اور باوجود ان کی یقین دہانی کے کہ وہ واقعی دل سے سکھ مذہب اختیار کر چکے ہیں' سکھوں نے انہیں تسلیم نہ کیا اور چند شرائط پیش کیں' جن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ سرعام جھٹکے کا گوشت کھائیں۔ اس بدبخت و بدقسمت جوڑے نے جھٹکے کا گوشت کھا

کر یہ شرط پوری کردی۔ اس کے بعد سکھوں نے دوسری شرط یہ پیش کی کہ اب سور کا گوشت کھاؤ۔ ان دونوں نے اعلانیہ سور کا گوشت بھی کھالیا۔ لیکن سکھوں کو اتنی سخت شرائط منوا لینے کے باوجود بھی ان کی طرف سے دلجمعی نہ ہوئی۔ لہٰذا یہ طے پایا کہ ایک بڑا اجتماع جسے سکھ لوگ اکھنڈ پاٹھ کے نام سے موسوم کرتے ہیں' منعقد کیا جائے اور یہ دونوں اس اجتماع میں سرِ عام پیغمبر اسلام ﷺ کی بے حرمتی کریں (نعوذ باللہ من ذلک) چنانچہ وہ دونوں یہ بھی کر گزرے۔ مگر اس حرکت سے آس پاس کے دیہات کے مسلمانوں کی سخت دل آزاری ہوئی۔ ان کی غیرتِ اسلامی جاگ اٹھی اور سارے علاقے میں ہیجان پھیل گیا' جس پر سکھوں نے مسلمانوں کے مجمع عام سے اس بیہودہ و ناپسندیدہ حرکت کی معافی مانگی' مگر مسلمانوں کی تسلی و تشفی نہ ہوئی۔ مسلمان بضد تھے کہ جس نابکار و نابکار جوڑے نے اس گستاخی و بے حرمتی کا ارتکاب کیا ہے' وہ تو سامنے نہیں آیا' نہ ہی ان لوگوں نے معافی مانگی ہے اور نہ ہی ان کو کوئی احساسِ ندامت ہوا ہے۔ اس پر ایک دوسرے اجتماع کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں اس بدکردار جوڑے نے بھی مسلمانوں سے معافی مانگ لی' البتہ سکھ مذہب کو ترک نہ کیا اور اس پر حسب سابق کاربند رہے۔

اس موقع پر غازی صوفی عبداللہ انصاری کی رگِ حمیت پھڑکی۔ عبداللہ پٹی تحصیل قصور کا رہائشی تھا۔ ان دنوں چک نمبر 24 شریف میں اپنے پیر خانے پر موجود تھا۔ وہ پکا مسلمان اور سچا عاشقِ رسول تھا۔ اس نے مسلمانوں سے کہا کہ ان مرتدین نے جو گناہِ عظیم کیا ہے' اس کی معافی تو اللہ پاک یا نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی دوسرا شخص دینے کا مجاز و حقدار نہیں۔ لیکن انہوں نے جو گستاخی حضور شہنشاہِ کونین ﷺ کی بابت کی ہے' اس کی سزا انہیں اسی دنیا میں ملنی چاہیے۔ اور یہ سزا انہیں میں دوں گا۔ میں بحیثیت ایک ادنیٰ غلامِ سرکارِ مدینہ کے ان کو واصلِ جہنم کروں گا۔

اس کے بعد صوفی عبداللہ کو یہی فکر دامنگیر رہتی کہ کب اور کس وقت اور کس طرح اس کی دلی آرزو و تمنا پوری ہوتی ہے۔ نماز پڑھتا اور خاموش بیٹھا یہی سکیمیں سوچتا رہتا۔ غریب محنتی آدمی تھا۔ بالآخر اس نے کہیں سے ایک معمولی چھری حاصل کر لی اور اسے تیز کیا اور اس راز کو سینے میں چھپائے چک نمبر 24 چھوٹی کی طرف چل دیا۔ اتفاقاً اسے راستے میں چنچل سنگھ کا حقیقی بھائی نتھو مل گیا۔ عبداللہ نہ چنچل سنگھ کو جانتا تھا اور نہ نتھو کو۔ بہر حال عبداللہ کے دریافت کرنے پر نتھو نے اشارے سے بتایا کہ وہ دیکھو سامنے چنچل سنگھ اپنے کھیت میں کام کر رہا ہے۔ غریب الوطن مردِ مجاہد اس کی جانب سیدھا ہو گیا اور اسے دور ہی سے للکار کر کہا کہ تیار ہو جاؤ' عاشقِ رسول آن پہنچا ہے۔ قومی ہیکل اور ہٹا کٹا چنچل سنگھ جو ہر وقت کرپان سے مسلح رہتا تھا' کرپان سونت کر عبداللہ کی طرف بہ ارادۂ پیکار بڑھا اور کرپان کا وار بھی کیا مگر وار خالی گیا۔ ادھر اللہ کے شیر نے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے قوتِ ایمانی کے جوش اور عشقِ نبی ﷺ

کے زور سے چھری کے ساتھ حملہ کیا اور پہلے ہی وار میں گستاخ رسول ﷺ چنچل سنگھ کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ قریب ہی کھیتوں میں اس کی چہیتی بیوی دلجیت کور کام کر رہی تھی۔ عبداللہ نے اسے للکارا تو وہ بھاگ نکلی مگر عبداللہ نے اسے بھی کچھ ہی فاصلے پر جالیا اور سر کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے چنچل سنگھ کے قریب لا کر ذبح کر دیا۔ کثیر تعداد میں سکھ یہ جانگداز منظر اپنے کھیتوں میں کھڑے دیکھتے رہے مگر ان کے قریب آنے اور ان کو بچانے کی جرأت نہ کر سکے' بلکہ اتنی ہمت بھی نہ پڑی کہ غازی عبداللہ کو پکڑ لیں۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے دلوں پر اس قدر دہشت اور خوف طاری کر دیا تھا۔

پھر یہ جری مجاہد اور مرد غازی اس کام سے فارغ ہو کر بڑے اطمینان کے ساتھ قریبی سیم نالہ کی طرف گیا۔ وہاں اس نے غسل کیا۔ کپڑے دھوئے اور نوافل شکرانہ ادا کیے کہ خدا تعالیٰ نے اسے اس عظیم کارنامہ سے عہدہ برآ کیا اور کامیابی سے ہمکنار فرمایا۔ ازاں بعد غازی عبداللہ نے ہرنالہ جا کر خود ہی پولیس کے روبرو اقبالِ جرم کر لیا۔ لیکن چونکہ وہ تحصیل قصور کا رہنے والا تھا' ضلع شیخوپورہ میں کوئی گواہ اس کی شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ اس بات کی آڑ میں مقدمہ کے دوران بعض مسلمانوں نے اس کو مالی و قانونی امداد کی پیشکش کرنے کے علاوہ یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اقبالِ جرم نہ کرے تو آسانی عدالت سے بری ہو سکتا ہے۔ مگر اس عشقِ رسول ﷺ کے متوالے اور ناموسِ رسالت ﷺ کے دیوانے نے کسی پیشکش کو قبول نہ کیا اور کہا کہ میں اس ثواب عظمیٰ اور ثواب دارین سے محروم نہیں رہنا چاہتا۔ چنانچہ مقدمہ سیشن کورٹ سپرد ہوا تو وہاں بھی مردِ مجاہد نے بصد خوشی اقبالِ جرم ہی کیا۔ پھر اس جرم کی پاداش میں لاہور جیل میں اسے پھانسی دے دی گئی۔ اور اس شہید ملت کی میت کو گمنامی کی حالت میں موضع پٹی حال تحصیل امرتسر (بھارت) میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

پروفیسر افضل حسین علوی نے اس مرتد اور مردود گستاخ رسول سکھ سے غازی صوفی عبداللہ کے انتقام لینے کا واقعہ اس طریقہ سے نقل کیا:

یہ واقعہ تقسیم برصغیر سے غالباً پانچ سال پہلے یعنی 1942ء کے لگ بھگ کا ہے۔ شاتم کا نام چلچل سنگھ تھا۔ یہ شقی پہلے مسلمان تھا اور سنا ہے کہ اچھا خاصا پڑھا لکھا تھا' مگر ایک سکھ عورت کے عشق میں ایسا مبتلا ہوا کہ بالکل ہی مت ماری گئی۔ اس عورت سے شادی کرنے کی خاطر مرتد ہو کر سکھ دھرم اختیار کر لیا اور اس کے گاؤں میں جا بسا جو ضلع شیخوپورہ میں وارث شاہ کے گاؤں جنڈیالہ شیر خاں کے قرب و جوار میں تھا۔ چلچل سنگھ نے حق کو کیا چھوڑا' اس کے اندر بھری ہوئی خباثتیں باہر امڈ آئیں۔ سکھوں کے اکسانے پر وہ جگہ جگہ حضرت رسولِ اکرم و پیغمبر اعظم ﷺ کی شانِ اقدس میں دریدہ دہنی اور یاوہ گوئی

کرنے لگا۔ گاؤں کی تقریباً ساری آبادی سکھوں پر مشتمل تھی جو بے حد مالدار، ثروت مند، خوشحال اور حکومت میں اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ ادھر مسلمانوں کے صرف چند گھر آباد تھے، وہ بھی ضعیف ونادار اور نہایت کمزوری وغریبی کی حالت میں تھے اور سکھوں کا مقابلہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔

چلچل سنگھ کے گاؤں سے کوسوں دور رہنے والے صوفی عبداللہ انصاری نے ایک رات خواب میں دیکھا۔ حضور پرنُور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: ''عبداللہ یہ مرتد مجھے دکھ پہنچا رہا ہے، اس کی زبان بند کرو۔'' اتنا فرما کر حضور سرورِ عالم ﷺ تشریف لے گئے۔ صوفی عبداللہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے کانوں میں ابھی تک حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کے الفاظ گونج رہے تھے۔ وہ اپنے اندر ایک عجیب سی قوتِ ایمانی اور جوش وجذبہ کھولتا محسوس کر رہا تھا۔ وہ اٹھا اور کسی کو بتائے بغیر مرتد ومردود سکھ کے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ ذرا غور کیجئے! ایک تن تنہا مسلمان نوجوان سکھوں کے گاؤں جا رہا تھا، جو اپنی سفاکی، خونریزی اور مجرمانہ سرگرمیوں کی وجہ سے ضلع بھر میں بدنام تھے۔ اور جن کے سامنے مسلمان خود کو اتنا بے بس وبے کس پا رہے تھے کہ چلچل سنگھ کی ہرزہ سرائیاں اور اپنے پیارے نبی علیہ السلام کی شان میں گستاخیاں اور گالیاں سن کر بھی خاموش رہے۔ وہ عبداللہ بادۂ عشق رسول ﷺ سے سرشار حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم کی تعمیل میں چلا جا رہا تھا۔ اسے نہ سکھوں کی کثرت اور طاقت کی پروا تھی اور نہ اپنی بے چارگی وکم مائیگی کا احساس وخیال۔ بس ایک ہی دھن اس کے سر پر سوار تھی کہ وہ کسی طریقے سے اپنے آقا ومولا ﷺ کا فرمان بجا لائے اور آخرت میں سرخرو ہو جائے۔

صوفی عبداللہ اسی دھن میں کھویا ہوا سکھوں کے اس گاؤں میں جا پہنچا۔ صبح کا وقت تھا۔ چلچل سنگھ کے بارے میں دریافت کیا تو پتہ چلا کہ وہ گاؤں سے باہر کنویں پر ہے۔ غازی اسلام نے کنویں کا رخ کر لیا۔ چلچل سنگھ کنویں پر بیٹھا تھا۔ بہت سے سکھ قریبی کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے۔ کچھ اس بدباطن اور بدبخت سے ذرا ہٹ کر اسی کنویں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ غازی عبداللہ نے ان کے بالکل پاس جا کر پوچھا: مجھے چلچل سنگھ سے ملنا ہے۔ ادھیڑ عمر کے ایک سکھ نے اشارہ سے بتایا: وہ سامنے بیٹھا ہے۔ پس عبداللہ بجلی کی سی تندی وتیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اسے دبوچ لیا۔ اس سے پیشتر کہ چلچل سنگھ اس ناگہانی افتاد سے سنبھلتا، صوفی عبداللہ نے اسے لٹا کر چھری اس کی گردن پر پھیر دی۔ چلچل سنگھ خاصا ہٹا کٹا اور موٹا تازہ تھا۔ لیکن ادھر عشق نبی ﷺ کی قوت کارفرما تھی۔ لہٰذا اس کی مضبوط گردن دیکھتے ہی دیکھتے کٹ گئی۔ خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ غازی عبداللہ نے چھری زمین پر رکھ دی اور خود بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہو کر خدائے وحدہٗ لاشریک کا شکر بجا لایا جس نے اسے اپنے حبیب ومحبوب ﷺ کا حکم ماننے کی توفیق وطاقت بخشی۔ پھر اٹھ کر بھاگ نہیں نکلا بلکہ بڑے اطمینان وسکون کے ساتھ وہیں بیٹھ گیا۔

ایک عجیب عالم تھا۔ بدباطن چلچل سنگھ کی گردن کٹی پڑی تھی اور وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ قاتل چند قدم کے فاصلے پر بیٹھا تھا مگر کسی سکھ میں اس کے قریب آنے کی ہمت نہ تھی۔ کچھ سکھوں نے بھاگم بھاگ اس سانحہ کی اطلاع پولیس کو دی۔ پولیس آئی تو اس وقت بھی غازی عبداللہ بے حد اطمینان سے چلچل سنگھ کی لاش کے قریب بیٹھا ہوا تھا جیسے پولیس کے انتظار میں ہو۔ پولیس کے سپاہی یہ منظر دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ حیران ہو کر سکھوں سے پوچھا: ''یہ اکیلا آدمی تھا اور تم ڈھیر سارے' تعجب ہے کہ چلچل سنگھ کو پھر بھی قتل سے نہ بچا سکے۔ بلکہ اس کے قریب آنے کی ہمت بھی نہ کر سکے۔ اس پر ان کا جواب اور بھی حیران کن تھا: ''یہ اکیلا کہاں تھا اس کے ساتھ تو مسلح جم غفیر تھا' جس کی وجہ سے ہمیں نہ قتل سے پہلے اس کی طرف بڑھنے کی جرأت ہوئی' نہ قتل کے بعد اس کے قریب پھٹکنے کی ہمت پڑی۔'' اور جب غازی عبداللہ سے پولیس افسر نے دریافت کیا: ''کیا واقعی تمہارے ساتھ کوئی مسلح گروہ تھا؟'' تو اس نے نفی میں جواب دیا۔ پھر ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

نتیجتہً غازی عبداللہ کو قتل عمد کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور عدالتی کارروائی کی گئی۔ غازی و مجاہد کی طرف سے مقدمے کی پیروی شیخوپورہ کے معروف وکیل ملک انور مرحوم نے کی۔ غازی علم الدین اور غازی عبدالقیوم کی طرح غازی عبداللہ سے بھی کہا گیا کہ اقبالِ جرم سے انکار کر دو تو سزا سے بچ سکتے ہو مگر عبداللہ کا جواب بھی وہی تھا جو پہلے دو غازیوں اور شہیدوں کا تھا کہ ''اس طرح تم لوگ مجھے بارگاہِ رسالت و نبوت میں حاضری سے محروم کرنا چاہتے ہو جو مجھے ہرگز منظور نہیں اور پھر یہ کہ اس جرم سے کیسے انکار کروں جس پر مجھے فخر و ناز ہے اور جو میری مغفرت و بخشش کے لیے میری زندگی کا سب سے بڑا نیک عمل ہے۔'' چنانچہ غازی عبداللہ کے نصیبوں میں چونکہ شہادت اور دربارِ رسالت میں فوری حاضری لکھی تھی' اس لیے فیصلہ عبداللہ کے خلاف ہوا اور اسے موت کی سزا سنا دی گئی۔ عدالت نے فیصلہ سنایا تو غازی کا چہرہ بشاشت سے چمک اٹھا اور جب اسے پھانسی کے تختے کی جانب لے کر گئے تو وہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا:

جان دی' دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ہر دو ماخذ سے واقعہ مذکورہ کی جزئیات پیش کرنے کے بعد مضمون نگار عرض کرتا ہے کہ سرزمین پاکستان و ہند میں تفحص و جستجو اور غور و خوض سے ایسے بے شمار غازیانِ اسلام کا کھوج لگایا جا سکتا ہے جنہوں نے ناموس و تحفظِ رسالت ﷺ اور عشق و محبت مصطفوی ﷺ میں اپنی جانیں اللہ و رسول ﷺ کی راہِ حقہ میں نثار کیں' مگر ماہرین تاریخ اور بالخصوص غیر مسلم مؤرخین نے ایسے سرفروشانِ

نبی و جاں نثارانِ اسلام کے ساتھ زیادتی کی انہیں پس پردہ رکھا ان کو منظر عام پر نہ آنے دیا اور ایسے واقعات کی نشر و اشاعت سے حتی الامکان گریز کیا تا کہ اس قسم کی قربانیوں سے مسلمانوں میں نیا ولولہ پیدا نہ ہو ان کا جذبۂ ایمانی جوش میں نہ آئے اور تہذیبِ مغرب کا وہ میٹھا زہر جو اس قوم کے مزاج میں شامل کیا جا رہا ہے اس کا عمل رک نہ جائے مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ۔

کشتگانِ خنجر تسلیم را
ہر زمان از غیب جانے دیگر است



غازی محمد صدیق شہیدؒ

اتیج ساجد اعوان

''غازی محمد صدیق شہیدؒ کا تعلق شیخ برادری سے تھا۔شمع نبوت کے اس شیدائی کی ولادت باسعادت 1914ء کے درمیانی مہینوں میں ہوئی۔ پانچ سال کا ہو جانے پر انہیں مسجد میں بٹھایا گیا۔1925ء تک دینی تعلیم کے علاوہ آپ پانچویں جماعت بھی پاس کر چکے تھے۔ چونکہ آپ کے والد ماجد شیخ کرم الٰہی فیروز پور چھاؤنی میں' جو قصور سے قریباً پندرہ میل کے فاصلے پر ہے' کچے چمڑے کا آبائی پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ وہ اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے گئے۔ غازی صاحب کو چھاؤنی کے قریب ہی ایک تعلیمی ادارے میں داخل کرایا گیا' جہاں آپ تین سال تک زیر تعلیم رہے اور آٹھویں کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران آپ کے والد گرامی چند روز کی ناسازی طبیعت کے بعد جہانِ فانی سے کوچ فرما گئے۔ غازی محمد صدیق شہیدؒ کی والدہ محترمہ کا نام عائشہ بی بی تھا۔ آپ بڑی نیک سیرت اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ ان کی تربیت کا اثر موصوف کے تاریخی عمل سے 1935ء میں سامنے آیا جب شمع رسالت کے یہ پروانے تختۂ دار کو رونق بخش گئے۔

آقا حضور حبیب کبریا ﷺ کے نام نامی سے ان کی محبت اور وارفتگی کی صحیح کیفیت کا بیان تو کسی صورت بھی الفاظ میں ممکن نہیں۔ ذات اقدس سے ان کی محبت والفت والہانہ تھی۔ لباس ہمیشہ سنت کے مطابق رکھتے...... نماز تو کبھی قضا نہ ہونے دی۔ روزے کے بھی سختی سے پابند تھے۔ غازی ممدوح کے برادر اصغر شیخ محمد شفیع طاہر صاحب نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے: ''چھوٹی عمر ہی میں آپ نے حضرت شیخ محمد صاحب نقشبندی محلہ پیرانوالہ نزد دہلی دروازہ (فیروز پور) کے دست حق پرست پر بیعت کر لی تھی اور حفظ قرآن کے لیے بھی کوشاں رہنے لگے۔'' (ماہنامہ ''نعت'' لاہور' جلد 4' شمارہ 4' ص 62)

ایک طرف رنگ مہر ووفا شوخ ہوتا رہا تو دوسری طرف ''قصور'' کی فضائیں پالال سنار کے غلیظ وجود سے متعفن ہو رہی تھیں۔

''مسمی پالال سنار ایک صاحب ثروت ہندو سنار تھا۔ اس کی دکان درگاہ حضرت بلھے شاہؒ سے ذرا دور تھی۔ اس کی پشت پر ہندو ساہوکاروں کا ہاتھ تھا۔ بنیوں کے ٹولے کی حمایت میں ابتداءً وہ مسلمانوں کی معاشی ناسازگاریوں پر بکواس کرتا تھا۔ اس نے کئی بار برملا کہا ''قرضہ تو یہ واپس دیتے نہیں اور بنے پھرتے ہیں ''مسلمان''۔ ایک مرتبہ اس نے کہا ''مسلمانوں کا خدا اپنے بندوں سے زکوٰۃ کی بھیک مانگتا ہے جبکہ ان بے چاروں کو دو وقت کی روٹی بھی کھانے کو نہیں ملتی۔'' مسلمانوں کو چپ سادھے دیکھ کر اس کا حوصلہ روز بروز بڑھتا گیا اور اولیائے عظام (رحمہم اللہ) کے متعلق گالیاں بکنا اس کا معمول بن گیا۔ ہندوؤں کو اکٹھا کر کے نماز کی نقلیں اتارنا اور اپنی عجیب وغریب حرکات سے انہیں ہنساتے رہنا گویا اس کا ہر روز کا مشغلہ تھا۔ بات فحش کلامی سے بہت آگے جا چکی تھی۔

روزنامہ ''انقلاب'' لاہور کی 7 ستمبر 1934ء کی اشاعت کے مطابق مسمی پالال نے بے ادبیوں کا یہ کھلم کھلا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ 16 مارچ کو جب لوگ نماز پڑھ رہے تھے تو مردود مذکور نے نہ صرف نماز کا مضحکہ اڑایا بلکہ سرکار مدینہ ﷺ کی ذات اقدس کے متعلق نازیبا کلمات بکے۔ شان رسالت مآب ﷺ میں صریحاً گستاخی کی اس قبیح حرکت پر پورے شہر میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی۔ مسلم

معززین کے مشورے پر محمد کلیم پیر صاحب نے عدالت میں استغاثہ دائر کر دیا۔ مسٹر ٹیل مجسٹریٹ درجہ اول لاہور نے بڑی تندہی سے اس مقدمے کی موشگافیوں کو پیش نظر رکھا۔ بالآخر فریقین کے دلائل سننے کے بعد مجسٹریٹ مذکور نے اپنے فیصلے میں لکھا ''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملزم نے واقعی توہین رسالت مآب ﷺ کی ہے جس سے مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہوئے اور سخت فساد کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس لیے پالا مل کو چھ ماہ قید اور دو سو روپے جرمانہ کی سزا دی جا رہی ہے۔'' (ایضاً ص 64-63)

10 ستمبر 1934ء کے روزنامہ ''سیاست'' لاہور میں اس کی تفصیل یوں درج ہے ''پالا مل سنار کے خلاف توہین پیغمبر اسلام ﷺ کے الزام میں مقدمہ چلتا رہا۔ ملزم نے مجسٹریٹ کے فیصلے کے خلاف مسٹر بھنڈاری سیشن جج لاہور کی عدالت میں اپیل دائر کر دی۔ یہاں سے اسے تا فیصلہ ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔''

(ایضاً ص 64)

ان دنوں فیروز پور روڈ سے گزرنے والوں نے سنا کہ لاہور چوبرجی کے نزدیک واقع مشہور گورستان میانی صاحب سے غم ناک چیخیں بلند ہو رہی ہیں۔ درد کی شدت اور آواز کا کرب مسلسل بڑھتا ہی چلا گیا۔ دل ہلا دینے والی یہ آہیں ''غازی علم الدین شہید'' کے مقبرے سے اٹھ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے آپ کہہ رہے ہوں کہ میں قبر میں تڑپ رہا ہوں۔ کون ہے جو میرے لیے سامانِ تسکین ڈھونڈ لائے۔ راجپال کا ہم ذوق قصور کی شاہراہوں پر دندناتا پھر رہا ہے۔ کیا میرے چاہنے والے مر گئے ہیں؟ اگر میرا کوئی جواں سال وارث زندہ ہے تو وہ خدا کے لیے تختۂ دار پر بزم رقص سجا کر مجھ سے ہم آغوش ہو جائے۔ وہ دیکھو سامنے آقا و مولیٰ ﷺ کوہ رضم کی چوٹیوں پر استقبال کے لیے تشریف فرما ہیں۔ ہے کوئی شہیدِ رسالت' جو آپ ﷺ کے بازوؤں میں سمٹ جائے۔''

(ایضاً ص 64)

''انھی دنوں کا ذکر ہے ایک رات حافظ غازی محمد صدیق صاحب نیند میں تھے کہ مقدر جاگ اٹھا۔ نصف شب بیت چلی تھی' جب آپ کو سرورِ بنی آدم' روحِ رواں عالم' دلیل کعبہ مقصود' کاشف سر مکنون' خازن علم مخزون جناب احمد مجتبیٰ'

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ سرکار ﷺ نے فرمایا ''قصور میں ایک بدنصیب ہندو پے در پے ہماری شان میں گستاخیاں کرتا چلا جا رہا ہے۔ جاؤ اور اس ناپاک زبان کو لگام دو۔'' قبلۂ صدق و وفا' کعبۂ ارباب حلم و حیاء وارث علوم اوّلین' مورث کمالات آخرین' شہنشاہ فضائل و کمالات' رحمتہ للعالمین خاتم النبیین ﷺ کی حرمت و عزت کا یہ جانباز محافظ کئی روز تک شدت غم و غصہ سے پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ان کے سینے میں جوش غضب کی چنگاریاں چیخ رہی تھیں۔ ان کے دل میں ایک ہی جذبہ موجزن تھا کہ وہ جلد از جلد قصور پہنچ کر اپنے آقا و مولا ﷺ کے دشمن کو جہنم رسید کریں۔'' (ایضاً ص 64-65)

10 ستمبر 1934ء کی بات ہے انہوں نے اپنی والدہ ماجدہ سے عرض کی کہ ''مجھے خواب میں ایک دریدہ دہن کافر دکھلا کر بتایا گیا ہے کہ یہ ناہنجار توہین نبوی ﷺ کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اسے گستاخی کا مزہ چکھاؤ تاکہ آئندہ کوئی شاتم اس امر کی جرأت نہ کر سکے۔ میں قصور اپنے ماموں کے پاس جا رہا ہوں۔ گستاخ موذی وہیں کا رہنے والا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس ذلیل کتے کی ذلت ناک موت میرے ہی ہاتھوں واقع ہو گی۔ نیز مجھے تختۂ دار پر جام شہادت پلایا جائے گا۔ آپ دعا فرمائیں' بارگاہ سرکار ﷺ میں میری قربانی منظور ہو اور میں اپنے اس عظیم فرض کو بطریق احسن نبھا سکوں۔'' ماں نے بخوشی اجازت دے دی۔ ایک مومنہ کے لیے اس سے بڑھ کر کیا مسرت ہو سکتی ہے کہ اس کا بیٹا دین اسلام کے کام آئے۔'' (ایضاً ص 65)

''17 ستمبر 1934ء کی شام کا واقعہ ہے حضرت قبلہ غازی صاحب دربار بابا بلھے شاہ کے نزدیک نیم کے درخت سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ عقابی نگاہیں آنے جانے والوں کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ اتنے میں ایک ایسا شخص دکھائی دیا' جس نے چہرے پر کسی حد تک نقاب اوڑھ رکھا تھا۔ آپ نے جھٹ اس کی راہ روکی اور پوچھا ''تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ یہاں کیا کرتا ہے۔'' اسے اپنا نام بتانے میں تامل تھا۔ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی۔ آپ کو تنہا دیکھ کر اسے بھی حوصلہ ہوا۔ وہ کہنے لگا ''مسلمانوں نے پہلے میرا کیا بگاڑ لیا ہے اور اب کون سی قیامت آ جائے گی۔'' الغرض غازی موصوف نے اسے پہچان لیا کہ

یہی وہ گستاخ رسول ﷺ ہے' جسے ٹھکانے لگانے پر اسے مامور کیا گیا ہے۔
غازی نے فرمایا کہ "میں تاجدار مدینہ ﷺ کا غلام ہوں۔کئی دنوں سے تیری تلاش میں تھا۔اے دہن دریدہ ملیچھ! آج تو کسی طرح بھی ذلت ناک موت سے نہیں بچ سکتا۔" یہ کہہ کر آپ نے تہہ بند سے رمبی (چمڑا کاٹنے کا اوزار) نکالی اور للکارتے ہوئے اس پر حملہ آور ہو گئے۔حافظ محمد صدیق متواتر وار کیے جا رہے تھے اور زور زور سے نعرۂ تکبیر لگا کر بے غیرت پر برس پڑے۔واقعات کے مطابق پورے ساڑھے سات بجے بارگاہ رسالت ﷺ میں گستاخی کرنے والا یہ خناس شخص' جسے لوگ لالہ پالا مل شاہ کے نام سے جانتے تھے' اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔" (ایضاً ص 66-65)

"مقتول مردود کے واویلا اور آپؒ کے نعرہ ہائے تکبیر سے کثیر تعداد میں لوگ اس جانب متوجہ ہو چکے تھے۔عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ "غازی اس وقت تک ملعون ساہوکار کی چھاتی سے نہیں اترے' جب تک موت کا پختہ یقین نہیں ہو گیا۔غازی کا لباس ناپاک خون کے چھینٹوں سے آلودہ ہو چکا تھا۔اردگرد بھی گندے لہو کے داغ ہی داغ تھے۔مقتول کا چہرہ نہ صرف بری طرف مسخ ہوا' بلکہ ہیبت ناک شکل اختیار کر گیا تھا۔یہاں تک کہ ڈر کے مارے کوئی قریب نہ پھٹکتا تھا۔" میڈیکل رپورٹ کے مطابق اس کے جسم پر چالیس زخموں کے واضح نشان تھے۔موقع پر موجود افراد کا بیان ہے کہ اگر غازی صاحب فرار ہونا چاہتے تو با آسانی ایسا کر سکتے تھے مگر انہوں نے اپنے فرض سے فارغ ہو چکنے کے بعد دوگانہ نماز شکرانہ ادا کی اور قریبی مسجد کی سیڑھیوں پر اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے اور وقفے وقفے سے زیر لب مسکراتے اور گنگناتے رہے۔اس وقت تمام ہندوؤں کے چہرے اترے اترے تھے مگر غازی صاحب نہایت مطمئن اور سرشار نظر آتے۔دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ کی یہ ادا مسلمانوں کی سربلندی اور غیرت مند فطرت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔" (ایضاً ص 66)

20 ستمبر 1943ء کو روزنامہ "سیاست" کے پرچہ میں یہ خبر ان الفاظ میں شائع ہوئی:

"قصور ضلع لاہور 17 ستمبر گزشتہ شب گیارہ بجے کے قریب قصور سے یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ لالہ پالا مل شاہ ساہوکار کو شام ساڑھے سات بجے قتل کر دیا

گیا ہے۔ اس قتل کے سلسلے میں ایک مسلمان محمد صدیق کو گرفتار کیا گیا ہے۔ پالا شاہ کے خلاف توہین اسلام کے الزام میں مقدمہ چلتا رہا۔ مسٹر ٹیل مجسٹریٹ لاہور نے پالامل کو چھ ماہ قید اور 200 روپے جرمانے کی سزا دی۔ اس فیصلے کے خلاف اس نے مسٹر بھنڈاری سیشن جج لاہور میں اپیل دائر کی تھی۔ اس کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ قتل بلھے شاہ کی خانقاہ میں ہوا اور قتل کے الزام میں محمد صدیق کو گرفتار کیا گیا ہے۔ پولیس بڑی تندہی سے تفتیش کر رہی ہے۔"

"جب حضرت قبلہ غازی صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو انہوں نے فرمایا "بلاشبہ پالامل کو میں نے قتل کیا ہے کیونکہ اس ملعون نے رسول کریم ﷺ کی توہین کی تھی۔ وہ دیدہ دانستہ اس جرم کا مرتکب ہوا۔ اسے راجپال اور غازی علم الدین شہیدؒ کے واقعہ کا بھی بخوبی علم تھا۔ اس نے سب کو جانتے بوجھتے ہوئے خود کو سزا کے لیے پیش کیا۔ اگر اس واقعہ (شان رسالت میں گستاخی) پر بیس سال بھی گزر جاتے تب بھی میں اسے ضرور بالضرور واصل جہنم کرتا۔ ہمارے مذہب کے مطابق وہ ہرگز مسلمان نہیں بلکہ کوئی منافق ہے، جو نبی پاک ﷺ کی توہین سن کر خاموش رہے اور عصمتِ رسول ﷺ پر جان قربان نہ کرے۔ کسی اور شخص کی ذات کا مسئلہ ہو تو برداشت ہو سکتا ہے' دنیوی امور میں کسی بھی فرد کی شان میں بکواس پر چپ رہا جا سکتا ہے لیکن سرکار مدینہ ﷺ کے مقام و مرتبہ پر ہرزہ سرائی کرنے والوں کے خلاف غیظ و غضب' جوش و ولولہ اور غصہ کسی حالت میں بھی کم نہیں ہو سکتا۔ میں نے جو کچھ کیا' خوب غور و فکر کے بعد غیرتِ دینی کے سبب اپنے رسول ﷺ کی شان کو برقرار رکھنے کے لیے کیا ہے۔ اس پر مجھے قطعاً تاسف یا ندامت نہیں بلکہ میں اپنے اس اقدام پر بہت خوش اور نازاں ہوں۔ عدالت زیادہ سے زیادہ جو سزا دے سکتی ہے' جب چاہے دے دے۔ مجھے قطعاً حزن و ملال نہ ہوگا۔ مگر جب تک ہمیں شہنشاہ مدینہ ﷺ کی حرمت اور تقدس کے تحفظ کی ضمانت فراہم نہیں کی جاتی' کوئی نہ کوئی سرفروش نوجوان بزم دار و رسن میں چراغ محبت جلاتا رہے گا۔ یہ تو ایک جان ہے' اس کی بات ہی کیا ہے؟ میں تو آپ ﷺ کی خاک قدم پر پوری کائنات بھی نچھاور کر ڈالوں تو میرا عقیدہ' ایمان اور عشق و وجدان یہی کہتا ہے کہ

گویا ابھی حق غلامی ادا نہیں ہوسکا۔"

"سیشن کورٹ میں حافظ غازی محمد صدیق کے مقدمہ کی سماعت چھ دسمبر 1934ء کو سنٹرل جیل لاہور میں مسٹر ٹیل کے روبرو شروع ہوئی۔ استغاثہ کی طرف سے خان قلندر علی خان پبلک پراسیکیوٹر اور صفائی کے لیے میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹر اور شیخ خالد لطیف گابا ایڈووکیٹ پیروکار تھے۔"

(ایضاً ص 60-59)

وکیل صفائی میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹر نے اپنی طرف سے بڑے مدلل اور جامع قانونی نکات فاضل جج کے سامنے بیان کیے۔ انہوں نے اپنی طویل بحث کے دوران کہا:

"میرا مسئلہ یہ ہے کہ ملزم کو مقتول سے کوئی ذاتی عداوت نہ تھی۔ اگر اس نے یہ فعل کیا ہے تو مذہبی عقیدہ کے تحت کیا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نوجوان ملزم کا بیان کہ میں بیس سال بعد بھی توہین رسالت کا انتقام لینے سے نہ ٹلتا۔ یہ کس جذبے کا ترجمان ہے؟ اس لیے کسی طور پر بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اسلامی روایات کے مطابق رسول کریم ﷺ کی تعظیم وتکریم خدا کے بعد دوسرے درجے پر ہے۔ پکے اور سچے مسلمان وہ ہیں، جو اپنے آقا ومولیٰ ﷺ کی شان میں کسی طرح کی ادنیٰ گستاخی کو بھی برداشت نہیں کرسکتے اور وہ آپ ﷺ کی شان برقرار رکھنے کے لیے اپنی جانیں دیوانہ وار فدا کرتے ہیں۔ محمد صدیق کے دل میں بھی اٹھارہ ماہ سے یہی جذبہ موجزن تھا اور اس نے جذبہ ایمان سے سرشار شہنشاہ مدینہ کی تعظیم وتکریم پر اپنا سب کچھ قربان کردیا...... لہٰذا بہت سے گزشتہ ایسے مقدمات کی مثالیں موجود ہیں، جن کے حوالے سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ملزم کو زیادہ سے زیادہ حبس دوام کی سزا دی جائے۔" (ایضاً ص 65)

"سیشن کورٹ میں فیصلے کے دن حضرت قبلہ حافظ صاحبؒ کی والدہ نے اپنے جواں سال بیٹے کی پیشانی چومتے ہوئے نہایت حوصلے کے ساتھ فرمایا "میں خوش ہوں۔ جس رسول ﷺ کی شان کے تحفظ کے لیے تم قربان گاہ پر جارہے ہو، اس محبوب کردگار ﷺ کی شان قائم رکھنے کے لیے مجھے تم جیسے بیس بیٹوں کی قربانی دینا پڑے تو رب کعبہ کی قسم! کبھی دریغ نہ کروں۔" روزنامہ "انقلاب" لاہور اور دیگر معاصر مسلم اخبارات میں غازی صاحب کی والدہ کے

اس جرأت مندانہ بیان کے علاوہ غازی موصوف کے بارے میں یہ بھی درج ہے کہ آپ نے ان ایمان پرور الفاظ کو سنتے ہی زور سے نعرہ تکبیر بلند کیا اور والدہ موصوفہ سے اپنے گناہوں اور غلطیوں کی معافی مانگتے ہوئے کہا کہ میں نے پالا مل کو قتل کر کے اپنے نبی ﷺ کی شان قائم رکھنے کے لیے جو قربانی پیش کی ہے اس کی خاطر اگر مجھے ہزار مرتبہ بھی جینا یا مرنا پڑے تو تب بھی ہر دفعہ ناموس رسالتؐ پر پروانہ وار فدا ہوتا رہوں گا اور اسے صدق دل سے اپنا فرض عین سمجھتا ہوں۔"

(ماہنامہ "نعت" لاہور' جلد 4' شمارہ 4' ص 68)

"سیشن کورٹ میں غازی محمد صدیقؒ کے لیے سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ زندہ دلانِ قصور نے اس فیصلہ کے خلاف ہائی کورٹ لاہور میں اپیل گزار دی۔
عدالت عالیہ میں 31 جنوری 1935ء کو سماعت ہوئی۔ فیصلہ صادر کرنے کے لیے ایک ڈویژنل بنچ تشکیل دیا گیا۔ اس میں چیف جسٹس اور جسٹس عبدالرشید شامل تھے۔ فیصلہ کے طور پر سیشن کورٹ کا حکم بحال ہوا۔" (ایضاً ص 69)

غازی محمد صدیق نے اپنی آخری وصیت میں فرمایا:

"مجھے صرف قرآن اور صاحب قرآن (ﷺ) سے انس ہے۔ آپ بھی ہمیشہ انہی سے لو لگائے رکھیں۔ میری قبر پر کبھی کوئی خلاف شرع عمل نہ کیا جائے اور نہ اس کی اجازت دینا۔ نیز قوالی بھی نہ ہو کہ سلسلہ نقشبندیہ میں اس کی ممانعت ہے۔ میری خوشی اسی میں ہے کہ خدانخواستہ اگر پھر بھی کہیں کوئی گستاخ رسول جنم لے تو میرے متعلقین میں سے ایک نہ ایک فرد باطل علامت کو ٹھکانے لگا دے۔"

"جیل حکام سے روایت ہے کہ تختۂ دار پر آپ کی زبان پر آخری الفاظ یہ جاری تھے "میرے اللہ تیرا ہزار شکر کہ تو نے اپنے حبیب پاک ﷺ کی عظمت کے تحفظ کے لیے مجھ ناچیز کو کروڑوں مسلمانوں میں سے منتخب فرمایا۔"

"قربان گاہ میں خونِ دل کی حدت سے مشعل وفا کو فروزاں رکھنے والے اس خوبرو مجاہد کی عمر اس وقت اکیس سال تھی۔"

"شہید رسالت کا عظیم منصب عطا ہونے پر غازی محمد صدیق کی والدہ صاحبہ نے

دیگر خواتین کو بھی اس موقع پر چیخ و پکار سے سختی کے ساتھ منع کر رکھا تھا۔ جب کوئی عورت تعزیت کی غرض سے ان کے پاس آتی تو آپ فرماتیں "اس واقعہ پر غم و اندوہ کا کیا جواز ہے؟ حضور ﷺ پر قربان ہونا تو خوشی کا مقام ہے۔"

"جنازہ عیدگاہ کے قریب اسلامیہ ہائی سکول قصور (موجودہ بوائز ڈگری کالج) کے ہال میں رکھا گیا' جہاں ان گنت مسلمان پُرنم آنکھوں سے شہید کی زیارت سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوتے اور دوسرے دروازے سے نکل جاتے تھے۔ کافی دیر تک پردہ نشین مستورات شہید کا چہرہ مبارک دیکھنے کو آتی رہیں۔"

"ٹھیک ایک بجے جنازہ اٹھایا گیا اور جلوس کی صورت میں نصف میل کا فاصلہ پورے تین گھنٹے میں طے ہوا۔ نماز جنازہ پریڈ گراؤنڈ میں ادا کی گئی' جس میں محتاط اندازے کے مطابق ایک لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی۔ جنازے کو کندھے دینے کے لیے چارپائی کے ساتھ۔ لمبے لمبے بانس باندھ دیئے گئے تھے۔ آپ کے جسد مبارک کو قبرستان میں پہنچایا گیا اور فدائی حبیب کبریا ﷺ غازی محمد صدیق شہید کو پورے چھ بجے سپرد خدا و رسول جل شانہ ﷺ کر دیا گیا۔" (ایضاً ص 71)

موت کو غافل سمجھتے ہیں اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی' صبح دوام زندگی

(اقبالؒ)

خطہ پاک و ہند پر آزادی سے پہلے کچھ آزاد سخن زمانے کی تلخیوں سے بے نیاز' جانباز مجاہد قبیلۂ عشاق کے مقتداء اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر عشق کے میدان میں ایسے معرکے سر کر گئے کہ تاریخ کی پیشانی ان کے اسمائے گرامی کے جھومر سے چمک رہی ہے' جن کا ذوق نظر یہ تھا۔

اس شرط پہ کھیلوں گا صنم پیار کی بازی
جیتوں تو تجھے پاؤں ہاروں تو صنم تیرا

تاریخ نے جنہیں غازی اور شہید کے نام سے خراج تحسین پیش کیا' جن کی جرأت اور مردانگی نے قحط الرجال کے تصور ماتم کو مٹا دیا' ہاں! یہ انہی پاک باز مجاہدوں کی کہانی ہے کہ جن کے تلووں کے دھوون سے انسانیت کو بقاء حاصل ہے۔



غازی بابو معراج دین شہیدؒ

محمد محسن اقبال

تاریخ ایک آئینہ ہے جس میں سلطنتوں، ملکوں، قوموں کی عظمت، جاہ وجلال، اقتدار، عسکری مہمات، تہذیبی کمالات اور اپنے اسلاف کے کارناموں کے خدوخال واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ جو قوم اپنی تاریخ سے واقفیت نہیں رکھتی، اس کا اس دنیا میں ایک باوقار اور توانا قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ممکن نہیں۔ جس قوم کا ماضی درخشندہ اور تابناک ہو اس کے افراد میں از سر نو فکر وعمل کو بیدار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اسلاف کے کیے ہوئے عالیشان کارناموں کو اجاگر کیا جائے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں اس قوم کے اصل اور حقیقی روپ کو دیکھ سکیں۔ آج ہم اس لازوال اور عظیم شخصیت کے بارے میں بیان کریں گے جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دربار میں اپنی جان کا نذرانہ عقیدت پیش کیا، اس عظیم ہستی کا نام بابو معراج دین تھا۔ آپ 1921ء میں اندرون لوہاری گیٹ لاہور کے محلہ چڑی ماراں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا نام چوہدری اللہ دتہ تھا اور آپ قوم کمبوہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور بہت محنت کش لوگ تھے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ لوہاری گیٹ سے حاصل کی۔ آپ کو ابتداء ہی سے اسلام سے گہرا لگاؤ تھا اور بہت حساس طبیعت کے مالک تھے۔ مذہبی لگاؤ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

اس دور میں ہندوستان انگریزوں کی غلامی کی صعوبتیں برداشت کر رہا تھا اور مسلمان سب سے زیادہ نشانہ بن رہے تھے۔ ان دنوں میں ایک بہت اہم واقعہ پیش آیا جس نے خاص طور پر لاہور

کے مسلمانوں کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ 19 اپریل 1929ء کو لاہور کے ایک باغیرت عاشقِ رسول ﷺ علم الدین نے کتابوں کے ہندو تاجر راجپال کو قتل کر دیا۔ اس نے اپنی کتاب میں نبی اکرم ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کی تھی۔ یہ واقعہ ہسپتال روڈ انارکلی لاہور میں پیش آیا۔ علم الدین کو اس قتل کے عوض شہادت کا رتبہ ملا۔ اس واقعہ نے لاہور بلکہ پورے ہندوستان میں مذہبی بیداری پیدا کر دی۔ اس واقعہ کے تقریباً چھ سال بعد 1935ء کو لاہور شہر میں ہی ایک اور ہولناک واقعہ ہوا جس نے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ سکھوں نے مسجد شہید گنج کو مسمار کرنے کی ناپاک جسارت کی۔ لاہور کے مسلمانوں نے اس پر سخت ردِعمل کا اظہار کیا۔ اس وقت لاہور میں بڑا مذہبی جوش و خروش تھا۔ بہت سے مسلمان نوجوانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ چونکہ معراج دین ایک حساس طبیعت کے مالک تھے' ان دونوں واقعات نے آپ کے ذہن میں اور زیادہ گرمی پیدا کر دی۔ ان کے مذہبی عقائد پختہ ہوتے چلے گئے۔ اپنی اس پیاس کو بجھانے کے لیے آپ نے مذہبی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

1940ء میں آپ نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ آپ کو لکھنؤ چھاؤنی میں تعینات کیا گیا۔ آپ نے فوج میں رہ کر بھی مذہبی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ آپ نے چند مسلمان فوجیوں کو ساتھ ملا کر چھاؤنی میں ایک مسجد قائم کی اور اس مسجد میں نماز پنجگانہ ادا ہونے لگی۔ اس کے علاوہ شام کو مسجد میں درس دیا جاتا تھا۔ یہ سارا سلسلہ ایک تنظیم کی شکل اختیار کر گیا۔ آپ تحریک پاکستان کے بھی بڑے حامی تھے۔ آپ نے چھاؤنی میں مسلمان فوجیوں کو پاکستان کی اہمیت کا احساس دلایا۔ اس چھاؤنی کا کمانڈر ایک سکھ میجر ہردیال سنگھ تھا۔ یہ مسلمانوں کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ بابو معراج دین اور ان کے ساتھیوں کی مذہبی اور سیاسی سرگرمیاں اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ انہی دنوں بابو معراج دین اور ان کے ساتھیوں نے عیدالضحیٰ کے موقع پر قربانی کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ لوگ جب قربانی میں مصروف تھے کہ وہاں پر میجر ہردیال سنگھ آ گیا اور اس نے مسلمانوں کے اس مقدس تہوار کا مذاق اڑایا اور قربانی کے گوشت کی بے حرمتی کی۔ بابو معراج دین کو اس کی یہ بدتمیزی برداشت نہ ہوئی۔ آپ نے اسی چھری کے ساتھ اس گستاخ سکھ کو اس کے کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ حکومت برطانیہ نے آپ کے خلاف کورٹ مارشل کیا اور آپ کو موت کی سزا سنائی۔ یہ 1942ء لکھنؤ چھاؤنی کا ایک مشہور واقعہ تھا۔ یہ خبر پورے شہر لکھنؤ اور چھاؤنی میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ چونکہ اس واقعہ سے لکھنؤ شہر اور چھاؤنی میں فرقہ وارانہ فساد کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا' چنانچہ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے انگریز فوجی حکومت نے سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا۔ چونکہ اس واقعہ سے لکھنؤ میں حالات ٹھیک نہیں تھے اس لیے معراج دین کو منٹگمری

(ساہیوال) جیل میں بھیج دیا گیا۔ یہاں پر بھی آپ کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ 1943ء میں آپ کو لاہور سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ آپ صوم وصلوۃ کے بڑے پابند تھے اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ آپ نے جیل ہی میں قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی اور زیادہ تر مذہبی رہنماؤں کا لٹریچر پڑھا کرتے تھے۔

ان دنوں پاکستان کے حصول کے لیے سرگرمیاں تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ آپ نے جیل میں مسلمان قیدیوں کو پاکستان کی افادیت سے روشناس کروایا۔ پاکستان کی آزادی کے فوراً بعد آپ کو رہا کر دیا گیا کیونکہ آپ کو جس جرم کی سزا ملی تھی، وہ جرم نہیں تھا بلکہ عبادت تھی۔ یہ ان کا مذہبی لگاؤ تھا۔ اس وقت آپ کا خاندان پیر غازی روڈ اچھرہ منتقل ہو چکا تھا۔ آپ رہائی پانے کے بعد ایک مکمل اور صالح مسلمان بن چکے تھے۔ 1949ء میں آپ کی شادی ہوگئی۔ خدا نے آپ کو دو بیٹوں سے نوازا۔

1951-52ء میں ختم نبوت کی تحریک زوروں پر تھی۔ آپ ایک سچے عاشق رسول تھے۔ آپ نے اس تحریک میں بھرپور طریقے سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاریؒ کا شمار اس تحریک کے بانیوں میں سے ہوتا تھا۔ آپ ایک شعلہ بیان مقرر تھے۔ بابو معراج دین کو شروع ہی سے شاہ جیؒ سے بڑی عقیدت تھی اور آپ جیل میں بھی ان کا لٹریچر پڑھا کرتے تھے۔ آپ ان کے جلسے اور جلوسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری صاحب بابو معراج دین سے دلی پیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اچھرہ کے عالم دین حضرت بابا فتح محمد المعروف بابا عطارؒ نے معراج دین کی سرپرستی کی۔ بابا جی ایک ولی اللہ تھے۔ آپ کو اسلام سے بڑا لگاؤ تھا۔ اچھرہ کے رہنے والوں پر آپ کے بڑے احسان ہیں۔ آپ نے یہاں کی تین پشتوں کو قرآن پاک پڑھایا۔ آپ نے اسلام کی بڑی خدمت کی۔ بابو معراج دین کو بابا جی سے خاص عقیدت تھی۔ بابا جی ان سے بڑا پیار کرتے تھے۔ اکثر بابا جی سے ختم نبوت کے سلسلے میں راہنمائی حاصل کرتے تھے۔ معراج دین نے بابا جی کی صدارت میں اچھرہ میں بہت سے جلسے منعقد کروائے اور بابا جی لوگوں کو ختم نبوت کی اہمیت کا احساس دلاتے رہے۔

6 مارچ 1952ء بروز جمعہ المبارک کو معراج دین نے جمعہ کی نماز کے بعد مسجد تکیہ لہری شاہ کے باہر لوگوں کو اکٹھا کیا۔ بابا فتح محمدؒ نے اس اجتماع سے ایک ولولہ انگیز تقریر کی۔ بابا جی کی قیادت میں یہ اجتماع جلوس کی شکل اختیار کرتے ہوئے مسجد وزیر خان کی طرف روانہ ہوا۔ بابا جی نے چند قدم اس جلوس کی قیادت کی، چونکہ آپ بہت کمزور تھے آپ نے جلوس کی قیادت معراج دین کے سپرد کر دی۔ آپ برگزیدہ ہستی تھے اور آپ جان چکے تھے کہ معراج دین کو بلند رتبہ ملنے والا ہے۔ آپ نے معراج دین کو دعا دیتے ہوئے الوداع کیا۔ بابا جی مسجد تکیہ لہری شاہ کے کونے میں آرام فرما رہے ہیں۔

جلوس میں اچھرہ' مزنگ اور گرد و نواح کے رہنے والوں نے شرکت کی۔ کوئی ایسا گھر نہ تھا جس نے اس جلوس میں حصہ نہ لیا ہو۔ چونکہ موجودہ حکومت اس تحریک ختم نبوت کو سختی سے کچل دینا چاہتی تھی' چنانچہ مال روڈ پر جہاں آج سٹیٹ بنک کی نئی عمارت قائم ہے' فوج نے اس جلوس کا راستہ روک لیا۔ ان کو منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج اور آنسو گیس استعمال کی گئی۔ اسی دوران فوج نے گولی چلا دی۔ بابو معراج دین کو دائیں بازو پر پہلی گولی لگی۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو لیٹ جانے کا حکم دیا۔ اسی دوران دوسری گولی آپ کی چھاتی میں لگی۔ اس وقت آپ کے چھوٹے بھائی چوہدری محمد زکریا بھی آپ کے ساتھ ہی تھے۔ آپ نے چھوٹے بھائی کی گود میں اپنا سر رکھ کر جام شہادت نوش فرمایا۔ شہادت کے وقت آپ کی زبان پر کلمہ طیبہ کا ورد تھا۔ آپ کے جنازے میں لوگوں نے جوق در جوق شرکت کی اچھرہ کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا جنازہ تھا۔ آپ کو فیروز پور روڈ اچھرہ اڈا کے قبرستان میں پٹرول پمپ کے عقب میں سپرد خاک کیا گیا۔





غازی امیر احمد شہید
غازی عبداللہ شہید

ضیاء جالوی

ابھی وہ جوان تھا' اس کی آرزوئیں بھی جوان تھیں' اور اُمنگیں بھی جوان تھیں۔ دُنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کے مواقع بھی اسے میسر تھے اور دنیا اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ اس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑی بھی تھی' لیکن وہ مردِ مومن تھا اور اس کی غیرت ایمانی محبت رسول کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز کو پرِ کاہ سمجھتی تھی۔ وہ اپنے رسول ﷺ کی ایک ایک ادا پر قربان ہونا چاہتا تھا۔ رسول ﷺ کی محبت اس کے دل میں اس طرح رچ بس گئی تھی کہ اب اس سے دست کش ہونا اس کے بس سے بھی باہر تھا۔ وہ اس محبت کو بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنے دل میں بسائے ہوئے تھا۔ اس نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس محبت کی پرورش کرتے رہنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی کی ساری پونجی اسی محبت کی نذر کر دے۔

اس نے کسی دار العلوم سے دستارِ فضیلت حاصل نہیں کی تھی۔ کسی شیخ الحدیث کی بارگاہِ علم و فضل میں زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا بھی کوئی موقع اسے میسر نہیں آیا تھا۔ کسی بحر العلوم سے اس کا کوئی رشتہ بھی نہیں تھا۔ کہ کم از کم اسی نسبت پر وہ فخر کر سکتا۔ اس کی پیشانی پر سجدوں کا کوئی ٹریڈ مارک بھی نہیں تھا۔ کم از کم یہی ہوتا کہ اس کے کرتہ کا دامن اس کے ٹخنوں کی بلائیں لیتا ہوتا' تو اتفاق سے یہ بات بھی نہیں تھی۔ اس

کا نامۂ اعمال بیوہ کی مانگ کی طرح صاف اور سپاٹ تھا' افشاں سے بھی محروم' سیندور سے بھی بے نیاز۔ اس کی عملی زندگی مفلس کی جیب کی طرح خالی تھی' نہ کھنکتے ہوئے سکے تھے' نہ بجتی ہوئی ریزگاریاں۔ اس کی علمی وجاہت لاوارث میت کی طرح بے گور و کفن تھی' اور اس کا خاندانی وقار ایک دھوپ تھی جو سورج کے ساتھ رخصت ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے پاس ایک ڈگری تھی' وہ یہ کہ وہ مسلمان تھا اور اس کی تحویل میں محبت رسولؐ نام کی ایک دولت تھی' جس کو بڑی احتیاط سے اس نے اپنے نہاں خانۂ دل میں چھپا رکھا تھا۔ اس محبت کو وہ ہر قسم کے دنیوی صلاح و فلاح کا ضامن سمجھتا تھا' اور اسی کو اُخروی نجات کا ذریعہ۔

امیر احمد کے دل میں ایمان کی جو چنگاری دبی ہوئی تھی' وہ وقت کے ساتھ ساتھ شعلۂ جوالہ بنتی گئی۔ امیر احمد اپنے خونِ جگر سے اس شجر محبت کو سینچتا رہا۔ قلب کے انتہائی خلوص اور دل کی شدید سچائی کے ساتھ اس کی امیدوں کا مرکز تنہا ایک ذاتِ رسالت ﷺ تھی۔ وہ اپنے دل میں اسی ذاتِ شریف کے لیے والہانہ جذبہ رکھتا تھا۔ اس کی جبین نیاز میں ہزاروں سجدے اسی ایک چوکھٹ کے لیے تڑپا کرتے تھے۔ اس کی آنکھیں اسی کے صحیفۂ رخ کا نظارۂ جمال کرنا چاہتی تھیں۔ اس کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ ایک شمع نبوت پر پروانہ وار قربان ہو جائے۔ کسی طرح اس کا نام بھی اس محبوبِ دلنواز کے عاشقوں کی فہرست میں مندرج ہو جائے۔ کسی طرح وہ بھی ان کی ایک نگاہِ لطف کا استحقاق حاصل کر سکے......"

زمانے نے ایک کروٹ اور لی۔ وقت کا قافلہ ایک قدم اور چلا' اور اب امیر احمد زندگی کی اکیسویں منزل میں قدم رکھ رہا تھا۔

یہ عمر امنگوں کی بیداری کی ہوتی ہے۔ اس عمر میں تمنائیں جاگ اٹھتی ہیں اور ولولوں کو شہپرِ پرواز مل جاتا ہے۔ امیر احمد کو بھی امیدوں نے سبز باغ دکھائے' آرزوئیں جھولے جھلانے لگیں۔ دنیا ایک حسین پیکر میں اس کے سامنے بھی آئی۔ اور کچھ دنیا کی دلفریبیوں نے اسے اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ کچھ گھریلو ضرورتوں نے اسے دنیا حاصل کرنے کی ترغیب دی۔

وہ سوچنے لگا' اسے بھی حق پہنچتا ہے کہ اپنی جوان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر دنیا سے بقدر حوصلہ و ظرف فیضیاب ہو۔ داعیاتِ نفس اور تقاضائے شباب کا پورا کرنا بھی لازمۂ حیات ہے۔ اس کی بوڑھی ماں جو اس امید پر اس کے جوان ہونے کی راہ دیکھ رہی ہے کہ وہ اس کے بڑھاپے میں عصائے پیری ہوگا۔ اس کی خدمت کا وقت آخر کب آئے گا؟ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے یتیم بھائی بہنوں کی تربیت سے کب تک پہلو تہی کرے گا؟ آخر وہ وقت کب آئے گا جب وہ اپنی جوان بہنوں کے ہاتھ پیلے کرے گا؟......لیکن ابھی وہ کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ کس طرح اپنے فرائض سے سبکدوش ہو؟ اپنی

ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کون سا قدم اٹھائے؟ اور اپنی زندگی کو خوشحال اور بامراد بنانے کے لیے کون سی صورت اختیار کرے؟ کہ اچانک ایک عجیب تصویر اس کی آنکھوں سے گزری' ایک غیر متوقع منظر اس کی آنکھوں نے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ جس پیکرِ نور کو وہ مصورِ فطرت کا سب سے حسین شاہکار سمجھتا تھا' کاغذ کے ایک ٹکڑے پر مرتسم ہے۔ گویا سمندر کوزے میں بند ہو گیا ہے اور بشریت کاغذ پر اُتر آئی ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ جس جسم لطیف کا سایہ تک نہ تھا' اس کی تصویر کاغذ پر کیسے اُتر سکتی ہے؟

پھر اس نے وہ سطریں پڑھیں جو بطور تعارف قلمبند ہوئی تھیں۔ وہ الفاظ پڑھے جو بطور القاب استعمال کیے گئے تھے۔ اور وہ دلخراش فقرہ پڑھا جس کو زیبِ عنوان بنایا گیا تھا' اور جس سے صاحبِ تصویر کی جلالت امی کا پتہ چلتا تھا۔ اور اب اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ کسی گستاخ نے اس کے محبوب ﷺ کا کارٹون بنایا ہے۔

وہ محبوب ﷺ جو کائنات کی عظیم و جلیل شخصیت ہے' جو دنیا کا نجات دہندہ بھی ہے اور فرمانروائے گیتی بھی...... جس نے انسانیت کی سب سے زیادہ خدمت کی اور جو دنیا والوں کو جینے کا سب سے اچھا سلیقہ سکھا گیا' اسی کی شان میں گستاخی کی گئی تھی' اسی کا مذاق اڑایا گیا تھا۔

امیر احمد غم سے نڈھال ہو گیا۔ وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ آج اس کے دل پر ایک چوٹ لگی تھی۔ اس کے قلب کو ایک صدمہ پہنچا تھا۔ اس کے دل کا سکون چھن گیا' اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سلب ہو گئی۔

کتاب اس کے سامنے ہی تھی۔ اس پر چھپی ہوئی تصویر اسے برابر دیکھے جا رہی تھی۔ وہ شدت درد سے چیخ اٹھا۔ گھاؤ گہرا تھا اس لیے اس کی تکلیف بھی ناقابلِ برداشت تھی۔ اس کی روح زخم کی اس ناقابلِ برداشت اذیت سے بلبلا اٹھی۔ اس کے ہاتھ سے پیمانہ صبر چھوٹ گیا۔ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ غم غلط کرنے کی کوئی صورت اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ سکون کی تلاش میں وہ ادھر ادھر بھٹکتا پھرا لیکن نہ خلوت کدہ اسے سکون بخش سکا' نہ جلوت میں اسے سکون میسر آیا۔ وہ پگڈنڈیوں پر بھی چلا' شاہراہوں پر بھی دوڑا۔ سکون وہاں بھی نہ تھا۔ وہ احباب کی بزم طرب میں بھی شامل ہوا اور اپنے شہر کی تفریح گاہوں کی بھی اس نے سیر کی۔ سکون کی تلاش وہاں بھی بے سود تھی۔ اس کی جراحتِ دل کا اندمال وہاں بھی نہ تھا۔ وہاں بھی اس کا غم غلط نہ ہو سکا اور اب اس نے طے کر لیا کہ وہ جلد سے جلد کلکتہ پہنچے گا جہاں سے وہ رسوائے زمانہ کتاب شائع ہوئی تھی۔ جہاں سکون اس کا انتظار کر رہا ہے' جہاں اسے ابدی راحت میسر آئے گی' اور اس کا زخم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مندمل ہو جائے گا۔

تانگہ ہوا سے باتیں کرتا ہوا سٹیشن کو جارہا تھا۔ پشاور کی گلیاں آج ہمیشہ کے لیے چھوٹ رہی تھیں، لیکن امیر احمد کو اس کا غم نہیں تھا۔ اس کی جبینِ ہمت پر شکن بھی نہ تھی۔ اس کے پائے استقامت میں تزلزل بھی نہ تھا۔ وہ لڑکھڑایا بھی نہیں، ڈگمگایا بھی نہیں۔ وہ آگے ہی بڑھتا گیا جیسے ندی دریا کی سمت دوڑتی ہے، جیسے چکور چاند کی طرف بھاگتا ہے۔

اس کا دوست عبداللہ اس کے ساتھ ہی تانگے پر سوار تھا۔ امیر احمد اس سے کہہ رہا تھا "میں نے زندگی کی آخری سانس تک تم سے دوستی نبھانے کی قسم کھائی تھی، میں نے تمام عمر رفاقت کا وعدہ کیا تھا، اور میں نے زندگی کے ہر موڑ پر تمہارا ساتھ دیا بھی۔ میں نے تم سے بے پناہ محبت کی اور میرا سارا پیار تمہارے لیے وقف رہا۔ لیکن آج میں پہلی بار تمہارا ساتھ چھوڑ رہا ہوں۔ میں نے طے کرلیا ہے کہ اپنے آقا ﷺ پر صدقے ہو جاؤں، ان کی عزت و حرمت پر کٹ مروں اور ان کی بارگاہِ ناز میں نقد جان بھی نذر کردوں۔ کلکتہ میں اسی مقصد سے جارہا ہوں۔ شوقِ شہادت ہی مجھے وہاں لے جارہا ہے۔ میرے بعد تم میری بوڑھی ماں کا خیال رکھنا۔ اور اگر تم سے ہوسکے تو میرے یتیم بھائیوں اور بے سہارا بہنوں کی خبر گیری کرنا۔ یہ میری آخری گزارش ہے۔"

سلسلۂ کلام جاری تھا اور عبداللہ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جب امیر احمد اپنی گفتگو تمام کرچکا تو عبداللہ نے کہا:

"اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہیں سٹیشن تک چھوڑنے جارہا ہوں تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں زندگی کی آخری منزل تک تمہارے ساتھ ہوں۔ کلکتہ تم تنہا ہی نہیں جارہے ہو، تمہارا عبداللہ بھی تمہارا رفیقِ سفر ہے۔ اپنے آقا ﷺ پر قربان ہو جانے کی تمنا اکیلے تمہارے ہی دل میں نہیں مچل رہی، اس میں میں بھی تمہارا شریکِ کار ہوں۔ شہادت کی تڑپ میرے دل میں بھی ہے۔ میں بھی اپنے آقا پر قربان ہونے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ شمع پر کچھ تمہارا اجارہ نہیں ہے کہ اکیلے تم ہی اس پر فدا ہو جاؤ۔ یہ سعادت تو کوئی بھی حاصل کرسکتا ہے۔ شمع پر جان دینا پروانوں کا پیدائشی حق ہے اور اس حق سے کوئی بھی اسے محروم نہیں کرسکتا۔ تمہارے آقا صرف تمہارے آقا نہیں ہیں وہ ہم سب کے آقا ہیں۔ ان کے بارِ احسانات سے تنہا تمہاری ہی گردن خم نہیں ہے، ہم سب ان کے منت کشِ کرم ہیں۔ ان کا جمالِ دلفروز ہماری آنکھوں کو بھی فروغ بخش رہا ہے اور ان کی تجلیوں سے ہمارا خانۂ دل بھی معمور ہے۔ میدانِ حشر کی تیز دھوپ میں ان کے سایۂ رحمت کی تلاش تنہا تمہی کو نہیں کرنی ہے۔ قبر کی منزل اور پلِ صراط کے سفر میں ان کے سہارے کی ہمیں بھی ضرورت ہے۔ ان کے دامنِ رحمت میں ہمیں بھی پناہ لینی ہے اور انہی کی کرم فرمائیوں پر ہماری نجات بھی منحصر ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو سعادت تم تنہا حاصل کرنا چاہ رہے

ہو میں اس سے محروم ہو جاؤں؟ میں تمہارے ساتھ ہی کلکتہ چل رہا ہوں۔ ہم دونوں ایک ساتھ جام شہادت نوش کریں گے۔ زندگی میں بھی ہمارا تمہارا ساتھ رہا ہے' مرنے کے بعد بھی ہم تمہارے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا تمہارا انجام بھی ایک ہو۔ قبر سے ہم دونوں ایک ساتھ ہی اٹھیں۔ ساتھ ہی جنت کو چلیں اور ہم دونوں کے آقا ہم دونوں کی قربانیاں قبول فرمالیں اور ایک ہی ساتھ ہم دونوں کو اپنے دامنِ رحمت میں پناہ دے دیں۔''

ابھی عبداللہ کی بات پوری نہیں ہو پائی تھی کہ امیر احمد نے اسے ٹوک دیا۔ ''تم بھی چلے جاؤ گے تو ہم دونوں کی بوڑھی ماؤں کا کیا ہوگا؟ کس کو ہماری بہنوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر ہوگی؟ کون ہمارے بھائیوں کی دستگیری کرے گا؟

عبداللہ ایک مرتبہ پھر گرجا۔ ''تمہاری عقل ماری گئی ہے۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ کارسازِ مطلق کوئی اور ہے۔ بھلا سوچو تو' جو خدا رحم مادر میں جنین کی پرورش کرتا ہے' وہ جوانوں کی تربیت سے کیسے غافل ہو جائے گا! پھر جان دینے والوں کو یہ سوچنے کی کیا ضرورت ہے کہ ان کے بعد دنیا کا کیا حال ہوگا؟ حضرت امام حسینؓ جس وقت میدانِ کربلا میں جان دے رہے تھے' انہوں نے کہاں سوچا تھا کہ ان کے بعد ان کی سکینہ کس طرح رہے گی۔ بیمار زین العابدین کیسے اپنی زندگی کے ایام بسر کریں گے! شہر بانو پر کیا گزرے گی! گلشن بتول کے نونہالوں اور باغ زہرا کی کلیوں کا کیا بنے گا! جان دینے والے تو بس جان دینا جانتے ہیں۔ ان کو اس سے کیا غرض کہ وہ اپنے پیچھے کتنے متعلقین چھوڑ رہے ہیں؟''

پشاور کا سٹیشن آ گیا تھا' اس لیے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور دونوں دوست پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی گاڑی کی طرف چل پڑے۔

کلکتہ ایک عظیم شہر ہے' جہاں دن رات مَن برستا ہے' جہاں روزانہ لڈو پھوٹتے ہیں۔ جہاں ہر وقت چاندی لٹتی ہے۔ کلکتہ دیکھنے کی آرزو ایک مدت سے ان دونوں کو تھی لیکن اب تک اس کا موقع انہیں نہیں ملا تھا۔ آج ان کی ٹیکسی کلکتہ کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ کلکتہ میں ان کے لیے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے دل میں تو کچھ اور ہی لگن تھی۔ یہ سٹیشن سے سیدھے لور چیت پور روڈ آئے اور موسیٰ سیٹھ کے مسافر خانہ میں قیام پذیر ہوئے۔ انہوں نے یہاں اپنا سامان اتارا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس محلّہ کی طرف چلے' جہاں سکون ان کا انتظار کر رہا تھا' اور طمانیت قلب ان کے لیے چشم براہ تھی۔ یہاں انہوں نے اس کتاب کے ناشر سے ملاقات کی جس نے ان کا سکون غارت کیا تھا اور وفا کیشوں کے جذبۂ محبت کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس کتاب کا ناشر ہی اس کا مصنف بھی تھا اور اسی کے زیر اہتمام اس کی طباعت بھی عمل میں آئی تھی۔

انہوں نے کہا: ’’اپنی کتاب سے فلاں حصہ نکال دو‘ اس سے ہم مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی ہے اور ایک معذرت نامہ بھی شائع کرو تا کہ جن لوگوں کی تم نے دل آزاری کی ہے ان کی کچھ تسکین ہو جائے۔‘‘

کتاب کے ناشر نے کہا: ’’کتاب میں ایک تصویر شائع ہوگئی تو کون سی قیامت آ گئی۔ تمہارے رسول کے خلاف ایک آدھ جملہ لکھ دیا تو کیا ہوگیا۔ تم کہتے ہو کہ میں نے غلطی کی ہے‘ لیکن میں غلطی ماننے کے لیے تیار ہی نہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے‘ ٹھیک ہی لکھا ہے۔ اگر میری تحریر سے کسی کی دل آزاری ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ میں ایسا کبھی نہیں کرسکتا کہ معافی نامہ شائع کروں۔ اگر میری غلطی تسلیم بھی کی گئی تو اس کی سزا اتنی سنگین نہیں۔ میں اپنی غلطی کا ڈھنڈورہ نہیں پیٹ سکتا۔ تم جاسکتے ہو۔ تم میری دکان سے نکل جاؤ‘ میرا دماغ مت چاٹو۔‘‘

امیر احمد کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں‘ اس کا چہرہ گلنار ہوگیا۔ اس کی رگیں تن گئیں‘ اور وہ بے قابو ہوگیا۔ غلطی اور اس پر اصرار؟ گستاخی اور وہ بھی آقا ﷺ کی شان میں۔ اس نے ایک جست کی۔ عبداللہ بھی اپنی جگہ سے اچھلا۔ دونوں اس نامراد پر ٹوٹ پڑے۔ پھر ایک بجلی تھی جو چمک گئی‘ ایک خنجر تھا جو کلیجہ میں اتر گیا اور اب یہ دونوں سڑک پر کھڑی ہوئی ٹریفک پولیس سے کہہ رہے تھے ’’میں نے خون کیا ہے۔ میں قاتل ہوں مجھے گرفتار کرلو‘ پولیس مارے خوف و دہشت کے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب انہوں نے قریب کے تھانے کو فون سے اطلاع دی۔ ’’میں فلاں مقام پر ٹھہرا ہوا ہوں میں نے خون کیا ہے۔ تم یہاں آ جاؤ تا کہ میں خود کو قانون کے حوالے کرسکوں۔‘‘ پھر دونوں گرفتار ہو گئے۔

عدالت میں آج ان دونوں کی پہلی پیشی تھی۔ آج ان کا مقدمہ کھلا تھا۔ ماہرِ قانون وکیلوں نے انہیں قانون کی زد سے بچا لینے کے لیے اپنی خدمات مفت پیش کیں۔ رؤسائے شہر نے ان کے مقدمہ کی پیروی کرنے کا بیڑا اٹھالیا۔ بچوں نے کئی دنوں سے مٹھائی اور چاکلیٹ کے سارے پیسے بچا بچا کر آج ہی کے لیے رکھ چھوڑے تھے۔ خواتین نے اپنے کانوں کی بالیاں آج ہی کے لیے اتار رکھی تھیں۔ سارا نگر یہ چاہتا تھا کہ یہ دونوں عدالت کی نگاہ میں مجرم نہ ثابت ہوں۔ کسی طرح یہ قانون کی زد سے بچ جائیں۔ خود حاکم کو بھی ان دونوں کی معصومیت پر ترس آ رہا تھا۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ خلاصی پا جائیں۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ خود یہ دونوں ایسا نہیں چاہتے تھے۔ شہادت کا شوق ان کے سروں میں سمایا ہوا تھا اور یہ جلد از جلد پھانسی کے تختے کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ آقا پر قربان ہو جانے کی تڑپ انہیں بے چین کیے دے رہی تھی۔ ان سے کہا گیا کہ کم از کم اپنی زبان سے اقبالِ جرم نہ کریں۔ صرف ایک بار کہہ دیں کہ انہوں نے خون نہیں کیا۔ لیکن دونوں یہی کہتے رہے۔ ’’میں نے خون کیا ہے‘

میں ہی قاتل ہوں، میں نے ہی اس گستاخ کو اس کی گستاخی کی سزا دی ہے۔

آخر فیصلہ کا دن آ ہی گیا۔ قانون کی نگاہ میں دونوں مجرم ثابت ہوئے اور دونوں ہی کے لیے پھانسی کی سزا تجویز کی گئی۔

آج شہر کی ساری آبادی علی پور جیل کے گردسٹ آئی تھی۔ ہر کوئی اشکبار آنکھوں سے ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ چہرے جن پر تقدس برس رہا تھا، معصومیت قربان ہو رہی تھی۔ تقدس برستا رہا۔ معصومیت ٹوٹتی رہی اور لوگ ان کا آخری دیدار کرتے رہے۔ سارے لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف تھیں، لیکن یہ دونوں کسی اور طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں بار بار ایک طرف اٹھ اٹھ جاتی تھیں۔ دفعتاً ان کے چہروں پر اضطراب کی ایک کیفیت نمودار ہوئی اور ان کا چہرہ اُتر گیا۔

ان دونوں کا آخری دیدار کرنے کے لیے ان دونوں کی مائیں بھی پشاور سے آ گئی تھیں، اور اس وقت یہ دونوں بھی دیکھنے والوں کی صف میں کھڑی تھیں۔ جب انہوں نے ان دونوں کی اس حالت کا اندازہ کیا، برس پڑیں:

''دمِ آخر چہروں پر حزن و ملال کے آثار کیوں؟ زندگی جب اتنی ہی پیاری تھی تو موت کو دعوت کیوں دی تھی؟ کیا اللہ والوں کا یہی وطیرہ ہے؟ شیدائیانِ رسول ﷺ کا ایسا ہی کردار ہوتا ہے؟ سرفروش اسی طرح جان دیتے ہیں؟ خبردار! جو چہرے پر غم کی کیفیت پیدا ہونے دی۔ یاد رکھو! اگر تم نے ہنستے ہوئے جان نہیں دی، اگر دار و رسن کا پُرتپاک خیر مقدم نہیں کیا، اگر مسکراتے ہوئے جامِ شہادت نہیں نوش کر سکے تو ہم تمہارا دودھ کبھی نہیں بخشیں گی۔ تم کو خوش ہونا چاہیے کہ آج تم اس سعادت سے بہرہ ور ہو رہے ہو، جو ہر کسی کا مقسوم نہیں:

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا،

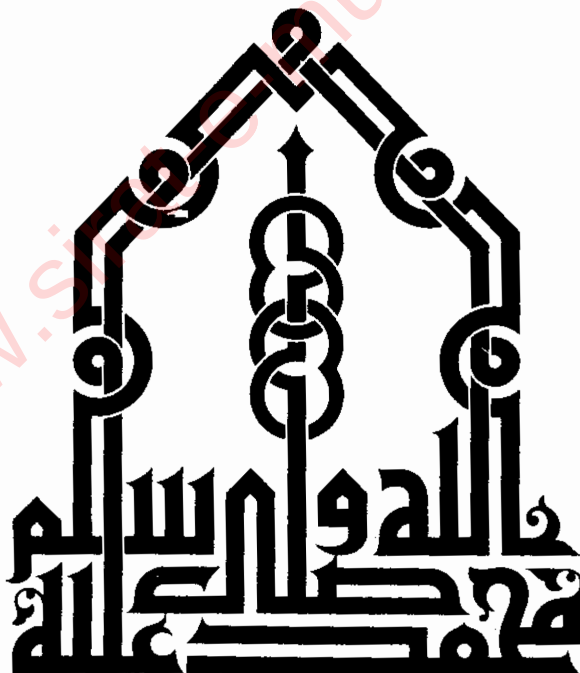
امیر احمد اور عبداللہ ایک ساتھ بول اٹھے: چہروں پر جو اضطراب کی لکیر آپ کو نظر آ رہی ہے، وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ ہم لوگ جان سے جا رہے ہیں۔ ہمارے چہروں پر غم کی گھٹا اس لیے نہیں چھائی ہے کہ ہم تختۂ دار پر چڑھنے ہی والے ہیں۔ ہماری پریشانیوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ جام شہادت پیش کرنے میں لوگ دیر کیوں کر رہے ہیں؟ ہماری نگاہیں اس وقت جو کچھ دیکھ رہی ہیں، اگر آپ دیکھ لیجئے تو آپ بھی ہماری جگہ آنے کی کوشش کیجئے۔ آپ کے اطمینان کے لیے ہم اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہماری منزل مل گئی ہے ہمارے آقا کالی کملی اوڑھے ہمارے سامنے کھڑے اپنے ہاتھوں کے اشارے سے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے اور ان کے درمیان شرط یہ ٹھہری ہے کہ ہم جام شہادت نوش کرنے کے بعد ہی ان تک پہنچ سکیں گے۔

پھانسی کا پھندا آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ ہنستے ہوئے جان دے رہے تھے۔ انہوں نے جان دے ڈالی' وہ دونوں شہید ہو گئے۔ رحمت کی گھٹائیں ان پر برس پڑیں اور وہ ان میں سر سے پاؤں تک ڈوب گئے۔

جنت کے جانے والے! جنت کا سفر مبارک ہو۔ اس کی سرمدی راحتیں مبارک ہوں۔ ابدی نعمتیں مبارک ہوں۔

ان شہیدانِ محبت کی آخری آرامگاہ کلکتہ کے گورا قبرستان میں ساتھ ساتھ ہیں جہاں سے آج بھی نامرادوں کو مرادیں ملتی ہیں اور محرومِ مسرت شادمانیوں سے ہمکنار کیے جاتے ہیں۔





غازی حاجی محمد مانک شہیدؒ

مولانا محمد اسماعیل شجاع آبادی

''موضع اکری سے تین چار میل کے فاصلہ پر واقع ایک بستی کا نام کرونڈی (تحصیل فیض گنج، سندھ) ہے۔ یہاں قادیانیت کا ایک کمینہ فطرت وشعبدہ باز مبلغ عبدالحق قیام پذیر تھا' جو امرتسر سے یہاں اٹھ آیا۔ علاقہ بھر میں یہ شخص نہایت عیار اور بدطینت خیال کیا جاتا۔ اس کے سیاسی اثر ورسوخ اور معاشی حیلہ سازیوں سے کئی سادہ لوح کلمہ گو' دولتِ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اسے اپنی قوت مناظرہ پر بہت بھروسہ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میری یہ صلاحیت مرزا قادیانی کی نبوت کی ایک دلیل ہے۔ اس نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ میں مرزا قادیانی کا جانشین نبی ہوں۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کی انگوٹھی پر ''عبدالحق نبی اللہ'' نقش تھا۔ قادیانی مذکور کے دم قدم سے کفر وارتداد نے خوب زور پکڑا۔ ایک دفعہ مناظرے کی بات چلی۔ 1967ء کے ابتدائی مہینوں کا ذکر ہے' فریقین ایک جگہ اکٹھے ہوئے تاکہ باہم شرائط طے ہوسکیں۔ مسلمانوں کی جانب سے مولانا لال حسین اخترؒ نمائندہ تھے۔ مولانا موصوف کا معاملہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ یہ ابتداءً مرزائیوں کے قریب رہے۔ ان کی تعلیم وتربیت پر قادیانیوں کی شاخ' لاہوری گروپ کے سربراہ محمد علی نے خاص توجہ دی۔ مختلف مدرسوں میں پڑھایا گیا۔ کہتے ہیں انہیں چھ زبانوں سے واقفیت تھی' فارغ التحصیل ہوچکنے پر وہ احمدیت کی تبلیغ میں جت گئے۔ پہلے پہل ''لاہوری جماعت'' کے آرگن ہفت روزہ ''پیغامِ صلح'' میں کام کیا اور پھر شعبہ مالیات کے محتسب مقرر ہوئے۔ تاہم آہستہ آہستہ ان پر مرزائی ابلہ فریبیاں منکشف ہونے لگیں۔ جھوٹ آخر جھوٹ ہوتا ہے۔ ملمع کاریوں کا دامن کب تک

چاک نہ ہوگا؟ بقول ان کے وہ تذبذب میں تھے کہ انہیں بذریعہ خواب' حق کی پہچان نصیب ہوئی۔ دوسری دفعہ تو واضح اشارہ ملا۔ میرا ضمیر مطمئن ہوگیا۔ میں نے جانا' مجھے منزل مل چکی ہے۔ بحمد اللہ اب میں مسلمان ہوں۔

قصہ کوتاہ مناظرے کے لیے مقام' وقت اور دیگر شرائط کا تعین ہو رہا تھا کہ مولانا لال حسین اختر صاحب نے قادیانی مبلغ عبدالحق سے پوچھا ''تم کس موضوع پر مناظرہ کرنا چاہتے ہو؟'' جواب ملا ''جس پہلو پر آپ کا جی چاہے۔'' مولانا بولے ''اگر یہ بات ہے تو میں کذبِ مرزا ثابت کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ سن کر قادیانی ملیچھ جل بھن کر رہ گیا اور غصہ میں جو بکواس کی' اسے نقل کرنے کا مجھ میں یارا نہیں۔ ان گستاخانہ الفاظ کے تصور سے ہی میرے دماغ کی شریانیں پھٹی جا رہی ہیں' سینے میں آگ لگی ہے۔ سوچتا ہوں ایک وہ وقت تھا جب عہدِ محکومی میں بھی ہمیں بارگاہ سرورِ کائنات ﷺ سے نسبت غلامی کی سندیں عطا ہوتی رہیں' تب ہم میں غازی علم الدین شہیدؒ کا ذوق وشوق موجود تھا۔ مائیں اپنے بچوں کو بتایا کرتی تھیں کہ نبی پاک ﷺ کے نعلین مبارک پر جانیں نچھاور کر دینا ہی ثبوتِ ایمان ہے۔ آج کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مہدی حسنوں وغیرہ کی کمی نہیں' ہر جگہ نور جہانیں بھی جمال آراء ہیں مگر حد نظر تک کوئی فاطمہ بنت عبداللہ یا لیلیٰ خالد دکھائی نہیں دیتی۔ کیا یہ ڈسکو رقاص راجپالی نسل کو کیفر کردار تک پہنچا سکیں گے؟

سگانِ آوارہ کی بہتات' انسانی صحت کے لیے ہمیشہ مضر رہی ہے۔ مناسب احتیاط نہ کی جائے تو بعض اوقات یہ باؤلے پن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے کاٹے سے آدمیوں کی زندگی محفوظ' نہ جانوروں کا بچاؤ یقینی۔ اگر آپ اس حقیقت سے آگاہ ہیں تو پھر کتے مار مہم میں دیر کیوں؟ اب یہ سلسلہ شروع ہو جانا چاہیے کیونکہ ملت کی بقا اسی میں مضمر ہے...... اگر کسی مسلمان کے لوحِ دل پر ''محمد ﷺ'' نہ لکھا ہو تو اس کے ایمان کا کوئی ثبوت نہیں۔ جس سینے میں شہنشاہِ دو عالم ﷺ کے درِ اقدس پر' پلکوں سے جھاڑو دینے کی تمنا کروٹیں نہ لیتی رہے اور آپ کے نعلینِ مبارک سے لپٹ لپٹ کر مرنے کی آرزو نہ ہو تو خدا کی قسم' وہ کوئی مومن نہیں' پکا کافر و زندیق ہے۔ آمدم بروئے موضوع قادیانی شیطان کے چیلے عبدالحق نے جس دریدہ دہنی اور زہر افشانی کا مظاہرہ کیا' وہ اس قدر دل آزار اور روح فرسا ہے کہ سچے مسلمان یہ سننے کی تاب نہیں رکھتے۔ پڑھ لینے کے بعد بھی اگر کسی کی آنکھیں خون کے آنسو نہ روئیں اور اس صدمے سے دل دھڑکنا نہ چھوڑ دے تو وہ بخدا ہرگز مسلمان نہیں' ایک عظیم منافق ہے۔ شاتم رسول عبدالحق قادیانی کے گستاخانہ کلمات فقط اس نیت سے نقل کرنے والا ہوں کہ آقائے نامدار ﷺ کے دیوانوں اور پروانوں کو بتا دیا جائے کہ کفر و ارتداد کے بچھو کس کس طرح نیش زنی کرتے پھر رہے ہیں۔

مولانا لال حسین اختر صاحب کی اس رائے پر کہ میں مرزا قادیانی کے کذب پر مناظرہ کرنا چاہتا ہوں' قادیانی مبلغ کا خبث باطن آشکارا ہو گیا۔ غلاظت کے اس ڈھیر کی یاوہ گوئیاں سننے سے پہلے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر استغفر اللہ کا ورد کرتے رہیں۔ ظلمتِ شب کے دروغ باف پرستار نے یوں بکواس کی:

''اگر تم مرزا صاحب کے کاذب وملعون اور مردود و گمراہ ہونے پر اظہارِ خیال کرنا چاہتے ہو تو میں آپ کے رسول...... ہونے پر بحث کروں گا۔''

ابلیس قادیان کے اس حرامی بیٹے کی ناپاک جسارت پر اہل ایمان' آتشِ غضب میں بھڑک اٹھے۔ یہ اتنا کاری زخم تھا کہ ہر ایک کا کلیجہ چھلنی ہو گیا۔ لوگ چاہتے تھے کہ اسے یہیں سرگ باش کر دیا جائے مگر بعض ایسی الجھنیں پیش آئیں کہ اس نے راہِ فرار اختیار کر لی اور غضبناک مسلمان کفِ افسوس ملتے رہ گئے۔

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا ہو خون جگر سے

قادیانی مذکورہ دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے انتہائی ذی اثر تھا۔ اس کے پاس مال وزر کی کوئی کمی نہ تھی۔ مختلف اوقات میں سندھ کی صوبائی کابینہ کے کئی وزراء سے اس کی صاحب سلامت رہی۔ وہ اپنے متبذل مقاصد کی تکمیل کے لیے بے دریغ سرمایہ لٹایا کرتے۔ جانے اس نے کتنے اور کس طرح کے گھناؤنے کاروبار رچائے رکھے۔ یہ حقیقت تو ہر ایک پر طشت از بام ہے کہ بے غیرت قادیانی عبدالحق نے کئی مجبور لڑکیوں کو جسم فروشی کے دھندے پر لگا رکھا تھا اور وہ اس کاروبار سے ہمیشہ ذاتی فائدے بھی اٹھاتا رہا۔

یہی وجہ ہے کہ عوام اس کے ابلیسانہ ہتھکنڈوں سے گھبراتے۔ محولا بالا ملعون و مردود کے اثر و رسوخ کی ادنیٰ سی مثال ملاحظہ کریں۔ اس کے اشارے پر ایک غیور مسلمان کو موضع کروندی ضلع خیر پور میں اینٹیں مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ قصور یہ تھا کہ وہ ان کا مہرہ بننے پر رضامند نہ ہو سکا۔ جب اس بے گناہ دلرزہ خیز قتل کی خبر پھیلی تو کوئی شخص میت اٹھالانے کو تیار نہ تھا۔ تھانہ میں رپورٹ درج کروانا اور مقدمے کی پیروی تو دور کی بات ہے۔

الغرض حاجی محمد مانک صاحب ان دنوں بلوچستان میں تبلیغی دورے پر تھے۔ لوٹ کر آئے تو آپ کی سن رسیدہ والدہ محترمہ نے روتے ہوئے کہا: ''بیٹا میں آپ کو دودھ معاف نہ کروں گی کہ آپ کے ہوتے ہوئے ایسے لوگ موجود ہیں جو ہمارے ملجا و ماویٰ' ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی

جناب میں گالیاں بکتے ہیں۔'' ان کے استفسار پر بوڑھی ماں نے پورا واقعہ کہہ سنایا۔ موصوف آٹھویں حج کی تیاری میں مصروف تھے۔ یہ دردناک حادثہ سن کر آپ نے اس کا پروگرام منسوخ کر دیا۔ دراصل اماں حضور کی ملتجی نگاہیں پوچھ رہی تھیں کہ میرے لختِ جگر! دربارِ حبیب ﷺ میں کون سا چہرہ لے کر جاؤ گے۔ جس کی فتنہ انگیزیوں سے خواب گاہِ نبی ﷺ پر لرزہ طاری ہے اور پیارے آقا ﷺ کی تربتِ انور شق ہو جاتی ہے' وہ بے غیرت تو تمہارے سامنے دندناتا پھر رہا ہے۔ اگر تم اپنے وطن میں ناموسِ رسالت ﷺ کا تحفظ نہیں کر سکتے تو پھر مدینہ منورہ میں حاضری کا کیا مقصد؟

میں یہی سوال پوری قوم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جس شہنشاہ ﷺ کی بارشِ رحمت کے چھینٹوں نے جامۂ بشریت میں لطف و کرم کے رنگ بھرے اور جن کی چارہ سازیوں نے بندوں کو خدا سے ملا دیا' اس نورِ مجسم ﷺ کی عزت خطرے میں ہو تو ہمارا زندہ رہنا بے غیرتی نہیں تو اور کیا ہے؟ واللہ' آپ رنجیدہ نہ ہوں تو اے مسلمانو' ان بے روح سجدوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ دربارِ نبوت ﷺ سے تعلقِ خاطر قائم نہ رہے تو یہ بے سرور عبادت بھی ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہے...... الغرض جناب غازی صاحب نے کرب میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں عرض کیا:

اماں! میں وہ مسلمان نہیں ہوں جو ظاہری عبادات کو ہی منزلِ مقصود سمجھ بیٹھے۔ میرے کریم ﷺ ہر وقت میری دستگیری فرماتے ہیں۔ جب تک میرے جسم میں جان باقی ہے' اپنے پیا کے ہر نقشِ قدم کو لہو کے قطروں سے تابناک بناتا رہوں گا۔ شمعِ رسالت ﷺ کا پروانہ زندہ ہو تو واقعی شاتمِ نبی کی کوئی علامت قائم نہیں رہ سکتی۔ میں آپ کے ساتھ وعدہ کرتا ہوں کہ میں انشاء اللہ بہت جلد اس قادیانی دشمنِ رسول کی بوٹیاں جنگلی سوروں سے نچوا دوں گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ غازی عبدالقیوم شہیدؒ کی روح بے چین ہے۔ آخر نتھو رام کی معنوی اولاد ہمیں کب تک کچوکے لگاتی رہے گی؟ پس آپ خدا کے حضور میری کامیابی کے لیے دعا فرما دیں کہ میری جدوجہد کو بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں قبولیت کی سند عطا ہو جائے۔

ٹھوکر سے میرا پاؤں تو زخمی ہوا ضرور
رستے میں جو کھڑا تھا' وہ کہسار ہٹ گیا

54 سالہ ایک شخص کا کلیجہ رنج و الم کی آگ سے کباب ہو چکا ہے۔ آنکھوں میں خشک آنسو اور سینے میں شورِ قیامت۔ اس کے دن بے سکون اور راتیں حسرت انگیز ہیں۔ اس کی معنی خیز لب بستگی بھی طرزِ فغاں ہے اور مفہوم انگیز گویائی ایک نوحہ۔ معلوم ہوا' اس پیکرِ حیرت اور مجسمۂ غیرت کا نام الحاج غازی محمد مانکؒ ہے۔ ان کی وجہ غم بیان ہوئی کہ ناموسِ رسالت ﷺ پر ناروا حملے ہو رہے ہیں۔ کریم

آقا ﷺ کا کوئی دشمن زندہ ہو تو غلام کا عہد وفا کسی طور معتبر نہیں ہو سکتا۔ میں مرزائی شاتم رسول' عبدالحق کو......ابدی ذلتوں کا مرکز بنا کر یہ فرضِ کفایہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

بالآخر آپ ملتِ مصطفوی ﷺ کو درس حریت دے گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے عوام الناس سے مردود قادیانی کی ناپاک جسارت کا تفصیلی واقعہ سنا' پھر اس پر علماء کرام کی مہر تصدیق ثبت ہوئی۔ پس اب ظالم کو گستاخیوں کا مزہ چکھانا باقی تھا۔

چونکہ گستاخ قادیانی عبدالحق مذکور مسلمانوں کے متوقع جوش و خروش کی وجہ سے چوکنا ہو چکا تھا لہٰذا حاجی محمد مانک صاحب کئی روز تک غور و خوض کرتے رہے کہ اس بے غیرت کو کس طرح تہ تیغ کیا جائے۔ آخر وہ ایک فیصلہ کر چکے اور پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آپ 7 رمضان المبارک 21 دسمبر 1966ء کو عبدالحق تک پہنچے۔

تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے کہ مرزائی مبلغ عبدالحق ایک مدت سے آپ کو جانتا تھا' وہ مختلف اوقات میں الحاج محمد مانک صاحب سے کئی بار ملا۔ اس کی شروع سے سازش تھی کہ آپ کسی طرح رام ہوں۔ بوقتِ ملاقات وہ احمدیت کی خوبیاں گنواتا۔ ایک مرتبہ اس نے آپ کو ربوہ چلنے کی پیشکش بھی کی۔ شیطانی ٹولے کی سازش یہ تھی کہ آپ کے بیعت ہو جانے کی صورت میں جماعت کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔

غازی محمد مانک صاحب اس قادیانی مردود عبدالحق کو اپنے پنجرے تک لانے میں کیسے کامیاب ہوئے؟ انہوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کونسا لائحہ عمل اختیار کیا؟ واردات کی رات کہاں بسر ہوئی؟ میرے خیال میں یہ ایک غیر ضروری حصہ ہے۔ اس پہلو کو نظرانداز کرتے ہوئے ذرا آگے بڑھتے ہیں۔ الغرض امر واقعہ یہ ہے کہ دہن دراز گستاخ ایک تنومند نوجوان تھا' جبکہ محافظِ ناموسِ رسالت بوجہ کہولت کمزور و ناتواں اور اس معاملے میں رازداری بھی بہرحال لازم تھی۔ ان اسباب کے پیش نظر انہوں نے سوچا کہ کسی نہ کسی طرح بدزبان ملعون کو ٹھکانے لگانا ضروری ہے' ظاہری نمود اور افسانوی شہرت ضروری نہیں۔ بفضلہٖ تعالیٰ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔

کافر کی موت سے بھی لرزتا ہے جس کا دل
کہتا ہے کون اسے کہ مسلمان کی موت مر

ساتواں روزہ تھا۔ موت کا بھیانک سایہ لحظہ بہ لحظہ اس کمینہ فطرت درندے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تقدیر کی گرفت اسے سیر کے بہانے مقام مرگ پر لے پہنچی۔ اب کسی لحہ مسلم جانباز جھپٹ کر شکار کو اپنے مضبوط پنجوں میں جکڑنے والا تھا۔ آفتاب رحمت و استغناء' مہتاب حسن و وفا' کے متوالے نے اس

ارذل واجہل علامت کو کس طرح لقمہ اجل بنایا' یہ بڑی دلچسپ اور راحت انگیز داستان ہے۔ مناسب ہے کہ جہاد کی کہانی خود مجاہد کی زبانی سنی جائے۔ الحاج غازی مانک صاحب نے اپنے چاہنے والوں اور عزیز و اقارب کو جیل میں اس کی تفصیل بتاتے ہوئے بیان کیا کہ:

''میرے پاس ایک ریوالور تھا اور چھوٹا سا چاقو بھی۔ باغ میں پہنچے تو عبدالحق قادیانی مزدوروں کے پاس آئندہ کام کے بارے میں ہدایات دینے چلا گیا۔ میں انہی سوچوں میں گم سم بیٹھا تھا کہ جانے کہاں سے آواز آئی ''اے بیدار بخت! تمہیں کاہے کا انتظار ہے۔ جرأت ایمانی سے کام لے کر اسے ابھی حوالۂ آتش کیوں نہیں کر دیتے۔''

یہ سن کر میں جوش غیرت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ خدا معلوم مجھ میں اچانک اس قدر پھرتی اور قوت کیسے عود کر آئی؟ میں آج تک خود بھی اس معاملے کی گتھی نہیں سلجھا سکا۔ جب وہ مکروہ صورت قادیانی گستاخ رسول' عبدالحق مزدوروں کی طرف سے لوٹتے ہوئے نشانے کی زد میں پہنچ گیا تو غصہ سے میری حالت غیر تھی۔ دل چاہتا تھا کہ جلد از جلد یہ قضیہ نپٹا دوں۔ فوراً لبلبی دبا دی گئی۔ یکے بعد دیگرے آتشیں گولیاں اگلیں۔ ہر طرف اس خوفناک آواز سے سناٹا چھا گیا۔ جب فائر ختم ہو چکے تو دیکھا کہ ملعون بسلامت موجود ہے' غالباً گولیاں اس کے اردگرد سے گزر گئیں۔ میں دم بخود تھا کہ اب کیا کروں؟ دوسری طرف اس پر بدحواسی طاری تھی۔ میرے یہ انداز دیکھتے ہوئے یہ مسلسل چیخ رہا تھا کہ حاجی صاحب' تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ خدا کے لیے مجھے نہ مارو' میں تمہارا کوئی دشمن تو نہیں...... ہمارے درمیان کچھ زیادہ فاصلہ نہ رہا۔ میری صرف ایک خواہش تھی کہ اسے بہر صورت مردہ حالت میں دیکھوں۔ قلابازی کھا کر اس پر جھپٹا اور گردن دبوچ لی۔ میں نے دیکھا کہ مجھ میں بجلی کی سی تیزی آ گئی ہے۔ میں تو اسے غیبی امداد ہی کہوں گا کہ وہ باوجود ہٹا کٹا ہونے کے موت کے خوف سے کانپ رہا تھا' حالانکہ ہم گتھم گتھا تھے۔ ہوا یہ کہ بدبخت گھبراہٹ کے عالم میں از خود زمین پر گر پڑا۔ موقع غنیمت جانتے ہوئے میں بہ سرعت اس کے سینے پر بیٹھ گیا۔ وہ بے حس و حرکت تھا۔ جانے کیوں اس کی قوت مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے یہ تن مردہ ہے اور اس میں جان باقی نہیں۔ الغرض

میں نے بڑے اطمینان اور حوصلے کے ساتھ جیب سے چاقو نکال کر دانتوں سے کھولا' اس کی گردن پر ٹکایا اور زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ جب اس کے ناپاک جسم سے سر کا بوجھ اتر چکا تو مقتول مردود کی زبان کاٹی اور پھر جبڑوں کو چیر پھاڑ دیا۔ وہ انگلی جس سے اشارہ کر کے بات کیا کرتا تھا' اسے بھی پنجے سے علیحدہ کر کے کہیں دور پھینکا۔ ساتھ ساتھ میری زبان سے بے ساختہ یہ جملے بھی ادا ہو رہے تھے کہ میرے نبی ﷺ کی گستاخی کرنے والوں کا حاجی مانک ہمیشہ یہ انجام کرتا رہے گا۔ ارے کُتّے' اب بھونکنے کی جرأت کر۔ رسولِ پاک ﷺ کی شانِ اقدس میں یاوہ گوئیاں کرنے والے ذلیل کمینوں کو ہم اسی طرح ملیامیٹ کیا کرتے ہیں۔"

پگ پگ ہمارے خون کے چھینٹے اُڑے تو کیا
یہ تو ہوا کہ شہر کو زیبائی مل گئی

الحاج محمد مانک صاحب کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔ آپ کی جرأت مندانہ جدوجہد سے ہر کس و ناکس پر عیاں ہو گیا کہ رسولِ عربی ﷺ کے چاہنے والے ابھی زندہ ہیں اور ان کے ذوقِ شہادت پر ایک دنیا گواہ ہے۔ فدائے رسولِ ﷺ عربی نے ثابت کر دیا کہ زندگی وہی ہے جو سید الکونین ﷺ کے قدموں پر قربان ہو جائے وگرنہ زندگی' زندگی نہیں' موت ہے۔ آپ نوکِ خنجر سے یہ ابدی و لازوال فیصلہ لکھ گئے کہ "اس ذاتِ فخر موجودات ﷺ کی شان میں نازیبا الفاظ تو کجا' ہم تو ان کوچوں اور گلیوں کی توہین بھی برداشت نہیں کر سکتے' جن کے ذرات کو اس پیکرِ رفعت و عظمت کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہوئی۔ ایک زندگی کیا؟ ہزار بار زندگی نصیب ہو اور ہزار بار اس شہنشاہ کونین ﷺ کی ناموس پر نچھاور ہو جائے تو بھی دل کی تمنا بر نہ آئے۔ جس سینے میں عشقِ رسول ﷺ کا سوز نہیں' وہ سینہ نہیں بدبختیوں اور تاریکیوں کا قبرستان ہے۔ جس دل میں ناموسِ محمد ﷺ پر مر مٹنے کی تمنا نہیں' وہ دل نہیں' بوم و کرگس کا وحشت انگیز کاشانہ ہے۔"

"اتنا اداس شام کا منظر کبھی نہ تھا"

حاجی محمد مانک صاحب کے تمام کپڑے خون آلودہ ہو چکے تھے۔ ایک نشہ تھا جس سے آپ جھوم جھوم گئے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی چاندنی کھیلنے لگی۔ آنکھوں میں خوشی سے آنسوؤں کے چراغ جل اٹھے۔ یہ حالت کیوں نہ ہوتی؟ گستاخ زبان ان کے جوتوں کی ٹھوکروں میں ہے۔ مردود قادیانی چیخ چیخ' جلا جلا اور تڑپ تڑپ کر واصلِ جہنم ہو چکا' اس مکروہ میت کا بھیانک منظر کیا بتاؤں' جیسے سڑک پر سؤر

کئی روز سے مرا پڑا ہو۔اس کے منہ کا وحشت ناک نقشہ مت پوچھو' معلوم ہوتا تھا کوئی پاگل کتا اپنی زبان باہر نکالے بھونک بھونک کر مر گیا ہے۔اس کے گلے میں لعنت کا طوق لٹک رہا تھا۔ادھر غازی محمد مانک صاحب کے چہرے پر ایسی بشاشت جیسے موتیے کی ادھ کھلی کلی کا بانکپن' ہونٹوں پر خمار اور انکھڑیوں میں وہ مستی کہ جیسے بارش کی رُت میں بادہ خوار کو ساقی کا دستِ کرم یاد آ جائے۔حضرت قبلہ غازی صاحب نے اس عظیم فریضہ سے سرخرو ہو چکنے پر چار میل کا سفر خراماں خراماں طے کیا۔لطف یہ ہے کہ راستے میں کسی شخص نے یہ بھی نہیں کہا کہ حاجی صاحب کپڑوں کی کیا حالت بنا رکھی ہے اور نہ آپ کے تعاقب میں آنے کی کسی کو جرأت پڑی۔

قتل کی اطلاع ذرا سے وقفے میں دور دور تک پھیل گئی۔یہ خبر اہلِ ضلالت کے دلوں پر بجلی بن کر گری' جبکہ کلمہ گوؤں کو مسرت و شادمانی کا سلیقہ سکھا رہی تھی۔حاجی صاحب جائے واردات سے سیدھے ''اکری'' میں اپنے گھر تشریف لائے اور والدہ محترمہ کو خوشخبری سناتے ہوئے کہا ''میں نے قادیانی گستاخ رسول ﷺ عبدالحق مردود کو نارِ جہنم میں جھونک دیا ہے۔اب تو مجھ سے خوش ہو جانا۔'' یہ سنتے ہی وہ اچھل پڑیں۔اپنے ہاتھوں سے دودھ کا کٹورا پلاتے ہوئے فرمایا ''بیٹا تم نے میرا حق ادا کر دیا ہے۔''

یہاں سے غازی صاحب سیدھے جامع مسجد گئے۔اپنے کپڑوں سے لہو کی ناپاک غلاظت اتاری۔غسل فرمایا' نفل شکرانہ ادا کیے اور قرآن شریف کی تلاوت میں محو ہو رہے۔اتنے میں رپورٹ درج ہونے پر پولیس بھی آپ کی گرفتاری کو آ پہنچی۔

پولیس اہلکاران آپ کے برادر اکبر محترم گل بہار صاحب سے ملے (جو ابھی تک صورت حال سے بے خبر تھے) اور حاجی موصوف کے بارے میں پوچھا۔اصل حقائق کا علم ہونے پر وہ دوڑے دوڑے آئے اور کہا ''حاجی صاحب' پولیس آپ کی تلاش میں ہے۔کیا عبدالحق قادیانی کو آپ نے ہی قتل کیا؟'' انہوں نے بتایا ''ہاں! اللہ تعالیٰ نے یہ کام مجھ گنہگار سے ہی لیا ہے۔آیئے پولیس کے پاس چلتے ہیں۔''

تھانے میں وقوعہ کی اطلاع مولوی عبدالحق قادیانی کے بیٹے مرزا یعقوب نے دی' جس پر زیر دفعہ 302 باقاعدہ رپٹ درج ہوئی۔جائے واردات سے پولیس سٹیشن ''فیض گنج'' تین میل بجانب مشرق واقع ہے۔ایف آئی آر میں واقعہ قتل کی وضاحت یوں درج ہے:

''سائل بیان کرتا ہے کہ عبدالحق میرا باپ ہے اور ہمارا آموں کا اپنا باغ ہے جس میں ہم آموں کی پنیری بوتے ہیں۔ہمارے پاس حاجی مانک آیا۔ایک

اور آدمی جس کا نام جان محمد بتایا گیا' بھی اس کے ساتھ تھا۔انہوں نے بتایا کہ ہمیں آم کی پنیری چاہیے۔ آج (21 ستمبر 1966ء) تقریباً گیارہ بجے دن مقتول (عبدالحق قادیانی) مذکورہ ملزموں کے ہمراہ باغ سے جنوب کی طرف گیا۔تھوڑی دیر بعد اچانک میرے باپ کی چیخ بلند ہوئی۔ہم نے دیکھا کہ حاجی مانک نے اسے پکڑ کر نیچے گرا دیا اور پھر چاقو نکال کر ذبح کرنے لگا۔آلۂ قتل حاجی مانک کے ہاتھ میں تھا۔ہمیں نزدیک آتے دیکھ کر ملزمان بھاگ گئے۔ہم نے بچشم خود مشاہدہ کیا کہ مقتول کی گردن کٹ چکی تھی۔ پیچھے سے کچھ حصہ کٹنا باقی تھا۔"

(پولیس ریکارڈ کے مطابق ایف آئی آر کا نمبر 87 جبکہ سیشن جج عدالت میں کیس نمبر 35 اور سن سماعت 1967ء ہے۔)

غازی محمد مانک صاحب پولیس کی حراست میں آ چکے تھے۔ آپ ہتھکڑیاں پہنے یوں خوش دکھائی دیتے' جیسے کہہ رہے ہوں "زنجیروں میں جکڑے ہوئے ان ہاتھوں کی خوش قسمتی تم کیا جانو! میرا ذوق محبت کہتا ہے کہ اس قید پر ہزار آزادیاں قربان کر دوں۔ یہ پا بجولاں کا بوجھ کیا؟ پھولوں کے گجرے ہیں جو میں نے کامیابی پر شاداں و فرحاں ہو کر سجا رکھے ہیں۔ کاش تم نے بھی میری طرح لطف آشنائی کا مزہ چکھ لیا ہوتا۔"

جب پولیس آپ کو موقع کی جانب لے جا رہی تھی تو عجب منظر تھا۔ کمر خمیدہ مانک سینہ تانے اکڑ اکڑ کر چلتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ایک طرف مقتول مردود عبدالحق قادیانی کی میت اپنے انجام کا وحشت ناک نظارہ پیش کر رہی تھی۔ چونکہ مقتول کے جسم پر گولی کا کوئی زخم نہ تھا' اس لیے ریوالور کے متعلق پولیس نے زیادہ پوچھ گچھ کی اور نہ ہی آپ نے کچھ بتایا۔ الغرض چاقو کی برآمدگی ہوئی۔ کاغذات تیار کیے گئے اور دیگر ضروری کوائف کا اندراج ہوا۔ بعد ازاں غازی ملت کو تھانے پہنچا دیا گیا مگر یہ پگلی دنیا نہیں جانتی کہ جسے جرم عشق پہ ناز ہو' بھلا اس کا نشہ بھی کبھی اترتا ہے۔

جنت کا تصور اب کیا آئے مرے دل میں
تصویر مدینے کی آنکھوں میں سجائی ہے

آج تھانے میں غازی صاحب کو پہلی رات تھی۔ آیئے ذرا معلوم کریں کہ آقائے نامدار حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے غلام پر اتنا کرم فرمایا۔ ابرِ رحمت کے چھینٹوں سے ان کی بات کس طرح بنی رہی۔ بے چین خواہشوں کو کیسے اور کیونکر چین آ گیا۔ ہم نے دیکھنا ہے کہ رخ زیبا کے شیدائی نے بے

حجاب جلووں کو کس قرینے سے اپنی بے تاب نگاہوں میں سمیٹا۔ اس راحت آمیز اور کیف آور واقعہ کی ابتداء یوں ہے کہ جب تیرگی کا قافلہ سطح زمین پر اتر چکا تو شہنشاہِ دو عالم ﷺ نے اپنے چہرۂ انور سے نقاب الٹ دی۔ بس پھر کیا تھا؟ اہل نگاہ میں اجالے بٹ گئے۔ فدا کارِ رسالت ﷺ کے مقدر کا کیا کہنا؟ جن کی تسکین کا خود آفتابِ نبوت ﷺ بندوبست فرمائیں۔

مصدقہ روایت ہے کہ متعلقہ پولیس افسر کی بیوی بڑی پاکباز' نیک سرشت اور عبادت گزار تھی۔ وہ نبی پاک ﷺ کے شہر کی ٹھنڈی ہوا کے لیے ہمیشہ تڑپا کرتی۔ ان کا تعلق پنجاب کے ایک معزز خاندان سے تھا اور یہ کہ اس خوش بخت خاتون کے باپ ایک باعمل اور متقی عالم دین تھے۔ قصہ مختصر نصف شب کے قریب موصوفہ سو رہی تھیں کہ یکا یک مقدر بیدار ہو گیا۔ خواب میں رسولِ پاک نبی کریم ﷺ تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا کہ حوالات میں ہمارا ایک مہمان آیا ہوا ہے' اس کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا۔ یہ نیک سیرت خاتون اسی لمحے اٹھ بیٹھیں۔ حدِ نظر تک اجالا ہی اجالا تھا۔ فضاؤں میں الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ کی وجد آفرین صدائیں گونج رہی تھیں۔ اب کہاں کی نیند اور کیسا اضطرار؟

انسپکٹر مذکور بغرض سحری گھر آئے تو ماحول بھینی بھینی خوشبوؤں میں رچا ہوا تھا۔ عجیب قسم کی راحت محسوس ہوئی۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکے' جھٹ اپنی رفیقۂ حیات سے پوچھا کہ یہ ہوا' یہ رات' یہ چاندنی' کس کی ادا پر نثار ہیں۔ مہکی مہکی ہوا' بدلے ہوئے موسم کا پتہ دے رہی ہے۔ ہمارے گھر میں بہار کی یہ رونقیں کیسے اور کب سے آ بسیں۔ شرم و حیا کی اس تصویر نے سجدۂ شکر سے سر اٹھایا اور اشکِ مسرت اپنے رخساروں سے پونچھتے ہوئے بولی:

> ''آج ہمارے پاک نبی ﷺ نے کرم فرمایا ہے۔ ان آنکھوں نے جب سے وہ جلوہ دیکھا' کسی اور نظارے کی حسرت نہیں رہی۔ شہنشاہِ مدینہ ﷺ کے یاقوتی ہونٹوں سے ایسے ترنم ریز الفاظ سنے ہیں کہ میں اپنے مقدر پر مرمٹی ہوں۔ آپ ﷺ کی حرمت و ناموس کا کوئی محافظ آج تھانے میں پابند ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہر طرح سے ان کی مدارات کا خیال رکھیں۔''

اس ایمان پرور واقعہ کے بعد پولیس کے رویہ میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ اب انسپکٹر حاجی صاحب کے ساتھ تفتیشی افسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک خادم کی طرح پیش آنے لگا۔ سحری و افطاری کا سامان بھی ادھر سے آ جاتا۔ کپڑے دُھلے ہوئے ملتے۔ نماز اور تلاوت کے لیے ہر طرح کی سہولت دی جانے لگی۔ اللہ کی اس نیک بندی کو یہی دُھن تھی کہ تاجدارِ مدینہ ﷺ کے مہمان بہرحال خوش رہیں۔ یہ قید نہ تھی' ایک انعام تھا کہ آپ دنیوی جھمیلوں سے بے نیاز ہمہ وقت یادِ الٰہی میں مگن رہتے

اور صبح و شام محبوبِ خدا ﷺ کے تصور میں گزار دیتے۔ کہتے ہیں ایک موقع پر کسی پولیس افسر نے پوچھا کہ حاجی صاحب آپ نے باوجود کبرسنی کے اسے کس طرح ہلاک کر دیا؟ جواب ملا ''ایک ضعیف صحابیؓ اللہ کی راہ میں جان دینے کی بڑی تڑپ رکھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں ایک نوکدار ہڈی عطا فرمائی اور وہ کفار کو جہنم میں دھکیلتے ہوئے واصل بحق ہو گئے۔ میں بھی وہی ذوق و شوق لے کر اٹھا تھا۔''

تھانے میں آپ کو دو ہفتے کے قریب ٹھہرایا گیا اور اس دوران آپ کو بفضلہٖ تعالیٰ ہر آسائش میسر رہی۔

وہ خوش قسمت سائل' جو دامن پھیلائے ہوئے بارگاہِ نبوت ﷺ میں آ جائے' اسے اتنی خیرات ملتی ہے کہ کاسۂ گدائی سے کیسۂ شاہی کو ذرا نسبت نہیں رہتی اور مانگنے والوں کو گلہ تنگیٔ داماں ہو جاتا ہے' بلکہ اہلِ دل کی نگاہ میں دربارِ محمد ﷺ سے تو بن مانگے ملتا ہے۔ وہ نادان ہیں جو یہاں بھی دستِ طلب بڑھا دیں۔

حضور رحمۃ للعالمین ﷺ کی چوکھٹ سے کیا کیا نہیں ملتا؟ فقیروں کو کشکول سے نوازنا' مانگنے کا سلیقہ عطا فرمانا اور پھر خود ہی ظرفِ طالب کو بھر دینا' ان کی ایک نگاہ کی بات ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ ﷺ فقط سوال ہی پورا نہیں کرتے' سائل کو سوال سے ہمیشہ کے لیے بے نیاز بھی کر دیتے ہیں۔

جب تفتیش کا مرحلہ ختم ہو چکا تو افسرانِ بالا کی ہدایت پر حاجی صاحب (محمد مانکؒ) کو ڈسٹرکٹ جیل خیر پور میں بھیج دیا گیا۔ یہاں ابرِ رحمت ایک بار پھر امڈ آیا۔ بتایا جاتا ہے کہ جیل سے ملحقہ ایک سید گھرانے کی رہائش تھی۔ غازی صاحب کے ادھر آتے ہی ایک سیدانی کو شہنشاہِ دو عالم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ نے فرمایا ''بیٹی! جیل میں آج شام سے ہماری عصمت و ناموس کا ایک نگہبان محبوس ہے۔ لوگ اسے حاجی مانک کے نام سے جانتے ہیں۔ اسے کھانے وغیرہ کی تکلیف نہ ہونے دینا۔'' علی الصبح گلشن زہراؓ کی اس پاکیزہ کلی نے تمام روداد اپنے بھائی سید امام علی شاہ صاحب کے گوش گزار کی۔ انہوں نے حاجی صاحب کے متعلق معلوم کروایا۔ پتہ چلا کہ وہ ایک قاتل ہے۔ اس پر پریشانی لاحق ہوئی۔ دوسرے روز پھر جمالِ قدس کا دیدار نصیب ہوا اور تاکید فرمائی گئی کہ یہی تو ہماری عظمتوں کے پاسبان ہیں۔

دورانِ اسیری ان کی طرف سے باقاعدہ کھانا پہنچتا رہا۔ نان و نفقہ کا یہ ایسا اہتمام تھا جو من و سلویٰ تناول کرنے والوں کے لیے باعثِ رشک ہے' اس لیے کہ خود محسنِ انسانیت ﷺ نے اپنے مخلص غلام کی خاطر اس کا حکم فرمایا۔

پولیس کے قانونی تقاضے پورے ہو چکے تھے۔ اب حسب ضابطہ مقدمے کی ابتدائی سماعت

سول کورٹ میں شروع ہوئی۔ یہاں آپ نے کوئی بھی بیان دینے سے انکار کیا۔ ازاں بعد مسل سیشن کورٹ میں روانہ کردی گئی۔ اس وقت سیشن جج جناب محمد علی عبدالرحمٰن صاحب تھے۔ انہوں نے کیس کو بطریقِ احسن نپٹایا۔ مقدمہ سیشن عدالت میں زیرِ سماعت تھا۔ ایک پیشی پر فاضل جج نے آپ سے پوچھا کہ بتائیں مقتول کی طرزِ گستاخی کیا تھی؟ یہ سن کر غازی صاحب پر کپکپاہٹ طاری ہوگئی اور کہا ''جناب جو کلمات میں سننا گوارا نہیں کرسکتا' وہ اپنی زبان سے کیسے ادا کرسکتا ہوں؟''

استغاثہ کے تمام گواہ قادیانی تھے۔ انہوں نے اپنے بیانات میں غازی صاحب کو مجرم ٹھہرایا۔ تاہم بغرضِ صفائی عدالت کی اجازت سے مسلمان گواہ بھی پیش ہوئے' جنہوں نے اس امر کے ثبوت فراہم کیے کہ مقتولِ مذکور مرزائیوں کا ایک یاوہ گو اور نمائندہ مبلغ تھا اور یہ کہ اس نے اہلِ اسلام کے جذبات کو بری طرح مجروح کیا تھا۔

سیشن کورٹ میں مرافعہ کی ایک مدت تک سماعت ہوتی رہی۔ غازی صاحب کی طرف سے مشہور ماہرِ قانون جناب سید غوث علی شاہ صاحب ایڈووکیٹ (سابق وزیرِ اعلیٰ سندھ) نے پیروی کی' جو ان دنوں خیر پور میں پریکٹس کررہے تھے۔ آپ نے مقدمہ میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا۔ بڑے وزنی دلائل اور اہم قانونی نکات عدالت کے سامنے رکھتے ہوئے واضح کیا کہ یہ ایک منفرد نوعیت کا مذہبی مقدمہ ہے۔ ملزم کے مذہبی جذبات کو بری طرح مجروح کیا گیا تھا' جس سے مشتعل ہوکر اس نے قتل کا فیصلہ کرلیا۔ لہٰذا حاجی صاحب کو باعزت طور پر بری کردینا چاہیے۔

وکلاء صاحبان کا خیال تھا کہ غازی ممدوح عدالت میں اپنے اقدام سے انکار کردیں گے مگر آپ نے یہ مؤقف تسلیم نہ کیا اور برابر بضد رہے کہ خواہ کوئی فیصلہ ہو' اس معاملہ میں ہرگز جھوٹ نہ بولوں گا۔ مجھ میں انکار کی جرأت ہرگز نہیں۔ بالآخر جب پوچھا گیا تو آپ نے تمام احوال عدالت کے روبرو بیان کیے اور ہر کہیں اپنے فعل کا متواتر اقرار کیا۔

عزتِ ملت بیضا کی حفاظت کے لیے
دوش پر لاکھوں سر ہوں تو کٹاتے جاؤ

سیشن کورٹ خیر پور میں سماعت کے پہلے دن مقدمے کی سرگزشت فاضل جج کے گوش گزار کی گئی۔ الحاج غازی مانک صاحب کی جانب سے ایڈووکیٹ سید غوث علی شاہ صاحب پیروکار تھے جبکہ مسٹر علی عباس پبلک پراسیکیوٹر نے وکیلِ معاونت کا دم بھرا۔

(تفتیشی افسران اور دیگر پولیس ملازمین کے بیانات کا خلاصہ درج ذیل ہے)

ایف آئی آر درج کرنے کے بعد ہیڈ کانسٹیبل شکایت کنندہ کے ساتھ جائے وقوعہ پر گیا اور

صورت حال ملاحظہ کی۔ لاش آم کے درخت کے نیچے پڑی تھی۔ لاش پر کئی گہرے زخم پائے گئے۔ نیز محمد اسلم اور یعقوب کی موجودگی میں تفتیشی رپورٹ تیار کرنے کے بعد نعش پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال بھیجی گئی اور گواہان محمد صادق' عبدالمجید اور بشیر احمد کے بیانات قلمبند کیے۔

رات دس بجے پولیس نے ملزم کے گھر چھاپہ مارا۔ حاجی مانک گرفتاری کے لیے ازخود پیش ہو گیا اور پوچھ گچھ کی۔ ملزم نے اپنی جیب سے چاقو نکال کر دیا' جس پر خون کے دھبے نہ تھے۔ ملزم' دوران تفتیش بار بار اعتراف قتل کرتا رہا۔ لہٰذا اسے 24 دسمبر 1966ء کو مختار کار مجسٹریٹ درجہ اوّل فیض گنج کے روبرو پیش کیا۔ ملزم نے ہمارے اور ذیلی عدالت کے روبرو عبدالحق قادیانی کے قتل کا اقرار کیا لیکن بالکل اکیلے نہ کہ جان محمد کے ساتھ' جیسا کہ استغاثہ کے بیان میں ہے۔

سیشن عدالت میں الحاج غازی مانک صاحب کے بیانات سے موضوع کا ایک نیا رخ ہمارے سامنے آتا ہے۔ گزشتہ صفحات میں درج کر چکا ہوں کہ ایک قادیانی مردود عبدالحق نے شرائط مناظرہ طے کرتے وقت رسول اکرم ﷺ کی شان اقدس میں گستاخانہ الفاظ بکے تھے۔ اس پر اہلِ ایمان کے دلوں میں غضب کا لاوا پھوٹ پڑا مگر غازی محمد مانک صاحب نے عدالت میں ایک اور بھی وجہ بیان فرمائی۔ درحقیقت معاملہ یوں ہے کہ جب مرزائی خبیث عبدالحق کی طرف سے گستاخی کا واقعہ پیش آیا تو جناب حاجی مانک صاحب موجود نہ تھے' ازاں بعد اتفاقاً آپ کو مزید تصدیق کے لیے بے غیرت ملیچھ عبدالحق قادیانی سے ملنے کا موقع بہم پہنچ گیا۔

چنانچہ بقول آپ کے ''مستری حسن محمد قادیانی' ایک بہانے سے مجھے قادیانی مبلغ عبدالحق کے پاس لے گیا۔ وہ چونکہ دونوں ہم مذہب تھے' اس لیے انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی سے متعلق گفتگو چھیڑ دی اور ترغیب دیتے رہے کہ میں احمدیہ مذہب میں شامل ہو جاؤں۔ وہ کوشاں رہے کہ کسی طرح میں مرزا قادیانی کی نبوت کو درست تسلیم کر لوں۔ مگر میرے لیے یہ بات قطعاً ناقابلِ برداشت تھی' بالآخر مقتول عبدالحق قادیانی نے کہا کہ میں ثابت کروں کہ مرزا غلام احمد کیسے نبی نہیں تھا؟ جواباً میری ایک دلیل یہ تھی کہ تمہارے مرزا نے دو پیشین گوئیاں کیں' جو بلاشبہ غلط ثابت ہوئیں۔ اوّل یہ کہ مرزا قادیانی نے کہا کہ عبداللہ آتھم 15 یوم کے اندر مر جائے گا اور دوم یہ کہ اس کی محمدی بیگم سے شادی ہوگی۔ اس پر جب مرزائی ملعونوں سے کوئی جواب بن نہ پڑا تو انہوں نے مجھ سے کہا ''اگر ایسا ہے تو تم ثابت کرو کہ حضرت محمد ﷺ نبی برحق تھے؟'' جب میں نے قرآن پاک کی ایک آیت تلاوت کی تو بے غیرت قادیانی مبلغ ''عبدالحق'' کمینگی پر اتر آیا اور بکنے لگا کہ تم اور تمہارے نبی ﷺ...... ہیں اور یہ کہ تمہارے رسولِ پاک ﷺ تو ''عورتوں کے شائقین'' (معاذ اللہ...... نقلِ کفر' کفر نہ باشد) تھے۔ میں قوتِ ایمانی

سے مشتعل ہوگیا اور مسواکِ بنانے اور فروٹ کاٹنے والے چاقو سے اس ذلیل کو ذلت کی موت سے دوچار کردیا۔ جناب غازی مانک کے وکیل مسٹر غوث علی شاہ نے بڑی جاندار اور مدلل بحث کی انہوں نے کہا کہ ملزم...... اپنے بیانات میں بالکل سچا ہے لیکن مستغیث کا دعویٰ درست ثابت نہیں ہوتا۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ واقعی کسی نے نہیں دیکھا اور چشم دید گواہ فرضی ہیں' لہٰذا قانونی طور پر ساتوں گواہان قابلِ اعتبار نہیں ٹھہرتے۔ جبکہ دوسری طرف ملزم نے پولیس' مجسٹریٹ اور دیگر ذیلی عدالتوں کے روبرو اپنے فعل کا متواتر اعتراف کیا ہے۔ الغرض درج ذیل نکات وضاحت طلب ہیں۔

1- آیا' مولوی عبدالحق قادیانی زخموں کے نتیجے میں مرا؟

2- یہ کہ ملزم نے ہی مقتول کو زخم لگائے ہیں؟

3- ملزم نے آئینی اعتبار سے کونسا جرم کیا ہے؟

اولاً' یہ نکتہ بالخصوص وجہ کا متقاضی ہے کہ ڈاکٹر سید عرفان احمد (جس نے پوسٹ مارٹم کیا) کی رائے میں موت کا سبب خوف و ہراس بنا...... قطع نظر نکتہ کے' ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ملزم نے کس نوعیت کا جرم کیا ہے...... ویسے بھی ملزم طبعی عمر کے آخری درجہ پر ہے۔ بنابریں مذہبی جذبات مشتعل ہونے کی وجہ سے ملزم کو بری کر دیا جانا چاہیے۔

بالآخر 20 اپریل 1968ء کو سیشن جج نے فیصلہ صادر کیا' جس کی رو سے تین سال قید کی سزا سنائی گئی۔ فاضل جج نے اپنے تاثرات میں لکھا۔

تمام گواہ احمدیہ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ بادی النظر یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ موقع پر موجود نہ ہوں۔ استغاثہ میں مبینہ جزئیات وتفصیلات دماغ پر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑتیں...... میڈیکل آفیسر سید عرفان احمد ولد محمد محسن سکنہ فیض گنج بہ عمر 36 سال نے حلفیہ بیان دیا ہے کہ پوسٹ مارٹم کے وقت بیرونی معائنہ سے میں نے درج ذیل زخم پائے۔

1-ایک گہرا زخم	"1/2 5 "1/2 3 X"	(گردن کے سامنے کی طرف ہڈی تک آرپار)
2-ایک گہرا زخم	"1/2 X "1/2 X "1	(زبان کی بائیں طرف)
3-ایک گہرا زخم	"1/2 X "1/2 X "1/4	(زبان کی دائیں طرف)
4-ایک گہرا زخم	"1/2 X "1/4	(دائیں رخسار پر)
5-ایک گہرا زخم	"1 X "1/4 X "1/2	(دائیں ہاتھ پر)
6-ایک گہرا زخم	"1 X "1/4 X "1	(بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر)
7-ایک گہرا زخم	"1/2 X "1/4 X "1 1/2	(دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر)

اور یہ کہ تمام زخم ایک تیز دھار آلہ سے لگائے گئے ہیں۔ لاش کے اندرونی معائنہ سے مندرجہ ذیل زخموں کا پتہ چلا۔ منہ کی اندرونی سطح اور بائیں طرف سے زبان بری طرح زخمی تھی۔ نسیں مکمل طور پر کٹی ہوئی ملیں۔ میں اندرونی و بیرونی معائنے سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شاید موت' ڈر اور خوف سے ہوئی۔ دونوں چشم دید گواہ (محمد یعقوب' محمد صدیق) جو کہ آنجہانی عبدالحق کے قریبی رشتہ دار ہیں' یہ بتانے سے قاصر رہے کہ واقعہ سے فوراً پہلے مقتول اور قاتل کے درمیان کیا گفتگو ہوئی۔ دوسری طرف ملزم کے بیانات کے حوالہ سے دیکھا جائے تو احمد دین والیاس احمد بنام حکومت (پی ایل ڈی 1967ء لاہور 649) میں ہے کہ جہاں ملزم کا بیان سزا کی بنیاد بنے تو بیان کو اس کی کلی حالت میں تسلیم کیا جائے۔ اس قانونی نظریہ کی مزید تصدیق غلام محمد بنام حکومت (پی ایل ڈی' 1968ء پاکستان جنرل) میں ہائی کورٹ کے فیصلہ سے ہو چکی ہے۔

ہمارے پاس یہ تازہ فیصلہ موجود ہے' جس میں ملزم نے سائیں غریبو کو قرآن پاک پھاڑنے پر مار دیا تھا۔ عزت مآب نے اس میں اس طرح بیان کیا "ہر مسلمان قرآن پاک کو گناہوں سے نجات کا ذریعہ مانتا ہے' اس کو کسی قسم کا پھاڑنا یا بے حرمتی یقینی طور پر مسلمانوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگی اور پھر ایک عالم کے لیے تو اور بھی زیادہ جو مختلف ماحول میں جوان ہوا اور بالکل مختلف تربیت حاصل کی۔

موجودہ مقدمے میں مقتول نے پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے خلاف نازیبا کلمات استعمال کیے' اس لیے ملزم اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے جلدی میں (ایمانی تقاضوں کے تحت) ایسا کیا' لہٰذا اشتعال انگیزی ظاہر ہوئی' پس میرے خیال میں اسے ایکسپشن 8 تعزیرات پاکستان کا فائدہ پہنچتا ہے۔

مسٹر غوث علی شاہ فاضل قانون دان' جو ملزم کی طرف سے پیش ہوئے' نے بہت سی کتابوں کا ذکر کیا ہے' جن سے احمدی مذہب کے لوگوں کا حضرت محمد ﷺ کے خلاف گستاخانہ رویہ ثابت ہوتا ہے' اس لیے میں ملزم حاجی محمد مانک کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ 304 کے تحت تین سال قید کی سزا سناتا ہوں۔ ساتھ ہی یہ امر ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہ ملزم دل کا مریض ہے' اس بنیاد پر اسے جیل میں کلاس بی عنایت کی جائے۔

آپ کو سزا کی یہ مدت خیرپور کی ضلعی جیل میں گزارنا تھی۔ غازی صاحب نے اپنے تعلق داروں اور مجلس تحفظِ ختم نبوت کے ارکان کو منع کر دیا تھا کہ وہ عدالتِ عالیہ میں اپیل ہرگز دائر نہ کریں' دوسری جانب سے قادیانیوں نے ہائیکورٹ سندھ میں نگرانی کی اپیل گزاری' جسے متعلقہ جسٹس نے سرسری سماعت کے بعد رد کر دیا اور یوں عدالتی چکر بازیاں اور قانونی چارہ جوئیاں ختم ہو گئیں۔

ابتداءً مقدمے کی پیروی غازی موصوف کے برادرِ اکبر گل بہار صاحب کرتے رہے۔ چونکہ بمشکل گزر اوقات ہو رہی تھی' اس لیے زمین کو گروی رکھنا پڑا۔ جب صحیح صورت حال تاجدارِ ختم نبوت ﷺ کے پروانوں کے علم میں آئی تو انہوں نے دست تعاون بڑھایا اور جملہ مصارف اپنے ذمہ لے لیے۔ رہن شدہ زمین آپ کے صاحبزادگان کو آزاد کرا دی' نیز آپ کے جوش ایمانی کو پورے علاقے میں متعارف کرایا اور بالخصوص سکھر میں مختلف میٹنگیں ہوتی رہیں' جن میں قانونی دفاع بھی زیرِ غور رہتا۔

یہ تذکرہ بھی بڑا پُر لطف ہے کہ سنٹرل جیل سکھر میں الحاج موصوف کے 3 برس کیسے گزرے؟ حقیقت یہ ہے کہ مقدمے کی سماعت کے دوران ہی آپ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ پیشی کے موقع پر عدالت میں سینکڑوں لوگ فقط اس نیت سے ٹوٹ پڑتے کہ غازی صاحب کی زیارت ہو جائے گی۔ عرصۂ اسیری میں ہزاروں افراد نے آپ سے ملاقات کی۔ بڑے بڑے اہلِ نظر آپ سے ملنے تشریف لائے۔ حضرت صاحبزادہ جناب محمود اسعد صاحب سجادہ نشین خانقاہِ عالیہ ہالیجی شریف آپ کی ملاقات کو اکثر و بیشتر آیا کرتے۔ وہ فرماتے کہ غازی صاحب پر رسولِ اکرم ﷺ کی خاص نظرِ کرم ہے۔ ایک وقت آئے گا جب لوگ فخر کیا کریں گے کہ میں نے ان کی زیارت کی تھی۔

آپ کے ساتھ جیل کے عملے کا سلوک بہت اچھا تھا۔ جیل خانہ کے سینئر افسروں نے انہیں ہر ممکن سہولتیں بہم پہنچائیں۔ یہ بھی سرکارِ مدینہ ﷺ کا خاص کرم ہے کہ آپ جہاں جہاں بھی پہنچے' لوگوں کے دلوں میں محبت کا جذبہ پیدا ہوا۔ حکامِ جیل تو گہری عقیدت رکھتے تھے' الغرض جب سزا کی مدت پوری ہو گئی تو آپ کو بیرونِ شہر سے مینارہ روڈ معصوم شاہ تک' ایک منظم جلوس کی شکل میں لایا گیا۔ اس روز اتنا عظیم اجتماع تھا کہ لوگ حیران رہ گئے۔ کئی ذمہ دار افراد نے آنکھوں دیکھا حال بتایا کہ جلوس پورے تین میل لمبا تھا۔ بعد میں اس نے جلسے کی صورت اختیار کر لی۔ پر جوش تقاریر ہوئیں۔ ''غازی مانک زندہ باد'' کے نعرے لگے۔ چائے اور کھانے کا بھی اہتمام تھا۔ دور دراز علاقوں سے بسلسلہ زیارت حاضر ہونے والوں کی تو کوئی گنتی نہیں۔ جلسہ وجلوس میں سندھ کے معروف اکابرین موجود تھے۔ جناب ایاز خاں صاحب (سابق ممبر مرکزی مجلسِ شوریٰ وسابق رکن مجلس تحفظِ ختم نبوت پاکستان) جن کا تعلق جمیعت العلماء پاکستان سے ہے اور ہر دلعزیز اور مخلص رہنما ہیں' نے آغاز سے آخر تک ہر اہم معاملے میں تعاون فرمایا۔ مقدمہ میں ان کا مشورہ اور عملی تعاون شامل رہا۔ کئی مرتبہ جیل تک ملاقات کے لیے تشریف لائے اور جلوس میں بھی شامل ہوئے۔ نیز اس موقع پر آپ نے ایک معرکہ آرا دل نشین تقریر بھی فرمائی۔

رہائی کے بعد جب حضرت قبلہ غازی صاحب کی ضیافتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو سپرنٹنڈنٹ جیل اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحبان نے بالخصوص دعوت منظور کی۔ سپرنٹنڈنٹ جیل جناب منظور حسین خان پنور صاحب، جو آج کل آئی جی جیل خانہ جات سندھ ہیں، نے ہر دور اہے پر جناب غازی ممدوح سے نیک برتاؤ کیا۔ آپ کا ابتدائی تعلق حسین آباد ضلع خیر پور سے ہے۔ ایسے صاحب کردار افسر بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ جب تک الحاج موصوف بقیدِ حیات رہے، آپ سے وقتاً فوقتاً ملتے رہنا ان کا معمول تھا۔ بعض اوقات تو سپیشل ملاقات کے لیے تشریف آوری ہوتی۔ محترم سپرنٹنڈنٹ جناب پنور صاحب بتاتے ہیں کہ ایک رات میں گشت پر تھا۔ غازی محمد مانک صاحب کی کوٹھڑی کے قریب سے میرا گزر ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ماحول خوشبوؤں میں رچا ہوا ہے اور عجب قسم کی روشنی بھی دیکھی۔ قریب پہنچا تو دکھائی دیا کہ غازی صاحب قبلہ رو سر بسجدہ ہیں۔ وہ پہلا دن تھا جب میرے دل میں عقیدت پیدا ہوئی اور پھر روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی۔ اب آپ سے ملتا تو دل مطمئن ہو جایا کرتا تھا۔ ہم لوگ ہمیشہ دعاؤں کی درخواست کیا کرتے۔

ظلمتِ دہر میں ہر سمت اجالا کر دوں
کاش! مل جائیں مجھے کوچۂ جاناں کے دیئے

غازی محمد مانک مرحومؒ نے تمام زندگی مرزائیوں کے خلاف جہاد کیا۔ 1974ء کی تحریکِ ختم نبوت کے دوران آپ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا ''میں نے پچاس مجاہدوں سے ان کے خون کے ساتھ دستخط لیے ہیں کہ اگر گورنمنٹ نے قادیانی گماشتوں کو اقلیت قرار نہ دیا تو ہم سندھ میں ان کے تمام مکانوں کو نذرِ آتش کر دیں گے۔'' ایک اور موقع پر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

''خدا کی قسم اگر تمام دنیا بھی ہماری دشمن ہو جائے تو ہم تحفظ ناموسِ رسالت ﷺ کا کام کرتے رہیں گے اور اس عظیم مقصد کے لیے ہر مصیبت بخوشی جھیلیں گے۔''

ایک بار جناب الحاج محمد مانک صاحب نے اپنے قریبی حلقہ کو بتایا کہ ابھی میں نے قادیانی مقتول کو واصل فی النار نہیں کیا تھا جب مجھے اشارہ ہوا کہ تم سے ایک بڑا کام لیا جانے والا ہے۔

غازی صاحب کے بقول ان کی بہت بڑی خواہش تھی کہ مرزائیوں کے خلاف کوئی انتہائی قدم اٹھائیں اور یہ کہ وہ اس سلسلے میں ایک بار ربوہ بھی تشریف لے گئے مگر بوجہ اپنے شکار تک رسائی نہ ہو سکی۔

بالآخر اس عظیم المرتبت مجاہد کو اپنے حبیب پاک ﷺ کی عظمت کا پرچم بلند کرتے، شاتمانِ نبی کی مادی قوتیں مٹاتے، بہ آوازِ بلند عشق رسول ﷺ کا نعرہ لگاتے اور سلام کی شمعیں جلاتے ہوئے

سفرِ آخرت کے لیے تیار پایا گیا۔

آپ کی مضطرب روح جلد از جلد محبوبِ خدا ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا چاہتی تھی۔
2 اکتوبر 1983ء مطابق 22 ذی الحجہ بروز ہفتہ چار بجے دن کی بات ہے کہ اس غازی مرد نے اپنے عزیز واقارب سے فرمایا کہ ”مجھے گاؤں کے قبرستان میں ہی مسنون طریقہ سے سپردِ خاک کیا جائے۔ میری خوشی اسی میں ہے کہ آپ لوگ ہمیشہ تاجدارِ ختم نبوت ﷺ کی عزت وناموس کا تحفظ کرتے رہیں اور آپ ﷺ کے ہر گستاخ کو ذلت ناک موت سے دوچار کریں۔ مجھے انتظار ہے حاجی غلام محمد صاحب کو بلواؤ۔“

اس کے ساتھ ہی آپ کی نبض ڈوبنے لگی۔ تارِ نفس کی آمد و شد کا سلسلہ اکھڑتا چلا گیا۔ آپ کا رخ مدینہ منورہ کی سمت تھا اور برابر کلمہ طیبہ کا ورد کرتے جا رہے تھے کہ اچانک طائرِ روح نے قفسِ عنصری سے اُڑان لی اور گنبدِ خضرا پر بوسے لٹاتا ہوا نغمہ سنج ہو گیا۔

نمازِ جنازہ دو بار پڑھی گئی۔ پہلی بار مولوی نور احمد صاحب' جو گاؤں کے رہائشی اور آپ کے عزیز تھے' کی اقتدا میں ادا ہوئی جبکہ دوسری دفعہ مولانا رحیم بخش صاحب امام تھے۔ جنازے میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ مصدقہ اطلاع کے مطابق آخری رسومات میں کم از کم بیس ہزار نفوس شامل ہوئے۔

غازی محمد مانک صاحب اکثر فرمایا کرتے ”اوائل عمری سے ہی میری سب سے بڑی خواہش تھی کہ نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت نصیب ہو۔ میں مدتوں اوراد و وظائف میں جتا رہا۔ سات حج کیے' باقاعدگی کے ساتھ نمازیں پڑھیں مگر ہمیشہ اس عظیم شرف سے محروم رہا۔ آخر میری قسمت اس وقت جاگی' جب میں نے اپنے نوکِ قلم سے نشانِ باطل (عبدالحق قادیانی) کو کھرچ ڈالا۔ اب کوئی رات ایسی نہیں گزرتی جس میں شہنشاہِ مدینہ ﷺ نے دستگیری نہ فرمائی ہو۔ ہر وقت ہر روز قربت کے مزے لوٹتا ہوں۔ بس میری زندگی کے روز و شب ان (ﷺ) کی نگاہِ کرم سے گزر رہے ہیں۔“



غازی عبدالمنان

عزیز ملک

رسوائے عالم شردھانند اور راجپال کے عبرتناک قتل پر چند ہی برس گزرے تھے کہ ناقابل اصلاح مہاسبھائی ذہنیت نے پھر ایک بار انگڑائی لی اور ضلع کیمبل پور کے ایک بدباطن کراڑ بچے نے شان رسالت مآب ﷺ میں گستاخی کا ارتکاب کیا۔

ہوا یہ کہ حضرو تھانہ سے تین میل مشرق کی جانب ایک گاؤں برہ زئی میں آلو پیاز کی پھیری لگانے والے ادھیڑ عمر ہندو بھیشو نے کسی خاتون گاہک کو سودا بیچنے میں حد ادب کو پھلانگتے ہوئے بلاوجہ شان رسالت ﷺ میں گستاخانہ حملہ کیا۔

وقتی طور پر بات رفت گزشت ہوگئی کیوں کہ آس پاس کوئی مرد اس وقت موجود نہ تھا۔ بھیشو ہانک لگاتا گاؤں سے باہر نکل گیا۔ وہ ایک نواحی قصبہ نرتوپہ کا رہنے والا تھا۔ اس کا اصل نام بھوشن اور عرفی نام بھیشو تھا۔ وہ برسوں سے آس پاس کے دیہات میں سبزی کی پھیری لگانے آتا۔ ہرچند اسے معلوم تھا کہ مسلمان دیہاتی ہی اس کے گاہک اور رزق کا وسیلہ ہیں' اس کی بے لگام زبان مسلمانوں کے بارے میں زہر اگلنے سے باز نہ رہتی۔ مسلمان صبر سے کام لیتے کہ کتے کی عف عف کا کیا جواب! آخر کار اس کے دل کی خباثت ابل کر ایک روز ہونٹوں تک آ گئی۔ یہ جولائی 1937ء کے پہلے ہفتے کا واقعہ ہے۔ گاؤں بھر میں چرچا ہوا۔

تیسرے چوتھے روز گاؤں کا ایک اٹھارہ سالہ نوجوان عبدالمنان دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں

غورغشتی کے مدرسہ سے صرف ونحو کا درس لے کر گھر واپس پہنچا تو اس کے بڑے بھائی حافظ غلام محمود نے کہا کہ بعد دوپہر جب دھوپ ذرا ڈھل جائے تو مجھے سائیکل پر حضرو چھوڑ آنا میں وہاں سے پنڈی کے لیے بس پکڑ لوں گا۔ عبدالمنان نے کہا۔"ٹھیک ہے آپ ذرا دیر آرام کرلیں، میں بھی مسجد میں جا کر ستا لوں۔"

وہ گھر سے باہر نکلا تو کسی نے اسے بتایا کہ بھیشو آج پھر گاؤں کی گلیوں میں ہانک لگاتا پھرتا ہے۔ عبدالمنان مسجد کے اندر جاتے جاتے رک گیا۔ اسے کچھ خیال آیا۔ ایک خیال جس نے اس کی تقدیر بدل دی۔ وہ تقدیر جس پر فرشتوں کو بھی رشک آئے۔ وہ تیزی کے ساتھ اپنے ایک دوست کے یہاں پہنچا اور اس سے کمانی دار چاقو مانگا جو حال ہی میں اس نے خرید کیا تھا اور عبدالمنان کو بہت پسند آیا تھا۔

چاقو لے کر وہ اپنے شکار کی تلاش میں نکلا۔ بھیشو اس دوران گاؤں سے باہر کھلے کھیتوں سے ہوتا ہوا ڈیڑھ فرلانگ دور جا چکا تھا۔ عبدالمنان نے تعاقب کیا اور کھیتوں سے پرے گھنے درختوں سے متصل ایک کنویں پر جا لیا جہاں بھیشو کچھ دیر ستانے کو رک گیا تھا۔ عبدالمنان اس کے پاس جا بیٹھا اور ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بھیشو نے اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر پوچھا۔"یہ کیوں کھول رکھا ہے؟"

عبدالمنان نے جواب دیا۔"ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔" دشمن رسول کو اپنے انجام کا احساس ہو گیا اور وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔

عبدالمنان نے پوچھا کہ تو نے اگلے روز شانِ رسالتؐ میں گستاخی کی جرأت کیوں کر کی۔ بھیشو کوئی معقول جواب نہ دے سکا تو عبدالمنان نے چاقو اس کے سینے میں پیوست کر دیا۔ وہ اٹھ کر بھاگنے لگا مگر اجل کہاں جانے دیتی ہے۔ عبدالمنان نے اسے گھٹنوں تلے دبوچ کر دو تین وار اور کیے۔ کافر کا ناپاک خون کنویں کے حوالی کی مٹی میں جذب ہونے لگا۔ بھیشو نے صرف اتنا کہا کہ مار تو چکا ہے اب تو بس کر۔

دشمن کو ابھی تک زندہ جان کر عبدالمنان نے اس کی شہ رگ کو چاقو کی دھار پر لیا اور اس کا کام تمام کر ڈالا۔ چند زمیندار جو کنویں سے چند گز اُدھر اپنے کام میں مصروف تھے، شور سن کر آ گئے۔

کچھ دیر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دیکھتے دیکھتے برہ زئی اور آس پاس کے دیہات سے مسلمان جمع ہو گئے۔ کسی نے حضرو تھانہ جا کر اطلاع کر دی اور پولیس آ گئی۔

ظہر کا وقت ہو چلا تھا جب پولیس کے جھرمٹ میں عبدالمنان کو حضرو لے جایا گیا۔ سینکڑوں آدمی تکبیر کے نعرے بلند کرتے ہوئے جلوس کی شکل میں ساتھ ساتھ گئے۔ حضرو پہنچتے پہنچتے ہزاروں کا

مجمع ہو گیا۔

تھانہ کے مسلمان انچارج نے عبدالمنان سے کہا کہ تم اپنا بیان میری ہدایت کے مطابق لکھواؤ۔ عبدالمنان نے کہا یہ پٹی تم کسی اور کو پڑھانا۔ میں نے اللہ کے حبیب کی محبت میں اپنا فرض ادا کیا ہے اور اب جھوٹ بول کر اپنے عمل کو ضائع نہیں کر سکتا۔

بہر کیف حضرو تھانہ میں عبدالمنان کا اقبالی بیان درج ہو گیا۔ تھانہ والوں نے کیمبل پور اطلاع دی کہ یہاں ہزاروں مسلمان مشتعل کھڑے ہیں۔ اندیشہ ہے کہیں ہندو مسلم تصادم نہ ہو جائے۔ کیمبل پور سے سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دو تین چھوٹے افسر حضرو پہنچ گئے اور عبدالمنان کو کار میں کیمبل پور لے آئے۔ یہاں بھی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے عبدالمنان کو ہمدردانہ مشورہ دیا مگر اس نے جھوٹ بولنے سے انکار کر دیا۔

دو تین روز میں استغاثہ مکمل ہو گیا۔ اقبالی بیان تو موجود تھا ہی۔ عبدالمنان سیشن سپرد ہو گیا۔ ان دنوں مسٹر جی۔ ڈی۔ کھوسلہ کیمبل پور کے ڈسٹرکٹ سیشن جج تھے۔ فریقین نے اپنے اپنے گواہ پیش کیے۔ مقتول کی طرف سے دو تین جگادھری ہندو وکلاء نے پیروی کی۔ پیشی کے روز عدالت کے باہر ہزاروں کا مجمع تھا۔ دراز قامت اٹھارہ سالہ نوجوان عبدالمنان مجرموں کے کٹہرے میں بڑے وقار کے ساتھ کھڑا مقدمے کی کارروائی سنتا۔ مقتول کی بیوی بھی گواہی کے لیے پیش ہوئی اور اس نے جرح کے دوران اس حقیقت کا اعتراف کر لیا کہ بھیشو اکثر مسلمانوں کے خلاف زہر چکانی کرتا اور منع کرنے کے باوجود باز نہیں آتا تھا اور آخر کار وہی ہوا جو غیر متوقع نہیں تھا۔ بیوی کے بیان نے مقتول شوہر کے استغاثہ کا حصار توڑ کر رکھ دیا۔

جی۔ ڈی کھوسلہ نے قتل کو فوری اشتعال کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے عبدالمنان کو سات سال قید سخت کی سزا سنائی اور فیصلہ میں لکھا کہ مجرم اگر جواں سال نہ ہوتا تو اسے عمر قید کی سزا دی جاتی۔

جس وقت فیصلہ سنایا جا رہا تھا عدالت کے باہر ان گنت مسلمان والہانہ نعرے لگا رہے تھے اور حب رسول ﷺ کی بارش اہل ایمان کے دلوں پر رم جھم برس رہی تھی۔

عبدالمنان کو عدالت کے عقبی دروازہ سے نکال کر عجلت کے ساتھ جیل پہنچا دیا گیا اور مجمع بہت دیر انتظار کرنے کے بعد منتشر ہو گیا۔ انہیں افسوس ہی رہا کہ اس روز وہ اس جیالے عاشق رسول ﷺ کی جھلک نہ دیکھ سکے۔

مسلمانوں نے ہائی کورٹ میں اپیل کے لیے تگ و دو کی۔ ڈاکٹر محمد عالم بیرسٹر کا خیال تھا کہ اپیل ضرور کرنی چاہیے مگر کچھ دوسرے مقتدر مسلمان وکلاء نے مشورہ دیا کہ سزا میں اضافہ کا امکان ہے،

اس لیے اپیل نہ کرنا ہی قرین مصلحت ہے چنانچہ اپیل نہ کی گئی۔

سات برس کی مدت قید چھوٹ کے ایام کی رعایت سے صرف پانچ برس رہ گئی جن میں سے عبدالمنان نے ایک برس ملتان اور چار برس پنڈی جیل میں گزارے۔

ایک محفل میں گذشتہ دنوں مجھے غازی عبدالمنان سے ملاقات کا موقع ملا۔ میں اس کی باوقار اور متین شخصیت سے متاثر ہوا۔ اس نے یہ سارا واقعہ دھیمے لہجے میں مجھے خود سنایا۔

غازی عبدالمنان نے ان دنوں برہ زئی میں آٹا پیسنے کی مشین لگا رکھی ہے۔ اس کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے جو پنڈی میں بیاہی ہوئی ہے۔ بڑا لڑکا انگلینڈ میں ہے اور خاصا متمول ہے۔



وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

هاشم ۱۳۷۰ هجرية

غازی منظور حسین شہیدؒ

اچ ساجد اعوان

غازی منظور حسین شہید ایک معروف علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم مولانا ابوالفضل محمد کرم الدین صاحب مرحوم کی پنجاب میں بہت شہرت تھی۔ ان کا تعلق ضلع چکوال کی ایک بستی ''بھیں'' سے تھا۔ مولانا موصوف اکثر حلقوں میں ایک حاضر دماغ اور کامیاب مناظر کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ ان کا روحانی تعلق سیال شریف سے تھا۔ شمس العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سے بیعت تھی یا آپ کے کسی خلیفہ سے۔

آیئے پہلے آپ کو ایک گاؤں ''لکی مروت'' لے چلوں۔ یہ ضلع بنوں میں میانوالی روڈ پر ہے۔ اس مقام پر ایک وسیع قبرستان ہے جس میں موجود ایک مسجد کے بالکل نزدیک مولانا قاضی منظور حسین شہید کی قبر ہے اور لوح مزار پر ان کے مختصر احوال کندہ ہیں۔

1941ء کی بات ہے تھانہ ڈوہمن کے ڈاک بنگلہ میں ایک متعصب ہندو چوہدری کھیم چند ایس ڈی او چکوال مقیم تھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس چکوال سے جہلم روڈ پر خانپور قصبہ کے قریب واقع ہے۔ اس بدطینت کو مہاشہ راجپال آریہ سماجی (جسے غازی علم الدین شہید نے واصلِ جہنم کیا تھا) کا قریبی رشتہ دار بتایا جاتا ہے۔

طرز گستاخی کیا تھی؟ اور اس نے یہ وطیرہ کب سے اختیار کر رکھا تھا؟ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ تاہم یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس کمینہ فطرت و ذہن دریدہ ہندو نے شان رسالت مآب ﷺ میں بے ادبانہ الفاظ بکے ہوں گے۔ بہرحال اسے شاتمیت کا مزا چکھانے کو قاضی صاحب

اپنے ایک مخلص ساتھی ماسٹر عبدالعزیز (چکوال) کے ہمراہ رات کی تاریکی میں وہاں گئے اور اس کی پیشانی پر پستول کا فائر کیا۔ ازاں بعد ماسٹر صاحب نے سات برچھیاں لگائیں۔ اتنے میں گستاخ نبی اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا تھا۔ مقتول مردود کے نزدیک اس کی اہلیہ سوئی ہوئی تھی۔ مجاہدین نے اسے کچھ نہ کہا کہ وہ بے گناہ ہے۔ تاہم جاتی دفعہ کہہ گئے کہ ہم نے توہین رسول ﷺ کا انتقام لے لیا ہے اور یہ کہ کچھ بھی ہو مگر مسلمان ابھی اتنے بے غیرت نہیں ہوئے کہ تاجدار مدینہ ﷺ کی بے عزتی پر چپ چاپ بیٹھے رہیں۔ دشمنان رسول سے نپٹنے کو ابھی غازی مرید حسین شہید کے احباب زندہ ہیں۔

حضرت مولوی منظور حسین 1904ء میں تولد ہوئے۔ غازی مرحوم نے بی اے تک باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کی۔ کالج کی زندگی میں آپ کو جسمانی قوت بڑھانے کا بہت شوق تھا۔ اس میں آپ نے مہارت حاصل کی۔ مولانا مظہر حسین صاحب کے بقول ''موٹر کار کو آپ سامنے سے سینہ لگا کر مضبوطی سے پکڑ لیتے تھے اور پھر خواہ کتنی سپیڈ سے چلائی جائے' روکے رکھتے تھے۔ لوہے کی دو نصف انچ موٹی سلاخوں کو جوڑ کر اپنے بازو پر لپیٹ لیتے تھے اور ایک انچ موٹی سلاخ گردن سے لپیٹتے تھے۔ کھڑے ہو کر ننگی چھاتی پر وزنی ہتھوڑوں کی ضربیں لگواتے تھے۔ ہاتھوں کی دو انگلیوں میں انڈے کو نوک کے بل رکھ کر توڑ ڈالتے تھے۔ اس قسم کے غیر معمولی قوت کے کرشموں کا آپ نے بہت دفعہ مظاہرہ کیا تھا۔ گارڈن کالج راولپنڈی سے فارغ ہونے کے بعد بھی آپ نے پہلوانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن بعد میں قرآن حکیم کی تلاوت اور اسلامی تاریخ کے مطالعہ نے آپ کے قلب میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ انگریزوں کی تہذیب سے سخت نفرت ہوگئی۔ فرنگی اقتدار کے کسی اثر کو آپ برداشت نہ کرتے تھے۔ اغیار کی غلامی میں رہنا آپ کے لیے سخت مشکل ہو گیا۔ آپ نے پہلے اپنی اصلاح کی اور شریعت کے سانچے میں ڈھل گئے۔ کالج میں چونکہ عربی پڑھی تھی اس لیے قرآن وحدیث سے استفادہ آسان تھا۔ والد مرحوم سے فقہ وحدیث کی بعض کتابیں پڑھ لیں۔ آپ نے تبلیغ دین بھی شروع کر دی۔ جہاد بالسیف کا جذبہ آپ پر غالب تھا اور اللہ کی راہ میں شہید ہونا آپ کا حال بن گیا تھا۔

1938ء میں مجاہد اسلام مولوی منظور حسین شہید نے خاکساروں کی طرز پر ان کے مقابلے میں ایک نئی تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ اس کا نام ''خدام اسلام'' قرار پایا۔ اور لائحہ عمل کے طور پر ایک پمفلٹ بعنوان ''خدام اسلام میدان عمل میں'' شائع کیا۔ یہ ہر لحاظ سے رضا کار فورس تھی۔ اس کی باقاعدہ پریڈ ہوتی اور زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا کہ معزز رکن کسی طور بھی اپنے تنظیمی رازوں کا کہیں انکشاف نہ کریں۔ اس کے لیے باقاعدہ حلف وفاداری ہوا کرتا تھا۔ گو تنظیم مذکور دور دور تک تو نہ پھیل سکی' بہر کیف اس کا دائرہ اثر چکوال' نزدیکی قصبات اور ارد گرد کے دیہات میں نہایت وسیع تھا۔ یہ بات بھی پایۂ تحقیق

کو پہنچ چکی ہے کہ قاضی موصوف کے غازی مرید حسین شہید سے دوستانہ مراسم تھے اور ان کی شہادت نے آپ کے دل میں جوش و ولولہ کی ایک نئی آگ لگا دی۔ مزید معلوم ہوا ہے کہ ان دونوں مجاہدین کی تنظیموں میں معاہدۂ تعاون بھی تھا۔ واقعے میں کسی قدر حیرت انگیز اشتراک ہے کہ غازی مرید حسین شہید نے ملعونِ زمانہ ڈاکٹر رام گوپال کو ٹھکانے لگایا اور قاضی موصوف اس سے قلبی لگاؤ رکھنے والے کھیم چند چوہدری کی ہلاکت کا سبب بنے۔

حضرت مولوی کرم الدین صاحب آف بھین نے اس واقعہ کو مختصر الفاظ میں یوں لکھا ہے "گردشِ دہر سے مجھ پر ایسا پُر آشوب وقت آ گیا کہ طرح طرح کے مصائب و آلام میں مبتلا ہو گیا۔ میرا ایک نوجوان فرزند غازی محمد منظور حسین ایک شقی القلب کلمہ گو شخص کے دست جفا سے بمقام عباسیہ متصل لکی مروت ضلع بنوں میں شہید ہو گیا۔ جبکہ وہ معہ اپنے دو رفقاء کے ایک درخت کے سایہ میں میٹھی نیند سو رہا تھا' ظالم دشمن نے اسی حالت میں فائر کھول دیا اور وہ تینوں وجیہ نوجوان شہید ہو گئے۔ مرحوم بڑا شیر دل بہادر تھا اور شہ زوری و شجاعت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ انگریزی میں بی۔ اے (گریجوایٹ) اور عربی و فارسی علوم میں فاضلِ اجل تھا۔ بڑا زاہد و عابد' متقی' بے ریا اور بے طمع صحیح معنوں میں مبلغ اسلام تھا۔"

ہوا یہ کہ گستاخ رسول چوہدری کھیم چند ہندو کو ٹھکانے لگا کر دونوں رفیق وہاں سے بہ سلامت نکل آئے اور آزاد علاقہ (پاکستان) میں چلے گئے۔ جہاں آپ حضرت بادشاہ گل صاحب خلف مجاہد اعظم حضرت حاجی ترنگزی صاحب کے پاس مقیم ہو گئے۔ کچھ مدت ایک مجاہد حضرت فقیر ایپی صاحب کے پاس بھی بسر کی۔ ادھر یہ ہوا کہ آپ کے والد صاحب اور دیگر بعض اقربا کو پولیس نے بغرض تفتیش اپنی حراست میں لے لیا اور غازی ممدوح کے اس جرأت مندانہ اقدام کا سارا بوجھ آپ کے والد محترم قاضی محمد کرم الدین صاحب کے سر آ گیا۔

اس بارے میں شہید موصوف کے برادرِ عزیز کا بیان ہے "حالانکہ آپ کو بھائی صاحب نے کسی راز سے مطلع نہیں کیا تھا اور نہ ہی پاکستان جانے کا آپ کو علم تھا۔ مکانات' اسباب ضبط کر لیے گئے۔ ادھر مجھے تین رفقاء کے ساتھ 20,20 سال عمر قید کی سزا سنائی گئی (یہ ایک اور مقدمہ قتل کے سبب سے تھا) اور ہم کو سنٹرل جیل لاہور میں بھیج دیا گیا۔ نیز پولیس نے مولانا مرحوم پر دفعہ 182 کے ماتحت ایک مقدمہ دائر کر دیا۔

سب سے زیادہ آپ کو مولوی منظور حسین صاحب کی روپوشی کا فکر تھا لیکن بعد میں بہ سلامت پاکستان پہنچنے کی خبر آ گئی تو آپ کو کچھ اطمینان ہو گیا۔

ماسٹر عبدالعزیز صاحب چکوال کے باشندے تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد سکول میں ملازمت اختیار کر لی۔ باہمت اور دلیر نوجوان تھے۔ مولوی منظور حسین کی رفاقت و صحبت نے آپ کے

اندر بھی جہاد فی سبیل اللہ کی روح پھونک دی اور ہمہ تن جہاد کی تیاریوں میں لگ گئے۔ چوہدری کھیم چند کے قتل میں شریک تھے۔ پاکستان میں بھی مولوی منظور حسین کے ہمراہ رہے۔ گرفتاری کے بعد ماسٹر صاحب موصوف کو چکوال میں لایا گیا اور ایس ڈی او مذکور کا مقدمہ چلایا گیا۔ اس کے نتیجہ میں آپ کو سزائے موت کا حکم ہوا۔ لاہور سنٹرل جیل میں چند ماہ تک پھانسی کی کوٹھڑیوں میں رہے۔ شب و روز ذکر و شغل میں مصروف رہے۔ اب آپ کی قلبی تمنا یہی تھی کہ زندہ دنیا میں واپس نہ جاؤں بلکہ اپنے رفقاء شہدا سے جاملوں۔ پھانسی ہونے سے پہلے روز اپنے اعزاء و اقرباء سے بڑی بشاشت سے ملاقات کرتے رہے۔ ان کو صبر کی تلقین کی۔ صبح کو جب پھانسی کے لیے نکلے تو راستے میں سورہ یٰسین بلند آواز سے نہایت اطمینان سے تلاوت کرتے گئے اور نعرۂ تکبیر بلند کر کے تختہ دار پر لٹک گئے۔"

"مولوی منظور حسین صاحب کے ساتھ شہید ہونے والوں میں غازی محمد خان ساکن بڈھیال ضلع جہلم بھی تھے جو آپ کے مخلص دوست تھے۔ فوج میں سپاہی تھے' وہاں سے چھٹی لے کر آئے تو گھر سے ہوتے ہوئے پاکستان میں آپ کے پاس پہنچ گئے اور آخری دم تک آپ کی رفاقت میں رہے۔ اب لکی مروت میں مدفون ہیں...... "غازی منظور حسین شہید کے دیگر دو ساتھی کون تھے؟ ان کے نام معلوم نہیں ہو سکے اور یہ خبر بھی نہیں ملی کہ وہ کہاں کے رہنے والے تھے اور آپ کے گروپ میں کب شامل ہوئے۔

مولانا غازی منظور حسین نے گستاخ نبی کو فنا فی النار کر دیئے جانے پر اپنے پیشروؤں کی طرح خود کو گرفتاری کے لیے کیوں پیش نہ کیا؟ اس کا تو کوئی تشفی بخش جواب نہیں۔ بہر حال یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ کے عزائم بہت بلند تھے اور چاہتے تھے کہ بزور طاقت کشمیر فتح کریں اور اس کے لیے انہوں نے ایک سکیم بھی بنائی مگر بوجوہ ایک سال پاکستان میں قیام کرنے کے بعد بعض عزائم کے پیش نظر اپنے دیگر چار رفقاء کی معیت میں وطن کی طرف لوٹے۔ سرفروش غازیوں کی یہ قلیل جماعت رائفلوں سے مسلح تھی۔ وزیرستانی قبائل سے ہوتے ہوئے آپ نے بنوں کی سرحد کو عبور کیا اور موضع عباسیہ تحصیل لکی مروت کے قریب ایک جگہ آرام کے لیے ٹھہرے۔ ماسٹر عبدالعزیز اور ایک دوسرے رفیق کو قریب کی بستی سے کھانا لانے کے لیے بھیجا۔ پولیس کو خبر ہوگئی۔ ان دونوں کو وہاں سے گرفتار کر لیا گیا اور دو سب انسپکٹر پولیس کی مسلح گارڈ اور پبلک کی جمعیت ساتھ لے کر مولوی منظور حسین کے مقابلہ کے لیے نکلے۔ پہاڑ کا طویل سفر طے کرنے کی وجہ سے تھکان غالب تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ آپ ایک درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں رفقاء سمیت گہری نیند سو گئے تھے۔ پولیس نے ان کو بیدار ہونے کا موقع ہی نہیں دیا اور بے خبری میں ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اور یوں ان مجاہدوں کی سعید روحیں عالم بالا کو پرواز کر گئیں...... یہ جولائی 1944ء کا واقعہ ہے۔"



غازی محمد اسحاق شہیدؒ

مفتی محمد مختار احمد گجراتی

اس دنیا میں یوں تو کروڑوں انسان پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں' مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو نرالی زندگی گزارتے ہیں اور اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس شان سے جاتے ہیں کہ ان کی زندگی اور موت رہتی دنیا کے لیے مثال بن جاتی ہے۔ بقول مولانا محمد علی جوہر۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

انہی خوش بختوں میں حضرت غازی محمد اسحاق شہید کا نام نامی مانندِ قمر مطلع عالم پر درخشاں ہے۔

مسجد شہید گنج کا قضیہ اپنے پورے عروج پر تھا۔ پورے متحدہ ہندوستان میں اور بالخصوص لاہور میں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان سخت کشیدگی تھی۔ انگریز اپنی مخصوص سیاست اور مسلمان دشمنی کے پیش نظر اقلیت کا طرفدار تھا۔ مسلمان پوری کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح موقع پا کر مسجد میں داخل ہو کر اسے سکھوں کے قبضہ سے آزاد کرا لیں۔ لیکن حکومت اور بالخصوص ایک سکھ پولیس افسر اس میں رکاوٹ تھا۔ یہ کشیدگی کئی روز سے جاری تھی۔ مسلمان جتھے بنا بنا کر آتے' لیکن گولہ بارود اور آنسو گیس وغیرہ کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ جاتی۔

ادھر غازی محمد اسحاق صاحب دل میں عجیب لگن اور جوش و مستی لیے ایک جداگانہ راہ پر گامزن

تھے۔ایک شاندار خنجر جس پر کلمہ شریف لکھا ہوا تھا' ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے۔ وہ صبح سے شام اور شام سے صبح تک ذکر وعبادت میں مصروف رہنے لگے۔اور اسی عالمِ وجد اور جوشِ شہادت میں موہڑہ شریف تشریف لے گئے' جہاں سے ولی کامل کی طرف سے فتح کا پرچم عطا ہوا اور اس کو اُڑاتے ہوئے لاہور آئے۔اب تک مسلمان اس رکاوٹ کو توڑ کر مسجد میں داخل نہ ہو سکے تھے' کیونکہ یہ سعادت تو غازی محمد اسحاق مرحوم کے حق میں لکھی جا چکی تھی۔

ایک روز عین مسجد کے مقابل سکھ پولیس افسر کے سامنے یہ جیالا غازی نمودار ہوا اور پلک جھپکتے ہی خنجر اس کے سینہ میں پیوست کر دیا۔غازی اپنا کام پورا کر کے دربار حضرت شاہ محمد غوث کے حوض پر وضو فرما رہے تھے تاکہ دشمن اسلام کو جہنم رسید کرنے کی خوشی میں دربار خداوندی میں سجدۂ شکر ادا کریں کہ پولیس نے انہیں آ گھیرا۔غازی صاحب نے جو عشقِ رسول کے نشہ میں سرشار تھے' گرجدار آواز میں فرمایا کہ خبردار کوئی کافر میرے قریب نہ آئے حتیٰ کہ وہ پاک ہو جائے۔مجھے پکڑنا ہے تو کوئی مسلمان افسر مجھے ہاتھ لگائے۔ چنانچہ ایک مسلمان پولیس افسر کے سامنے خود کو نہایت اطمینان کے ساتھ پیش کر دیا' اور حیات ابدی کے شوق میں تنگ وتاریک کوٹھڑی کو آزادی پر ترجیح دی۔نزعی بیان میں مقتول سکھ پولیس افسر نے قاتل کا جو حلیہ بیان کیا تھا وہ انتہائی حسین وجمیل نورانی صورت غازی نوجوان کے خلاف تھا۔

قائداعظم محمد علی جناح اور دیگر نامور وکلاء غازی صاحب کی پیروی کر رہے تھے۔صرف قتل سے انکار کرنا کافی تھا اور جان بچ سکتی تھی۔ پھر اس نو ماہ جیل کی زندگی میں خبر ملی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک لڑکے کی ولادت سے غازی کے گھر کو منور فرمایا ہے۔عزیز واقرباء' والدین' بہن بھائی واسطے دے کر انحراف پر مجبور کر رہے تھے' لیکن ''شہادت ہے مقصود ومطلوبِ مومن'' غازی صاحب سب سے مسکرا کر فرماتے۔ جو میری تمنا ہے اس میں رکاوٹ نہ بنو' مجھے موت کا کوئی خوف نہیں۔عزیز واقرباء اور دنیا کے تمام رشتے جوش شہادت کے سامنے ہیچ ہیں۔

نو مہینے جیل میں رہنے کے بعد محرم کی یکم تاریخ بمطابق 25 مارچ 1936ء کو مرحوم کی ولی تمنا کے مطابق انہیں تختۂ دار پر لٹکایا گیا۔ا ر انہیں شہادت نصیب ہوئی۔

دیکھنے والوں کی آنکھیں اس منظر کو کیسے بھول سکتی ہیں کہ شاہ کربلاؓ کے اس غلام نے مسکرا کر موت کا استقبال کیا۔نہایت خوشی سے چاروں طرف دیکھا' گویا گوہرِ مقصود ہاتھ آ گیا ہو۔مجاہد خود پھانسی کی طرف بڑھا۔غازی خود تختۂ دار پر چڑھا اور پھانسی کی رسی کو چوم کر خود اپنے گلے میں ڈال لیا۔مرحوم نے اپنی جان قربان کر دی۔آج بھی لاہور کی نواحی بستی سلامت پورہ کے اس شہید غازی کی قبر پر آسمان شبنم بکھیر رہا ہے۔



غازی فاروق احمد

محمد صدیق شاہ بخاری

اقوام عالم میں یہ اعزاز صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ اللہ رب العزت کے فرستادہ تمام پیغمبر اُن کے نزدیک عصمت وحرمت کے اعتبار سے یکساں محترم ومعزز ہیں۔ مسلمانوں کو لا نفرق بین احد من رسلہ کا فرمانِ ربانی نہ صرف ہمیشہ مستحضر رہتا ہے بلکہ وہ اس کا عملی ثبوت دینے کے لیے بھی ہر آن تیار و چوکس رہتے ہیں۔ حضرت آدمؑ سے لے کر نبی آخر الزمان ﷺ تک تمام انبیاء ورسل مسلمانوں کے اپنے ہیں۔ اوران سب کی عزت وناموس انہیں ویسے ہی عزیز ومحترم ہے جیسے نبی ﷺ کی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی کونے میں اگر توہین انبیاء کا ارتکاب ہو تو سب سے پہلے جس قوم کے دل سے ہوک سی اٹھتی ہے اور سب سے پہلے جو قوم میدانِ عمل میں اترتی ہے وہ بلاشبہ قومِ مسلم ہے۔

چند برس قبل بی۔ بی۔ سی ٹیلی ویژن نے سیدنا مسیح علیہ السلام کی ''جنسی زندگی'' کے موضوع پر ایک بیہودہ فلم دکھائی تو دنیا نے حیرت سے دیکھا کہ اس فلم کی نشرواشاعت پر پورے برطانیہ میں صرف مسلم کمیونٹی نے زبردست احتجاج کیا اور ایسا احتجاج کیا کہ نہ صرف اس فلم کی مزید نشرواشاعت روک دی گئی بلکہ اس حرکت کے ذمہ داروں کو اپنے مسلم ناظرین سے معافی بھی مانگنی پڑی۔ اس طرح آرٹ کے نام پر ہفت روزہ نیوز ویک نے سال 1996ء میں اپنی کسی اشاعت میں حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کی برہنہ خیال تصاویر اپنے سرورق پر چھاپ دیں تو اس وقت بھی احتجاج کرنے میں جو قوم صف اوّل میں

تھی، وہ مسلمان ہی تھے۔

اس تناظر میں مسلم قوم کی نفسیات کا مطالبہ ہر ذی شعور اور بے تعصب فرد کو یقیناً اس نتیجے پر پہنچائے گا کہ جب مسلمانوں کے نزدیک سب کے انبیاء ورسل یکساں محترم ہیں تو پھر باقی دنیا پر بھی یہ عقلی اور فطری فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ بھی مسلمانوں کے نبی کی عزت و ناموس کے معاملہ میں اس ذمہ داری کا ثبوت دیں۔ مگر المیہ یہ ہے کہ حقیقت حالات اس کے برعکس ہے۔ اور یہ معکوس عمل ہی مسلمانوں میں ردعمل کی نفسیات کو جنم دیتا ہے۔ عمل اور ردعمل انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اور یہ ایک بدیہی امر ہے کہ یا تو ایسا عمل ہی وجود میں نہ آئے کہ جس پہ سخت ردعمل پیدا ہونے کا اندیشہ موجود ہو یا پھر ردعمل کے ظہور کے سہل اور مثبت راستے موجود ہوں۔ اور اگر یہ راستے پر پیچ اور صعب بنا دیئے جائیں تو ایسی صورت میں سخت بلکہ پر تشدد عمل کا روکنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے اور مزید یہ کہ اس صورت حال میں اگر بنظر عمیق دیکھا جائے تو اس سخت ردعمل کا فی الواقع مجرم اصل میں وہ عمل ہی ہوتا ہے کہ جس نے اس ردعمل کو جنم دیا ہو۔

ایسی ہی صورت حالات وطن عزیز پاکستان میں بھی جاری ہے۔ ناموسِ رسالتؐ کے ضمن میں ایک طویل جدوجہد کے بعد اگرچہ پارلیمنٹ اور اعلیٰ عدالتوں کی مداخلت سے ایک قانون تو بن گیا مگر اس کے نفاذ کے ضمن میں ہر دور کی حکومتی مشینری کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ اس کی راہ میں ایسی رکاوٹیں حائل کر دی جائیں کہ اس کا نفاذ غیر مؤثر ہو کر رہ جائے۔ اور اگر بھول کر کبھی کوئی کیس رجسٹر ہو ہی جائے تو پھر مغرب کے خوف سے ملزمان کو باعزت بری کروا کے بصد ادب واحترام بیرون ملک پہنچا دیا جائے۔

یہی وہ پس منظر اور تاریخ ہے جو عاشقانِ مصطفیٰؐ اور غازی علم الدین کے وارثوں کو ملکی قانون سے بے نیاز کر دیتی ہے اور وہ نقد جان ہتھیلی پہ لیے اپنے آقا کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے میدانِ عمل میں کود پڑتے ہیں۔ اور جسد ملت میں صدیوں سے جاری قانون کی پاسداری کرتے ہوئے گستاخِ رسول کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔

1994ء میں ایک دفعہ پھر فیصل آباد میں یہ تاریخ دھرائی گئی۔ فیصل آباد کے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کے دفتر میں عارضی طور پر تعینات ایک سینئر عیسائی ٹیچر (معروف ترقی پسند شاعر) نعمت احمر کو مبینہ طور پر سرکار دو عالم ﷺ کی گستاخی کرنے اور شعائر اسلام کا مذاق اڑانے کی بنا پر ایک مسلمان نوجوان غازی فاروق احمد نے چھری کے پے درپے وار کر کے ہلاک کر دیا۔ میانی اور چک 242 ر۔ب دسوہہ کے گاؤں کے سکولوں میں تعیناتی کے دوران نعمت احمر کے بارے میں شکایت پائی جاتی تھی کہ وہ گستاخ رسولؐ ہے اور طلباء کے سامنے عقائد اسلام اور اکابرین اسلام کے بارے میں نامناسب

ریمارکس دیتا تھا۔ چک 242 ر۔ب دسوہہ کے متعدد لوگوں اور بالخصوص اساتذہ نے محکمہ تعلیم کے اعلیٰ حکام کو نعمت احمر عیسائی ٹیچر کے خلاف درخواستیں بھی دی تھیں۔ مقتول کے خلاف تھانہ ڈجکوٹ میں اس کے نامناسب ریمارکس کے خلاف پرچہ بھی درج ہوا تھا۔ افسوس کہ نہ تو پولیس نے کوئی کارروائی کی اور نہ ہی محکمہ تعلیم کے اعلیٰ حکام نے کوئی توجہ دی۔ البتہ حفظ ماتقدم کے طور پر اسے عارضی طور پر ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر (مردانہ) میں تعینات کر دیا گیا۔ اس طرح علاقہ کے لوگوں میں غم وغصہ کی لہر مزید تیز ہوگئی کہ شان رسالتؐ میں گستاخی کرنے والے اور اسلام کے خلاف نازیبا ریمارکس دینے والے عیسائی ٹیچر کے خلاف انضباطی کارروائی کرنے کی بجائے اسے مزید تحفظ دیا گیا۔ علاقہ بھر میں مقتول کے خلاف سخت اشتعال پایا جاتا تھا۔ چنانچہ غازی فاروق قصائی جو چک نمبر 242 ر۔ب دسوہہ کا رہائشی تھا' دفتر میں آیا اور اسے اپنی برانچ سے باہر بلوا کر دفتر کے احاطہ میں کھلی جگہ پر لے آیا جہاں غازی نے چھری کے تقریباً پانچ وار کیے جس سے وہ شدید زخمی ہو کر تڑپنے لگا اور کسی قسم کی طبی امداد پہنچنے سے قبل ہی دم توڑ گیا۔ غازی فاروق خون آلود چھری کے ساتھ وہیں کھڑا' خوفزدہ ہو کر بھاگنے والے افراد کو پکارنے لگا کہ ''مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے شانِ رسولؐ میں گستاخی کرنے والے کو قتل کر کے جہاد کیا ہے اور میں نے اپنے لیے جنت خرید لی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے چھری نیچے پھینک دی اور لوگوں سے کہا کہ پولیس کو بلوا کر مجھے اس کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ اطلاع ملنے پر پیپلز کالونی پولیس نے موقع پر پہنچ کر اس کو گرفتار کر لیا۔

عیسائی گستاخ رسولؐ کا قتل قطعی ذاتی عداوت یا رنجش کا نتیجہ نہیں بلکہ ایف آئی آر میں بھی اس بات کو تسلیم کیا گیا کہ چک 242 ر۔ب کی تعیناتی کے دوران جب وہ تعلیم و تدریس کرتا تھا تو رسول اکرم ﷺ کی شان مبارک میں گستاخی کی تھی۔ تنظیم اساتذہ کے ایک وفد نے امجد حسین امجد کی سربراہی میں فیصل آباد کے علماء کے ایک اجلاس میں جو تفصیلات بیان کیں' اس سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مقتول نعمت احمر اور مسلمان فاروق کے درمیان کوئی ذاتی تنازعہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فاروق نے عیسائی ٹیچر کو قتل کرنے کے بعد سرعام اعلان کیا تھا کہ

> ''میں نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کو قتل کر کے جہاد کیا ہے اور میں نے اپنے لیے جنت خرید لی ہے۔''

عیسائی ٹیچر کے قتل کے بعد عیسائی رہنماؤں نے اس کیس کو غلط رنگ دینے کی کوشش کی۔ عیسائیوں کی طرف سے جلوس نکالا گیا' عیسائی رہنما خصوصاً جے سالک' سابق وفاقی وزیر مملکت برائے اقلیتی امور پیٹر جان سہوترا' جارج کلیمنٹ اور بشپ جان جوزف نے فیصل آباد میں مختلف جگہوں پر جو

اشتعال انگیز تقریریں کیں اور اسے سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی' اس کے ردعمل میں مسلمانوں نے اپنے جذبات پر قابو پائے رکھا ورنہ لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ اس موقع پر عیسائی رہنماؤں کو سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ عیسائی پاکستان میں اقلیت ہیں' جنہیں معاشرہ میں باوقار مقام حاصل ہے۔ انہیں آئینی اور قانونی طور پر وہ تمام مراعات حاصل ہیں جو پاکستانی ہونے کے ناتے دیگر شہریوں کو حاصل ہیں۔ اگر کوئی مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت مریمؑ کی توہین کرے تو وہ قابل تعزیر ہے۔ محکمہ تعلیم اور پولیس کی روایتی تساہل پسندی اور غفلت کی وجہ سے یہ واقعہ رونما ہوا۔ غازی فاروق کا اقدام اس کے مذہبی جذبات کے مجروح ہونے کا نتیجہ تھا اگر محکمہ تعلیم کے اعلیٰ حکام نے بروقت کارروائی کی ہوتی تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

4 جون 1994ء کو فیض احمر بھٹہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے گستاخ رسول نعمت احمر کے قاتل غازی فاروق احمد کو 14 سال قید بامشقت کی سزا کا حکم سنایا۔

مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن سرکار دو جہاں ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک اقلیت کے لیے یہ کسی طور پر مناسب نہیں کہ وہ اکثریت پر اپنا رعب جمانے اور اپنا فیصلہ تھوپنے کی کوشش کرے۔ غازی فاروق نے جس جہت سے اپنے اس عمل کو دیکھا' اس میں وہ اپنے اس دعویٰ میں یقیناً حق بجانب نظر آتا ہے مگر ان لوگوں کے لیے اس دعویٰ کو سمجھنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن لگتا ہے کہ جن کی آنکھیں لندن و واشنگٹن کے جلوؤں سے خیرہ رہتی ہیں مگر وہ جو اپنی آنکھوں میں خاکِ مدینہ بسانے کی آرزو رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک فاروق کا عمل نہ صرف مستحسن ہے بلکہ قابل رشک بھی ہے اور وہ خود بھی اس صف میں جگہ پانے کے منتظر رہتے ہیں۔ اور اس ضمن میں قانون کی دفعات ان کی راہوں کی زنجیر نہ پہلے کبھی بنی تھیں اور نہ کبھی آئندہ بن سکیں گی۔

اللہ کرے کہ یہ حقیقت ہمارے ہر آن بدلتے حکومتی چہروں' لندن و واشنگٹن پلٹ دانشوروں اور علمی دنیا کے بزرجمہروں کی سمجھ میں بھی آ جائے۔ سمجھ میں آ جائے تو ان کا اپنا بھلا ہے۔ اور اگر نہ بھی آئے تو بھلا عاشقانِ مصطفےٰ ﷺ کا اس سے کیا بگڑتا ہے!



غازی عبدالرحمان شہید

ابوالحسن منظور احمد شاہ آسی

انگریز ملعون کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" برطانوی سامراج کے برصغیر میں آنے سے پہلے ہندو مسلم باہم شیر وشکر تھے۔ فتاویٰ عالمگیری پورے برصغیر میں نافذ العمل تھا۔ ہندو بھی مسلمانوں کی رعایا تھی۔ انہوں نے اس پر کبھی اعتراض نہ کیا تھا جبکہ ہندو اس وقت بھی اکثریت میں تھے لیکن برطانوی نو آبادیاتی بن جانے کے بعد برطانوی سامراج نے اپنی مشہور زمانہ پالیسی پر عمل شروع کیا چنانچہ ہندوؤں میں بعض ایسے افراد پیدا کیے جنہوں نے پیغمبر خدا ﷺ کی شان اقدس میں نازیبا الفاظ استعمال کیے اور بعض کتابیں لکھیں جن میں پنڈت دیانند سرسوتی کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" سرفہرست ہے۔ یہ کتاب 1875ء میں منظر عام پر آئی تو ہندوستان میں جگہ جگہ ہندوؤں نے شانِ رسالت ؐ میں گستاخیوں کی جسارت شروع کر دی۔ اس وقت علماء کرام اور مسلم عوام نے اپنے اپنے فرائض ادا کیے اور گستاخوں کا تعاقب کیا اور بہت سے گستاخانِ رسول ﷺ کو واصل جہنم کیا۔ یہ واقعات 1923ء میں آ کر شدت اختیار کر گئے۔ زیادہ تر ہندوؤں نے بدزبانی شروع کی تو اس وقت دیگر علماء کے ساتھ ساتھ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی شخصیت سرفہرست تھی جو قریہ قریہ، بستی بستی یہ پیغام پھیلا رہی تھی کہ "اے مسلمانو! میں تمہاری سوئی ہوئی غیرت کو جھنجھوڑنے آیا ہوں، آج کفار کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ مسلمان مر چکا ہے اور انہوں نے توہین پیغمبر کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آؤ اپنی زندگی کا ثبوت

دیں۔ عزیز نوجوانو! تمہارے دامن کے سارے داغ مٹانے کا وقت آ پہنچا ہے۔ گنبد خضریٰ کے مکین تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ ان کی آبرو خطرے میں ہے' ان کی عزت پر کتے بھونک رہے ہیں۔ اگر قیامت کے روز حضرت محمد ﷺ کی شفاعت کے طالب ہو تو پھر نبی ﷺ کی توہین کرنے والی زبان نہ رہے یا سننے والے کان نہ رہیں۔" (حیات امیر شریعت ص118)

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر کے طول و عرض میں شمع رسالتؐ کے پروانے اپنی جانوں پر کھیل کر ان زبان درازوں کی بیخ کنی کرنے لگے۔ برطانوی حکومت کی طرف سے تمام تر سختیوں' سزاؤں اور مقدمات کے باوجود شمع رسالتؐ کے پروانوں کے جذبے اور ولولے نہ تو ختم ہو سکے اور نہ ہی سرد! میں اس نشست میں ایسا ہی ایک ایمان افروز واقعہ درج کر رہا ہوں جو یہاں مانسہرہ میں پیش آیا۔ مانسہرہ شہر میں قیام پاکستان سے قبل ہندو کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ ایک آدھ دوکان مسلمانوں کی تھی' اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ آئے دن کوئی نہ کوئی واقعہ برصغیر میں ظاہر ہوتا۔ ہندو رسالت مآب ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے اور یوں صورتحال خاصی گڑبڑ ہوتی۔ یہاں کشمیر روڈ پر بھی ایک سکھ تھا جو انتہائی خودسر اور گستاخ تھا۔ 24 سال کا جوان تھا' اکثر مسلمانوں کے ساتھ وہ بحث مباحثہ کرتا رہتا اور بڑی رعونت سے پیش آتا۔ غازی عبدالرحمان شہید نماز جمعہ پڑھنے کے لیے موضع صابر شاہ نزد بفہ سے پیدل چل کر مانسہرہ تشریف لائے تھے۔ حسب معمول وہ جمعہ پڑھنے کے لیے گھر سے نکلے تو ان کے بھانجے سنگار خان اپنی زمین میں مال مویشی چرا رہے تھے' اس کو اپنے پاس بلایا اور سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا بیٹا' میرے لیے دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے مقصد میں کامیاب فرمائے۔ سنگار خان کہنے لگے کہ میں اس وقت چونکہ چھوٹا سا تھا اس لیے پوچھ نہ سکا کہ آپ کا کیا مقصد ہے؟ جب غازی صاحب روانہ ہونے لگے تو میں نے کہا کہ مجھے بھی ساتھ لے جائیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ غازی عبدالرحمان صاحب کے ہاتھ میں ہمیشہ چھوٹی سی کلہاڑی ہوتی۔ جب مانسہرہ آئے تو کشمیر روڈ پر سودا لینے کے لیے گئے جہاں سکھوں کی دوکانیں تھیں۔ سکھوں کی دوکان پر غازی علم الدین شہید کے واقعہ کا تذکرہ ہو رہا تھا اور سکھ تنقید کر رہے تھے۔ اس سے دو چار دن پہلے مانسہرہ میں ایک احتجاجی جلوس نکلا تھا جس میں مولوی غلام سرور صاحب نے تقریر کی اور گستاخانِ رسولؐ کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر حکومت سزا نہیں دے سکتی تو ایسے بدقماش لوگوں کا قلع قمع ہم خود کریں گے۔ جب غازی عبدالرحمان صاحب سکھوں کی دوکان پر پہنچے تو اس نوجوان سکھ نے جوانی کے جوش میں مسلمانوں کے خلاف کچھ باتیں کی۔ غازی عبدالرحمان صاحب نے کہا کہ اگر تمہارے بھائی بند ایسے واقعات کا ارتکاب نہ کریں جس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے تو ایسے حالات ہی پیدا نہ ہوں۔ اس سکھ نے کہا جو میرے بھائی بند

کرتے ہیں، میں وہی کروں گا۔ غازی صاحب نے کہا پھر ہم تمہاری بھی زبان گدی سے کھینچ لیں گے۔ اسی تو تکار میں اس نے آقائے نامدار ﷺ کے بارے میں زبان سے کوئی نازیبا لفظ کہہ دیا۔ بس پھر کیا تھا غازی عبدالرحمان صاحب وہ لفظ سن کر ہوش کھو بیٹھا۔ اس سکھ پر لگاتار وار کیے۔ آگے آگے وہ سکھ بھاگ رہا تھا اور پیچھے پیچھے غازی صاحب تعاقب کر رہے تھے۔ پرانے جی ٹی ایس اڈے کے قریب اس سکھ کے بھائیوں کی سوڈا واٹر کی دو کانیں تھیں۔ وہ ان دو کانوں میں داخل ہوا۔ جگت سنگھ اس کا بھائی تھا۔ اس نے بھی غازی صاحب کو نہ روکا۔ غازی صاحب نے مشینوں کے نیچے گھسے ہوئے سکھ پر کئی وار کیے اور شدید زخمی کر دیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر پورا بازار بند ہو گیا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ غازی عبدالرحمان صاحب ایبٹ آباد روڈ سے نعرے لگاتا ہوا کشمیر روڈ کی طرف آیا اور خوشی سے یہی کہہ رہا تھا کہ "میں نے اپنے آقا کا بدلہ لے لیا۔" "میں نے اپنے آقا کا بدلہ لے لیا۔" "میں نے اپنے آقا کا بدلہ لے لیا۔"

غازی صاحب سکھ کو قتل کرنے کے بعد بھاگے نہیں اور نہ ہی کوئی ایسی بات کی بلکہ بالکل پرسکون رہے۔ جب غازی عبدالرحمان صاحب نے اپنا بیان پولیس کو دیا تو کہا میں نے ہوش وحواس میں اس سکھ کو جہنم رسید کیا ہے۔ اگر وہ میرے آقا و مولی ﷺ کی توہین کا ارتکاب نہ کرتا تو میں اسے سزا نہ دیتا۔ جب کیس عدالت میں پہنچا تو تین چار وکیل غازی عبدالرحمان صاحب کے دفاع میں پیش ہوئے۔ وکلاء نے کہا غازی صاحب آپ کہہ دیں کہ میں اتنا مشتعل تھا کہ مجھے کوئی ہوش نہ تھا۔ ہم آپ کو بچا لیں گے۔ لیکن غازی عبدالرحمان صاحب نے کہا "میں جھوٹ بول کر اپنا ثواب ضائع نہیں کرنا چاہتا۔" چنانچہ عدالت نے غازی عبدالرحمان کو پھانسی کی سزا سنادی۔

وکلاء نے غازی عبدالرحمان سے کہا، کیا ہم ہائی کورٹ میں اپیل کریں؟ غازی صاحب نے صاف کہہ دیا۔ میں اب اپیل نہیں کروں گا۔ اس جان کی پرواہ نہیں ہے۔ چنانچہ غازی عبدالرحمان کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ جب پھانسی کے بعد اس پروانے کی لاش صابر شاہ لائی گئی تو بھیڑ کنڈھ سے صابر شاہ تک راستہ کے دونوں کناروں پر عوام کا جم غفیر تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ برصغیر کے تمام مسلمان آج مانسہرہ کی سرزمین پر جمع ہو گئے ہیں۔ نہایت تزک واحتشام سے غازی عبدالرحمان شہید کو سپرد خاک کیا گیا۔ آج وہ صابر شاہ کے بڑے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔ بقول شاعر ؎

ہم نے دیکھی تھی ادا کل تیرے دیوانے کی
دھجیاں لیے بیٹھا تھا گریبانوں کی



غازی احمد دین شہید

ظفر اقبال نگینہ

موسم سرما کی ٹھٹھرتی ساعتوں کے دوران جب غازی علم الدین شہید کی داستان حیات مرتب کر رہا تھا تو میرے ایک دوست نے ''غازی احمد دین'' کا غائبانہ تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ 48 سال قبل ''راجہ جنگ'' میں ایک سکھ ویدا سنگھ نے اذان کی ممانعت کر رکھی تھی جسے غازی صاحب نے قتل کیا اور اقبال جرم کے باعث انہیں عمر قید کی سزا ہوئی۔ اس انکشاف پر کہ غازی صاحب بقید حیات ہیں۔ میں نے فوری ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ پھر تو ہم طے شدہ پروگرام کے مطابق غروب آفتاب سے پہلے ہی قصبہ راجہ جنگ پہنچ گئے۔ چونکہ واقعہ نصف صدی پرانا تھا اس لیے میں نے اس دور کے لوگوں کی تلاش شروع کر دی۔ اس دوران غازی صاحب کی بابت معلوم ہوا کہ وہ رائے ونڈ میں مستقل طور پر اقامت پذیر ہیں۔ راجہ جنگ میں چند ایک سے ملا بھی۔ غروب آفتاب سے کچھ دیر بعد ہم رائے ونڈ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور جب میں غازی احمد دین کے در پہ دستک دے رہا تھا تو میری قوت سماعت سے مساجد سے گونجنے والی ''اللہ اکبر'' کی صدائیں ٹکرا رہی تھیں۔ قصبہ راجہ جنگ جو تقریباً پانچ سو سال سے آباد چلا آ رہا ہے' پچاس سال قبل بھی اس قصبہ میں مسلمانوں کی آبادی سکھوں سے زیادہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود ویدا سنگھ نے اس قصبہ میں اذان کی ممانعت کر رکھی تھی' کیونکہ اس کے آباؤ اجداد سے یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا اور اس قصبہ کے لوگوں کو مقامی مساجد سے اذان سنے 140 سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا تھا۔ اس بستی میں 140 سال بعد کس طرح دوبارہ اذان کی آواز گونجی' یہ سب غازی احمد دین کی زبانی

سنئے:

جب غازی علم الدین شہید کا جنازہ پڑھائے جانے کا اعلان لاہور کی مساجد میں ہورہا تھا' اس وقت میں شاہدرہ میں تھا' سب کام چھوڑ کر میں بھی جنازہ پڑھنے کے لیے چل دیا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ ہر کوئی اسی سمت چلا جارہا ہے۔ جب میں بھاٹی چوک (داتا صاحب) پہنچا تو وہاں پولیس کی بھاری نفری موجود تھی اور لوگوں کے بڑے بڑے گروپ نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے وہاں سے روانہ ہورہے تھے۔ میں بھی ایک گروپ کے ساتھ ہولیا۔ حرمتِ رسول ﷺ کے فداکار غازی علم الدین شہید کی نمازِ جنازہ کے لیے جب صفیں ترتیب دی گئیں تو میں نے حساب لگایا کہ میرا نمبر سترھویں صف میں تھا۔ جنازہ دیکھ کر میں نے یہ تمنا کی کہ "اللہ مجھے بھی یہ رتبہ عطا فرمائے۔" کچھ عرصہ بعد جھنگ شہر میں ایک اکالی سکھ نے ایک مسلمان عورت کو اغوا کر لیا اور اسے اکالی بنا کر شادی کر لی۔ اس پر ایک مسلمان نے دونوں کو قتل کر دیا۔ اور پھر ایک ہندو کھتری کو جو قصور میں حضرت بابا بلھے شاہ کو گالیاں دیتا تھا' محمد صدیق نامی شخص نے قتل کر دیا اور اللہ کے نام پر پھانسی کے تختہ پر جا پہنچا۔ ان واقعات نے مجھے جنونی بنا دیا کیونکہ میں بہت عرصہ سے سنتا چلا آرہا تھا کہ ایک سکھ ویدا سنگھ نے جو قصبہ راجہ جنگ کا رہنے والا ہے' وہاں مسجد میں اذان کی ممانعت کر رکھی ہے۔ اس سکھ کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے تھانہ مصطفیٰ آباد (للیانی) میں تقریباً اڑھائی سو رپورٹیں درج تھیں۔ میں ہر وقت سوچا کرتا تھا کہ کیوں نہ اس سکھ کو جو مسلمانوں کو پریشان کرتا ہے' جہنم واصل کر دوں۔

ان دنوں میرا ذریعہ معاش کاشتکاری تھا اور میں رائے ونڈ کے قریبی موضع برہان پور "حکیماں والا" میں اقامت پذیر تھا۔ ایک روز میرا دل اس قدر بے چین ہوا کہ روح کی تسکین کے لیے میاں شیر محمد صاحبؒ (شرقپور شریف) کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے التجا کی کہ مجھے اپنا مرید بنالیں۔ جواباً پیر صاحب نے اپنے مریدوں سے فرمایا: "آج ایک خاص آدمی آیا ہے' اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے۔" اور پھر میں جتنی دیر وہاں رہا' تمام مرید میرے اردگرد ہی رہے۔

پیر صاحب مجھے بغور دیکھتے رہے لیکن کہا کچھ نہیں۔ وہاں مجھے قدرے ذہنی سکون ملا اور پھر میں واپس اپنے گاؤں آ گیا۔ کچھ عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ حضرت میاں صاحب رحلت فرما چکے ہیں تو میں دوبارہ شرقپور شریف چلا گیا اور ان کے روضۂ مبارک سے لپٹ گیا۔ پیر صاحب کے مریدوں میں سے چند ایک شاید وہاں اس وقت بھی موجود تھے جن کی موجودگی میں پیر صاحب نے پہلی ملاقات کے دوران میری خصوصی دیکھ بھال کرنے کی ہدایت کی تھی' انہوں نے مجھے پہچان لیا اور تسلی تشفی دینے لگے لیکن میں آپ کے روضہ سے لپٹ کر دعا مانگتا رہا اور اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ "اے خداوند کریم! میں

یہاں سے نہیں جاؤں گا' جب تک مجھے کوئی خاص پیغام نہ مل جائے۔'' نجانے کتنی دیر تک میں یونہی بیٹھا رہا' اس دوران مجھے اونگھ آ گئی تو ایک آواز سنی جسے میں سمجھ نہ سکا تاہم میری آنکھ کھل گئی اور پھر میں مسجد چلا گیا۔ وہاں مجھے دوبارہ اونگھ آئی تو میں نے دیکھا کہ رائے ونڈ سے تین سکھ راجہ جنگ کی طرف جا رہے ہیں اور پھر کسی نے مجھے اشارے سے بتایا کہ ''ویدا سنگھ ان کے درمیان موجود ہے۔'' شاید وہ مجھے کچھ اور بتاتا کہ پیر صاحب کے ایک مرید کے جھنجھوڑنے پر میں بیدار ہو گیا۔ میں اشارہ سمجھ گیا تھا کہ ویدا سنگھ کی نشاندہی کیوں کی گئی ہے۔ میں نے اپنا مقصد پا لیا تھا۔ اب میرا وہاں ٹھہرنا محال تھا۔ اگلے روز میں واپس اپنے گاؤں حکیماں والا پہنچا اور خاص طور پر ایک چھری بنوائی جس کی تیز دھار میری آنکھوں میں محفوظ ویدا سنگھ کا چہرہ بگاڑنے کے لیے کافی تھی اور پھر میں راجہ جنگ جا پہنچا۔ وہاں میری ملاقات امام دین سے ہوئی۔ اسے جب میں نے راجہ جنگ میں اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس نے میرے ساتھ اس قدر تعاون کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس نے اپنے ذمے یہ کام لیا کہ وہ دن بھر ویدا سنگھ کی مصروفیات' گھر میں آمد اور روانگی پر کڑی نظر رکھتا۔ ویدا سنگھ ہر وقت اپنے ساتھ محافظ رکھتا تھا اور خود بھی بڑا شہ زور تھا۔ لہٰذا امام دین نہیں چاہتا تھا کہ اگر میں اس پر حملہ کروں تو میرا نشانہ خطا ہو جائے کیونکہ ایسی صورت میں وہ علاقے کے تمام مسلمانوں کے لیے مصیبت بن جاتا۔

میں کچھ دن امام دین کے گھر رہا۔ اس وقت تک کسی کو وہاں میری موجودگی کا علم نہ تھا۔ پھر ایک روز امام دین نے مجھے یہ نوید سنائی کہ آج رات تمہیں ویدا سنگھ کی حویلی چھوڑ آؤں گا۔ میرے لیے اس سے بڑی خوش خبری کیا ہو سکتی تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق رات کی تاریکی میں ہم دونوں ویدا سنگھ کی حویلی کی طرف چل پڑے۔ راستے میں ہماری کسی سے ملاقات نہ ہوئی اور پھر ایک بڑی حویلی کے قریب پہنچ کر امام دین رک گیا۔ میں جان چکا تھا کہ ویدا سنگھ کی حویلی یہی ہوگی۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ مل کر امام دین بیٹھ گیا اور میں اس کے کندھوں پر سوار ہو گیا اور میں نے حویلی کی دیوار عبور کی۔ میں بڑی احتیاط سے دیوار کی دوسری طرف اترا' صحن میں اس وقت بہت سے لوگ سوئے ہوئے تھے۔ تاریکی کے باعث مجھے یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ ویدا سنگھ کس چارپائی پر ہے؟ بہت دیر اسی کوشش میں رہا لیکن کامیاب نہ ہوا۔ میں نے یہ سوچ کر واپسی کی راہ لی کہ اگر یہاں ویدا سنگھ کے ساتھی جاگ پڑے تو میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ حویلی سے باہر آ کر میں نے امام دین کو صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نے بھی میرے ساتھ اتفاق کیا اور یوں ہم واپس آ گئے۔

چند روز بعد امام دین کو جب معلوم ہوا کہ ویدا سنگھ اپنی حویلی میں موجود ہے' تو ہم نے رات گئے اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کا پروگرام بنایا۔ پہلے کی طرح جب میں حویلی میں داخل ہوا تو زمین

پر میرے چھلانگ لگانے کی آواز سے چند جوان جاگ اٹھے اور میں ایک کونے میں مویشیوں کے پیچھے جا چھپا۔ اب کی بار بھی ویدا سنگھ کو شکار کرنے میں ناکام رہا اور مجبوراً مجھے واپس لوٹنا پڑا۔ اس روز میں نے اس معاملہ پر غور کیا تو میری عقل میں یہ بات آئی کہ خواب میں تو حضرت میاں صاحب نے مجھے جو نقشہ سمجھایا تھا وہ جگہ راجہ جنگ سے رائے ونڈ آتے ہوئے دکھائی گئی تھی۔ تب مجھے ہوش آیا کہ مجھے حکم کیا دیا گیا ہے اور میں کیا کر رہا ہوں؟ میں نے امام دین سے کہا کہ معلوم کرو ویدا سنگھ رائے ونڈ کب جا رہا ہے۔ امام دین ویدا سنگھ کے پیچھے سائے کی طرح لگ گیا اور ایک روز شام کے وقت وہ باہر سے آیا اور مجھے بتایا کہ ویدا سنگھ اگلے روز رائے ونڈ جا رہا ہے اور اس کے باڈی گارڈ بھی ساتھ ہی ہوں گے۔ میں نے بڑی بے چینی سے رات گزاری۔ اگلے روز میں منہ اندھیرے امام دین کے گھر سے نکلا اور راستے میں ایک پُل پر جا کر بیٹھ گیا۔ بہت دیر بعد تین سکھ راجہ جنگ سے رائے ونڈ کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں نے ویدا سنگھ کو اس کی چال اور کچھ خواب میں دیکھے ہونے سے پہچان لیا۔ وہ میرے قریب پہنچا اور آگے بڑھ گیا۔ اور میں تیز تیز قدم اٹھاتا ان کے پیچھے چل دیا۔ میں نے اپنی دھوتی کی ڈب سے چھری نکالی' موت اور ویدا سنگھ میں صرف چند قدم کا فاصلہ تھا کہ اچانک میری نظروں کے سامنے وہی نقشہ گھوم گیا کہ ویدا سنگھ رائے ونڈ سے راجہ جنگ جا رہا تھا۔ میں نے چھری دوبارہ ڈب میں رکھ لی اور مطمئن ہو کر ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

شہر میں اپنی مصروفیات کے بعد ویدا سنگھ پولیس تھانے چلا گیا اور میں تھانے سے باہر ایک جگہ بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب ویدا سنگھ تھانے سے باہر نکلا تو اس کے محافظوں کے علاوہ تھانیدار اور تھانے کا عملہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ تھوڑے فاصلہ پر آ کر وہ رکے اور الوداعی ملاقات کی۔ تھانیدار اور دوسرا عملہ واپس ہوا تو ویدا سنگھ اپنے محافظوں کے ہمراہ راجہ جنگ کی طرف چل دیا۔ پولیس سٹیشن سے کچھ دور کپاس بیلنے کا کارخانہ تھا۔ اس کے دونوں باڈی گارڈ کارخانہ میں چلے گئے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے حصولِ مقصد کا موقع فراہم کر دیا۔ میں اس کے قریب چلا گیا اور پوچھا:

''سردار جی ویدا سنگھ تہاڈا ناں ای اے؟''

''آہو بچڑا ویدا سنگھ مینوں ای کہندے نے۔''

ویدا سنگھ نے انتہائی فرعونیت سے جواب دیا۔ میں نے پھر پوچھا:

''مسجد وچ اذان تسیں نہیں ہون دیندے جے؟''

اس پر ویدا سنگھ نے گردن اکڑاتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑا ٹمب جس پر شام چڑھی ہوئی تھی' گردن کی پشت پر رکھ کر دونوں بازوؤں کو پیچھے سے کہنیوں تک رکھتے ہوئے کہا:

''ایہہ وی ساڈا ای کم اے بجڑا۔''

''تے فیر تگڑا ہو جا ویدا سنگھ! اج اللہ دے دشمن دی اخیر اے۔'' اور پلک جھپکنے میں چھری کا پھل ویدا سنگھ کے پیٹ میں تھا۔ میرا پہلا وار ہی اتنا شدید اور ٹھکانے پر لگا تھا کہ ویدا سنگھ اوندھے منہ زمین پر جا گرا' اور اس کی انتڑیاں پیٹ سے باہر آ گئی تھیں۔ میں خون آلود چھری لے کر تھانے کی طرف دوڑ پڑا۔ اسد اللہ خان تھانیدار کو جب میں نے بتایا کہ میں ویدا سنگھ کو قتل کر آیا ہوں تو اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں تھانیدار کو لیے جائے وقوع پر پہنچا تو اس وقت ویدا سنگھ ٹھنڈا ہو چکا تھا اور اس کے محافظ قریب کھڑے تھے۔

پولیس نے نعش اپنی تحویل میں لی اور مجھے پولیس سٹیشن لے آئی۔ تھانے دار نے مجھے کہا کہ فرار ہو جاؤ۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس وقت دن کے دو بج رہے تھے۔ 1938ء فروری کا مہینہ اور تاریخ غالباً 18 تھی اور شاید جمعہ کا دن تھا۔ ویدا سنگھ کے قتل کی خبر جب راجہ جنگ پہنچی تو اس کا بیٹا سوہن سنگھ پولیس تھانے آیا اور جب اس نے مجھے وہاں چارپائی پر بیٹھے دیکھا تو تھانیدار پر برس پڑا کہ ایک قاتل کو مہمان بنا کر بٹھایا ہوا ہے؟ تھانیدار نے جواباً کہا کہ آپ ایف آئی آر درج کرائیں۔ اس قاتل کو تو میں اپنے سر پر بھی بٹھاؤں تو کم ہے (ویدا سنگھ کے قتل کے بعد اسی روز مغرب کی اذان کھجور والی مسجد میں دی گئی۔ جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور تا قیامت رہے گا۔)

تھانیدار کے اس جواب پر سوہن سنگھ نے نرم لہجے میں مجھے کہا۔ ''جن پانچ سکھوں کے نام تمہیں بتاتا ہوں' ان کے نام بھی اپنے ساتھ لکھوا دو۔'' لیکن میں نے انکار کرتے ہوئے کہا:

''یہ قتل احمد دین نے کیا ہے اور صرف احمد دین کا نام ہی لکھا جائے گا۔''

ویدا سنگھ کے قتل کی خبر سن کر اگلے روز ڈپٹی کمشنر وہاں آ گیا۔ میرے بیانات لیے اور پھر مجھے رائے ونڈ سے قصور منتقل کر دیا گیا۔ مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ میں نے کوئی وکیل نہ کیا۔ مقدمے کے دوران سید مبارک علی شاہ' حاجی رب نواز اور شیر نواز خان میرے پاس آئے اور ہر قسم کے تعاون کا وعدہ کیا اور میری اخلاقی اور مالی مدد بھی کرتے رہے۔ میں نے اقبال جرم کر لیا تھا' اس لیے وکلاء صاحبان کی کسی نے نہ سنی۔ عدالت میں مجھ سے چھریوں کی شناخت کرائی گئی۔ میرے سامنے 25 چھریاں رکھی گئی تھیں۔ لیکن میں نے اپنی چھری شناخت کر لی۔ پھر میرے فیصلے کا دن مقرر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے فیروز پور جیل بھیج دیا گیا۔ سیشن جج فیروز پور نے جو ایک مسلمان تھا' اپنے فیصلے میں مجھے چودہ سال قید کی سزا سنائی۔ اور مجھے لاہور سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ چھ ماہ بعد یہی سیشن جج مجھے ملنے آئے۔ مجھ سے معافی مانگی۔ سات سو روپے اور قرآن پاک کا نسخہ مجھے دیا۔ رقم میں نے واپس کر دی اور قرآن پاک

جیل کے ایک قیدی کو دے دیا کیونکہ میں قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اپریل 1940ء میں مجھے ''کالے پانی'' لے جانے کا حکم سنایا گیا۔ اس وقت میرا بھائی اللہ دتہ' میری بیوی اور دو بیٹے ساتھ تھے۔ میرا بڑا بیٹا کلکتہ سٹیشن پر فوت ہو گیا۔ وہاں مسلم لیگ والوں نے اس کے کفن و دفن اور جنازہ کا بندوبست کیا۔ ''کالا پانی'' لے جانے کے لیے جب قیدیوں کو سمندری جہاز میں سوار کیا جا رہا تھا تو میرے بھائی' بیوی اور بچے کو جہاز پر سوار ہونے سے روک دیا گیا۔ تب میرے مسلمان بھائیوں کے شور مچانے پر متعلقہ حکام نے انہیں بھی اجازت دے دی۔ ''کالا پانی'' جزائر انڈیمان کھلا جیل خانہ تھا۔ وہاں پر جاپان نے حملہ کیا تو اس میں دوسرے لوگوں کے ساتھ میرا چھوٹا بھائی بھی مارا گیا۔ بعد ازاں جاپان کو بھی شکست ہوئی اور پھر جب بعض قیدیوں کو چھوڑا گیا تو ان میں مجھے بھی شامل کر دیا گیا۔ چنانچہ 1945ء میں میری واپسی ہوئی۔ میری بیوی' بیٹا اور ایک بچی جو ''کالا پانی'' میں پیدا ہوئی تھی' بحری جہاز پر سوار ہو کر کلکتے آ گئے وہاں میری بچی انتقال کر گئی۔ جسے ہم نے آبائی گاؤں آ کر دفن کیا۔ پھر میرے دوستوں نے میرے روزگار کا بندوبست کر دیا۔



غازی زاہد حسین

محمد اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ

علامہ اقبال کی رجز خوانی سے مسلمانان پاکستان منزل مراد کی جانب گامزن ہوئے۔ ذات رسالت مآب ﷺ سے انہیں جو بے پناہ عقیدت و محبت تھی' اس سے کون واقف نہیں اور خود بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے لنکنز ان میں داخلہ اس لیے لیا تھا کہ وہاں دنیا کی قانون ساز شخصیتوں میں حضور ﷺ کی ذات گرامی انہیں سب سے نمایاں نظر آئی۔ دراصل یہ مملکت خداداد پاکستان مسلمان رہنماؤں اور اسلامیان برصغیر کے عشق رسول کا مظہر ہے' اس لیے یہاں اندیشہ نہ تھا کہ کوئی سرکار رسالت مآب ﷺ کی جناب میں گستاخی کا مرتکب ہوگا' لیکن جس طرح بچھو اپنی زہرناک فطرت سے نیش زنی پر مجبور ہے' اسی طرح پاکستان میں بھی ایسے مار آستین چھپے ہوئے تھے' جنہوں نے ملت اسلامیہ کو رسول عربی ﷺ کی شان میں گستاخی کر کے ڈسنے کی کوشش کی' جس پر ملت کے غیرت مند نوجوانوں نے اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اپنے پیش روشہیدوں کی طرح شمع رسالت پر پروانہ وار نثار ہونے کے لیے جس جرأت کا مظاہرہ کیا' اس کا تذکرہ تحفظ ناموس رسالت کے سلسلہ میں ازبس ضروری تھا' جو نذر قارئین ہے۔

سال 1961ء میں ایک عیسائی مبلغ پادری سیموئیل نے مغلپورہ ورکشاپ میں دوران تبلیغ آنحضور ﷺ کی شان میں کچھ نازیبا الفاظ استعمال کیے۔ زاہد حسین اور اس کے ساتھیوں نے سیموئیل

کو سختی سے منع کیا کہ وہ اپنی ہرزہ سرائی بند کرے' لیکن وہ شیطان اپنی شرارت سے باز نہ آیا' جس پر زاہد حسین نے مشتعل ہو کر اس گستاخ کا سر پھاڑ دیا' جس کے نتیجہ میں وہ بدبخت ہلاک ہو گیا۔ زاہد حسین نے عدالت کے روبرو اعتراف قتل کر لیا' جس پر اس کو اشتعال انگیزی کی بنا پر صرف جرمانہ کی سزا دی گئی۔ اس کے خلاف ہائی کورٹ میں نگرانی دائر کی گئی جو خارج ہوئی۔ اس مقدمہ کی پیروی ڈاکٹر جاوید اقبال ریٹائرڈ جج سپریم کورٹ نے کی جو اس وقت پیشہ قانون سے وابستہ تھے اور ان کی معاونت برادر عزیز میاں شیر عالم نے کی تھی۔

سال 1964ء میں اس غازی زاہد حسین کو جب یہ معلوم ہوا کہ لاہور کی ایک عیسائی مشنری کی مشہور دکان پاکستان بائبل سوسائٹی انارکلی میں ایک رسوائے زمانہ کتاب ''اثمار شیریں'' فروخت ہو رہی ہے' جس میں رسول کریم ﷺ کے بارے میں توہین آمیز مواد موجود ہے۔ اس پر یہ مرد غازی ایک بار پھر تڑپ اٹھا اور اپنے معتمد ساتھی الطاف حسین شاہ کے ساتھ مل کر اس نے بائبل سوسائٹی کی اس دکان میں' جہاں یہ کتاب فروخت ہو رہی تھی' آگ لگا دی اور اس کے منیجر ہیکٹر گوہر مسیح پر الطاف حسین شاہ نے پستول سے قاتلانہ حملہ کر دیا لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ عدالت کے سامنے جب یہ مقدمہ پیش ہوا تو ان دونوں نے بلا پس و پیش اقبال جرم کیا' جس پر علاقہ مجسٹریٹ نے دونوں کو تین تین سال سزائے قید سنائی اور ایڈیشنل جج لاہور نے اس سزا کو بحال رکھا۔ اس فیصلے کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں نگرانی دائر ہوئی۔ زاہد حسین کے عزیزوں کو جو اس مقدمے کی پیروی کر رہے تھے' خواب میں بشارت ہوئی کہ میاں شیر عالم ایڈووکیٹ کو ملزمان کی جانب سے وکیل مقرر کریں۔ چنانچہ ان کی جانب سے میاں شیر عالم اور استغاثے کی جانب سے مسٹر جرمی ریٹائرڈ پبلک پراسیکیوٹر پیش ہوئے۔ مقدمہ جب جسٹس شیخ شوکت علی کے سامنے پیش ہوا' تو فاضل جج نے مسٹر جرمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''اگرچہ کہ وہ خود ایک گنہگار مسلمان اور مذہبی رواداری کی حمایت میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں' لیکن اس کتاب میں پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں جو قابل اعتراض باتیں منسوب کی گئی ہیں' وہ ان کے لیے بھی ناقابل برداشت ہیں' جنہیں پڑھ کر ان کا خون بھی کھول رہا ہے۔'' اس لیے انہوں نے ملزم کو مزید قید میں رکھنے سے انکار کر دیا اور حکومت کو ہدایت کی کہ وہ اس کتاب کو فوری طور پر ضبط کر لے۔



ایک گمنام شہیدِ رسالت اور سر محمد شفیع

محمد اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ

نام و ناموسِ مصطفیٰ ﷺ پر نذرانہ دل و جاں پیش کرنے والے گمنام شہیدوں کی تعداد ساری دنیا میں یوں تو ستاروں کی مانند بے حد و حساب ہے۔ ان خون کے چھینٹوں سے دنیا کا کوئی گوشہ خالی نہیں۔ میرے بعد آنے والا کوئی محقق ان کے بارے میں بھی تفصیلات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرے گا۔ ان میں ایک گمنام شہید کا واقعہ لاہور ہائی کورٹ سے متعلق ہے، جس نے اس دور کے انگریز ججوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

تقسیم ہند سے قبل کا واقعہ ہے۔ ایک انگریز میجر کی بیوی نے اپنے مسلمان خانساماں کے سامنے حضور ﷺ کی شان میں کچھ نازیبا الفاظ استعمال کیے، جس پر اس مردِ غیرت مند نے اسی وقت اس انگریز میم کا کام تمام کر دیا۔ یہ مقدمہ جب لاہور ہائی کورٹ پہنچا تو ڈویژن بنچ میں دو انگریز جج اس مقدمہ کی سماعت کر رہے تھے۔ ملزم کی جانب سے اس وقت پنجاب کے سیاسی رہنما اور ممتاز قانون داں میاں سر محمد شفیع، جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بھی تھے، مقدمہ کی پیروی کر رہے تھے۔ یہاں ہمیں سر محمد شفیع کے سیاسی معتقدات سے بحث نہیں، بلکہ سرکار دربار میں رسائی کی باوجود ان کی دینی حس کو بتلانا مقصود ہے۔ اس مقصد میں دوران بحث میاں محمد شفیع کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، جس پر مقدمہ کی سماعت کرنے والے ججوں نے حیرت سے پوچھا: ''سر شفیع! کیا آپ جیسے ٹھنڈے دل و دماغ کا بلند

پایہ وکیل بھی اس طرح جذباتی ہوسکتا ہے؟'' جس پر سر شفیع نے جواب دیا: ''جناب آپ کونہیں معلوم' ایک مسلمان کواپنے پیغمبر کی ذات سے کتنی گہری عقیدت اور محبت ہوتی ہے۔ سر شفیع بھی اگر اس وقت وہاں ہوتا تو وہ یہی کر گزرتا جو اس ملزم نے کیا ہے۔'' یہ واقعہ بھی راقم کو راجہ سید اکبر مرحوم نے سنایا تھا۔ افسوس کہ اس مرد مجاہد کا نام اور ان ججوں کے نام راجہ صاحب مرحوم کی یادداشت میں محفوظ نہیں تھے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں جنگ آزادی کے دوران مسلمانوں کے جذبۂ جہاد اور شوق شہادت کو دیکھا ہوا تھا' اس لیے وہ اس حساس اور نازک مسئلہ پر مسلمانوں سے براہ راست الجھنے سے گریزاں تھے' لیکن پس پردہ وہ ہندوؤں کو شہ دیتے رہے اور شریر ہندو اپنی کمینہ فطرت اور خبث باطن کو چھپا نہ سکے اور انہوں نے ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے خلاف اس ناپاک مہم کو بڑے زور و شور سے چلانے کی کوشش کی' لیکن سرفروشان ملت کی ان بروقت قربانیوں سے ان کے عزائم پست ہوگئے اور انہیں بار بار اس قسم کے ذلیل اور سوقیانہ حملے کرنے کی جرأت نہ ہوسکی کیونکہ انہیں یہ علم ہوگیا کہ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر زندہ ہے اور مسلمان جہاں کہیں بھی ہو اور جس مقام پر ہو' وہ حضور رسالت مآب ﷺ کی شان میں ذرا سی گستاخی بھی برداشت نہیں کرسکتا اور اس کے لیے ہر وقت مرنے مارنے پر تیار اور مستعد رہتا ہے۔





جب عساکرِ اسلام نے خالدؓ بن ولید کی قیادت میں
مسیلمہ کذاب کے فتنۂ نبوت کا ارتداد کیا

جنگ یمامہ

الطاف علی قریشی

جب رسول کریم ﷺ نے 6 یا 7 ہجری میں شاہانِ عالم کو خطوط روانہ کیے تو ایک خط ہودہ بن علی الحنفی اور اہل یمامہ کے نام بھی تحریر فرمایا تھا' جس میں انہیں اسلام کی دعوت دی گئی تھی اور یہ خط سلیط بن قیس الانصاری ثم الخزرجی کے ہاتھ روانہ فرمایا۔ ان لوگوں نے خدمت اقدس میں اپنا وفد بھیجا۔ وفد میں ایک شخص مجاعہ بن مرارہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے جاگیر میں ایک افتادہ زمین عطا فرمائی' جس کی اس نے درخواست کی تھی۔ اسی وفد میں ایک شخص الرجال بن عنفوہ تھا۔ اس نے اسلام قبول کیا اور سورۃ البقرہ اور قرآن مجید کی دوسری سورتیں پڑھیں اور انہی میں ایک شخص مسیلمہ کذاب ثمامہ بن کبیر بن حبیب تھا۔ مسیلمہ نے رسول کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ ﷺ کی نبوت کا مسئلہ فی الحال چھوڑ دیں اور اس شرط پر آپ ﷺ سے بیعت کر لیں کہ آپ کے بعد یہ نبوت ہمیں ملے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں' آنکھ جیسی نعمت کی قسم ہرگز نہیں' بلکہ خدا تجھے غارت کرے۔"

جب بنی حنیفہ کا وفد یمامہ واپس آیا تو مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ الرجال بن عنفوہ نے اس

کے دعوے پر شہادت دی کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو اپنے ساتھ شریک امر کرلیا ہے۔ بنی حنیفہ اور ان کے علاوہ دیگر اہل یمامہ اس کی پیروی کرنے لگے۔ اس نے پھر رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں خط بھیجا۔ "مسیلمہ رسول اللہ کی جانب سے محمد رسول اللہ کے نام۔ امابعد' نصف زمین ہماری اور نصف قریش کی مگر قریش انصاف نہیں کرتے۔ والسلام علیک۔" رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں تحریر کیا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد نبی اللہ کی جانب سے مسیلمہ کذاب کے نام۔ زمین اللہ کی مِلک ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے' اس کا وارث بنا دیتا ہے' عاقبت پرہیزگاروں کے لیے ہے اور سلامتی اس پر' جو راہِ راست پر چلے۔"

حضور اکرم ﷺ چونکہ سراپا شفقت و رحمت تھے' آپ ﷺ نے بارہا مسیلمہ کو عذابِ آخرت سے ڈرایا اور دعوتِ حق دی مگر وہ باز نہ آیا۔

درحقیقت جس بات نے مسیلمہ کی طاقت میں اضافہ کیا' وہ نہار الرجال کا اس سے مل جانا تھا۔ یہ شخص اسی علاقے کا رہنے والا تھا اور ہجرت کر کے رسول اللہ ﷺ کے پاس آ گیا تھا۔ اس نے قرآن مجید پڑھا اور دین کی تعلیم حاصل کی' چونکہ بڑا ذہین تھا' اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اسے اہل یمامہ کو دین اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرنے اور لوگوں کو مسیلمہ کی متابعت سے روکنے کے لیے بطورِ معلم خود روانہ کیا تھا' لیکن وہ مسیلمہ سے بھی زیادہ فتنہ پرور نکلا۔ جب اس نے دیکھا کہ لوگ مسیلمہ کی اطاعت قبول کرتے جا رہے ہیں تو وہ لوگوں کی نظروں میں اپنے آپ کو سرخرو کرنے کے لیے ان سے مل گیا اور مسیلمہ کی چرب زبانی اور لالچ دلانے پر مرتد ہو گیا اور رسول اللہ کی جانب سے یہ جھوٹا قول بھی منسوب کر دیا کہ مسیلمہ کو ان کے ساتھ نبوت میں شریک کیا گیا ہے۔ اہل یمامہ کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے تھا کہ نہار الرجال مسیلمہ کی نبوت کی گواہی دے رہا ہے' چنانچہ لوگ جوق در جوق مسیلمہ کے پاس آنے لگے اور بنی حنیفہ کے رسول کی حیثیت سے اس کی بیعت کرنے لگے۔ مسیلمہ نے یمامہ میں حرم بھی متعین کرلیا اور چند دنوں میں اس کی قوت میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ مسیلمہ نے نہار الرجال کو اپنا خاص معتمد بنا لیا اور اس کے مشورے سے نبوت کے کام انجام دینے لگا اور اس کے عوض نہار الرجال کو دنیا بھر کی نعمتیں میسر آ گئیں۔

علامہ بلاذری لکھتے ہیں کہ مسیلمہ کا قد ٹھگنا' چہرہ نہایت زرد اور ناک چپٹی تھی اور ابو ثمامہ اس کی کنیت تھی۔ بعض ابو شمالہ کہتے ہیں۔ ایک شخص جس کا نام حجیر تھا' اس کے لیے اذان دیتا تو کہتا تھا: "اشھدان مسیلمه یزعم انه رسول الله" (میں گواہی دیتا ہوں کہ مسیلمہ رسول اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے) اس پر ایک نے کہا "افصح حجیر" یعنی حجیر بڑا فصیح ہے اور اس کا یہ فقرہ ضرب المثل ہو گیا۔ البتہ

تاریخ طبری (جلد 3 صفحہ 244) میں مذکور ہے کہ مسیلمہ کے ہاں نبی اکرم ﷺ کے لیے اذان کہی جاتی تھی اور اذان میں برابر اشہدان محمد رسول اللہ کی گواہی دی جاتی تھی اور مسیلمہ کا مؤذن عبداللہ بن نواحہ تھا اور اقامت حجیر بن عمیر کہتا تھا۔ مگر جب مسیلمہ کے ایلچی جن میں یہ عبداللہ بن نواحہ بھی موجود تھا' آنحضرت ﷺ کے حضور حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے پوچھا:

حضور ﷺ :مَاتقُولان انتُما یعنی تمہارا مسیلمہ کے دعویٰ نبوت کے متعلق کیا عقیدہ ہے؟

ایلچی :نقول کما قال یعنی جو حضرت مسیلمہ کہتے ہیں' ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

حضور ﷺ :اگر ایلچیوں کا قتل کرنا خلاف اصول نہ ہوتا تو میں تمہاری گردن اڑا دیتا۔

مسیلمہ کی ترقی کا راز دراصل قومی عصبیت اور قبائلی خودمختاری کا جذبہ تھا' وگرنہ جہاں تک اس کے معجزات دکھانے کا تعلق ہے' نہ لوگوں نے اس کا کوئی معجزہ دیکھ کر اسے قبول کیا اور نہ اس کی خودساختہ وحی سے متاثر ہو کر اس پر ایمان لائے۔ مندرجہ ذیل واقعہ اس قومی عصبیت کی نشاندہی کے لیے کافی ہے۔

ایک رئیس طلحہ نمری یمامہ آیا تو اس نے لوگوں سے پوچھا: ''مسیلمہ کہاں ہے؟''

''تم اس کا نام اس قدر بے ادبی سے لیتے ہو' حالانکہ وہ اللہ کا رسول ہے۔'' لوگوں نے کہا۔

اس نے کہا کہ میں تو اس کو اس وقت تک رسول ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں' جب تک اس سے مل نہ لوں۔ تم مجھ کو اس کے پاس لے چلو۔

مسیلمہ کے پاس پہنچ کر طلحہ نے پوچھا: ''تمہارے پاس کون آتا ہے؟''

''رحمان۔'' مسیلمہ نے جواب دیا۔

''روشنی میں یا اندھیرے میں؟''

''اندھیرے میں۔''

اس پر طلحہ بولا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ تو کذاب ہے اور محمد ﷺ سچے ہیں' لیکن اپنا کذاب ہمیں دوسروں کے سچے سے زیادہ محبوب ہے۔'' چنانچہ اس نے مسیلمہ کی اطاعت قبول کر لی اور اسی کے ہمراہ جنگ یمامہ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ مسیلمہ کے برخلاف اصل میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عکرمہؓ بن ابی جہل کو بھیجا تھا اور اس کے پیچھے شرحبیلؓ بن حسنہ کو ایک لشکر دے کر اس کی مدد کے لیے روانہ کیا تھا۔ عکرمہؓ یمامہ کی جانب بڑھتا چلا گیا اور شرحبیلؓ کے پہنچنے کا انتظار نہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ مسیلمہ پر فتح یاب ہونے کا فخر تنہا اسی کے حصہ میں آئے۔ عکرمہؓ ایک تجربہ کار ماہر جنگ اور دشمن کو خاطر میں نہ لانے والا شہسوار تھا۔ اس کی فوج میں بڑے بڑے بہادر شامل تھے' جو پچھلی جنگوں میں لوگوں پر اپنے کارناموں کی دھاک

بٹھا چکے تھے‘ لیکن اس کے باوجود وہ مسیلمہ کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا اور بنو حنیفہ نے اسے شکست دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ عکرمہؓ نے اپنی ہزیمت کا سارا حال حضرت ابوبکرؓ کو لکھ بھیجا‘ جسے پڑھ کر ان کے غصہ کی انتہا نہ رہی اور انہوں نے عکرمہؓ کو لکھا:

"اے ابن ام عکرمہ! (اے عکرمہ کی ماں کے بیٹے) میں تمہاری صورت دیکھنے کا مطلق روادار نہیں۔ تم واپس آ کر لوگوں میں بددلی پھیلانے کا باعث نہ بنو‘ بلکہ حذیفہؓ اور عرفجہؓ کے پاس جا کر اہل عمان اور مہرہ سے لڑو اور ان کے دوش بدوش مرتدین سے جنگ میں حصہ لو۔"

مسیلمہ کی قوت بڑھ جانے اور اس کے مقابلے میں عکرمہؓ کے شکست کھانے کے باعث حضرت ابوبکرؓ کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ خالدؓ بن ولید کو اس کی سرکوبی کے لیے روانہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے شرحبیلؓ بن حسنہ کو لکھا کہ جب تک خالدؓ اس کے پاس نہیں پہنچ جاتے‘ وہ جہاں پہنچ چکا ہے‘ وہیں ٹھہرا رہے۔

بطاح سے خالدؓ اپنے لشکر اور حضرت ابوبکرؓ کی بھیجی ہوئی کمک لے کر بنی حنیفہ سے جنگ کرنے روانہ ہوئے۔ جو کمک حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھیجی تھی‘ وہ تعداد اور قوت میں خالدؓ بن ولید کے اصل لشکر سے کم نہ تھی۔ اس میں مہاجرین اور انصار کے علاوہ جنہوں نے رسول کریم ﷺ کے زمانے میں کفار سے لڑائیاں لڑی تھیں‘ ان قبائل کے لشکر بھی شامل تھے‘ جن کا شمار عرب کے طاقتور اور جنگجو قبائل میں ہوتا تھا۔ انصار ثابتؓ بن قیس اور براءؓ بن مالک کی سرکردگی میں تھے اور مہاجرین ابوحذیفہؓ بن عتبہ اور زیدؓ بن خطاب کے ماتحت تھے۔ ان لوگوں میں قرآن مجید کے حافظوں اور قاریوں کی بھی بھاری تعداد تھی۔ اس طرح ایک خاص دستہ ان صحابہ کا بھی تھا‘ جنہوں نے جنگ بدر میں حصہ لیا تھا۔ لشکر کی کل تعداد تیرہ ہزار بتائی گئی ہے۔

ابھی خالدؓ یمامہ کے راستہ ہی میں تھے کہ مسیلمہ کی فوجوں نے شرحبیلؓ کی فوجوں سے ٹکر لی اور اسے پیچھے ہٹا دیا۔ بعض مورخین لکھتے ہیں کہ شرحبیلؓ نے بھی وہی کیا‘ جو اس سے پہلے عکرمہؓ کر چکے تھے‘ یعنی وہ مسیلمہ پر فتح یابی کا فخر خود حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن انہیں بھی شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ جب خالدؓ اس کے پاس پہنچے اور انہیں واقعات کا علم ہوا تو انہوں نے شرحبیلؓ کو بہت سرزنش کی۔ خالدؓ کا خیال تھا کہ اگر دشمن سے ٹکر لینے کی طاقت نہ ہو تو اس کے مقابلے سے گریز کرنا چاہیے‘ جب تک کہ مطلوبہ طاقت حاصل نہ ہو جائے‘ بہ نسبت اس کے کہ طاقت نہ ہونے کے باوجود دشمن سے لڑائی مول لی جائے اور نتیجے میں شکست کھانی پڑے۔

حضرت خالدؓ نے دونوں لشکروں کے ہمراہ یمامہ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اسی دوران بنی حنیفہ کا ایک سردار مجاعہ بن مرارہ' بنی عامر اور بنی تمیم کے چند اشخاص سے اپنے کسی رشتہ دار کے قتل کا انتقام لینے کے لیے کچھ لوگوں کے ہمراہ نکلا۔ اس نے ان قبائل میں پہنچ کر اپنا قصاص لیا اور واپس چل پڑا۔ جب وہ لوگ ثنیۃ الیمامہ پہنچے تو تھکاوٹ کی وجہ سے بے خبر ہو کر سو گئے۔ اتنے میں حضرت خالدؓ کا لشکر وہاں پہنچ گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے۔ حضرت خالدؓ کو معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ بنو حنیفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس خیال سے کہ یہ ان سے لڑنے نکلے ہیں۔ انہیں قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ سے لڑنے کے لیے نہیں بلکہ بنو تمیم سے انتقام لینے کے لیے نکلے تھے۔ اس پر حضرت خالدؓ نے پوچھا: ''اسلام کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

انہوں نے کہا: ''ایک نبی ہم میں ہے اور ایک نبی تم میں ہے۔''

اس پر حضرت خالدؓ نے انہیں قتل کرا دیا۔ اس وقت ایک آدمی ساریہ بن عامر نے عین اس وقت جو تلوار اس کا گلا کاٹنے والی تھی' مجاعہ کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''اگر تم دربار یمامہ کو اپنے تصرف میں لینا چاہتے ہو تو مجھے اور اس شخص کو اپنی پناہ میں لے لو۔''

حضرت خالدؓ نے مجاعہ کو' جو کہ بنی حنیفہ کے سرداروں میں سے تھا' اس خیال سے قتل نہ کیا کہ شاید آگے چل کر اس سے کچھ کام نکل سکے۔ چنانچہ اسے لوہے کی بیڑیوں میں جکڑ کر اپنے خیمے میں ڈال دیا۔

خالدؓ اسی روز جب انہوں نے مجاعہ کو قید کیا تھا' مسیلمہ کی فوج کے مقابلے میں آ گئے۔ مسیلمہ نے اپنا لشکر یمامہ کی ایک جانب عقرباء میں جمع کیا' جو یمامہ کی سرحد پر اس کے کھیتوں اور سرسبز علاقے کے سامنے واقع ہے اور سارا مال و اسباب لشکر کے پیچھے رکھا۔ اس کا لشکر چالیس ہزار اور بعض روایتوں کے مطابق ستر ہزار تھا۔ ایسے عظیم الشان لشکر سے مسلمانوں کا واسطہ کم ہی پڑا تھا۔ تمام عرب بلکہ ایرانی باشندے بھی بڑی بے صبری سے اس جنگ کے نتیجے کے منتظر تھے۔ مسیلمہ کا لشکر اس پر کامل ایمان رکھتا تھا اور اس کی راہ میں کٹ مرنے پر تلا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں حجاز و عرب کی دیرینہ دشمنی بھی مسلمانوں کے خلاف بنی حنیفہ کے اس جوش و خروش میں مزید اضافے کا باعث بنی۔ بنی حنیفہ کے بڑے سردار محکم بنی طفیل جسے محکم الیمامہ کے منصب پر فائز کیا گیا تھا' اس نے اپنے علاقے کے تمام مشاہیر کو طلب کر کے کہا: ''خالدؓ بن ولید تمہاری تخریب اور بربادی کے لیے ایسی فوج کے ساتھ آیا ہے' جو حیات ابدی کے لیے اپنی جانِ عزیز کو ذلیل سمجھتے ہیں۔'' اس پر اہالیان یمامہ نے جواب دیا: ''لڑائی میں ہم ایسی بہادری دکھائیں گے کہ خالد اپنی جرأت پر نادم ہو گا اور اگر موت کے پنجے سے رہائی پا سکے تو مدینہ پہنچ کر ہی دم

لے گا۔'' محکم بن طفیل نے ان کی تعریف کی اور کہا: ''تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔''

حضرت خالدؓ بن ولید اپنی مسند پر بیٹھے تھے اور عمایدو اشراف ان کے پاس تھے کہ فوجیں میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے سامنے تھیں۔ بنی حنیفہ کی سمت سے روشنی دیکھی تو حضرت خالدؓ نے کہا: ''اے مسلمانو! اللہ نے تمہیں دشمنوں کے بارے میں سبکدوش کر دیا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ان میں بعض نے بعض پر تلواریں کھینچ لی ہیں۔ میرا خیال ہے ان میں باہم اختلاف ہو گیا ہے اور ان کی قوت آپس میں صرف ہونے لگی ہے۔''

مجاعہ جو بیڑیوں میں جکڑا ہوا حضرت خالدؓ کے عقب میں موجود تھا' اس روشنی کو دیکھ کر کہنے لگا کہ جو بات آپ سمجھے ہیں' یہ نہیں ہے بلکہ یہ چمک بنی حنیفہ کی ہندی تلواروں کی ہے' جن کے لڑائی میں نکمے ہو جانے کے خوف سے انہوں نے ان کو نرم کرنے کے لیے دھوپ دکھائی ہے اور واقعہ بھی یہی تھا۔

باب ۹

عقربا کا میدان

شمال
مشرق
مغرب
جنوب
دشمن کے لشکر کی خون کی ندی (شعیب الدم)
جبیلہ کی بستی
وادی حنیفہ
پہاڑی
اسلامی کیمپ
مسیلمہ کا لشکر
اسلامی لشکر
میدانِ جنگ کا نقشہ

لڑائی کا میدانِ جنگ وادیٔ حنیفہ تھا۔ وادی کا شمالی کنارہ تقریباً سو فٹ اونچا تھا اور جنوبی

کنارہ دوسو فٹ۔ وادی کے شمال میں حبیلہ کی بستی کے پاس مسیلمہ کی فوج کا پڑاؤ تھا اور اس کے پیچھے عقرباء کا میدان اور تقریباً دو میل دور وہ اباض نامی باغ' جسے مسیلمہ کی ملکیت کی وجہ سے ''حدیقتہ الرحمان'' کہا جاتا تھا' واقع تھے' اس کے برعکس اسلامی فوج وادی کے جنوب میں خیمہ زن تھی' جیسے کہ مندرجہ ذیل نقشہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ مسیلمہ نے اپنی فوج کی صف بندی اس طرح کی تھی کہ میمنہ پر محکم بن طفیل اور میسرہ پر نہار الرجال اور قلب کو اپنی کمان میں رکھا اور اس کے مقابلے میں حضرت خالدؓ بن ولید نے میمنہ زیدؓ بن الخطاب میسرہ ابوحذیفہؓ اور قلب اپنی کمان میں رکھا۔

جنگ یمامہ شروع شوال 11 ہجری (دسمبر 632ء) میں ہوئی اور لڑائی شروع ہونے سے پہلے مسیلمہ کا لڑکا بنی حنیفہ کی صفوں میں پھر کر اپنے آتشیں کلام سے ان کی غیرت و حمیت کی آگ بھڑکاتے ہوئے کہتا پھر رہا تھا کہ اے بنو حنیفہ! آج تمہاری غیرت کا امتحان ہے' اگر تم شکست کھا گئے تو تمہارے پیچھے تمہاری عورتیں لونڈیاں بنالی جائیں گی اور ان کے نکاح زبردستی دوسرے لوگوں سے کر دیئے جائیں گے۔ اس لیے اپنے حسب و نسب کی خاطر مسلمانوں سے جنگ کرو اور اپنی عورتوں کی عزت بچاؤ۔

حضرت خالدؓ کے ماتحت عرب کے مشہور شہسوار تھے۔ زیدؓ بن الخطاب' عبداللہ بن عمرؓ' ابو دجانہؓ جنھوں نے جنگ احد میں رسول کریم ﷺ کو تیروں اور تلواروں کی زد سے اپنی پشت پر سنبھالا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابوبکرؓ' معاویہؓ بن سفیانؓ' ام عمارہؓ جو جنگ احد میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ میں شریک تھیں اور حضرت وحشی۔

حضرت خالدؓ نے فوج کو حملے کا حکم دیا تو وہ اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ دشمن کی طرف بڑھے۔ قلب اور دونوں بازو یکبار دشمن پر ٹوٹ پڑے اور گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی اور جو شخص بھی خالدؓ کی زد میں آیا بچ کر نہ جاسکا' لیکن بنو حنیفہ اپنی جگہ ڈٹے رہے اور بڑی بے جگری سے مقابلہ کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد مسلم لشکر میں کمزوری کے نشان ظاہر ہونے لگے اور بدقسمتی سے اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مہاجرین و انصار اور بدویوں میں یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ دونوں فریقوں میں کون بہادر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صفوں میں انتشار ظاہر ہونے لگا اور مسلمان بنی حنیفہ کے مقابلے میں ثابت قدم نہ رہ سکے اور پیچھے ہٹنے لگے۔ مسیلمہ نے یہ کمزوری دیکھ کر اپنی فوج کو دفاع کے بجائے حملے کا حکم دے دیا۔ دشمن کے دباؤ کے تحت اسلامی لشکر کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اور یہ پسپائی بھگدڑ میں تبدیل ہوگئی اور کچھ دستوں نے راہ فرار اختیار کی۔ اسلامی فوج پیچھے ہٹتے ہٹتے اپنے کیمپ سے بھی پیچھے ہٹ گئی اور دشمن کی فوج کیمپ میں گھس گئی' جہاں حضرت خالدؓ کے کیمپ کے ساتھ لیلیٰ ام تمیم کا کیمپ تھا' جس میں مجاعہ بیڑیوں سے جکڑا پڑا تھا۔

ایک آدمی نے لیلیٰ کو قتل کرنے کے لیے تلوار اٹھائی لیکن مجاعہ چیخ اٹھا: "ٹھہر جاؤ' میں اسے امان دیتا ہوں' تم اسے چھوڑ دو اور مردوں سے لڑو۔" لشکر کے سپاہیوں نے خیمے کی رسیاں کاٹ ڈالیں اور خیمے کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا لیکن مجاعہ کو آزاد نہ کیا بلکہ اس امید پر کہ وہ ابھی مسلمانوں پر فتح یاب ہو کر واپس آ جائیں گے' چنانچہ اسے بیڑیوں میں جکڑا چھوڑ گئے۔

دشمن کی فوج نے کیمپ کو لوٹنا شروع کر دیا اور جو چیز جس کے ہاتھ لگی' وہ اٹھا لے گیا۔ انہوں نے ہر چیز کو تہس نہس کر دیا۔ حتیٰ کہ خیموں کی رسیاں تک کاٹ ڈالیں لیکن جلد ہی دشمن فوج عقرباء کے میدان کی طرف واپس لوٹ گئی' کیونکہ مسلم لشکر ہٹتے ہٹتے پھر منظم ہو چکا تھا اور دوبارہ مسیلمہ کے لشکر پر حملہ کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ حضرت خالدؓ نے پھر دوبارہ دستوں کو قبائلی طریقہ پر ترتیب دیا تاکہ ہر ایک قبیلہ کی کارگزاری خود دیکھیں' پھر حضرت خالدؓ اور دوسرے سرداروں نے صفوں کا چکر لگایا اور مسلمانوں کو غیرت دلائی کہ جھوٹے نبی کے آگے ہمت ہارنا' اپنی ذلت کو قبول کرنے کے برابر ہے۔ چنانچہ مجاہدوں نے قسم کھا کھا کر یقین دلایا کہ وہ جان توڑ کر لڑیں گے اور اگر ضروری ہوا تو دانتوں تک سے کام لیں گے۔

حضرت خالدؓ نے پھر چند جنگجو چنے اور انہیں اپنا باڈی گارڈ بنایا اور اپنے فوجیوں کو ذاتی مثال دیتے ہوئے گھمسان کی جنگ میں خود کودنے کا عزم کیا اور اپنے باڈی گارڈوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے پیچھے نگرانی کا کام کریں۔

دوبارہ صف بندی کے بعد حضرت خالدؓ نے فوج کو عقرباء کے میدان میں بڑھنے کا حکم دیا اور اب کی دفعہ وہ بھوکے شیروں کی طرح کود پڑے۔ ادھر مسیلمہ نے پھر دفاعی جنگ کو بہتر سمجھا' تاکہ جب مسلمانوں کے حملے کا زور ٹوٹ جائے گا تو پھر وہ اپنے لشکر کو بھرپور حملے کا حکم دے گا اور اسے یقین تھا کہ وہ پھر اسی طرح مسلمانوں کو پسپا کر کے تہس نہس کر دے گا۔

تاریخ طبری جلد دوم میں عبید بن عمیر سے مذکور ہے کہ اس جنگ میں نہار الرجال بن عنفوہ' حضرت عمرؓ کے بڑے بھائی حضرت زیدؓ بن الخطاب کے مقابل تھا' جب معرکہ شروع ہوا اور دونوں نے صف بندی کی تو زیدؓ نے کہا: "رجال' اللہ سے ڈرو۔ تم نے بخدا مذہب ترک کر دیا ہے اور اب میں جس بات کی تم کو دعوت دینا چاہتا ہوں' اس میں تمہارے لیے دین و دنیا کی بھلائی ہے" مگر رجال نہ مانا۔ آخر دونوں نے ایک دوسرے پر تلوار سے حملہ کیا اور رجال مارا گیا۔ اس کے قتل سے فتنہ مسیلمہ کے سب سے بڑے سرغنہ کا خاتمہ ہو گیا۔

انصار کے ایک سردار حضرت ثابتؓ بن قیس جوش میں للکارتے ہوئے تلوار سونت کر دشمنوں میں گھس گئے اور اس بے جگری سے لڑتے رہے کہ ان کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا' جہاں زخم نہ لگے ہوں۔ آخر اسی طرح لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ مشہور صحابی حضرت انسؓ بن مالک کے بھائی براء بن مالک ان صنادید عرب میں سے تھے جو پیٹھ دکھانا نہ جانتے تھے۔ جب انہوں نے مسلمانوں کے قدم پیچھے ہٹتے دیکھے تو وہ تیزی سے کود کر ان کے سامنے آ گئے اور چیخ کر کہا: ''مسلمانو! میں براء بن مالک ہوں' میری پیروی کرو۔'' اسی وقت ایک جماعت ان کے ساتھ ہو گئی۔ وہ انہیں لے کر دشمن کے مقابلے میں آ گئے اور اس بہادری سے لڑے کہ دشمن کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

حضرت ابو حذیفہؓ پکار پکار کر کہہ رہے تھے: ''اے اہل قرآن اپنے افعال کے ذریعے قرآن کو عزت بخشو'' اور پھر دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ مہاجرین کا علم اس کے بعد ان کے آزاد کردہ غلام سالمؓ کے ہاتھ میں تھا۔ ایک شخص نے اس پر نکتہ چینی کی اور کہا ہم کو تمہاری طرف سے اندیشہ ہے۔ اس لیے ہم کسی دوسرے کو علم بردار بنائیں گے۔ بولے اگر میں بزدلی دکھاؤں تو میں سب سے زیادہ بدبخت حامل قرآن ہوں۔ یہ کہہ کر نہایت جوش سے حملہ آور ہوئے۔ درحقیقت انہوں نے اپنے آپ کو بہترین حامل قرآن ثابت کیا۔ جب اثنائے جنگ میں ان کا داہنا ہاتھ قلم ہوا تو بائیں ہاتھ نے قائم مقامی کی۔ وہ بھی کٹ گیا تو دونوں بازوؤں نے حلقہ میں لے کر لوائے توحید کو سینہ سے چمٹا دیا۔ آخر زخموں سے چور ہو کر گرے تو پوچھا: ''ابو حذیفہؓ نے کیا کیا۔'' لوگوں نے کہا: ''شہید ہوئے۔'' پھر بولے اس شخص نے کیا کیا' جس نے مجھ سے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ جواب دیا گیا: ''وہ بھی شہید ہو گئے۔'' فرمایا: ''مجھے ان دونوں کے درمیان دفن کرنا۔''

ابن سعدؒ کی روایت ہے کہ جنگ میں مسلمانوں کے پاؤں پیچھے پڑنے لگے تو حضرت سالمؓ نے کہا: ''افسوس رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہمارا یہ حال نہ تھا۔'' وہ اپنے لیے ایک گڑھا کھود کر اس میں کھڑے ہو گئے اور علم سنبھالے ہوئے آخری لمحہ حیات تک جانبازانہ شجاعت کے جوہر دکھاتے رہے۔ اختتام جنگ کے بعد دیکھا گیا تو اس شہید ملت کا سر اپنے منہ بولے باپ حضرت ابو حذیفہؓ کے پاؤں پر تھا۔ اسی طرح حضرت عمارؓ بن یاسر جن کی عمر اس وقت 67 سال کے قریب تھی' اس جوش سے لڑ رہے تھے کہ ان کا ایک کان شہید ہو گیا' جو سامنے زمین پر پھڑک رہا تھا لیکن وہ بے پرواہی سے حملے پر حملہ کر رہے تھے اور جس طرف رخ کرتے تھے' صفیں کی صفیں تہہ و بالا کر دیتے تھے۔ مسلمانوں کے پاؤں پیچھے پڑتے دیکھ کر انہوں نے ایک بلند چٹان پر کھڑے ہو کر للکارا: ''اے گروہ مسلمانان! کیا جنت سے بھاگ رہے

ہو۔ میں عمار بن یاسر ہوں۔ میرے پاس آؤ۔" اس صدا نے سحر کا کام کیا اور جنت کے شیدائی سنبھل کر ٹوٹ پڑے۔ بہادروں کے اس جوش ایمان کا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں میں جانبازی کی لہر دوڑ گئی اور وہ اس سرفروشی سے لڑنے لگے کہ مسیلمہ کے لشکر کو اس کی پہلی جگہ پر دھکیل دیا۔

عین لڑائی کے دوران یہ اتفاق ہوا کہ سخت آندھی آ گئی اور ریت اڑ اڑ کر مسلمانوں کے چہروں پر پڑنے لگی۔ چند لوگوں نے اس پریشانی کا ذکر حضرت زیدؓ بن الخطاب سے کیا۔ اور پوچھا کہ اب کیا کریں۔ انہوں نے جواب دیا: "واللہ میں آج کے دن اس وقت تک کسی سے بات نہ کروں گا' جب تک دشمن کو شکست نہ دے لوں۔ یا' اللہ مجھے شہادت عطا نہ فرمائے۔ اے لوگو! آندھی سے بچاؤ کی خاطر اپنی نظریں نیچی کر لو اور ثابت قدم رہ کر لڑو۔" یہ کہہ کر تلوار سونت لی اور اپنے دستے کو لے کر دشمنوں کی صفوں میں گھس کر اس بے جگری سے لڑتے رہے کہ زخموں سے چکنا چور ہو گئے اور آخر کار جام شہادت نوش کیا۔

لڑائی اس شدت سے جاری تھی کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ مسلمان بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے اور بنو حنیفہ بھی ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے اور مسلمانوں کی عظیم بہادری' ذاتی شجاعت اور تیر و تفنگ کے بہترین استعمال کا جواب اپنی کثرت تعداد سے دے رہے تھے۔ دو گھاٹیوں کے درمیان ایک گلی میں اس قدر خونریز لڑائی ہوئی اور دشمن کا اس قدر خون بہا کر اس کا نام شعیب الدم پڑ گیا' لیکن لڑائی کے اختتام کے ابھی کوئی آثار نہ تھے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ بڑے غور سے میدانِ جنگ کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہیں اپنی فتح کا یقین تو تھا' لیکن چاہتے تھے کہ فتح کا حصول حتی الامکان جلد ہو جائے۔ انہوں نے دیکھا کہ بنو حنیفہ' مسیلمہ کے گرد کٹ کٹ کر گر رہے ہیں اور اس کی حفاظت میں موت کی پروا بھی نہیں کرتے' چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ جس قدر جلد ہو سکے' مسیلمہ کو قتل کر دینا چاہیے۔ مسیلمہ حضرت خالدؓ کے مقابل ضرور تھا' لیکن وہ سامنے آنے سے کتراتا رہا۔ وہ اپنے فدائین کے گھیرے میں محفوظ تھا اور اسے اس گھیرے سے باہر لانا ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت خالدؓ دشمن کے جوانوں کو پے در پے قتل کرتے ہوئے مسیلمہ کے سامنے جا پہنچے۔

تاریخ طبری جلد دوم میں مذکور ہے کہ مسیلمہ کے متعلق رسول کریم ﷺ نے حضرت خالدؓ سے فرمایا تھا کہ ایک شیطان مسیلمہ کے تابع ہے اور جب مسیلمہ اس کے پاس ہوتا ہے تو اس کے منہ سے اس قدر جھاگ جاری ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے' اس کے دونوں جبڑوں میں ناسور ہے اور جب مسیلمہ کوئی

بھلی بات کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ شیطان اسے روک دیتا ہے' لہٰذا اگر تم کو کبھی اس کے خلاف موقع مل جائے تو ہرگز اس کو ہاتھ سے جانے نہ دینا۔

حضرت خالدؓ نے مسیلمہ کو بات چیت کے لیے بلایا' جس پر وہ راضی ہو گیا۔ جب وہ حضرت خالدؓ کے مقابل چند گز کے فاصلے پر آیا تو حضرت خالدؓ نے اسے پوچھا کہ اگر ہم مشروط صلح کر لیں تو تمہاری شرطیں کیا ہوں گی۔ مسیلمہ نے اپنا سر ایک طرف پھیرا' جیسے وہ کسی غائبانہ ہستی کی بات سن رہا ہو...... کیونکہ اس کے الہام کا طریقہ ایسے ہی ہوا کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت خالدؓ کو رسول اکرم ﷺ کا فرمان یاد آ گیا کہ مسیلمہ کبھی اکیلا نہیں ہوتا بلکہ اس کے شیطان ہمیشہ اس کے ہمراہ ہوتے ہیں' جن کی وہ کبھی نافرمانی نہیں کرتا اور اس کے شیطانوں نے کسی بھی صلح کی شرط کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس کو اپنے سر کی جنبش سے ظاہر کیا۔ حضرت خالدؓ ایسے موقعے کی تلاش میں تھے کہ وہ ذرا غافل ہو تو اس پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیں' چنانچہ انہوں نے اس سے دوسرا سوال کیا' لیکن جب مسیلمہ نے سر پھیر کر غیبی مشیر کی بات سننے کا اعادہ کیا تو حضرت خالدؓ نے پھرتی سے اس پر حملہ کر دیا لیکن مسیلمہ حضرت خالدؓ سے بھی زیادہ پھرتیلا نکلا اور بھاگ کر اپنے فدائیوں کے حلقہ میں جا چھپا۔ مسیلمہ کے اس فرار نے اسے مزید چند گھنٹوں کی زندگی تو ضرور بخش دی لیکن اس کی قوم کے حوصلے یہ دیکھ کر پست ہو گئے کہ ان کا اپنا نبی موت کے ڈر سے بڑی بزدلی کے ساتھ خالدؓ کے آگے بھاگ نکلا ہے۔

حضرت خالدؓ کی اس کارروائی سے مسلم لشکر میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا ہو گیا۔ اس موقع پر حضرت خالدؓ نے عام حملے کا حکم دے دیا۔ مسلمانوں کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ جلد ہی بنو حنیفہ کی صفوں میں انتشار پیدا ہونے لگا۔ اس وقت انہوں نے پکار کر مسیلمہ سے پوچھا: ''آپ کے وہ وعدے جو فتح کے متعلق آپ نے ہم سے کیے تھے' کہاں گئے؟'' اس انتشار کے بعد جب دشمن فوج میں بھگدڑ مچ گئی تو مسیلمہ نے بھی فرار کا ارادہ کر لیا اور پیٹھ پھیرتے ہوئے اپنے فوجیوں سے کہا: ''اپنے حسب و نسب کی خاطر لڑتے رہو۔ یہ موقع اب ایسی باتیں دریافت کرنے کا نہیں۔''

دائیں بازو کے سردار محکم بن طفیل نے جب مسیلمہ کے فرار کے بعد اپنی بھاگتی ہوئی فوج کو بے دریغ قتل ہوتے دیکھا تو اس نے چلا کر انہیں باغ میں پناہ لینے کے لیے پکارا اور اتنے میں انہیں عقب سے بچانے کا ذمہ لے لیا۔

یہ باغ ''حدیقتہ الرحمان'' کہا جاتا تھا' میدان جنگ کے قریب ہی تھا اور مسیلمہ کی ملکیت تھا۔ یہ طویل اور عریض تھا اور قلعے کی طرح اس کے چاروں طرف بلند دیواریں تھیں۔ محکم بن طفیل کی

آواز سن کر مسیلمہ کے ساتھیوں نے اس کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ جب کہ مسیلمہ پہلے ہی اس میں داخل ہو چکا تھا۔ اس بھگدڑ میں صرف چوتھائی فوج ہی باغ میں پہنچنے کے قابل ہو سکی اور محکم ایک دستے کے ساتھ انہیں مسلمانوں کی یلغار سے بچاتا رہا۔ باقی فوج کے بیشتر حصے کا مسلمانوں نے صفایا کر دیا اور خود محکم بن طفیل لڑتے لڑتے حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کے تیر سے گھائل ہو گیا۔ تقریباً سات ہزار آدمی مسیلمہ سمیت باغ میں داخل ہوئے۔

مسیلمہ اور اس کی باقی ماندہ قوم باغ میں پناہ گزیں ہو چکی تھی۔ مسلمانوں نے باغ کا محاصرہ کر کے اس کے چاروں طرف پڑاؤ ڈال دیئے اور کسی ایسی جگہ کی تلاش کرنے لگے' جہاں سے باغ میں گھس کر اس کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو سکیں' لیکن انہیں کوئی ایسی جگہ نہ مل سکی۔ آخر براءؓ بن مالک نے کہا کہ مسلمانو! اب صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ تم مجھے اٹھا کر باغ کے اندر پھینک دو اور میں اندر لڑ بھڑ کر دروازہ کھول دوں گا۔ مسلمانوں نے ایسا کرنا گوارا نہ کیا لیکن براءؓ برابر اصرار کرتے رہے اور کہا: ''میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تم مجھے باغ کے اندر پھینک دو۔'' آخر مجبور ہو کر مسلمانوں نے انہیں باغ کی دیوار پر چڑھا دیا۔ باغ میں انہوں نے دشمن کی زبردست جمعیت کو دیکھا تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گئے لیکن پھر اللہ کا نام لے کر باغ کے دروازے کے سامنے کود گئے اور دشمنوں سے لڑتے بھڑتے بیسیوں کو قتل کرتے ہوئے کمال ہوشیاری اور پھرتی سے باغ کا دروازہ کھول دیا۔

مسلمان باہر دروازے کے کھلنے کے منتظر تھے۔ جونہی دروازہ کھلا' وہ تلواریں سونت کر باغ میں داخل ہو گئے اور دشمنوں کو بے دریغ قتل کرنے لگے۔ بنی حنیفہ نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن مسلمانوں کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ گئی۔ ادھر باہر نکلنے کا راستہ بھی مسلمانوں نے روک رکھا تھا۔ طرفین کے کثیر آدمی اس معرکہ میں قتل ہوئے لیکن بنو حنیفہ کے مقتولین کی تعداد بے حساب تھی۔ مسیلمہ خود بھی تلوار ہاتھ میں لیے لڑتا رہا۔ وہ ایک چالاک اور بہادر جنگجو تھا اور غیض کی حالت میں اس کے منہ سے جھاگ بہہ نکلی اور اس کی شکل ایک مہیب اور بدصورت بھوت کی طرح ہو گئی۔ دشمن کی لاشیں ایک دوسرے پر گر رہی تھیں اور خون سے تمام مٹی اور گرد رنگین ہو گئی تھی۔ حضرت جبیرؓ بن مطعم کے آزاد کردہ حبشی غلام وحشی جس نے جنگ احد میں بحالت کفر حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا اور جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہو گیا تھا' اس موقع پر موجود تھا اور اس موقع کی تاک میں تھا کہ جونہی مسیلمہ اس کے نیزے کی زد میں آئے تو وہ اس پر اپنا وار کرے' ادھر جنگ احد کی مشہور خاتون ام عمارہ بھی مردانہ وار لڑ رہی تھی۔ گو اس پر اب بڑھاپے کے آثار تھے لیکن وہ اپنے لڑکے کے ہمراہ لڑائی میں مشغول تھی۔ وہ مسیلمہ کی طرف بڑھی

تو ایک مرتد نے اس پر حملہ کر کے اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا' اس کا لڑکا فوراً مدد کے لیے پہنچا۔ اس نے مرتد کو قتل کر کے اپنی والدہ کو محفوظ مقام پر پہنچایا۔ جونہی وحشی نے مسیلمہ کو اپنی زد میں لے کر اس پر نیزہ پھینکا تو ادھر حضرت ابودجانہؓ (جو جنگ احد میں اپنے جسم سے حضور ﷺ پر ڈھال بن گئے تھے) تلوار لیے مسیلمہ کی طرف بڑھے۔ وحشی کا نیزہ مسیلمہ کے پیٹ میں گھس گیا اور آر پار نکل آیا اور اسی لمحے حضرت ابودجانہؓ بھی جست لگا کر مسیلمہ پر جھپٹے اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا اور وہ جب اس کے قتل کا اعلان کرتے ہوئے پکارے تو ایک مرتد نے انہیں تلوار کے وار سے شہید کر دیا۔ بنو حنیفہ کے فوجی نے چیخ کر پکارا کہ ایک حبشی نے مسیلمہ کو قتل کر دیا ہے۔ جلد ہی یہ خبر تمام باغ میں پھیل گئی اور بنو حنیفہ کی ہمتوں نے جواب دے دیا۔ مسلمانوں نے انہیں بے تحاشا قتل کرنا شروع کر دیا۔ عرب میں اس وقت جتنی جنگیں ہوئی تھیں' یمامہ سے بڑھ کر کسی جنگ میں اتنی خونریزی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے ''حدیقۃ الرحمان'' کا نام ''حدیقۃ الموت'' پڑ گیا۔

جب باغ کا معرکہ ختم ہو گیا تو حضرت خالدؓ اپنے خیمے سے مجاعہ کو' جو بیڑیاں پہنے ہوئے تھا' ساتھ لے کر میدان میں آئے کہ وہ مقتولین کو دیکھ کر بتائے کہ ان میں مسیلمہ کون ہے؟ چنانچہ ایک ایک مقتول کا چہرہ اس کی شناخت کے لیے کھولا جاتا تھا۔ اس طرح گزرتے ہوئے حضرت خالدؓ محکم بن طفیل کی نعش پر آئے' جو ایک نہایت قد آور وجیہ اور شاندار آدمی تھا۔ حضرت خالدؓ نے اس کی شکل دیکھ کر مجاعہ سے پوچھا: ''کیا یہ ہے تمہارا صاحب؟'' مجاعہ نے کہا: ''ہرگز نہیں۔ یہ اس سے کہیں بہتر آدمی تھا۔ یہ محکم یمامہ ہے۔'' آگے چلے تو حضرت خالدؓ مقتولین کے چہروں کی شناخت کے لیے اسے دکھاتے جاتے تھے' باغ میں پہنچے اور وہاں کے مقتولوں کو دیکھنا شروع کیا۔ آخر وہ پھرتے پھراتے ایک ٹھگنے قد اور چپٹی ناک والے زرد رو لاشے پر پہنچے۔ مجاعہ نے کہا: ''یہ مسیلمہ ہے' جسے تم نے قتل کر دیا ہے۔'' حضرت خالدؓ نے کہا: ''یہی وہ شخص ہے' جس نے تمہیں گمراہ کر کے ایک عظیم فتنہ برپا کر دیا تھا۔'' مجاعہ نے کہا: ''ہاں' ثابت تو یہی ہوا ہے۔''

اگرچہ مسیلمہ بمع اپنے ہزاروں ساتھیوں اور (مجاعہ کے علاوہ) تمام بڑے سرداروں کے ختم ہو چکا تھا لیکن خالدؓ ابھی مطمئن نہ تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ نے ان سے کہا کہ اب لشکر کو کوچ کا حکم دیجیے اور چل کر بنو حنیفہ کے قلعوں کا محاصرہ کر لیجیے۔ لیکن خالدؓ نے جواب دیا۔ فی الحال تو میں دستوں کو ان لوگوں کے تعاقب میں بھیج رہا ہوں' جو قلعوں میں نہیں گئے بلکہ اردگرد کے

علاقوں میں پھر رہے ہیں۔ اس کے بعد جو ہوگا' سو دیکھا جائے گا۔ چنانچہ چاروں طرف دستے روانہ کیے گئے۔ یہ دستے غنیم کی کافی تعداد کو قتل کرنے کے بعد' مال غنیمت اور عورتوں اور بچوں کو لے آئے۔ خالدؓ نے انہیں قید کرنے کا حکم دے کر بنوحنیفہ کے قلعوں کا محاصرہ کرنے کا حکم دے دیا۔

لیلیٰ ام تمیم کو بنی حنیفہ کے ہاتھوں سے بچانے اور مسیلمہ کے بارے میں سچی باتیں بتانے پر حضرت خالدؓ کو مجاعہ پر پورا بھروسہ ہوگیا تھا۔ جب مسلمان بنوحنیفہ کے قلعوں کا محاصرہ کر چکے تو مجاعہ حضرت خالدؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ نے بنوحنیفہ پر فتح حاصل کر لی ہے۔ یمامہ کے قلعوں میں ہمارے جنگجوؤں کی بھاری تعداد موجود ہے' جو کہ سختی سے آپ کا مقابلہ کرے گی۔ اگر آپ صلح چاہتے ہیں تو مجھے شہر جانے کی اجازت دیجیے' تاکہ میں انہیں صلح پر آمادہ کرسکوں۔''

حضرت خالدؓ کو معلوم تھا کہ لشکر مسلسل لڑائیوں سے اب تنگ آ چکا ہے اور صلح کو جنگ پر ترجیح دے گا۔ چنانچہ انہوں نے اسے اجازت دے دی۔ مجاعہ نے اندر جا کر دیکھا کہ وہاں عورتوں اور بچوں کے سوا کوئی جوان نہ تھا۔ اس نے انہیں زرہ بکتر پہنا کر فصیل پر جمع ہونے کو کہا تاکہ مسلمان سمجھیں کہ قلعہ میں کافی فوج ہے اور اس طرح نرم شرائط پر صلح کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ مسلمانوں نے جب قلعہ کی دیواروں پر زرہ بکتر پہنے ہوئے تلواریں اور نیزے ہاتھ میں لیے ہوئے آدمیوں کو دیکھا تو مجاعہ کی باتوں کا یقین آ گیا۔ اتنے میں مجاعہ بھی واپس آ گیا اور کہنے لگا۔ میری قوم آپ کی پیش کردہ شرائط پر صلح نہیں کرنا چاہتی۔ چنانچہ اسے کہا گیا کہ ہم نصف مال و اسباب اور نصف قیدیوں کو بنی حنیفہ کے لیے چھوڑ دیں گے' تم جا کر انہیں سمجھاؤ۔ مجاعہ واپس گیا اور وہاں سے آ کر کہنے لگا کہ وہ ان شرائط پر بھی راضی نہیں' آپ چوتھائی مال و اسباب لینے پر رضامند ہو جائیں۔ بالآخر ان شرائط پر صلح ہوگئی اور بعد ازاں جب مسلمان شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں کسی نوجوان کا نام و نشان بھی نہیں۔ انہوں نے مجاعہ سے پوچھا کہ تم نے یہ دھوکا کیوں کیا؟ اس نے کہا میری قوم تباہ ہو جاتی۔ میرا فرض تھا کہ میں ان کی جانیں بچاؤں۔ اس لیے میں نے یہ تدبیر اختیار کی۔ حضرت خالدؓ نے اس کا یہ عذر قبول کرلیا اور صلح نامہ برقرار رکھا۔ دریں اثنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قاصد حضرت خالدؓ کے پاس حکم لے کر آیا کہ ہر اس شخص کو جو لڑائی کے قابل ہو قتل کر دیا جائے' لیکن خالدؓ ان سے صلح کر چکے تھے۔ انہوں نے صلح نامہ توڑنا پسند نہ کیا۔ اس کے بعد بنوحنیفہ بیعت کرنے اور مسیلمہ کی نبوت سے برأت کا اظہار کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ خالدؓ کے پاس ان سب کو لایا گیا' جہاں انہوں نے دوبارہ اسلام کا اعلان کیا۔ حضرت خالدؓ نے

ان کا ایک وفد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں مدینہ روانہ کیا جہاں ان کی عذر داری قبول کر لی گئی۔

جنگ یمامہ میں بنوحنیفہ کے میدانِ جنگ میں سات ہزار آدمی مارے گئے۔ سات ہزار باغ ''حدیقتہ الموت'' میں کام آئے اور باقی سات ہزار مجاہدین کے تعاقب میں قتل ہوئے۔ سارا مالِ غنیمت جو سونے چاندی، ہتھیاروں اور گھوڑوں پر مشتمل تھا' وہ مسلمانوں کی ملکیت ٹھہرا۔ بنوحنیفہ کی بستیوں میں جو باغات اور مزروعہ زمینیں تھیں' ان پر بھی مسلمانوں کا تصرف ہو گیا۔

اس جنگ میں مسلمانوں کا نقصان بھی کچھ کم نہ ہوا تھا۔ شہدا کی تعداد پچھلی تمام جنگوں کو مات کر گئی جو بارہ سو لکھی گئی ہے یعنی تین سو ستر مہاجرین۔ تین سو انصار اور باقی دیگر قبائل کے لوگ۔ ان میں تین سو ستر صحابہ کبارؓ اور قرآن کے حافظ بھی تھے' جن کا درجہ مسلمانوں میں بہت بلند تھا۔ اس سانحہ عظیم کا البتہ ایک اچھا اثر یہ ضرور ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اس خوف سے کہ کہیں آئندہ جنگوں میں بقیہ حافظوں سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں' حضرت عمرؓ کے پیہم اصرار پر قرآنِ مجید کو جمع کرنے کا حکم دے دیا' جو کہ بعد میں ایک۔ جلد کی صورت میں مدون ہو گیا۔

مسلمانوں کی بھاری تعداد کے شہید ہو جانے سے ان کے رشتہ داروں کو جو صدمہ پہنچا' اس کی تلافی صرف اس چیز نے کی کہ خداوند کریم نے اتنے بڑے فتنۂ ارتداد پر مسلمانوں کو مکمل فتح بخشی۔ ویسے تو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اور قبائل عرب کے سینکڑوں گھرانے اپنے بہادروں اور سپوتوں پر غم کے آنسو بہا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب کو تو خصوصیت سے اپنے بڑے بھائی زیدؓ کی شہادت سے بہت دکھ ہوا تھا۔ ان کے رنج و الم کا یہ عالم تھا کہ جب ان کے بیٹے عبداللہؓ اس جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دے کر واپس مدینہ آئے تو ان سے کہا: ''جب تمہارے چچا زیدؓ شہید ہو گئے تھے تو تم کیوں زندہ سلامت چلے آئے' تم نے اپنا منہ مجھ سے کیوں نہ چھپا لیا۔'' عبداللہ نے صرف یہ جواب دیا: ''انہوں نے حصولِ شہادت کی تمنا کی تو انہیں مل گئی۔ میں نے بھی اس غرض کے لیے پوری کوشش کی۔ لیکن افسوس میں اسے حاصل نہ کر سکا۔''

جنگ یمامہ فتنۂ ارتداد پر ایک کاری ضرب ثابت ہوئی' جس نے بچے کھچے مرتدین کے حوصلے پست کر دیئے۔ اس کے بعد چند ایک لڑائیاں لڑی گئیں' جن میں مرتدین نے ہر جگہ شکست کھائی' حتیٰ کہ پھر تمام عرب حلقۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔

شہیدانِ ناموسِ رسالت ﷺ

گلزار احمد ساجد

حمد وثناء ربِ ذوالجلال کے لیے جس نے مخلوق کی ہدایت کے لیے قرآن مجید نازل فرمایا......اور درود وسلام نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ پر جس نے چاردانگ عالم میں اس کو پھیلایا۔ اور رب ذوالجلال کی لاکھوں رحمتیں نازل ہوں ان مقدس شخصیات کی قبور پر جنہوں نے ناموسِ رسالت ﷺ کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

حضور خاتم النبیین ﷺ اور امت مسلمہ کے مابین وہی ربط وتعلق ہے، جو جسم وجان کا ہے۔ آپ ﷺ کی ناموس کی حفاظت ملت اسلامیہ کا اہم ترین فریضہ رہا ہے۔ مسلمان سب کچھ برداشت کرسکتا ہے، مگر آپ ﷺ کی توہین، تنقیص اور بے ادبی یا آپ کی شانِ مبارک میں ادنیٰ سی گستاخی کا شائبہ تک بھی برداشت نہیں کرسکتا۔

مسلمان اپنے آقا ومولا ختم المرسلین وخاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی عزت وناموس پر مر مٹنے اور اس کی خاطر دنیا کی ہر چیز قربان کرنے کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے ہیں۔ اس پر تاریخ کی کسی جرح سے نہ ٹوٹنے والی ایسی شہادت موجود ہے جو مسلمہ حقیقت بن چکی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو خواہ وہ ایشیا ہو یا یورپ، افریقہ ہو یا کوئی اور خطۂ ارض جہاں بھی اقتدار حاصل رہا، وہاں کی عدالتوں نے اسلامی قانون کی رُو سے شاتمانِ رسول ﷺ کو سزائے موت کا فیصلہ سنایا۔ اس کے برعکس جب کبھی یا جہاں

ان کے پاس حکومت نہیں رہی' وہاں جاں نثارانِ رسول ﷺ نے غیر مسلم حکومت کے رائج الوقت قانون کی پرواہ کیے بغیر گستاخانِ رسول ﷺ کو کیفر کردار تک پہنچایا اور خود ہنستے' مسکراتے تختۂ دار پر چڑھ گئے۔ اور نسلِ نو کو یہ پیغام دے گئے کہ۔

نماز اچھی' حج اچھا' روزہ اچھا' زکوۃ اچھی
مگر میں باوجود ان کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ بطحاؑ کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

جنگ یمامہ' جھوٹے مدعیانِ نبوت کے خلاف امتِ محمدیہؐ کا پہلا جہاد:

نبی آخرالزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رحلت کے بعد منافقین نے نبوت کے جھوٹے دعویداروں کی صورت میں سر اٹھایا۔ جانشین رسولؐ' امیرالمومنین' خلیفۂ اوّل و بلافصل سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے ناموسِ رسالتؐ و آبروئے ختم نبوت کی پاسبانی کا حق ادا کرتے ہوئے' اللہ کی تلوار حضرت خالد بن ولیدؓ کو اس فتنے کی جڑیں کاٹنے اور ان بے ایمانوں کے سرتن سے جدا کرنے پر مامور کیا...... جنگ یمامہ کفرواسلام کے اسی معرکہ کی تاریخ ہے' جس میں بارہ سو کے قریب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جام شہادت نوش کیا۔ ان شہداء میں تین سو ستر ایسے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے جو قرآن کے حافظ تھے اور ان کا درجہ مسلمانوں میں بہت بلند تھا۔ جنگ یمامہ کے جذبے اور ولولے شمع ختم نبوت کے پروانوں کے لیے رہتی دنیا تک نمونۂ عمل رہیں گے۔

اے جان دینے والو! محمدؐ کے نام پر
ارفع بہشت سے بھی تمہارا مقام ہے

ختم نبوت کا پہلا شہید: حضرت حبیب بن زید انصاریؓ:

تاریخ اسلام میں عقیدۂ ختم نبوت کے لیے سب سے پہلے اپنی جان کا نذرانہ رسول اللہ ﷺ کے نوجوان انصاری صحابی حضرت حبیب بن زید انصاریؓ نے پیش کیا۔ وہ مسیلمہ کذاب کے ساتھیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور انہیں مسیلمہ کے دربار میں پیش کیا گیا۔ مسیلمہ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم حضرت محمد ﷺ کو اللہ کا رسول مانتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا' ہاں مانتا ہوں۔

مسیلمہ نے پھر پوچھا کہ کیا تم مجھے اللہ کا رسول تسلیم کرتے ہو؟ حضرت حبیب بن زیدؓ نے جواب میں فرمایا' میرے کان تمہاری یہ بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مسیلمہ نے انہیں قتل کرنے کا حکم

دیا۔ اور تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت حبیب بن زیدؓ کو مسیلمہ کے دربار میں اس درندگی کے ساتھ شہید کیا گیا کہ پہلے ان کا ایک بازو کاٹا گیا پھر دوسرا بازو' پھر ایک ٹانگ پھر دوسری ٹانگ' اس دوران مسیلمہ مسلسل سوال کرتا جاتا تھا اور اس عاشقِ رسول صحابیؓ کا ہر سوال پر یہی جواب تھا کہ میرے کان جناب نبی اکرم ﷺ کے بعد کسی اور کے لیے نبوت کا لفظ سننے کے لیے تیار نہیں۔ حتیٰ کہ حضرت حبیب بن زید انصاریؓ عقیدہ ختم نبوت کے اسی والہانہ اظہار کے ساتھ جامِ شہادت نوش کر گئے۔

حضرت زید بن خطاب القرشی العدویؓ:

یہ اس لشکر کے علمبردار تھے جو مسیلمہ کذاب کے مقابلہ میں حضرت صدیق اکبرؓ نے روانہ کیا تھا۔ دشمن کے ایک حملہ میں ان کا لشکر متفرق ہو گیا' تو انہوں نے کہا کہ اب مرد مرد نہیں رہے' پھر بلند آواز سے کہا الٰہی! میں اپنے ساتھیوں کے فرار کا تیرے حضور میں عذر پیش کرتا ہوں۔ مسیلمہ کذاب اور محکم بن طفیل کی سازشوں سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر آگے بڑھے اور شدت سے حملہ کیا اور مرتدین کو قتل کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ یہ حضرت زیدؓ خلیفۂ ثانی سیدنا عمر فاروقؓ کے بھائی ہیں۔

حضرت سالم بن معقل شہیدؓ:

حضرت سالم بن معقلؓ اصلی باشندے اصطخر کے تھے۔ بعض نے ان کا وطن موضع کرمد (علاقہ فارس) بھی لکھا ہے۔ شبیتہ بنت تعار انصاریہ کے غلام تھے۔ یہ خاتون ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف کی زوجہ ہیں۔ انہوں نے ان کو آزاد کر دیا اور ابوحذیفہؓ نے ان کو اپنی تربیت میں لے لیا۔ حتیٰ کہ متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) بنا لیا۔ جب تنسیخ تبنیت کا حکم اترا تو اپنی بھتیجی فاطمہ بنت ولید بن عتبہ قرشیہ کا نکاح ان سے کر دیا۔

حضرت سالمؓ کو انصاری اس لیے کہتے ہیں کہ وہ انصاریہ کے آزاد کردہ تھے اور مہاجر اس لیے شمار کرتے ہیں کہ انہوں نے مکہ میں ابوحذیفہؓ کے ہاں پرورش پائی' اور مکہ سے ہجرت کر کے اس قافلہ میں مدینہ پہنچے جس میں حضرت عمر فاروقؓ بھی شامل تھے۔

ان کا شمار فضلا الموالی' خیار الصحابہؓ اور کبار صحابہؓ میں کیا جاتا ہے۔ ان کو عجمی اصل وطن کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے جید قاری تھے۔ نبی کریم ﷺ نے معلمین قرآن میں ان کے نام کا تعین فرمایا تھا۔ غزوہ بدر میں حاضر تھے' جنگ یمامہ میں حضرت سالم اور ان کے مربی حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہما دونوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ دفن ہونے میں حضرت سالمؓ کا سر ابوحذیفہؓ کے پاؤں کی جانب تھا۔

حضرت سائب بن عثمان بن مظعون القرشی الحمجی شہیدؓ:

یہ سائب بن مظعون کے برادر زادے ہیں۔ ان کے والد عثمان بن مظعون اور ان کے چچاؤں قدامہ' عبداللہ اور سائب نے ہجرتِ حبشہ کی تھی۔ یہ بھی حبشہ کی ہجرتِ دوم میں شامل تھے۔ جنگ یمامہ میں شہادت کے مرتبہ پر فائز ہوئے' اس وقت ان کی عمر 30 سال سے زائد تھی۔

حضرت شجاع بن ابی وہب الاسدی شہیدؓ:

ان کا نسب نبی کریم ﷺ کے ساتھ خزیمہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ بھی حبشہ کی ہجرتِ دوم میں شامل تھے۔ اور پھر یہ سن کر کہ اہل مکہ مسلمان ہوگئے ہیں حبشہ سے واپس آ گئے تھے۔ غزوۂ بدر میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہے' مواخات میں نبی کریم ﷺ نے انہیں ابن خول کا بھائی بنایا تھا۔ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے' اس وقت ان کی عمر چالیس سال سے کچھ زائد تھی۔

حضرت عبداللہ بن مخرمہ شہیدؓ:

نبی کریم ﷺ کے ساتھ ان کا نسب گیارہویں پشت میں فہر سے مل جاتا ہے۔ ان کی والدہ ام فہک بنت صفوان ہیں۔ یہ مہاجرین اولین میں سے ہیں اور بقول ذوالہجرتین بھی ہیں۔ جنگ یمامہ میں اکتالیس سال کی عمر میں شہید ہوئے۔

انہوں نے دعا کی تھی کہ الٰہی مجھے اس وقت تک موت نہ آئے جب تک میں اپنے بند بند کو تیری راہ میں زخم رسیدہ نہ دیکھ لوں۔ جنگ یمامہ میں ان کے زخموں کا یہی حال تھا کہ جملہ مفاصل (جوڑوں) پر زخموں کے نشان تھے۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب میں ان کے پاس آخری وقت پہنچا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ روزہ داروں نے روزے کھول لیے ہیں؟ میں نے کہا' ہاں۔ انہوں نے کہا میرے منہ میں پانی ڈال دو۔ ابن عمر حوض پر گئے اور ڈول میں پانی لے کر آئے۔ آ کر دیکھا تو وہ سانس پورے کر چکے تھے۔

حضرت مالک بن امیہ بن عمرالسلمی شہیدؓ:

یہ بنو اسد بن خزیمہ کے حلیف ہیں' بدر میں حاضر ہوئے۔ جنگ یمامہ میں جام شہادت نوش کیا۔

حضرت مالک بن عمرو السلمی شہیدؓ:

یہ بنو عبد شمس کے حلیف ہیں' بدر میں حاضر تھے۔ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔

حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ شہیدؓ:

ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف قرشی' ان کا نام ہشم یا ہشیم یا ہاشم بیان کیا گیا ہے۔ فضلاء صحابہ میں سے ہیں۔ ابھی نبی کریم ﷺ دار ارقم میں داخل نہ ہوئے تھے کہ یہ اسلام لا چکے تھے۔ اوّل ہجرت حبشہ کی' پھر مکہ سے مدینہ ہجرت کی۔ ان کی اہلیہ سہلہ بنت سہیل نے ہجرت حبشہ میں ساتھ دیا تھا۔ بدر' احد' خندق' حدیبیہ جملہ غزوات میں آنحضرت ﷺ کے ہمرکاب رہے' جنگ یمامہ میں بعمر 53 سال جام شہادت نوش کیا۔

حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن ابی بن سلول الانصاری الخزرجی شہیدؓ:

یہ بنو عوف بن خزرج میں سے ہیں' ان کا قبیلہ مدینہ بھر میں مشہور تھا۔ ان کو ابن الحبلی بھی کہتے ہیں۔ سلول عبداللہ منافق کی دادی کا نام ہے' ابی اپنی ماں کی نسبت سے مشہور ہے۔ حضرت عبداللہؓ کے باپ عبداللہ کو اہل یثرب اپنا بادشاہ بنانے لگے تھے' اس کے لیے تاج تیار کرنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں کہ سرور عالم ﷺ رونق افروز مدینہ ہو گئے۔ خزرجی مسلمان ہو گئے' ابن ابی کا اقتدار خاک میں مل گیا۔ رشک و حسد نے اسے رئیس المنافقین بنا دیا۔

جب "لیخرجن الاعزمنھا الاذل" کا جملہ رئیس المنافقین کے منہ سے نکلا تو اس کے بیٹے حضرت عبداللہؓ جو نہایت مخلص مسلمان تھے' حضور ﷺ کی خدمت میں گئے اور عرض کیا کہ اگر ارشاد ہو تو اپنے نالائق باپ کا سر کاٹ کر حاضر کر دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں' تم اپنے باپ سے حسنِ سلوک رکھو۔

الغرض ابن ابی رئیس المنافقین کے گھر میں حضرت عبداللہؓ صدق و اخلاص کا کامل نمونہ تھے۔ ایمان اور محبت رسول ﷺ کے مدارج میں ترقی یافتہ تھے' ان کا شمار خیار صحابہؓ اور فضلائے صحابہؓ میں ہوتا تھا۔ بدر' احد اور دیگر تمام غزوات میں آنحضرت ﷺ کے ہمرکاب رہے اور جنگ یمامہ میں اپنی جان کا نذرانہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور پیش کیا۔

حضرت سماک بن خرشتہ الانصاری شہیدؓ:

ان کی کنیت ابو دجانہ ہے اور اپنی کنیت سے مشہور ہیں۔ ان کا شمار چیدہ اور برگزیدہ بہادروں میں ہوتا ہے۔ تمام مغازی میں حضور ﷺ کے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ بدر میں حاضر تھے' جنگ

یمامہ میں شہید ہوئے۔

حضرت عائذ بن ماعض الانصاری شہیدؓ:

یہ اور ان کے بھائی معاذ بن ماعض رضی اللہ عنہما غزوہ بدر میں حاضر تھے۔ مواخات میں ان کو نبی کریم ﷺ نے سوبط بن حرملہؓ کا بھائی بنایا تھا۔ بیر معونہ یا بقول بعض یوم یمامہ میں جام شہادت نوش کیا۔

حضرت نعمان بن اعقر بن الربیع البلوی الانصاری شہیدؓ:

یہ انصار بنو معاویہ بن مالک کے حلیف تھے۔ بدر' احد' خندق اور جملہ مشاہد میں شریک ہوئے' جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔

حضرت معن بن عدی بن جد بن عجلان ضیعہ البلوی الانصاری شہیدؓ:

انصار بن عمر کے حلیف تھے۔ عاصم بن عدی کے برادرِ حقیقی ہیں۔ مواخات میں نبی کریم ﷺ نے زید بن خطابؓ کو ان کا بھائی بنایا تھا۔ بدر سمیت جملہ مشاہد میں حاضر باش رہے۔ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔

حضرت عقبہ بن عامر الانصاری الخزرجی شہیدؓ:

بیت عقبہ اولیٰ سے مشرف تھے' بدر و اُحد میں حاضر تھے۔ اُحد کے دن خودِ آہنی پر سبز عمامہ سجائے رکھا تھا اور دور سے نمایاں ہوتے تھے۔ خندق اور دیگر مشاہد میں بالالتزام حاضر رہے' جنگ یمامہ میں جام شہادت نوش کیا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عبداللہ البلوی الانصاری شہیدؓ:

یہ فرار بن بلی کی نسل اور بنو قضاعہ میں سے ہیں۔ ان کا نام عبدالعزیٰ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کا نام عبدالرحمٰن عدو الاوثان تجویز فرمایا۔

بدر میں حاضر تھے' جنگ یمامہ میں شہادت کے مرتبۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔

حضرت عباد بن بشر بن وقش الانصاری الاشہلی شہیدؓ:

حضرت عباد بن بشر بن وقش بن زغبہ بن زعورا بن عبدالاشہل الانصاری الاشہلی یہ قدیم الاسلام ہیں۔ مدینہ میں حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔

بدر' احد اور دیگر جملہ مشاہد میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ فضلائے صحابہ

رضوان اللہ علیہم میں سے ہیں۔

حضرت انس بن مالکؓ نے روایت کی ہے کہ اندھیری رات میں ان کا عصا روشن ہو جایا کرتا تھا۔ یہ ان چھ بزرگوں میں سے ہیں جو کعب بن اشرف یہودی کے قتل میں شامل تھے۔ جنگ یمامہ میں مردانہ وار لڑتے ہوئے، مرتدین کو مارتے ہوئے بعمر 45 سال شہید ہوئے۔

حضرت ثابت بن ہزال بن عمرو الانصاری شہیدؓ:

حضرت ثابت بن ہزال الانصاریؓ بدر اور دیگر جملہ مشاہد میں حاضر باش رہے، جنگ یمامہ میں شہادت پائی۔

حضرت ثابت بن خالد بن نعمان بن خنا الانصاری شہیدؓ:

یہ بنو مالک بن النجار میں سے ہیں۔ بدر و اُحد میں حاضر ہوئے اور جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔

حضرت ایاس بن ورقہ الانصاری الخزرجی شہیدؓ:

یہ بنو سالم بن عوف بن خزرج سے ہیں۔ بدر میں حاضر ہوئے، اور جنگ یمامہ میں شہادت پائی۔

مندرجہ بالا شہداء ناموس رسالتؐ کے علاوہ مولانا ابوالقاسم دلاوری نے ابن اثیر کے حوالے سے درج ذیل شہداء ناموس رسالت صحابہؓ کے اسماء مبارکہ لکھے ہیں:

1- حضرت عباد بن حارث الانصاریؓ جو جنگ احد میں شریک تھے۔
2- حضرت عمیر بن اوسؓ شریک احد
3- حضرت عامر ابن ثابتؓ بن سلمہ انصاری
4- حضرت عمارہ ابن حزم انصاریؓ جو غزوہ بدر میں شریک تھے۔
5- حضرت علی بن عبید اللہ ابن حارثؓ
6- حضرت فروہ بن نعمانؓ جو جنگ اُحد میں شریک تھے۔
7- حضرت قیس بن حارث بن عدی انصاریؓ شریک جنگ اُحد۔
8- حضرت سعد بن حجاز انصاریؓ شریک غزوہ احد۔
9- حضرت سلمہ ابن مسعود بن سنان انصاریؓ۔
10- حضرت سائب ابن عوامؓ جو زبیرؓ کے حقیقی بھائی اور سید المرسلین ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی

تھے۔

-11 حضرت طفیل ابن عمر الدوسیؓ شریک غزوہ خیبر۔

-12 حضرت زرارہ ابن قیس انصاریؓ۔

-13 حضرت مالک ابن امیہ سلمٰی بدریؓ۔

-14 حضرت مسعود ابن سنانؓ اسود شریک غزوہ اُحد۔

-15 حضرت صفوانؓ۔

-16 حضرت فرار ابن ازور اسدیؓ جنہوں نے حضرت خالدؓ کے حکم سے مالک بن نویرہ کو قتل کیا۔

-17 حضرت عبداللہ بن حارث سہمیؓ۔

-18 حضرت عبداللہ ابن عتیکؓ انصاری بدری، جنہوں نے گستاخ رسول ﷺ یہودی ابو رافع بن ابی الحقیق کو حضور ﷺ کے حکم پر قتل کرنے کا فریضہ سرانجام دیا۔

-19 حضرت ہریم ابن عبداللہ مطلبی قرشیؓ۔

-20 اور ان کے بھائی حضرت جنادہؓ۔

-21 ولیدؓ بن عبد شمس بن مغیرہ جو حضرت خالدؓ کے عم زاد بھائی تھے۔

-22 حضرت ابوحبہ ابن غزیہؓ انصاری جو اُحد میں موجود تھے۔

-23 حضرت ابوقیس ابن حارث سہمیؓ جو مہاجرین حبش میں داخل اور جنگ اُحد میں شریک تھے۔

-24 حضرت یزید بن ثابتؓ جو حضرت زید بن ثابتؓ انصاری کے بھائی تھے۔

-25 حضرت مالک ابن عوس ابن عتیک انصاریؓ جو اُحد میں شریک تھے۔

-26 نعمان بن عصر بدریؓ۔

-27 حضرت یزید بن اوسؓ جو فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے۔

-28 حضرت ابو عقیل بلوی بدریؓ۔

اس طرح بعض مورخین نے چند اور نام بھی بتائے ہیں۔

(''آئینہ تلبیس'' جلد اوّل، ص 88-87)

برصغیر میں تحریک تحفظ ناموسِ رسالتؐ:

برصغیر پاک و ہند میں برطانوی دورِ استعمار سے قبل، حتیٰ کہ مغل شہنشاہ اکبر کے سیکولر دور میں بھی شاتمِ رسول ﷺ کو سزائے موت دی گئی۔ لیکن جب اس ملک پر سازشوں کے ذریعہ انگریزوں کا

غاصبانہ قبضہ ہوگیا تو انہوں نے توہین رسالت ﷺ کے اس قانون کو یکسر موقوف کر دیا۔ پھر انگریز حکومت ہی کی شہ پر جب ہندوؤں' آریہ سماجیوں' اور مہا سبھائیوں نے مسلمانوں کی دل آزاری کرتے ہوئے پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی قدر پر حملے کرنے شروع کر دیئے تو مسلمانوں نے شاتمان رسول ﷺ کو قتل کر کے' اقرار جرم کرتے ہوئے دار و رسن کی روایت کو از سرِ نو زندہ کیا۔

"عزت پہ تری کملی والے
حرمت پہ تری کملی والے
کٹنے کے لیے مرنے کے لیے
تیار ہیں ہم تیار ہیں ہم
تیار ہیں ہم تیار ہیں ہم"

(سید محمد امین گیلانی)

"غلامی کا ہر سال جدو جہد" آزادی" کے لیے مصائب کے کوہِ گراں لے کر آیا۔ اُن دنوں ہر صبح کا طلوع ہونے والا آفتاب اپنی کرنوں میں محبانِ وطن کے لیے ایسے فیصلے لے کر طلوع ہوتا کہ جن میں دار و رسن کے فیصلے جلی طور پر رقم ہوتے۔

لیکن 1926ء کا سورج عجیب انداز سے اُبھرا کہ غیر ملکی استعمار اگر ایک طرف آتشیں اسلحہ سے لیس تھا تو دوسری طرف سیاسی بساط کے مہرے اس رخ پر چلائے کہ ان کی ہر چال شہ کو مات دیتی ہوئی چلی گئی۔

سائمن کمیشن میں ہندوستان کی عدم شمولیت' لارڈ برکن ہیڈ کا چیلنج اور ہندوستانی رہنماؤں کے فیصلے ہنوز متصادم تھے کہ آریہ سماج اور مرزائیوں کی چپقلش نے ہندوستان میں تحریکِ شاتم رسول ﷺ کو جنم دیا۔

1875ء میں پنڈت دیانند کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" پہلی بار بنارس میں شائع ہوئی۔ قادیانی مذہب کے بانی مرزا غلام احمد نے "ستیارتھ پرکاش" کے شائع ہوتے ہی کتابِ ہذا کے مصنف اور دوسرے رہنماؤں کو چیلنج کیا کہ "جو کتاب میں (مرزا غلام احمد) مستقبل قریب میں لکھنے والا ہوں اگر ہندو اور سوامی دیانند مجھے اس کا جواب دیں تو میں انہیں دس ہزار روپیہ انعام دوں گا۔" اس کے بعد مرزا غلام احمد کی کتاب "براہین احمدیہ" کا سلسلہ شائع ہونا شروع ہوا جس میں ہندو دھرم' ویدٗ آریہ سماج' پنڈت دیانند پر اعتراضات والزامات تراشے گئے۔

اکتوبر 1883ء میں پنڈت دیانند کی موت واقع ہوئی اور 1884ء میں "براہین احمدیہ" کی

چوتھی جلد شائع ہوئی۔ اس میں پنڈت دیانند کی موت پر اس کے خلاف زورِ قلم کا مظاہرہ دیکھا گیا۔ آخر اسی سال ''ستیارتھ پرکاش'' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اضافی طور پر جن دو ابواب کو شامل اشاعت کیا' ان میں داعیٔ اسلام حضور خاتم الانبیاء ﷺ کی ذاتِ گرامی پر براہ راست حملے کیے گئے تھے' جنہیں مسلمان برداشت نہ کر سکے اور کتاب ہذا کے خلاف ہندوستان بھر میں احتجاجی مظاہرے اور جلسے ہوئے نیز حکومت سے اس کتاب کی ضبطی کا مطالبہ کیا گیا۔

انہی دنوں قاسم علی (مرزائی) کی کتاب ''انیسویں صدی کا مہارشی دیانند'' شائع ہوئی جس میں پنڈت دیانند کو ہدفِ تنقید بنایا گیا تھا۔ اس کتاب کے بازار میں آتے ہی ہندو مسلمان پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ قاسم علی (مرزائی) کے جواب میں آریہ سماجی لیڈر پنڈت چماپاوتی ایم اے پروفیسر ڈی' اے' وی کالج لاہور نے (نعوذ باللہ) ''رنگیلا رسول'' ایسی رسوائے عالم کتاب لکھی۔

اس مسموم فضا میں امرتسر کے ایک ہندی رسالہ ''ورت مان'' نے بھی خاتم الانبیاء علیہ السلام کی ذاتِ گرامی پر کیچڑ اچھالا جسے رائج الوقت قانون نے چھ ماہ کی سزا دی۔ لیکن کتاب ''رنگیلا رسول'' (نعوذ باللہ) نے حالات کو بد سے بدتر کر دیا۔''

(حیاتِ امیر شریعت صفحات 102,101,100 از جانباز مرزاؒ)

شاتمِ رسول واجب القتل ہے' جمعیۃ العلمائے ہند کا فتویٰ:

''علمائے دین کی توجہ جب کتاب ''رنگیلا رسول'' کی طرف ہوئی تو جمعیۃ العلمائے ہند نے شاتمِ رسول ﷺ کو واجب القتل قرار دیا۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی عبدالعزیز نامی شخص نے کتابِ ہذا کے ناشر مہاشہ راجپال پر جس نے کہ مصنف کی ذمہ داری بھی قبول کر لی تھی' لاہور میں قاتلانہ حملہ کیا' جس سے راجپال زخمی ہوا' اور حملہ آور کو چودہ سال کی سزا ہوئی۔

اس کے بعد خدا بخش نامی (المعروف اکو جیا) نے حملہ کیا' مگر یہ وار بھی جان لیوا ثابت نہ ہوا۔ خدا بخش کو چھ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ راجپال کو گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ آخر مسلسل قاتلانہ حملوں اور مسلمانوں کے اضطراب کے ردِ عمل پر حکومت نے مہاشہ راجپال کو گرفتار کر لیا۔ عدالت نے تین سال قید اور جرمانے کی سزا دی لیکن سیشن جج نے جرمانہ معاف کر دیا اور سزا بحال رکھی۔ ہائیکورٹ میں اپیل پر جسٹس کنور دلیپ سنگھ (عیسائی) نے راج پال کو بری

کر دیا۔اس فیصلے پر لاہور کے انگریزی روزنامہ ''مسلم آؤٹ لک'' نے تبصرہ کیا تو اسے توہین عدالت پر سزا ہوئی۔جسٹس کنور دلیپ سنگھ کے اس رویہ پر عوام کا احتجاج اس قدر عام ہوا کہ حکومت کو عدالت عالیہ کی پوزیشن محفوظ کرنا مشکل ہوگئی۔'' (حیاتِ امیر شریعت صفحات نمبر 103,102 از جانباز مرزا)

مسلمانوں کا جذبۂ شوقِ شہادت اور شاتم رسول ﷺ کا قتلِ عام:

''ایک طرف سائمن کمیشن کے ارکان ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایسی بو سونگھ رہے تھے جس سے انہیں اپنے لیے سکون میسر نہیں تھا' دوسری طرف مہاشہ راجپال کے بری ہونے پر فرقہ پرست ہندوؤں نے منظم سازش کے تحت تحریکِ شاتم رسول کو ہندوستان میں ہوا دی' جس سے آریہ سماجی ہندوؤں کے حوصلے بڑھے اور انہوں نے پیغمبر آخرالزماں حضور نبی کریم ﷺ کے خلاف پہلے سے زیادہ تقریر و تحریر پر ہنگامہ شروع کر دیا۔'' (حیاتِ امیر شریعت ص 116 از جانباز مرزا)

''ایسے حالات میں اوّل الذکر گروہ (آریہ سماج) نے سرورِ کائنات ﷺ کی توہین کرنے کا فیصلہ پختہ کر لیا۔اس سلسلے میں وہ ایسی ایسی تحریریں سامنے لائے کہ مسلمانوں کے دل بیٹھ گئے' غلامی کا جوا ان کی گردنوں پر کوہ ہمالیہ سے بھی زیادہ بوجھل محسوس ہونے لگا۔غم اور غصے کے ملے جلے جذبات سے وہ ہندوؤں کا مقابلہ کرتے رہے۔آخر انہی دنوں شاہ جی نے عصمت انبیاء کے تحفظ کا فیصلہ کیا۔درویش اپنی گودڑی سنبھال کر بے سروسامانی کے عالم میں نکل کھڑا ہوا۔قانون افرنگ اور دولتِ ہنود اس کے ارادوں میں نہ تو کانٹے بکھیر سکی اور نہ ہی اس کے قدموں کی رفتار مدھم ہو سکی۔''

صدائے امیر شریعت:

''مسلمانو! میں تمہاری سوئی ہوئی غیرت کو جھنجھوڑنے آیا ہوں۔آج کفار نے توہین پیغمبر ﷺ کا فیصلہ کر لیا ہے۔انہیں شاید یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مسلمان مر چکا ہے۔آؤ اپنی زندگی کا ثبوت دیں۔عزیز نوجوانو! تمہارے دامن کے سارے داغ صاف ہونے کا وقت آ پہنچا ہے۔گنبدِ خضریٰ کے مکینؐ تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ان کی آبرو خطرے میں ہے۔ان کی عزت پر کتے بھونک رہے ہیں۔اگر قیامت کے دن محمد ﷺ کی شفاعت کے طالب ہو تو پھر نبیؐ کی توہین کرنے والی زبان نہ رہے یا سننے والے کان نہ رہیں۔'' (حیاتِ امیر شریعت ص 118 از جانباز مرزا)

ان خیالات کو شاہ جی نے برصغیر کے مسلمانوں میں بیان کیا۔وہ شب و روز دیوانوں کی طرح تقریریں کرتے' گاؤں' قصبات' شہر اور بستیوں کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا۔ہندوستان کے مسلمانوں کے منجمد خون میں حرارت پیدا ہوئی۔بس پھر کیا تھا؟ شیر کی طرح بپھرا ہوا مسلمان گستاخ ہندوؤں کو تلاش

کرنے لگا۔ نگاہیں جنت کی تلاش میں موت سے ہمکنار ہونے کو بے قرار نظر آنے لگیں۔ دلوں میں شوقِ شہادت کی لذت محسوس ہونے لگی۔ خرد مسکراتی رہی مگر عشق منزل کی جانب رواں دواں رہا۔ اس طرح شاہ جی نے مسلمان نوجوان کو ابھار کر ایسے مقام پر لا کھڑا کیا کہ اس کے آگے دو ہی راستے تھے' یا تو ہندوستان میں داعیٔ اسلام حضرت محمد ﷺ کی عزت ہمیشہ کے لیے نابود ہو جائے یا پھر غیر مسلموں کو آئندہ جرأت نہ ہو کہ وہ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی پر زبانِ طعن دراز کریں۔

دلوں کے اس فیصلہ کن مقام پر پہنچ کر سب سے پہلے 6 اپریل 1929ء کو لاہور کے ایک بڑھئی نوجوان غازی علم الدین نے دوپہر کے وقت لاہور میں کتاب ''رنگیلا رسول'' (نعوذ باللہ) کے ناشر مہاشہ راجپال کو اس کی دوکان (ہسپتال روڈ) میں قتل کر دیا۔

(حیاتِ امیر شریعت ص 119,118 از جانباز مرزا)

اس طرح غازی عبدالرشید قاضی' غازی محمد صدیق' غازی عبداللہ' غازی غلام محمد' غازی عبدالقیوم' غازی میاں محمد' غازی مرید حسین' غازی حاجی محمد مانک اور غازی عبدالمنان وغیرہ بھی گستاخانِ رسول ﷺ کو جہنم واصل کر کے بارگاہِ رسالت ﷺ میں مقبول ہوئے۔

کب موت سے ڈرتے ہیں غلامانِ محمدؐ
یہ اپنے غلاموں پہ ہے فیضانِ محمدؐ
ہوتا ہے الگ سر مرا شانوں سے تو ہو جائے
پر ہاتھ سے چھوٹے گا نہ دامانِ محمدؐ

(سید محمد امین گیلانی)

ایچ ساجد اعوان کی شہرۂ آفاق کتاب ''تحفظ ناموسِ رسالتؐ اور گستاخ رسول کی سزا'' میں ''تحفظ ناموسِ رسالت کی چند گم شدہ کڑیاں' شخصیات و واقعات'' کے عنوان سے مزید شہیدانِ ناموسِ رسالت کا تذکرہ ملتا ہے ملاحظہ فرمائیں:

1- غازی محمد منیر شہید موضع موکہ ضلع فیروز پور (بھارتی پنجاب) کے وٹرنری ہسپتال میں بلحاظ پیشہ چپڑاسی تھے' جذبہ عشق رسول سے سرشار ایک موقع پر تحفظ ناموس نبی (ﷺ) کے لیے آگے بڑھے اور جان پر کھیل گئے۔ شاتم رسول کو واصل فی النار کرنے کے بعد عدالتی فیصلے کی رو سے انہیں سزائے موت کا مستحق گردانا گیا۔ وہ جام شہادت کے متمنی تھے اور سرِ دار لٹک کر لافانی نسخہ حیات بتلا گئے۔ دنیائے صحافت میں شہید موصوف کا تعارف غالباً کیپٹن ممتاز ملک صاحب کے ایک مضمون بعنوان ''نوجوانان اسلام کی حرمت وشان'' سے ہوا۔ انہوں

نے جنوری 1983ء کو نوائے وقت کے پرچوں سے شہیدان رسالت کا مختصر تذکرہ قلمبند کیا تھا۔ تاہم ان کے نقشِ قدم کا کھوج مجھے غازی میاں محمد شہید کے برادرِ حقیقی ملک نور محمد صاحب کی کمال مہربانی سے ملا۔

2- غازی خدا بخش اکو جہانے راجپال مردود پر سب سے پہلے 26 ستمبر 1927ء کی صبح قاتلانہ حملہ کیا۔ یہ سرفروش اندرون یکی گیٹ لاہور کا رہنے والا تھا۔ باپ کا نام محمد اکبر اور اس کا تعلق ایک معروف کشمیری خاندان سے تھا' اس کو سات سال قید سخت جس میں تین ماہ کی قید تنہائی بھی شامل تھی' سزا کا حکم سنایا گیا۔

3- راجپال ناری گستاخ رسول بچ رہا تھا' اس لیے 19 اکتوبر 1927ء کی شام کو غازی عبدالعزیز ایک غیور پٹھان نے اپنی قسمت آزمائی۔ مذکورہ نوجوان رمضہ علاقہ غزنی افغانستان کا رہنے والا تھا اور بغرض تجارت ہندوستان چلا آیا تھا۔ لاہور میں آریہ سماجی کتب فروش پر جھپٹا گر اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اقدام قتل کے سبب انہیں سات سال قید سخت کی سزا دی گئی۔ ازاں بعد اس فتنے کا سدباب غازی علم الدین شہیدؒ کے ہاتھوں ہوا۔

4- غازی محمد حنیف شہید نے اپنی بے مثال وفاؤں کا باب مسلم ریاستی دارالحکومت ''بھوپال'' میں رقم کیا۔ کہا جاتا ہے وسط ہند کے اس تہذیبی شہر میں ایک گرلز ہائی سکول کی انگریز ہیڈ مسٹریس نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت مدرسہ کی صفائی کے بہانے قرآن کریم کے بوسیدہ اوراق ایک خاکروب کے ہاتھوں کوڑے میں ڈلوائے اور جب اس پر احتجاج کیا گیا تو اس بدزبان و بد نصیب عورت نے قرآنِ پاک' دینِ متین اور پیغمبر اسلام (ﷺ) کے بارے میں نازیبا اور اشتعال انگیز الفاظ کہے۔ بھوپال کے ایک غیرت مند نوجوان محمد حنیف نے جو پیشے کے اعتبار سے قصاب تھے' انگریز عورت کو راستے میں روک لیا اور اس سے کہا کہ وہ اپنی اس ناپاک جسارت اور شیطانی حرکت پر شہر کے مسلمانوں سے معافی مانگے اور اعلانِ توبہ کرے۔ حکومت کے نشہ میں چُور اس بنتِ ابلیس نے یہ مطالبہ ٹھکرا دیا اور مجاہد ملت کے ہاتھوں انجام کو پہنچی۔ غازی محمد حنیف اس غلط کار عورت کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر تھانے میں حاضر ہو گئے۔ اقبالِ فعل کیا اور تمام عدالتوں میں اعترافِ حقیقت بیان فرمائی۔ کچھ عرصہ جیل میں گزارا۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی اور محمد حنیف غازی کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔

5- ضلع گجرات کے معروف قصبہ منڈی بہاؤالدین سے نزدیکی گاؤں ''آہلہ'' میں بھی ایک سکھ گستاخ رسول کو جہنم رسید کیا گیا تھا۔ قاتل کا نام غازی محمد اعظم تھا جو بفضلہٖ تعالیٰ بقید حیات ہیں۔

بناء بریں سرگودھا روڈ پر واقع پنڈی بھٹیاں کے علاقہ میں ذخیرہ بیرانوالہ سے ملحقہ بستی چک کوکارہ میں بھی اس طرز کا ایک تاریخی واقعہ پیش آیا۔قاتل ومقتول ہم جماعت تھے۔ہندو طالب علم نے شانِ رسول (ﷺ) میں ارتکاب گستاخی کیا اور مسلمان مجاہد نے نہایت سوچ سمجھ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔کم عمری کی بناء پر عدالتی سزا سے بچ نکلے اور ابھی زندہ ہیں۔

-6 پکا قلعہ حیدرآباد (سندھ) میں قیام پاکستان سے فقط ایک برس قبل 1946ء میں ہندو جن سنگھیوں کا ایک بڑا اجتماع ہوا تھا۔اس میں آٹھ دن دس ہزار ہندو شریک تھے۔مذکورہ جلسے میں ملت اسلامیہ کو نہ صرف غلیظ گالیاں دی گئیں بلکہ ان کے ایک گرو نینوں مہاراج نے' نبی اکرم (ﷺ) کی شان مبارک میں بھی گستاخانہ باتیں کیں۔اس بات نے تین نمبر تالاب کے مسلمان نوجوانوں کو بے تاب کردیا۔جب یہ پچیس نوجوان حرمت نبی (ﷺ) پر اپنی جانیں نچھاور کرنے کا جذبہ لیے قلعہ پر حملہ آور ہوئے اور نعرۂ تکبیر بلند کیا تو جلسے میں بھگدڑ مچ گئی۔عاشقان مصطفیٰ (ﷺ) نے بے تحاشہ ڈنڈے اور لاٹھیاں برسانا شروع کردیں۔ اسی اثناء میں نینوں مہاراج' ایک جوشیلے نوجوان عبدالخالق قریشی ولد محمد ابراہیم قریشی کے سامنے آ گیا۔نوجوان نے اس بے غیرت ملیچھ کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔وار کاری ثابت ہوا اور شاتم رسول اپنے ہی پیروکاروں کے درمیان تڑپ تڑپ کر جہنم رسید ہوگیا۔جن سنگھی بدحواس ہوکر اپنی لاٹھیاں' جوتیاں' تلواریں' اور دوسرے ہتھیار چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔اس واقعے میں حصہ لینے والے چند معلومہ خوش قسمت اشخاص مندرجہ ذیل ہیں:
حاجی محمد بخش عرف موشیدی' اللہ ورایو شیدی' محمد علی شیدی' علی مراد شیدی' لکھانو الوٗ صدیق گودڑ' نبی بخش عرف نبوٗ مہر محمد عرف مہرل' اللہ ڈنو شیدی' رحیم بخش ابراہیم حجام' عبدالخالق قریشی' لالہ مجیدی پسٹروی۔

-7 گستاخ آریہ سماجی "لیکھر ام" کو بھی کسی نامعلوم مسلمان نے سرگباش کیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ مرزا قادیانی نے بھی اس ملعون کی ہلاکت کی پیشین گوئی بعض مصلحتوں کے پیش نظر داغی تھی۔یہی وجہ ہے کہ پولیس کی تفتیش میں مرزا قادیانی پر تحریکِ قتل اور اعانت کا شبہ ہوا اور اس کی خانہ تلاشی بھی لی گئی مگر کوئی ثبوت بہم نہ پہنچ سکا۔حقیقت حال یہ ہے کہ اس مردود کا قاتل بھی کوئی مسلمان ہی ہوسکتا ہے۔مرزائیوں کا' تحفظ ناموس رسالت سے کیا واسطہ؟ وہ تو خود تحریک شاتم رسول کی ایک کڑی ہیں۔الغرض مرزا قادیانی کی پیشین گوئی اس سوچ کا تجرباتی مظہر نظر آتی ہے کہ غیرت مند مسلمان اس ناپاک وجود کو برداشت نہیں کرسکیں گے'

لہٰذا کیوں نہ الہامی دعوے آزما لیں۔

-8 4-اپریل 1935ء کو ہندوستان کے مسلم اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ یکم اپریل کو بمبئی میں ایک باغیرت مسلمان ...... نے ایک ہندو...... کو ہلاک کردیا اور پولیس کے سامنے بیان دیا کہ مقتول نے ایک مقامی ورنیکلر اخبار میں حضرت رسول اکرم (ﷺ) کی عکسی تصویر شائع کر کے اس کے جذبات مجروح کیے تھے۔

-9 28 اپریل 1935ء کے اخبار میں ایک اور خبر نمایاں تھی کہ ملتان شہر میں 14 اپریل کو سات بجے شام مسمّی ''ویر بھان'' آریہ سماج نے حضور ختمی مرتبت آقائے دو جہاں (ﷺ) کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے۔ آج بعد دوپہر آریہ سماجی مذکور کو ساڑھے تین بجے گلی گردھاری لال اندرون پاک دروازہ میں کسی نامعلوم شخص نے پیٹ میں چھرا اتار کر ہلاک کردیا۔ شبہ قتل میں محمد بخش چوب تراش، حاجی فیض بخش، حاجی عبداللہ اور الٰہی بخش کو گرفتار کرلیا گیا۔ ازاں بعد عدم ثبوت کی بناء پر عدالت سے رہا ہوئے۔

-10 جہلم شہر میں دریا کے کنارے واقع شمالی محلّہ کے ایک مسلمان غازی غلام محمد شہید کی سرگزشت بھی قابل ذکر ہے۔ ان کے مقدر جاگنے کی تفصیل کچھ یوں ہے ''شہنشاہ دو عالم (ﷺ) کی ولادت باسعادت کا مبارک دن تھا۔ ہر طرف خوشیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ کائنات کی نعمت کبریٰ کے وُرُود مسعود پر کون شکر ادا نہ کرتا، اس روز بھی اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم پر پوری ملت اسلامیہ سربسجود تھی۔ اظہار مسرت کے طور پر عید میلاد کا اک جلوس تشکیل دیا گیا۔ فرزندان توحید کا یہ قافلہ مذکورہ بالا شہر کے کسی چوراہے سے گزر رہا تھا۔ قریب ہی سکھوں کی آبادی تھی۔ سکھ مت کا ایک آوارہ پیروکار اہل سنگھ پارچہ فروش آوازے کسنے لگا۔ یہ مجاہد اس کے نزدیک کھڑا نہ صرف تمام اوچھی حرکات دیکھ رہا تھا بلکہ زہر میں بجھے ہوئے اس کے بے باکانہ جملے بھی سنائی دے رہے تھے۔ اسی اثناء میں جلوس کے پیچھے گدھے پر سوار کوئی لڑکا دکھائی دیا، اب کے وہ انتہائی گمراہ کن ولرزہ خیز الفاظ بک رہا تھا۔ اس نے زور سے چلا کر کہا'' وہ دیکھو مسلمانوں کا نبی براق پر چڑھ کر آ گیا ہے۔'' ان سے رہا نہ گیا، بعجلت اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور کہا کہ'' بے غیرت کتے اپنی زبان کو قابو میں رکھ ورنہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دوں گا'' مگر وہ اپنی ذلیل حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ غازی غلام محمد نے غصہ کی حالت میں اپنا چاقو اس کے سینے میں گھونپ دیا اور پے در پے وار کیے۔ بجرم قتل آپ کی گرفتاری عمل میں آئی۔ عدالت میں مقدمہ چلا اور سزائے موت کے

مستحق ٹھہرایا گیا۔آپ جنازگاہ جہلم کے قریب مشہور قبرستان میں مدفون ہیں۔''

11- 1942ء میں لکھنؤ چھاؤنی میں ایک سکھ میجر ہر دیال سنگھ کو شعائر اسلامی کا مذاق اڑانے اور تضحیک کرنے کی پاداش میں ایک مسلمان فوجی بابو معراج الدین نے قتل کر دیا تھا۔''

شہدائے ملتان' تھانہ کپ:

ملتان شہر کے ایک تھانہ (کپ) کے سب انسپکٹر غلام مصطفیٰ نے (جس کے متعلق لوگوں کی رائے تھی کہ یہ مرزائی ہے) 18 جولائی 1952ء کو عوام کے ایک جلوس پر لاٹھی چارج کیا تھا۔ عوام نے تھانہ کے سامنے جمع ہو کر پاکستان کے وزیر خارجہ مرتد چوہدری ظفر اللہ خان کے خلاف احتجاج کیا' تو اس مجمع پر بلا وارننگ گولی چلا دی گئی۔ دس منٹ تک ستر (70) راؤنڈ چلائے گئیں جس کے نتیجے میں چھ (6) مسلمان شہید ہوئے اور زخمیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ اس خونی واردات کے خلاف سارے پاکستان میں یوم احتجاج منایا گیا۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ بخاری نے 25 جولائی 1952ء کو شہدائے ملتان کو حسب ذیل الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

''جب مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کر کے اسلام کے بنیادی عقیدہ کو گزند پہنچانے کی ناپاک کوشش کی تو حضرت صدیق اکبرؓ نے اس کاذب و مفتری سے کسی قسم کا مناظرہ کر کے دعویٰ نبوت کے جواز میں دلیل طلب نہیں کی۔ اگر کیا تو یہ کہ سات ہزار سے زائد حافظ قرآن صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین ناموسِ رسالت ﷺ اور تاج و تختِ ختم نبوت پر قربان کر دیئے اور اس طرح مسلمانوں کی متاعِ دین و ایمان کو ایک عیار اور مکار کی دست برد سے بچا لیا۔ اور آئندہ کے لیے ملت اسلامیہ کو سبق دیا کہ جو شخص اس قسم کی ناپاک کوشش کرے' اس کے لیے اسلام اور ملت اسلامیہ کا فیصلہ کیا ہے؟

ملتان کے غیور اور صاحب ایمان مسلمانوں نے بھی اس دورِ پُر آشوب میں جبکہ کفر و ارتداد کی سیاہ گھٹاؤں نے ایمان و یقین کو پریشان کر رکھا ہے اسلام کی لاج رکھ لی' اور اپنے جگر گوشوں کو شمعِ رسالت پر پروانہ وار نثار کر کے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان آج بھی فخر دو عالم ﷺ کی عزت و ناموسِ گولیوں کی بارش میں مسکرا سکتا ہے۔

رتبہ شہید ناز کا گر جان جایئے
قربان جانے والے کے قربان جایئے

خدا کی نعمتیں نچھاور ہوں تم پر اے شہیدانِ ناموسِ رسالت' سلام ہو تم پر اے ختم المرسلین ﷺ

کی عزت و آبرو پر قربان ہونے والو مبارک ہیں ان کے والدین کہ ان کے نذرانے سرکارِ رسالت مآب ﷺ میں شرف قبولیت حاصل کر گئے۔

یوں تو اس دنیا میں ہزاروں بچے جنم لیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ہزاروں کلیاں کھلتی ہیں اور بادِ سموم کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر مرجھا جاتی ہیں' مگر وہ موت جو حق اور راستی کی راہ میں آئے حیاتِ جاوداں بن کر آتی ہے۔

جو موت آئے تو زندگی بن آئے
قضا کی نرالی ادا چاہتا ہوں

تحریکِ ختم نبوت 1974ء:

اس تحریک میں تینتیس شمع رسالت ﷺ کے پروانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

(ہفت روزہ ''لولاک'' فیصل آباد ص 5 جلد نمبر 15 شمارہ نمبر 16,37 فروری 1979ء)

مولانا شمس الدین شہیدؒ:

حضرت مولانا شمس الدین شہیدؒ 1945ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محمد زاہد فورٹ سنڈیمن کے نامور عالمِ دین شمار کیے جاتے ہیں۔ مولانا شمس الدین مرحوم نے میٹرک کے بعد مختلف دینی مدارس میں دینی تعلیم کی تکمیل کی۔ آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی' مولانا محمد یوسف بنوری' مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک اور مولانا سرفراز خان صفدر مدظلہ العالی سرفہرست ہیں۔ دورۂ حدیث 1969ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے کیا۔ جس وقت مولانا شمس الدین رحمۃ اللہ نصرت العلوم گوجرانوالہ میں تعلیم مکمل کر رہے تھے' چند نوجوان مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں جمع ہوئے تاکہ اس امر پر غور کیا جائے کہ ملک کے طالب علم نوجوانوں میں دینی جذبہ اجاگر کیا جائے اور ایک ایسا متحدہ پلیٹ فارم قائم کیا جائے تاکہ ملک میں اسلامی نظام کے لیے عملی جدوجہد کی جائے۔ کافی غور و خوض کے بعد جمعیت طلبائے اسلام کا قیام عمل میں لایا گیا' اور ملک کے دوسرے صوبوں میں کنوینر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اجلاس میں جب صوبہ بلوچستان کا نام آیا تو اس مدرسہ کا نوجوان طالب علم جس کی پیشانی سے عزم و ہمت کے سوتے پھوٹ رہے تھے' کھڑا ہوا اور کہا کہ بلوچستان کی ذمہ داری میں اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ ان کی اس پیشکش کو قبول کر لیا گیا اور اس نوجوان کو بلوچستان کا پہلا کنوینر مقرر کر دیا۔ یہ وہ نوجوان تھا جو بعد میں ''شمس الدین شہید'' کے نام سے تاریخ بلوچستان میں جگمگا رہا ہے......

مولانا شمس الدین شہیدؒ نے جن محاذوں پر خاص طور پر کام کیا' ان میں ایک محاذ مرزائیت کا

بھی ہے۔انہوں نے جمعیت طلبائے اسلام کے جیالوں سے مل کر بلوچستان سے مرزائیت کا جنازہ نکال دیا تھا۔ 1973ء میں جب قادیانیوں نے انتہائی دجل وفریب کے ساتھ قرآن کے معنی ومفہوم میں ملحدانہ تحریف کر کے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے بطور خاص شائع کیے تو مولانا کی غیرتِ ایمانی جوش میں آئی۔ آپ نے مطالبہ کیا کہ قرآن شریف کے تحریف شدہ نسخے کو فوراً ضبط کیا جائے اور قادیانیوں کو فوراً یہاں سے نکال دیا جائے۔ حکام نے اسے معمولی بات سمجھ کر ٹالنے کی کوشش کی۔ اس ناپاک حرکت پر فورٹ سنڈیمن کے غیور مسلمان سراپا احتجاج بن گئے۔ عوام نے اپنے عقائد کی کھلم کھلا توہین کے خلاف احتجاج کے لیے 15 جولائی 1973ء کو ایک مقامی پارک میں جلسہ عام کا اعلان کر دیا۔ عوام عملی کارروائی کرنے پر زور دے رہے ہیں۔ اس دوران ایک قادیانی مسلمانوں کے جوش اور غضب کا نشانہ بنا اور جہنم رسید ہوا' اس موقع پر مولانا شمس الدین شہید' مولانا محمد خان شیرانی اور صاحبزادہ نورالحق سمیت 36 سرکردہ حضرات رضاکارانہ طور پر گرفتاری کے لیے پیش ہوئے اور کئی راتیں تھانے میں گزاریں۔

(ہفت روزہ ختم نبوت' ص 13-14 جلد نمبر 8 شمارہ نمبر 20,44 تا 26 اپریل 1990ء)

کوئٹہ سے ژوب آتے ہوئے بگٹی کے مقام پر مولانا شمس الدین مردہ پائے گئے۔ ملک گل حسن کے پٹرول کی گاڑی اس وقت وہاں سے گزر رہی تھی۔ انہوں نے ژوب اطلاع کر دی کہ مولوی صاحب موٹر میں مردہ پڑے ہیں۔ کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے۔ لوگ وہاں گئے اور انہیں ژوب لے آئے۔ یوں بھٹو حکومت کی شرارت پر 13 مارچ 1974ء کو مولانا شمس الدین نے جام شہادت نوش کر لیا۔ گھر لانے پر سب گھر والوں' عزیز واقارب اور دوستوں نے انہیں شہید ہونے پر مبارکباد دی۔ 14 مارچ 1974ء کو ہزاروں اشکبار آنکھوں نے انہیں رخصت کیا۔ انہیں دفن کرنے کے بعد ان کی قبر پر پھولوں کی بارش ہوئی۔ ان کے خون سے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔

(ماخوذ از ژوب میں تحریک ختم نبوت ایک نظر میں بحوالہ
تحریکِ ختم نبوت 1974ء ص 761 از مولانا اللہ وسایا صاحب)

شہدائے ساہیوال 1984ء:

26 اکتوبر 1984ء جامع رشیدیہ ساہیوال کے مدرس اور مولانا حبیب اللہ فاضل رشیدی کے عزیز الحاج حافظ بشیر احمد حبیب کو اطلاع ملی کہ مرزائی مشن روڈ پر واقع اپنی عبادت گاہ میں اذان دیتے ہیں۔ چنانچہ 26 اکتوبر کی صبح کو قاری صاحب مذکور اپنے چند ساتھیوں سمیت تحقیق حال کے لیے موقع پر گئے۔ جب صبح کی اذان کی آواز آئی تو مذکور اور پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کے طالب علم اظہر رفیق نے قادیانیوں کی عبادت گاہ کے مین گیٹ سے جھانک کر دیکھنا چاہا کہ کون اذان دے رہا ہے تاکہ اس کے

خلاف صدارتی آرڈی ننس (امتناع قادیانیت) کی خلاف ورزی پر قانونی کارروائی کی جائے۔ اس اثناء میں قادیانی غنڈوں نے فائرنگ کر کے قاری بشیر احمد حبیبؒ اور اظہر رفیق کو موقع پر شہید کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

اس خونی واقعہ کی اطلاع پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ پورا شہر جامعہ رشیدیہ میں جمع ہو گیا اور شہر میں مکمل ہڑتال ہو گئی۔ نمازِ جنازہ کا عظیم اجتماع ہوا' جلوس نکلے' جلسے ہوئے' انتظامیہ نے کئی ایک علمائے کرام کو گرفتار کر لیا۔ اخبارات کے نمائندوں کو سختی سے پابند کر دیا گیا کہ وہ اس خبر کو شائع نہ کریں۔ اس عظیم حادثہ کے بعد پورا ملک سراپا احتجاج بن گیا۔ ملزموں کی گرفتاری اور ان کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے مطالبات شروع ہو گئے۔ اس صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے مرکزی مجلس عمل کا ہنگامی اجلاس ساہیوال طلب کر لیا گیا۔

(ہفت روزہ ختم نبوت ص18 جلد نمبر11 شمارہ نمبر45-7 تا13 مئی 1993ء)

ہفت روزہ ختم نبوت کراچی نے اپنے اداریہ میں مسئلہ ختم نبوت اور قادیانی جارحیت کے انسداد سے متعلق مندرجہ ذیل تجاویز اور مطالبات پیش کیے:

1- قادیانی معابد میں بہت سی جگہ اب بھی اذان ہوتی ہے۔ (ساہیوال کا سانحہ اس کی روشن دلیل ہے) یہ نہ صرف شعائر اسلامی کی توہین ہے' بلکہ ملکی قانون کی بھی تضحیک ہے۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے اس کا احساس کریں۔

2- قادیانی معابد سے کلماتِ طیبہ اور آیاتِ قرآنی ہٹائی جائیں۔

3- ربوہ سے کراچی تک قادیانی مراکز میں وافر مقدار میں اسلحہ موجود ہے' ان مراکز پر چھاپہ مار کر اسلحہ ضبط کیا جائے۔

4- قادیانی اخبارات ورسائل کے ڈیکلریشن منسوخ کیے جائیں۔

5- مرزا قادیانی اور اس کی ذریت کا لٹریچر جو سراسر کفر وارتداد کا پلندہ ہے' اسے ضبط کیا جائے۔

6- قاری بشیر احمد حبیب شہید اور اظہر رفیق شہید کے قاتلوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

محمد عباس شہیدؒ:

محمد عباس شہید بچیانہ کے نواحی گاؤں چک نمبر563 گ ب کے رہائشی تھے' جنہیں جولائی 1989ء میں قادیانی غنڈوں نے حملہ کر کے شہید کر دیا تھا۔

(ہفت روزہ ختم نبوت ص16 جلد نمبر8 شمارہ نمبر11-25 تا30 اگست 1989ء)

سردار احمد خان شہیدؒ:

یہ نوجوان چک سکندر 30 کھاریاں (چک باسریاں اسے چک کا نا بھی کہا جاتا ہے) کے رہائشی تھے۔ گاؤں میں عید کے روز اور اس کے دو دن بعد تک لوگ قربانی کے جانور ذبح کرتے رہے۔ قربانی کے جانوروں کی کھالیں جمع کرنے کے لیے مسلمان نوجوانوں کا ایک گروپ گاؤں میں چکر لگا رہا تھا۔ وہ سب معاہدے کے مطابق نہتے تھے' قادیانیوں نے خفیہ طور پر سازش کر رکھی تھی اور وہ مسلح ہو کر ایک چوبارے میں بیٹھے تھے' جب یہ نوجوان ان کی زد میں آئے تو انہوں نے آتشیں اسلحہ کے فائر کھول دیئے۔ نتیجۃً ایک مسلمان نوجوان سردار احمد خان شہید ہو گیا اور دوسرے زخمی ہوئے۔ محمد امیر اصل ہدف تھا مگر اسے اللہ نے بچا لیا۔

(ہفت روزہ ختم نبوت ص 18 جلد نمبر 8 شمارہ نمبر 13-8 تا 14 ستمبر 1989ء)

شہدائے جامع مسجد منزل گاہ سکھر:

جامع مسجد منزل گاہ سکھر پر قادیانیوں کا دستی بموں سے حملہ 2 مسلمان شہید' 12 زخمی' شہر میں مکمل ہڑتال' جنازہ میں ڈیڑھ لاکھ شیدائیان ختم نبوت کی شرکت۔

سکھر۔ تفصیلات کے مطابق جامع مسجد منزل گاہ میں صبح فجر کی نماز ہو رہی تھی کہ ایک کار اور دو موٹر سائیکلوں پر سوار قادیانیوں نے مسجد کی شمالی جانب سے دو بم پھینکے جس سے مدرسہ کا ایک طالب علم حافظ منظور احمد اور ایک نمازی ملک نور احمد موقع پر شہید ہو گئے جبکہ 12 افراد زخمی ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ مسلح قادیانی مدرسہ کے مہتمم اور شیخ الحدیث مولانا محمد مراد کو قتل کرنا چاہتے تھے' جو شدید زخمی ہیں۔ اس حادثہ فاجعہ کی اطلاع آناً فاناً پورے شہر میں پھیل گئی تو ہزاروں کی تعداد میں مسلمان جمع ہو گئے۔ جمعہ میں شہداء کی نماز جنازہ ادا کی گئی' جس میں ایک لاکھ سے زیادہ فدائیان ختم نبوت نے شرکت کی۔ پورا شہر بند ہو گیا۔ جمعۃ المبارک کے اجتماعات میں اس مرزائی غنڈہ گردی پر غم و غصہ کا اظہار کیا گیا کہ قاتلوں کو فی الفور گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔

(ہفت روزہ ختم نبوت ص 17 جلد نمبر 11 شمارہ نمبر 46-14 تا 20 مئی 1993ء)

شہیدانِ ناموس رسالت ﷺ و شہدائے ختم نبوت کا پوری امت پر احسان ہے کہ انہوں نے اپنی لاشوں سے بند باندھ کر آنے والی نسلوں کو دریائے ارتداد میں غرق ہونے سے بچا لیا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں بھی ان شہدائے ناموس رسالت ﷺ کی راہوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین



تحریکِ ختم نبوت 1953ء

مولانا تاج محمودؒ

پاکستان میں خواجہ ناظم الدین کا دور اقتدار تھا۔ دستور پاکستان کی تدوین زیر بحث تھی۔ حکمران اپنی شخصی حکومتوں کی عمریں لمبی کرنے کے لیے ملک کو دستور دینے میں ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ بالآخر خواجہ ناظم الدین کے زمانے میں دستور کے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ (بی' پی' سی رپورٹ) شائع ہوئی۔ اس رپورٹ میں ملک کے لیے جداگانہ طریقہ انتخاب تجویز کیا گیا تھا۔ اقلیتوں کی نشستیں الگ مخصوص کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اقلیتوں کی تعداد اور ان کے ناموں کا نقشہ بھی اس رپورٹ میں شائع کیا گیا۔ دکھ کی بات یہ تھی کہ قادیانیوں کو مسلمانوں میں شمار کیا گیا تھا۔ حالانکہ پہلے سے ہی مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ مرزائیوں کو مسلمانوں میں شامل نہ کیا جائے بلکہ ان کو علیحدہ غیر مسلم اقلیتوں میں شمار کیا جائے۔

اس رپورٹ کے آنے کے کچھ دنوں بعد دسمبر 1952ء میں چنیوٹ میں سالانہ ختم نبوت کانفرنس تھی۔ انہی دنوں مرزائی جماعت کا بھی ربوہ میں سالانہ جلسہ جسے وہ ظلی حج سمجھتے ہیں' انعقاد پذیر تھا۔ ان دنوں مرزائی جماعت کا سربراہ مرزا بشیر الدین محمود تھا جس نے پہلے سے اعلان کر رکھا تھا کہ "1952ء کے ختم ہونے سے پہلے پہلے ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ احمدیت کے تمام دشمن ہمارے قدموں میں آگریں۔"

28,27,26 دسمبر کو چنیوٹ کی ختم نبوت کانفرنس ہے۔ 1952ء کے گزرنے میں تین دن باقی ہیں۔ مرزا بشیر الدین کا ''اعلان'' ناکام ہو گیا ہے۔ مرزائیت کے احتساب کا شکنجہ مزید کس دیا گیا ہے۔ مرزا بشیر الدین کے اعلان کا جواب دیتے ہوئے حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے پُرجوش الہامی تقریر کرتے ہوئے فرمایا ''کہ اے مرزا محمود 1952ء تیرا تھا اور اب 1953ء میرا ہوگا۔'' اس سے قبل مرزائیوں کی جارحانہ ارتدادی سرگرمیوں کے باعث پورے ملک کے مسلمانوں میں شدید اشتعال تھا۔ پوری پاکستانی مسلمان قوم مرزائیت کی جارحیت پر فکرمند تھی۔ اسی ختم نبوت کانفرنس چنیوٹ کے موقع پر ایک بند کمرے میں جماعت کے رہنماؤں کا ایک خصوصی غیر رسمی اجلاس منعقد ہوا جس میں مجھے بھی شامل ہونے کی سعادت حاصل ہے۔ اجلاس میں طے پایا کہ مرزائیوں کی جارحیت دماغ کی خرابی کی حد تک پہنچ گئی ہے، جس کا سدباب کرنا ضروری ہے۔ بی' پی' سی رپورٹ کی رو سے خدا اور رسول ﷺ کے نام پر حاصل کردہ ملک کے دستور میں مرزائیوں کو مسلمان شمار کیا جا رہا ہے۔ اس لیے حکومت کے ساتھ مذاکرات کیے جائیں۔ اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن حکومت کے رویے سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ وہ راہِ راست پر نہیں آئے گی لہٰذا تمام مکاتب فکر کے علماء کو اس مہم میں شریک کیا جائے۔ موسم سرما ختم ہوتے ہی ان کا اجلاس بلایا جائے اور آئندہ کے لائحہ عمل پر سوچ بچار کر کے فیصلے کیے جائیں۔

میں اُن دنوں ایم سی ہائی سکول لائلپور میں صدر مدرس تھا۔ چنیوٹ کی اس میٹنگ میں مجھے شیخ حسام الدین اور مولانا محمد علی جالندھری نے حکم دیا کہ تم یا تو سکول کی ملازمت سے استعفیٰ دے دو یا پھر یہ کہ لمبے عرصہ کی چھٹی لے لو تا کہ قادیانیت کے اس فتنہ سے امت کو بچانے کے لیے نئے مرحلہ میں آزادی کے ساتھ کام کر سکو۔ چنانچہ میں نے چھٹی لے لی۔

پورے ملک میں تمام رفقاء نے تمام مکاتب فکر کے علماء و مشائخ سے رابطہ قائم کر کے ان کو قادیانیت کے مسئلہ کی سنگینی کی طرف توجہ اور ذمہ داری کا احساس دلایا۔ جنوری 1953ء کے آخر میں آل پارٹیز مرکزی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کا ایک اجلاس کراچی میں منعقد ہوا' جس میں فیصلہ ہوا کہ خواجہ ناظم الدین پر اتمامِ حجت کے لیے ایک ماہ کا نوٹس دیا جائے۔ اگلے روز ایک وفد سر سینہ شریف (مشرقی پاکستان) کی قیادت میں خواجہ ناظم الدین سے ملا' اور یہ مطالبات پیش کیے:

1- مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

2- سر ظفر اللہ خان مرتدِ اعظم کو وزارتِ خارجہ سے ہٹایا جائے۔

3- ربوہ کو کھلا شہر قرار دیا جائے۔

4- مرزائیوں کو کلیدی عہدوں سے برطرف کیا جائے۔

خواجہ صاحب نے وفد سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ظفر اللہ خان کو ہٹانے اور مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے سے امریکہ پاکستان سے ناراض ہو جائے گا اور ہر قسم کی امداد بند کر دی جائے گی۔

وفد نے ایک تحریری نوٹس ان کو پیش کیا جس میں درج تھا کہ اگر حکومت نے ایک ماہ کے اندر ہمارے یہ خالصتہً دینی مطالبات تسلیم نہ کیے تو اسلامیانِ پاکستان مرزائی جارحیت کے خلاف راست اقدام کرنے پر مجبور ہوں گے اور مجلس عمل کی قیادت میں تحریک چلائی جائے گی۔

اواخر فروری 1953ء میں دوبارہ آل پارٹیز مرکزی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کا کراچی میں اجلاس منعقد ہوا۔ چونکہ حکومت نے مطالبات تسلیم نہیں کیے تھے' اس لیے تحریکِ راست اقدام چلانے کے فیصلہ پر عملدر آمد کا اعلان کیا گیا۔

تفصیل یہ طے کی گئی کہ پانچ پانچ رضا کاروں کے دو دستے یومیہ مظاہرہ کرنے کے لیے سڑکوں پر نکلیں۔ پانچ رضا کاروں کا ایک دستہ خواجہ ناظم الدین کی کوٹھی پر جا کر مظاہرہ کرے۔ اور دوسرے پانچ رضا کاروں کا دستہ ملک غلام محمد گورنر جنرل کی کوٹھی پر جا کر مظاہرہ کرے۔ دو دستوں کے جانے کا فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ صرف خواجہ ناظم الدین کی کوٹھی پر جا کر مظاہرہ کرنے سے تحریک کے دشمن یہ تاثر نہ دے سکیں کہ یہ تحریک مغربی پاکستان کے لوگ بنگالی وزیراعظم کے خلاف چلا رہے ہیں۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ جلوس پُر رونق اور پر ہجوم راستوں اور سڑکوں سے نہ جائیں تا کہ ٹریفک میں رکاوٹ کا مسئلہ پیدا نہ ہو اور حکومت کو شر انگیزی کرنے کا موقع میسر نہ آئے۔

27 فروری کی رات کو مجلسِ عمل کے تمام رہنما جن میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادریؒ عبدالحامد بدایونیؒ' مولانا لال حسین اخترؒ' سید مظفر علی شمسیؒ اور دوسرے بیسیوں رہنما شامل تھے' کراچی میں گرفتار کر لیے گئے۔

28 فروری کو پنجاب اور ملک کے دوسرے حصوں میں سینکڑوں رہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاری عمل میں آئی۔

28 فروری کو لائلپور میں دوسرے شہروں کی طرح مجلسِ عمل کی اپیل پر ان رہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف تاریخ ساز ہڑتال کی گئی۔ دھوبی گھاٹ میں لاکھوں انسانوں کا اجتماع منعقد ہوا۔ حضرت مولانا مفتی محمد یونس مراد آبادی' مولانا حکیم حافظ عبدالمجید' صاحبزادہ ظہور الحق' سید صاحبزادہ افتخار الحسن' مولانا عبیداللہ اور بندہ تاج محمود دیگر حضرات کے بیانات ہوئے۔ لوگوں نے ہر قسم کی قربانیاں دینے کا عہد کیا۔ اگلے روز تحریک شروع ہوگئی۔ لائلپور مجلس عمل کا صدر بندہ تاج محمود کو بنایا گیا۔

قادیانیت کے خلاف مسلمانوں کا جوش و جذبہ قابل دید تھا۔ چہار طرف سے تحریک کے الاؤ کو روشن کرنے کے لیے مسلمان اپنی جانوں کا نذرانہ تک دینے کو تیار تھے۔ حکومت نے دھوبی گھاٹ پر قبضہ کرلیا۔ ہم نے تحریک کا مرکز لائلپور کی مرکزی جامع مسجد کچہری بازار کو بنالیا۔ شہر اور ضلع بھر کے دیہات سے ہزاروں رضا کار جمع ہونا شروع ہوگئے۔ مسجد اور اس کی بالائی منزل رضا کاروں سے بھرنے لگی۔ صبح نو بجے اور تین بجے مسجد میں جلسے ہوتے' سو رضا کاروں کا دستہ صبح اور سو رضا کاروں کا دستہ سہ پہر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرتا' جلوس اس شان سے نکلتا کہ اس پر فرشتے بھی رشک کرتے ہوں گے۔ محمد عربی ﷺ کی ذاتِ اقدس کے حوالہ سے چلنے والی تحریک میں رضا کاروں' کارکنوں' رہنماؤں غرضیکہ ہر عام و خاص کا جذبہ عشقِ ختم نبوت ﷺ قابل دید تھا۔ ہر آدمی بازی لے جانے اور شفاعت محمدی ﷺ کا پروانہ حاصل کرنے کے لیے بیتاب تھا۔

کچھ دنوں تک تو حکومت رضا کاروں کو گرفتار کرتی رہی لیکن بعد میں چند رضا کاروں کو گرفتار کرلیا جاتا اور اکثر رضا کاروں کو بسوں میں بٹھا کر تیس چالیس میل دور لے جا کر جنگلوں میں چھوڑ دیا جاتا۔

میرا دفتر جامع مسجد کی اوپر کی منزل پر قائم تھا۔ ہر روز رات کو دس گیارہ بجے کے قریب کرفیو کے اوقات میں نکلتا' ساتھ میرے عزیز دوست فیروز اقبال کا گھر ہے' وہاں جاتا' بچیاں کھانا لاکر دیتیں' دو چار لقمے زہر مار کرتا یہاں تک تو میرے معتمد خاص کو علم ہوتا تھا کہ مولانا اس وقت کہاں ہیں۔ یہاں سے رات کے اندھیرے اور کرفیو کی حالت میں اکیلے چھپتے چھپاتے اپنی بہن کے گھر واقع کچی آبادی مال گودام کے دوسری طرف پہنچتا۔ یہ سفر میرے لیے انتہائی کٹھن ہوتا' ذرا سی آہٹ کا جواب گولی ہوسکتا تھا۔ ایک اور دوست کے ہاں جانا ہوتا یا پھر اپنی مسجد ریلوے کالونی میں آکر تھوڑی دیر آرام کرتا۔ صبح فجر کی اذان سے پہلے کچہری بازار کی مسجد میں واپس آجاتا۔ رضا کاروں کے ساتھ نماز پڑھتا۔ ہر روز میرا یہی معمول تھا۔

میرے دو شاگرد' ایک ڈپٹی کمشنر کا سٹینو گرافر تھا اور دوسرا پولیس کے دفتر میں ملازم تھا۔ ان دونوں کا ذہن اور قلب و جگر تحریکِ مقدس ختم نبوت کے ساتھ تھا۔ وہ ہر روز عشاء کی نماز کے بعد آتے اور خفیہ حکومتی ارادوں پروگراموں کی رپورٹ سے مجھے مطلع کرتے۔ ان میں سے ایک آج کل فیصل آباد کے معروف ایڈووکیٹ ہیں۔ دوسرے اللہ رب العزت کو پیارے ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کریں کہ وہ تحریک کے لیے بہت مخلص تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ آج آپ کے جلوس کے ساتھ ایک کی بجائے دو مجسٹریٹوں کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ میں حیران ہوا کہ ہمارا تو روز کا معمول ہے اور

حکومت کا بھی کہ ایک مجسٹریٹ ہوتا ہے۔ آخر یہ دو مجسٹریٹوں کی کیوں ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ دوسرا یہ کہ ہمارا جلوس تو دن کو ہوتا ہے اس وقت تمام رضا کار سوئے ہوتے ہیں' رات کو جلوس اور مجسٹریٹوں کی ڈیوٹی یہ کیا ماجرا ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ جلوس کون نکالے گا' کہاں سے آئے گا۔ میں نے اپنے معتمد خاص سے کہا کہ آج رات مسجد کے تمام دروازے اچھی طرح بند کر کے تالے لگا دیں' اور نصیحت کر دیں کہ رات کو کوئی رضا کار ہرگز باہر نہ جائے۔ میں یہ ہدایت دے کر باہر آ گیا' حسب معمول اقبال فیروز کے گھر گیا' کھانا سامنے رکھا گیا کہ جلوس کے نعروں کی آواز سنائی دی۔ میں متوجہ ہوا۔ ہجوم مرزائیت مردہ باد اور ختم نبوت زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا مسجد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مسجد کے قریب آ کر جلوس نے مسجد کے دروازوں کو بند پایا۔ اردگرد کا چکر لگایا۔ جب چکر لگا کر چترال ہاؤس کے قریب آیا تو یکدم فائر کی آواز سنائی دی۔ میں حیران تھا کہ یہ لوگ کون ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں۔ گولی کس نے چلائی؟ گولی کس کو لگی ہے؟ کون زخمی ہوا؟' کون مرا؟ کہیں اس میں میرے رضا کار تو شریک نہیں۔ میں واپس مسجد آیا' رضا کاروں کے بارے میں دریافت کیا معلوم ہوا کہ ہمارا کوئی رضا کار اس میں شریک نہ تھا۔ مگر باہر گولی لگنے سے چار' پانچ آدمی جاں بحق اور بہت سارے زخمی ہوئے۔ ہم لوگ پوچھتے' کچھ پتہ نہ چلتا۔ کافی عرصہ گزر گیا۔ میں گرفتار ہوا' قید ہوئی۔ قید کاٹ کر رہا ہو کر بھی آ گیا۔ مگر یہ راز نہ کھلا۔

یہ انکشاف اس وقت ہوا' کہ وہ کون تھے؟ جنہوں نے اس رات جلوس نکالا تھا۔ اور پولیس نے ان کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا تھا۔

ہوا یوں کہ شہر کے ایک شخص کو قتل کے مقدمہ میں سیشن کورٹ سے سزائے موت ہوئی۔ ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ سے بھی مقدمہ خارج ہوا۔ صدر نے رحم کی اپیل مسترد کر دی۔ سزائے موت پر عملدرآمد کا وقت قریب آیا تو سپرنٹنڈنٹ جیل نے آخری خواہش پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ میں ایک راز سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں کہ میں اس مقدمہ قتل میں بے قصور ہوں مگر یہ سزائے موت جو مجھے دی جا رہی ہے' یہ فلاں رات تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں جلوس نکال کر چار' پانچ نوجوانوں کو موت کی آغوش میں دھکیلنے کی پاداش میں پا رہا ہوں۔ اس نے انکشاف کیا کہ پولیس کی سازش سے یہ جلوس نکالا گیا۔ پولیس کی پلاننگ یہ تھی کہ میں (سزائے موت پانے والا) محلہ کے چند بچوں اور نوجوانوں کو اکٹھا کر کے جلوس نکالوں۔ نعرے لگاتے ہوئے مسجد میں آئیں۔ وہاں طے شدہ پروگرام کے مطابق جلوس کے گرد چکر لگائے۔ نعرے بازی کرے' اسی اثناء میں مجلس کے رضا کار جلوس میں شامل ہو جائیں گے۔ پولیس ان میں سے چند کو گولیوں کی بوچھاڑ سے ٹھنڈا کر دے گی۔ باقی رضا کار خوف زدہ ہو کر دب جائیں گے اور یوں تحریک کو ٹھنڈا کر دیا جائے گا۔ میں ان بچوں کو ڈگلس پورہ اور اس کے اردگرد سے مٹھائی

کا لالچ دے کر لایا گیا تھا۔ اور جلوس کی شکل میں وہاں لا کر پولیس کے لیے تر نوالہ۔ کیا' ن کا یہ قتل میرے ذمہ ہے۔ میں اس قتل کی سزا پا رہا ہوں۔

یہ تھی دوسری بار گولی چلنے کی داستان۔ اس سے قبل بھی لائلپور میں گولی چلی تھی۔ میرے ایک سو کے قریب رضا کار لائلپور سے کراچی جا رہے تھے۔ جیسے ہی ٹرین روانہ ہوئی فوراً ہی سٹیشن کی حدود سے نکلنے سے پہلے ہی روک لی گئی' اور رضا کاروں کو منتشر ہونے کا حکم دیا گیا۔ رضا کار ڈٹ گئے۔ ان کے پاس ڈنڈے تھے اور پولیس کے پاس گولی تھی۔ پولیس نے اندھا دھند فائرنگ کی' بیسوں رضا کار شہید ہو گئے۔ کئی لاشیں پولیس نے موقع سے اٹھا کر غائب کر دیں۔ ہمارے ہاتھ پانچ لاشیں آئیں۔ جب اس اندوہناک واقعہ کی اطلاع ملی' میری کمر ٹوٹ گئی۔ میرے سامنے کربلا کی فلم چلنے لگی۔ غم سے نڈھال ہو گیا۔ وحشت عود کر آئی۔ دل آنسو بہا رہا تھا۔ دماغ پھٹنے کو ہو گیا۔ ضمیر بے رحم حکمرانوں کو کوس رہا تھا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ اقبال کا یہ مصرع ڈھارس بندھا رہا تھا:

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

لاشیں سٹیشن سے مسجد میں لائی گئیں۔ چار کی شناخت ہو گئی' ان کے لواحقین کو اطلاع کر دی گئی' وہ آ گئے۔ ہم نے سب لاشوں کو غسل دیا۔ کفن کا انتظام کر کے شہر میں اعلان کرا دیا کہ صبح ساڑھے نو بجے دھوبی گھاٹ اقبال پارک میں نماز جنازہ پڑھائی جائے گی۔ جنازہ کی چارپائیوں کے ساتھ بڑے بڑے بانس باندھ کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو آخری کندھا دینے کی سعادت حاصل کرنے کا انتظام کیا گیا۔ جنازے اٹھا کر جلوس کی شکل میں دھوبی گھاٹ لائے گئے۔ جنازہ پڑھنے کے لیے سارا شہر امڈ آیا تھا۔ اردگرد کے دیہاتوں کے لوگ بھی بہت بڑی تعداد میں جنازہ میں شریک ہوئے۔ اتنا بڑا ہجوم لائلپور کی تاریخ میں کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہاں بڑے بڑے لیڈر آئے۔ ان کے جلوس میں نے بچشم خود دیکھے مگر اتنا رش اس سے پہلے اور اس کے بعد آج تک نہیں دیکھا۔ گراؤنڈ پوری بھر چکی تھی' باہر کی تمام سڑکیں بھر چکی تھیں۔ گورنمنٹ کالج کی طرف جھنگ روڈ تک صفیں تھیں۔ ادھر بھوانہ بازار سامنے نالہ کی چھت پر اور اس کے پیچھے گلیوں تک اجتماع تھا۔ بھلا اندازہ کیجئے کہ جن شہیدوں کو رخصت کرنے والے اتنے لوگ ہوں گے' ان کی آگے خدا تعالیٰ کے دربار میں کیسی پذیرائی ہوئی ہو گی۔

میں مجلسِ عمل تحفظ ختم نبوت لائلپور کا صدر تھا۔ حضرت مولانا مفتی محمد یونس' مولانا حکیم حافظ عبدالمجید نابینا' صاحبزادہ ظہور الحق' مولانا محمد صدیق' صاحبزادہ سید افتخار الحسن' مولانا محمد یعقوب نورانی' مولانا عبدالرشید اشرف اور دیگر حضرات مجلسِ عمل کی عاملہ کے رکن تھے۔ مجلس عاملہ کے پہلے ہی اجلاس

میں فیصلہ کرلیا گیا تھا کہ باقی سب حضرات رضا کاروں کے دستوں کی قیادت کرتے ہوئے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کریں گے۔ لیکن میں (مولانا تاج محمود) تحریک کو جاری اور منظم رکھنے کے لیے گرفتاری نہ دوں۔ مجلسِ عمل کا دفتر جامعہ مسجد کی بالائی منزل پر تھا۔ کم وبیش پانچ ہزار رضا کار گرفتاری دینے کے لیے اپنی باری کے انتظار میں مسجد میں جمع رہتے تھے۔ صبح وشام دو سو رضا کار یومیہ گرفتاری دے رہے تھے۔ جامع مسجد میں جلسہ ہوتا تھا۔ ہر طرف ختم نبوت کی بہاریں ہی بہاریں تھیں۔ یہ سلسلہ پندرہ بیس دن جاری رہا' پندرھویں یا سولہویں دن یہاں کے ڈپٹی کمشنر سبط حسن کے حکم سے مسجد کی بجلی و پانی منقطع کر دیا گیا۔

دوسرے روز جامع مسجد میں جلسہ ہوا۔ میں نے پانی وبجلی کے منقطع کرنے پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ ''سبط حسن تم سید ہو' اور اس فرقہ سے تعلق رکھتے ہو جو 1350 سال سے کربلا میں پانی کی بندش اور حضرت حسینؓ کی شہادت کا ہائے حسینؓ ہائے حسینؓ کہتے ہوئے ماتم کرتا ہے۔ کم ازکم تیرے لیے یہ مناسب نہ تھا۔ اگر تیری ماں کو مسجد کے پانی وبجلی کے منقطع کرنے کے تیرے اس کارنامے کا علم ہوتا تو وہ تیرا نام سبط حسن کی بجائے ابن یزید رکھتی۔''

اس تقریر کی رپورٹ پہنچنے پر میجر سبط حسن ڈی سی لائلپور میرا ذاتی و جانی دشمن ہو گیا اور اس نے حکم دے دیا کہ مجھے بہر طور گرفتار کرلیا جائے۔ پہلے نرمی اور حکمت عملی سے پھانسنا چاہا۔ رانا صاحب ایس پی جو تحریک سے پہلے کے میرے جاننے والے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے دفتر بلوایا کہ آپ سے ایک ضروری امر پر مشورہ کرنا ہے۔ میں صورت حال کو بھانپ گیا اور میں نے تعلقات کے باوجود ان کے دفتر میں جانے کو پسند نہ کیا۔ پھر میاں مظفر اے ڈی ایم جو میرے اور مولانا عبیداللہ احرار کے مشترکہ دوست تھے' وہ تشریف لائے اور مجھے کچہری بازار کے ایک ہوٹل میں بلوایا کہ مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں ان کے دھوکہ میں بھی نہ آیا اور ملنے سے انکار کر دیا۔ اسی وقت اطلاع ملی کہ اے ایس پی نے ہمارے گرفتار شدہ رضا کاروں کو جیل کے دروازے پر ڈنڈوں اور بیدوں سے پٹوایا ہے۔ ہم نے اگلے روز پھر جلسہ کیا اور ڈی سی' ایس پی سے مطالبہ کیا کہ اے ایس پی کو یہاں سے چلتا کیا جائے' ڈیوٹی سے ہٹایا جائے۔ اور اگر ایسا نہ کیا گیا اور یہ قتل ہو گیا تو ہماری ذمہ داری نہ ہوگی۔ اسی رات کو ہی پولیس نے چنیوٹ بازار میں گولی چلا کر کئی مسلمانوں کو خاک وخون میں تڑپا دیا تھا۔ جب میں ان کے چکر میں نہ آیا تو انہوں نے مجھے گرفتار کرنے کے لیے مسجد میں بوٹوں سمیت پولیس کو داخل ہونے کا حکم دینے کا فیصلہ کیا۔ 19,18,17 مارچ پورے تین روز بغیر کسی وقفہ کے شہر میں کرفیو نافذ رہا۔ پورے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ کرفیو کے دوران مجھے ہر قیمت پر گرفتار کرنے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ میں 20 مارچ کو

رات ایک بجے چک نمبر 67 نزد گلبرگ سے گرفتار ہوا۔ راجہ نادر خان میری گرفتاری کے وقت پولیس کے ہمراہ شامل تھے۔

20 مارچ 1953ء کو گرفتاری عمل میں آئی۔ جون 1954ء میں تقریباً سوا سال بعد رہا ہوا۔ گرفتار کرنے کے بعد پہلی رات مجھے لائکپور کی حوالات میں رکھا گیا۔ دوسری رات تین بجے صبح لائکپور سے لاہور شاہی قلعہ میں منتقل کیا گیا۔ یہاں پر تفتیش شروع کی گئی۔ تفتیش کا مقصد یہ تھا کہ حکومت جاننا چاہتی تھی کہ اس تحریک کے مقاصد کیا ہیں۔ اس تحریک میں کسی بیرونی ملک یا طاقت کا ہاتھ ہے؟ یہ تحریک ملک کے خلاف قومی سازش ہے؟ یا وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ قادیانیوں کی وہ کونسی چیزیں ہیں جن کا اتنا شدید ردعمل ہوا۔ ایک لاکھ سے زائد لوگوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ تمام جیل خانے بھر گئے۔ بڑی بڑی جیلوں میں کیمپ لگانے پڑے۔ مختلف لوگوں کو مختلف المیعاد سزائیں دی گئیں۔ سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند رکھا گیا۔ ہزاروں مسلمان شہید ہوئے۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟

مجھے پہلی دفعہ قلعہ جانے کا اتفاق ہوا۔ میں ان کی تفتیش کی تکنیک سے ناواقف تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں تاریک تہہ خانوں میں رکھیں گے۔ ظلم وتشدد کے پہاڑ توڑیں گے۔ جب بھی قلعہ کا ذکر آتا ہے اس وقت ظلم وتشدد کی داستانیں ذہن میں ابھرتی ہیں۔ اس کے برعکس صاف ستھری بارکوں میں رکھا گیا۔ سلاخ دار دروازے تھے۔ پانی بجلی موسم کے مطابق' کمبل وغیرہ ہر چیز مہیا تھی۔ ایک ماہ میں میری معلومات کے مطابق تحریک کے کارکنوں پر تشدد تو درکنار انگلی تک نہ اٹھائی گئی۔ بلکہ ذہنی کرب اور فکری کوفت و پریشانی میں ان کو اس طرح مبتلا کیا گیا کہ اس ذہنی تکلیف کے سامنے بیسیوں قسم کے تشدد کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

مثلاً مجھے پہلے دن بارک نمبر 10 میں فردوس شاہ ڈی ایس پی کے قاتل اشرف کاکا کے ساتھ رکھا گیا۔ اشرف کاکا کے متعلق مشہور تھا کہ اس نے فردوس شاہ ڈی ایس پی کو قتل کیا ہے۔ پولیس نے اسے گرفتار کیا' اس سے فردوس شاہ کے ریوالور کی برآمدگی ڈالی گئی۔ چونکہ یہ نوجوان کئی دنوں سے قلعہ کی اس کوٹھڑی میں تنہا بند تھا' دماغی لحاظ سے ماؤف سا دکھائی دیتا تھا۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ یہ قتل کا مجرم ہے' اور لائکپور میں جو لوگ پولیس کی گولی سے جان بحق ہوئے ان کے قتل کے جرم کی پاداش میں آپ پر بھی 302 کا مقدمہ چلایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص نو گرفتار قفس ہوا اسے ذہنی طور پر اذیت پہنچانے کے لیے یہ بات کافی تھی۔

1- اب میری تفتیش شروع ہوئی۔ مجھ پر الزام لگایا کہ کسی بیرونی ملک کا روپیہ تحریک کے لیے آتا رہا ہے اور وہ آپ کو بھی ملتا رہا ہے۔

-2 آپ کی تحریک کے لیڈر دولتانہ صاحب سے ملے ہوئے ہیں۔ دولتانہ صاحب کا کوئی آدمی آپ کو لائلپور ہدایت دیتا رہا۔

-3 افغانستان کے کوئی مشکوک لوگ آ کر آپ سے ملے تھے' ان سے آپ کی کیا گفتگو ہوئی۔ انہوں نے آپ کو کیا دیا تھا؟

-4 آپ مسجد کی بالائی منزل پر جن کمروں میں رہتے تھے وہاں کافی اسلحہ بھی پہنچا ہوا تھا۔ یہ اسلحہ آپ کو کس نے پہنچایا تھا؟

-5 گوجرانوالہ کے پہلوان رضاکاروں کا ایک جتھہ آپ سے اس مسجد میں ملا تھا۔ یہ جتھہ ربوہ میں مرزائیوں کے سربراہ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ آپ نے ان کو کیا ہدایت دیں؟

-6 جو لوگ پولیس کی گولیوں سے مارے گئے' وہ آپ کی ہدایت پر پولیس کے مقابلے میں نکلتے تھے۔

-7 آپ نے ٹرینیں رکوائی تھیں' لائن اکھڑوائی تھی۔ اور بعض جانداروں کو نذر آتش کرایا تھا۔

-8 اس کی کیا وجہ تھی کہ مرکزی مجلسِ عمل نے رضاکاروں کے دستے لاہور بھیجنے کی آپ کو ہدایت کی تھی۔ لیکن آپ نے لائلپور کے سربراہ کی حیثیت سے ان کا رخ کراچی کی طرف کیوں موڑ دیا تھا؟

غرضیکہ اس طرح کے بے سروپا جھوٹ اور افترا پر مبنی الزامات کی ایک طویل فہرست مجھے پڑھ کر سنادی گئی' جن کو سن کر میرا ابتدائی تاثر یہ تھا کہ ہم جناب رسول مقبول ﷺ کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے جانوں پر کھیل رہے ہیں اور یہ ہم پر کس طرح کے جھوٹے الزامات عائد کر رہے ہیں۔ صبح کے وقت یہ کارروائی ہوئی۔ انسپکٹر پولیس جو میری تفتیش پر مامور تھا جس کا نام دماغ سے نکل گیا ہے' اس نے یہ الزامات عائد کر کے مجھے کہا کہ آپ ان سوالات کے جواب تیار رکھیں' شام پانچ بجے ملاقات ہوگی۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ پورے آٹھ روز تک نہ آیا۔ میں مسلسل ان الزامات کو جھوٹا اور بے بنیاد ثابت کرنے اور اصل صورتحال بتانے کی تیاری کرتا۔ لیکن رات کو نیند تک نہ آتی۔ غنودگی بھی طاری ہو جاتی۔ یادِ الٰہی کی جو کیفیت اور تجلیات و برکات قلعہ کے ایام اسیری میں محسوس کی' پھر وہ عمر بھر نصیب نہ ہو سکی۔ جب آٹھویں دن صبح کو اٹھا تو میرا دل و دماغ نئی سلیٹ کی طرح صاف تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں کچھ نہ سوچوں گا۔ موقع پر جو سوالات کریں گے' صحیح صحیح جوابات دے دوں گا۔

ابھی یہ فیصلہ ہی کیا تھا کہ انسپکٹر صاحب آ دھمکے اور معذرت کرنے لگے کہ میں کسی ضروری

کام سے باہر چلا گیا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں تمہارے ہتھکنڈوں سے ناواقف تھا۔ اس لیے ذہنی کوفت میں رہا۔ تشریف لائیے' پوچھیے میں بتائے دیتا ہوں۔ مجھے حوالات سے نکال کر بارک میں لے گئے۔ ہتھکڑی بھی نہیں لگائی۔ پھل کے خالی کریٹ کو اوندھا کر کے مجھے اس پر بٹھا دیا گیا۔ ان سوالوں کا جواب صحیح صحیح دینا ہے۔ کوئی غلط جواب نہ دیں اور یہ یاد رکھیں کہ یہ شاہی قلعہ ہے۔ یہاں سے آپ کی چیخ و پکار بھی باہر نہیں جاسکتی اور نہ ہی آپ کی مدد کو کوئی بلند و بالا دیواریں پھلانگ کر اندر آ سکتا ہے۔ یہ اس کے تمہیدی کلمات تھے۔

اب سوالات شروع ہوئے' میں مختصر جواب دیتا رہا۔ جب مالیات کے متعلق سوال کیا کہ کس کس شخص نے کیا کیا مدد کی۔ کل کتنا روپیہ تھا۔ کتنا کہاں صرف ہوا' باقی کہاں ہے۔ مجھے لائکپور میں معلوم ہوگیا تھا کہ جن مخیر حضرات کی تحریک میں مالی معاونت کا حکومت کو علم ہو جاتا ہے اس کی شامت آ جاتی ہے اس لیے میں نے جان خطرے میں ڈال کر کہا کہ یہ شعبہ میرے پاس نہیں ہے۔ میری رہائش شہر سے میل ڈیڑھ میل باہر ہے میں شہر کے لوگوں کو زیادہ جانتا بھی نہیں' اس نقطے پر مجھے بڑی کوفت ہوئی' بڑی اذیت کا سامنا کرنا پڑا مگر میں نے ثابت قدمی کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا۔ غرضیکہ پوری ہسٹری شیٹ تیار کی۔ صبح کے چھ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک مختلف وقفوں سے یہ عمل جاری رہا۔ گیارہ بجے رات تھک چور ہو کر حوالات میں آ کر نماز پڑھی' نیند نے آ دبوچا۔ صبح فجر کی نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ انسپکٹر صاحب آ دھمکے اور بڑی معصومیت اور مصنوعی طور پر مایوسی کا اظہار کرتے اور چہرہ بناتے ہوئے کہا کہ میری اور آپ کی کل کی ساری محنت ضائع ہوگئی۔ وہ دستاویزات میرے سائیکل کے کیریئر پر سے گھر جاتے ہوئے راستہ میں گر گئیں۔ آیئے اور کل والا بیان پھر لکھوایئے تاکہ میں اوپر افسران کو بھیج سکوں۔ میں پھر کل والی بارک میں پہنچایا گیا۔ وہیں دوبارہ پھر سارا بیان لکھوایا۔ بعض مقامات ایسے تھے جہاں میں نے معلومات بہم پہنچاتے ہوئے احتیاط سے کام لیا تھا۔ آج بعض اور مقامات پر احتیاط کی گئی۔ کل والی احتیاط کا خیال دماغ میں نہ رہا۔ رات گیارہ بجے پھر فراغت ہوئی اور مجھے میری حوالات میں پہنچا دیا گیا۔ ضروریات و فرائض سے فارغ ہوا گہری نیند کل کی طرح سو گیا' تیسرے روز ابھی نماز صبح سے فارغ ہوا ہی تھا کہ پھر انسپکٹر صاحب آ دھمکے اور کہا کہ ستم ہو گیا وہ آپ کا پرسوں کا بیان میرے میز کی دراز میں رہ گیا تھا۔ وہ بھی مل گیا لیکن اب جو میں نے آپ کے دونوں بیانات کو پڑھا ہے تو ان میں تضاد و اختلافات ہیں۔ چنانچہ ان تضادات کو رفع کریں۔ مثلاً میں نے پہلے بیان میں کہا کہ میں نے شاہ جی سے متاثر ہو کر 1932ء میں احرار میں شمولیت اختیار کی۔ دوسرے بیان میں' میں نے 48,47ء بتایا۔ اب اس نے کہا کہ ان میں سے کون سی بات صحیح ہے۔ میں نے کہا کہ رسمی طور پر تو 32ء سے شامل تھا

باضابطہ طور پر 48,47ء میں شامل ہوا۔ غرضیکہ مسلسل اس قسم کی پورا دن کھینچا تانی جاری رہی۔

چوتھے روز اصغر خان ڈی آئی جی قلعہ نے وہ زبان استعمال کی' دلخراش خرافات کا ریکارڈ توڑ دیا۔ مسلسل ہتھکڑی لگا کر صبح 6 بجے سے رات 11 بجے تک کھڑا کیا گیا' کمر کا درد ہمیشہ کا ساتھی بن گیا۔ قلعہ کے دن بڑے سخت تھے۔ اشرف کا کا کو وعدہ معاف گواہ بنا کر مولانا عبدالستار خان نیازی کو فردوس شاہ کے قتل میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر وہ انکاری رہا۔ اشرف کا کا بڑا بہادر انسان تھا۔ تین سال جیل کاٹ کر ملتان سے رہا ہو کر میرے پاس آیا۔ بعد میں پھر ملاقات نہ ہو سکی نہ معلوم کہ اب وہ زندہ ہے یا انتقال کر گیا۔ جس حالت میں ہے اللہ تعالیٰ اسے سلامت رکھے!

شاہی قلعہ کے بعد دس دن سبی کی حوالات میں گزارے۔ یہ دن میرے لیے پہلے سے زیادہ اذیت ناک اور تکلیف دہ تھے۔ کیونکہ حوالات سماج دشمن عناصر سے بھری پڑی تھی۔ پھر چند دن کے لیے لاہور سنٹرل جیل میں بھیج دیا گیا' یہاں سے بالآخر کیمبل پور (اٹک) جیل بھیج دیا گیا۔ بقیہ ایام اسیری یہاں گزارے۔ قلعہ اور اٹک جیل میں مزید سیاسی رہنماؤں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی' مولانا عبدالستار خان نیازی' مولانا عبدالواحد گوجرانوالہ' چوہدری ثناء اللہ بھٹہ' حکیم حافظ عبدالمجید نابیناء' آغا شورش کاشمیری کا ساتھ رہا۔

میرے پیچھے میرے گھرانے پر جو صعوبتیں آئیں' وہ بڑی دلخراش کہانی ہے بقول غالب ؎

ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو اس کی خزاں نہ پوچھ

گھر کا سارا سامان حکومت ضبط کر کے لے گئی۔ چند چیزیں مال خانہ میں جمع کرا کر باقی سامان پولیس نے مال غنیمت سمجھ کر آپس میں تقسیم کر لیا۔ ریلوے والوں نے تنخواہ بند کر دی۔ شہر والے سمجھتے رہے کہ مولانا ریلوے کے بادشاہ ہیں۔ اور ریلوے والے سمجھتے رہے کہ مولانا شہر کے بادشاہ ہیں۔ بچوں کو خاصی پریشانی رہی۔ بہر حال جیسے کیسے وقت گزر گیا ؎

بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

رہائی کے بعد ریلوے والے گزشتہ ایام کی پوری تنخواہ لائے۔ میں نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ میری عدم موجودگی میں میرے بچوں کو رقم کی زیادہ ضرورت تھی اس وقت تو آپ نے دی نہ' اب تو میں آ گیا ہوں۔ میری عدم موجودگی میں جس ذات باری تعالیٰ نے انتظام کیا۔ وہ اب میری موجودگی میں بھی اس کا اہتمام کر لے گی۔ وہ دن جائے آج کا دن آئے پھر کبھی ریلوے والوں سے مسجد کی

خطابت کی تنخواہ نہ لی۔

تحریک ختم نبوت کے بارے میں حکومت کا رویہ

حکومت انفرادی ملاقاتوں میں تسلیم کرتی تھی کہ ہمارا موقف درست ہے۔ لیکن پبلک کے سامنے انکار کرتی تھی۔ اصل میں بدقسمتی یہ تھی کہ مرکز میں خواجہ ناظم الدین برسراقتدار تھے۔ قادیانیت کا مرکز پنجاب میں تھا' جہاں دولتانہ برسراقتدار تھے۔ ملک کا دستور زیر ترتیب تھا۔ دستور میں یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ صوبہ سرحد' پنجاب' سندھ' بلوچستان اور مشرقی بنگال' اس لحاظ سے بنگال کا حصہ پانچویں بھائی کا بنتا تھا۔ اور مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کی آبادی کچھ زیادہ تھی اس لیے دوسرا موقف یہ تھا کہ ملک کے سیاسی و معاشی آدھے حقوق مغربی پاکستان کے ہیں اور آدھے مشرقی پاکستان کے۔ یہ تمام بحثیں بنگالی و پنجابی رہنماؤں کے درمیان تلخیاں پیدا کر رہی تھیں۔ خواجہ ناظم الدین کو بنگال کا نمائندہ سمجھا جا رہا تھا۔ اور دولتانہ کو پنجابیوں کا لیڈر گردانا جا رہا تھا۔ یہ بحثیں ابھی جاری تھیں کہ تحریک ختم نبوت ملک میں زور پکڑ گئی۔ مرزا بشیر الدین ان دنوں سخت اشتعال انگیز بیان دے رہا تھا۔ اس کا یہ اعلان بھی شامل تھا کہ 1952ء گزرنے سے پہلے ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ دشمن ہمارے پاؤں پر گرنے پر مجبور ہو جائے۔ اور پھر یہ بیان کہ وہ وقت آنے والا ہے جب اقتدار ہمارے پاس ہوگا اور ہم دشمنوں کے ساتھ چوڑھے چماروں کا سا سلوک کریں گے۔

مرزا محمود کے ان بیانات نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ملک میں تحریک بھڑک اٹھی۔ جب گرفتاریاں شروع ہوئیں تو مرکزی حکومت کے رہنماؤں خصوصاً بنگالی قائدین نے اس تحریک کو دولتانہ کی تحریک کا نام دیا کہ وہ خواجہ ناظم الدین اور مرکزی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے علماء کو اکسا کر کراچی بھیج رہے ہیں' اور پورے ملک کے امن کو تہہ و بالا کیا ہوا ہے' حالانکہ خود دولتانہ تحریک ختم نبوت کے رہنماؤں کے مقابلہ میں تحریک کی مخالفت کے لیے جگہ جگہ دورے کر رہے تھے۔ کئی جگہ ان کے جلسے بدامنی کا شکار ہو گئے۔ کئی جلسوں میں ان پر سوالات کی ایسی بوچھاڑ ہوئی کہ ان کے لیے جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔ وہ خود مشکل میں پھنسے ہوئے تھے۔ پنجاب مسلم لیگ تحریک کی دشمن تھی۔ اس لیے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ تحریک کے معمولی رہنماؤں کے جلسے میں لاکھوں افراد پہنچ جاتے تھے اور اس کے برعکس لیگ یا دولتانہ کا جلسہ ہوتا تو چند گنے چنے مسلم لیگی' ڈیوٹی والے پولیس کے ٹاؤٹ اور سادہ کپڑوں میں پولیس کے لوگ ہوتے۔ اس کیفیت سے مسلم لیگ خائف تھی کہ اگر تحریک کو کچلا نہ گیا تو آنے والے الیکشن میں مسلم لیگ مجلس احرار کے ہاتھوں بری طرح شکست کھا جائے گی لیکن دوسری طرف ناظم الدین اور اس کے ساتھی

پنجاب کی ساری صورت حال کی ذمہ داری مسلم لیگ پر ڈالتے رہے اور جو کچھ وہ تحریک کے خلاف کر رہے تھے اس کو دولتانہ کی مکاری وعیاری سمجھتے رہے۔ یہ بات کہ ختم نبوت کی تحریک کے لیڈروں نے دولتانہ صاحب کے اشارے پر ناظم الدین کو گرانے کے لیے یہ تحریک شروع کی تھی۔ تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ اور اس پر مزید یہ کہ ناظم الدین اور اس کی مرکزی حکومت کے علاوہ منیر انکوائری کورٹ نے بھی مرکزی حکومت کے موقف کو تسلیم کیا۔ تحریک اور تحریک کے رہنماؤں کو بدنام کرنے اور ان کی کردار کشی کرنے اور انہیں ذلیل کرنے کی پوری کوشش کی گئی جس کا فائدہ مرزائیوں یعنی فریقین کے دشمن کو پہنچا۔ منیر نے اپنی رپورٹ میں علماء کی کردار کشی کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست پاکستان کے علماء اسلام کی متفقہ تعریف نہیں کر سکے۔ یہ لکھ کر دنیائے عیسائیت کے ہاتھ میں اسلام کے خلاف ایک بڑا دستاویزی ثبوت مہیا کر دیا حالانکہ یہ تحریک علماء اور مسلمانوں کے اپنے نیک جذبات اور اخلاص پر مبنی تھی اور اس کا باعث مرزا بشیر الدین کے اشتعال انگیز بیانات اور مرزائیوں کی جارحانہ ارتدادی سرگرمیاں تھیں۔

مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی سیاست کا اس میں دخل نہ تھا نہ بنگالی پنجابی کی حمایت یا مخالفت میں کچھ کیا جا رہا تھا۔ دولتانہ کو جو وفود ملتے رہے اس میں ان کے ان الفاظ کو اس جھوٹ کے پلندے کی بنیاد بنایا گیا۔ دولتانہ کا یہ کہنا تھا کہ آپ کے چار مطالبات ہیں:

1- مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔
2- ظفر اللہ خاں مرتد قادیانی کو وزارت خارجہ سے ہٹایا جائے۔
3- مرزائیوں کو کلیدی عہدوں سے برطرف کیا جائے۔
4- ربوہ کو کھلا شہر قرار دیا جائے۔

جہاں تک پہلے تینوں مطالبات کا تعلق ہے وہ مرکزی اسمبلی سے متعلق ہیں جس کے ہم بھی ممبر ہیں۔ ان مطالبات کو آپ وہاں پیش کرائیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم آپ کے مطالبات کی تائید میں ووٹ دیں گے۔

البتہ آپ کا یہ مطالبہ کہ ربوہ کو کھلا شہر قرار دیا جائے یہ پنجاب حکومت سے متعلق ہے۔ اس پر میری حکومت غور کرنے اور تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے۔ مجلسِ عمل کے وفود اور دولتانہ کی گفتگو کو سازش کا نام دیا گیا۔ اور اس جھوٹ کی بنیاد پر تمام جھوٹ کی عمارت کھڑی کی گئی۔

چنانچہ اس کے بعد مجلسِ عمل کا اجلاس کراچی میں ہوا۔ خواجہ ناظم الدین سے وفود کی ملاقات ہوئی اور ان سے صاف کہا گیا کہ ہمارے تین مطالبات کا تعلق آپ کی وزارت کا بننا اور قومی اسمبلی سے

ہے۔ آپ ہمارے مطالبات تسلیم کریں' اور قومی اسمبلی میں مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرارداد پیش کریں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ مجلسِ عمل کے وفود کئی بار خواجہ ناظم الدین سے ملتے رہے اور ملاقاتوں میں خواجہ ناظم الدین نے مطالبات تسلیم نہ کرنے کے دوسرے دلائل دیئے' حالانکہ اس کے دل میں شبہ یہ تھا کہ یہ وفود دولتانہ منظم کر کے بھیج رہا ہے۔ آخری مرتبہ جب مجلس عمل کا وفد مشرقی پاکستان کے پیر سرسینہ شریف کی قیادت میں خواجہ ناظم الدین سے ملا' بحث مباحثہ کے بعد وفد نے ایک ماہ کا تحریری الٹی میٹم دیا۔ اس پر ناظم الدین نے پیر سرسینہ شریف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''پیر صاحب یہ مطالبات ماننا میرے بس میں نہیں ہے۔ اگر میں ظفر اللہ خاں مرتد قادیانی کو وزارت سے نکال دوں تو امریکہ پاکستان کو ایک دانہ گندم کا بھی نہ دے گا۔'' پھر اسی گفتگو کو ناظم الدین نے منیر انکوائری کمیشن میں بھی دُہرایا۔ یہ جملہ منیر انکوائری رپورٹ میں موجود ہے۔

دکھ کی بات یہ ہے کہ خواجہ ناظم الدین' دولتانہ اور مسلم لیگی لیڈروں کے انجام کو دیکھنے کے بعد بھی کچھ پڑھے لکھے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ تحریک خواجہ ناظم الدین کو پریشان کرنے کے لیے دولتانہ کے ایماء پر چلائی گئی تھی۔ ہم اس کی تردید میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ **لعنۃ اللّٰہ علی الکاذبین۔**

تحریک کے زمانہ میں کوہ مری میں حکومت کا اجلاس تھا۔ بعض بدبخت مسلم لیگی رہنما وزراء تحریک کے رہنماؤں کو قتل کرنے کے فیصلے کر رہے تھے اور رب العزت کی شان بے نیازی کہ وہاں ایک نیک سیرت کمشنر صاحب ای یو خان بھی تھے جنہوں نے اس تجویز کی نہ صرف مخالفت کی' بلکہ اس کے نقصانات گنوا کر مسلم لیگی وزیروں کو قائل کیا کہ اس اقدام کے بعد آپ بھی نہ بچ سکیں گے۔ اس روایت کے راوی مولانا قاضی احسان شجاع آبادیؒ تھے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو جنہوں نے تحریک کی کسی بھی درجہ میں حمایت کی جزائے خیر دیں۔ جو مخالف تھے ان کا کیا انجام ہوا' یہ بڑی عجیب و غریب داستان ہے۔

تحریک کے مخالفوں کا انجام

اگرچہ تحریک قہراً کچل دی گئی اور حکمران بظاہر ظفریاب ہوئے' لیکن لاکھوں مسلمانوں کا جیلوں میں جانا' ہزاروں مسلمانوں کا خاک و خون میں تڑپ کر شہید ہونا' چھوٹے چھوٹے بچوں کا سینوں پر گولیاں کھانا اللہ تعالیٰ کے ہاں ہرگز ضائع نہیں ہو سکتا تھا۔ اور نہ ہی قدرت نے ان لوگوں کو معاف کیا'

جنہوں نے معصوم و مظلوم مسلمانوں پر ستم ڈھائے تھے۔ سردار عبدالرب نشتر مرحوم نے ایک تقریب میں آغا شورش کاشمیری مرحوم سے فرمایا۔ شورش جو لوگ خوش ہیں کہ تحریکِ ختم نبوت کچل دی گئی' وہ احمق ہیں۔ ہم میں سے جس شخص نے اس مقدس تحریک کی جتنی مخالفت کی تھی اتنی سزا اسے قدرت نے اس دنیا میں دے دی ہے اور ابھی عاقبت باقی ہے۔ تحریک کے سب مخالفین روح کے سرطان میں مبتلا ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تحریک ختم نبوت کی مخالفت کرنے والے' اس کو کچلنے والے' ظلم کرنے اور بیگناہوں کا خون بہانے والوں کو قدرت نے دنیا ہی میں اس کی عبرتناک سزا دی۔

ملک غلام محمد

ملک کے اس وقت گورنر جنرل تھے' اس وقت اربابِ اقتدار کے اس گروہ کے سرغنہ تھے جو تحریک کا دشمن اور مخالف تھا۔ پھر انہوں نے تحریک کے بعد اپنے رشتہ دار جسٹس منیر کو انکوائری کمیشن کا چیئرمین بنا کر وہاں علماء اور اہل حق کی تذلیل کا سامان کیا۔ اس غلام محمد کو فالج ہوا۔ مفلوج حالت میں نہایت ذلت کی زندگی کا آخری حصہ گزارا۔ اس کی آخری زندگی ایک ذلیل جانور سے بھی بدتر ہو گئی۔ مرنے کے بعد لوگوں نے اسے چوڑھوں کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ آج کوئی مسلمان اس کی قبر پر نہ سلام کہتا ہے اور نہ دعائے مغفرت۔

سکندر مرزا

دوسرے نمبر پر تحریک کا دشمن سکندر مرزا تھا۔ یہ تحریک کے دنوں میں ڈیفنس سیکرٹری تھا۔ مرزائی سیکرٹریوں سے مل کر تحریک کو تباہ کرنے کے درپے ہوا۔ حتیٰ کہ جب پنجاب حکومت لوگوں کے احتجاج اور قربانیوں سے زچ ہو گئی تو حکومت پنجاب نے ریڈیو پر اعلان کر دیا کہ لوگوں کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ حکومت پنجاب کے دو نمائندے مرکزی حکومت کے پاس مطالبات منوانے کے لیے جا رہے ہیں۔ سکندر مرزا نے اس وقت خواجہ ناظم الدین کو مجبور کر کے اور اونی پونی اجازت لے کر لاہور فوج کے حوالے کرا دیا اور کرفیو لگوا دیا۔ جنرل اعظم نے ظلم کی انتہا کر دی اور اس سے بھی بڑھ کر میجر ضیاء الدین قادیانی نے تو یہاں تک کیا کہ مرزائی نوجوانوں کو فوجی جیپوں میں سوار اور مسلح کر کے فوجی وردی کے ساتھ شہر میں گشت کے لیے بھیج دیا اور حکم دیا کہ جہاں کہیں مسلمانوں کا اجتماع دیکھیں اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں' جیسا کہ منیر انکوائری رپورٹ میں پنجاب اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے۔ سکندر مرزا پر بھی خدا کی گرفت آئی۔ اس کا جوان بیٹا جو ایئر فورس کا آفیسر تھا' جہاز تباہ ہونے سے بھسم ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد ایوب خان کمانڈر انچیف نے سکندر مرزا سے اقتدار چھین لیا اور اسے مال بردار

جہاز میں سوار کر کے انتہائی ذلت کے ساتھ کوئٹہ اور وہاں سے لندن بھیج کر جلاوطن کر دیا۔ سکندر مرزا کی یا تو یہ ٹھاٹ کہ ڈیفنس سیکرٹری کے بعد گورنر جنرل بنے یا پھر یہ ذلت و بے بسی کہ لندن میں ایک معمولی ہوٹل کے معمولی ملازم کے طور پر بقیہ زندگی برتن دھو کر گزار دی۔ اسی بے کسی میں لندن میں مر گیا۔ اس کی بیوی نے امانتاً لندن میں دفن کیا' پھر شہنشاہ ایران سے رابطہ کر کے اسے ایران لا کر دفن کیا۔ کیونکہ سکندر مرزا کی بیوی ناہید ایرانی تھی' اس لیے ایران میں دفن کی اجازت مل گئی لیکن شہدائے ختم نبوت کے خون کا رنگ دیکھئے اور قدرت کا انتقام ملاحظہ کیجئے۔ تھوڑے دنوں بعد شہنشاہ ایران کو اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ وہاں پر جناب خمینی صاحب کی حکومت آ گئی۔ اس کے رضا کاروں نے سکندر مرزا کی قبر اکھاڑ کر میت کا تابوت باہر پھینک دیا' ہڈیاں وغیرہ سمندر میں ڈال دی گئیں۔ **فاعتبروا یااولی الابصار۔**

مسٹر دولتانہ

پنجاب کا وزیر اعلیٰ تھا۔ اس نے بھی تحریک کو کچلنے اور بدنام کرنے میں بہت زیادہ حصہ لیا۔ قدرت کا انتقام دیکھئے' پہلے وزارت گئی' پھر مسلم لیگ سے چھٹی۔ گوشۂ گمنامی میں چلا گیا۔ اس کی ذلت کی انتہا یہ ہے کہ وہ ایک دفعہ ٹرین سے کراچی جا رہا تھا۔ اس ٹرین میں ذوالفقار علی بھٹو بھی سفر کر رہا تھا۔ جب بھٹو صاحب کو علم ہوا کہ اس ٹرین کے کسی ڈبے میں ممتاز احمد خان دولتانہ بھی سوار ہیں تو کسی سٹیشن پر بھٹو صاحب نے اخباری نمائندوں سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ اس ٹرین کے کسی اگلے ڈبے میں ایک ''چوہا'' بھی سفر کر رہا ہے اور پھر اس سے بڑھ کر دولتانہ کی ذلت دیکھئے کہ دولتانہ نے اپنے اسی حریف ذوالفقار علی بھٹو کا ملازم بن کر انگلستان کی سفارت قبول کر لی اور بھٹو صاحب کا کورنش بجالانے لگا۔ پھر وزارت کی طرح سفارت بھی گئی۔

خان عبدالقیوم خان

یہ سرحد کا مرد آہن تھا۔ اس نے بھی تحریک ختم نبوت کے مجاہدین پر ظلم وستم کیا۔ اس کی وزارت بھی قدرت نے چھین لی۔ مسلم لیگی ہو کر مسٹر بھٹو کے ساتھ شریک اقتدار ہوا۔ ایک میٹنگ میں بھٹو صاحب نے ایسا ذلیل کیا کہ دم بخود ہو گیا۔ در بدر کے چکر صبح و شام موقف میں تبدیلی نے اس کی عزت بھی خاک میں ملا دی۔

خواجہ ناظم الدین

طبعاً نیک اور شریف انسان تھے۔ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن مرزائیت سے اتنے خائف تھے کہ ظفر اللہ خاں مرتد قادیانی کو پورے ملک کے احتجاج کے باوجود وزارت سے نکالنے

پر آمادہ نہ ہوئے حالانکہ جہانگیر پارک کراچی کے مرزائیوں کے جلسہ میں جب ظفر اللہ خان مرتد قادیانی شرکت کے لیے جانے لگا تو خواجہ صاحب نے ان کو منع کیا۔ ظفر اللہ خان مرتد قادیانی نے کہا کہ میں وزارت چھوڑ سکتا ہوں' اپنی جماعت (قادیانیوں) کا جلسہ نہیں چھوڑ سکتا۔ اس جلسہ میں بہت بڑا فساد ہوا۔ مرزائیوں کے کئی ہوٹل اور دوسرے تجارتی ادارے مشتعل جلوس نے پھونک دیئے۔ ظفر اللہ خان کی اس شرکت اور حکم نہ ماننا' وزارت سے علیحدگی کا باعث قرار دیا جا سکتا تھا' مگر خواجہ صاحب کی شرافت یا بزدلی مانع ہوئی۔ چنانچہ خواجہ صاحب بھی ہمیشہ کے لیے اقتدار سے محروم ہو گئے اور ابھی تک قیامت کی جواب دہی اور ذمہ داری ان کے سر ہے۔

میاں انور علی

ڈی آئی جی' سی آئی ڈی پنجاب تھے۔ تحریک کے دنوں میں مرکزی حکومت نے ان کو کراچی طلب کیا اور تھپکی دی کہ تمہیں آئی جی بنا دیا جاتا ہے۔ تم اس تحریک کو کچلنے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہو؟ میاں انور علی نے سکندر مرزا ایسے سازشیوں کے ذریعے خواجہ ناظم الدین کو جواب دیا کہ میں صرف ایک ہفتہ میں تحریک کو کچل سکتا ہوں' یہ آئی جی بنا دیئے گئے۔ اس نے اسلامیان لاہور اور پنجاب کے دوسرے اضلاع کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی ایک نئی داستان رقم کی۔ وقت گزر گیا۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اس کے ساتھ اپنی گھریلو زندگی میں ایک ایسا بدترین سانحہ پیش آیا جس سے اس کی ساری زندگی کی عزت خاک میں مل گئی۔ (اس کی ایک...... جناب...... کے صاحبزادے کے ساتھ......) اس سانحہ سے اس کی غیرت رسوائی کے گہرے گڑھے میں دفن ہو گئی۔ وہ سانحہ چونکہ ایوب خان مرحوم کے صاحبزادوں سے متعلق تھا اس لیے اس نے اس سانحہ کی اطلاع ایوب خان کو دی اور کسی خاص غرض سے دی (کہ اب ان دونوں کو شرعی طریقہ پر منسلک کر دیا جائے) ایوب خان مرحوم برہم ہو گئے اور اپنے سامنے سے "گٹ آؤٹ" کہہ کر نکال دیا اور ایسے ہتک آمیز الفاظ استعمال کیے جو زیب قلم نہیں۔ (ان گدھیوں کو باندھ کر رکھو کہ گدھوں کے پاس نہ جایا کریں) اور ساتھ ہی اس کی موقوفی کے آرڈر بھی بھیج دیئے۔ ایک ہفتہ میں تحریک کچلنے والا ایک لحظہ میں دنیا و آخرت کی رسوائیاں لے کر واپس آ گیا۔ اس طرح خونخوار بھیڑیئے کا حشر ہوا۔

جنرل اعظم

لاہور میں مارشل لاء کا انچارج بنایا گیا۔ اس نے میجر ضیاء الدین قادیانی کو مارشل لاء کا نظم و نسق سپرد کر دیا۔ پیچھے سے سکندر مرزا تار ہلا رہے تھے اور یہ پوچھتے تھے کہ آج کتنی لاشیں اٹھائی گئی ہیں؟

قادیانی میجر نے قادیانی فرقان فورس کے قادیانیوں کو مسلح کر کے لاہور میں مجاہدینِ ختم نبوت کا قتل عام کرایا۔ یہ جنرل اعظم ''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پُوچھتا نہیں'' کی تصویر بنا بیٹھا رہا۔ جس مرزائیت کے تحفظ کے لیے اس نے مسلمانوں کا قتل عام کرایا' وہ مرزائیت اس کے سامنے اور یہ اس کے سامنے اپنی موت کے دن گنتا رہا۔ ایک دو مرتبہ سیاست کو منہ مارنے کی کوشش کی ہے لیکن لاہور کے مارشل لاء کی ابدی لعنت سے اس کا سیاہ چہرہ لوگوں کو کبھی پسند نہیں آیا۔

ڈپٹی کمشنر غلام سرور

یہ سیالکوٹ میں تعینات تھا۔ اس نے تحریک کے رضاکاروں پر بے تحاشہ ظلم وستم کیا۔ قدرت کا انتقام دیکھئے کہ یہ پاگل ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر ہاؤس سے لاکر پاگل خانے میں بند کر دیا گیا۔

راجہ نادر خان

میری گرفتاری کے وقت پولیس کے ساتھ یہ صاحب بھی تھے۔ فقیر نے ان کے لیے کبھی بددعا نہیں کی لیکن قدرت کا انتقام دیکھئے کہ کار کے ایک حادثہ میں ٹانگ ٹوٹ گئی۔ پاکستان سے لندن تک ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ قابل رحم حالت میں انتقال ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی یہ تکلیف کسی اور آزمائش اور سلسلے کی کڑی ہو مگر اس مظلوم (مولانا تاج محمود) کا دل گرفتاری کے وقت ان کی طرف سے آزردہ ضرور ہوا تھا۔

قدرت کی قہاریت کا عجیب واقعہ

مجھے جب لائلپور سے لاہور لے جا کر قلعہ میں بند کیا گیا تو میرے پاس چوہدری بہاول بخش ڈی ایس پی تشریف لائے اور مجھے بتایا کہ میرا لڑکا ایم سی ہائی سکول میں آپ کا شاگرد رہا ہے۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس سے بڑھ کر اور کیا خدمت ہوسکتی ہے کہ وحشت نگری میں آپ نے میری خیریت دریافت کی ہے۔ اگلے روز پھر وہ تشریف لائے اور کہا مولانا انہوں نے کچھ فارم چھپوائے ہیں آپ ان پر دستخط کر دیں اور گھر جائیں۔ میں سمجھ گیا کہ چوہدری صاحب کا اشارہ معافی نامہ کے فارموں کی طرف ہے۔ میں نے کہا کہ چودھری صاحب جو لوگ میرے ہمراہ سینوں میں گولیاں کھا کر حضور علیہ السلام کے نام وناموس پر شہید ہو گئے' لائلپور کی سڑکوں پر ابھی تک ان کا خون خشک نہیں ہوا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ماؤں کے بچے مروا کر خود معافی نامہ پر دستخط کر کے گھر چلا جاؤں۔ چوہدری صاحب شرمندہ ہوئے' معذرت کی اور کہا کہ اگر آپ یہ حوصلہ رکھتے ہیں تو پھر آپ کا ڈٹ جانا ہی اصولی طور پر درست ہے۔ شیخ محمد شفیع انارکلی لائلپور والے چوہدری صاحب کے بہت

گہرے دوست تھے۔ وہ ان سے ملنے کے لیے شاہی قلعہ میں آئے۔ ان دونوں کے درمیان میرا بھی ذکر آیا اور خدا جانے آپس میں کیا باتیں ہوئیں۔ شیخ محمد شفیع نے لائلپور واپس جا کر یہ مشہور کر دیا کہ مولانا تاج محمود کو شاہی قلعہ میں پولیس نے اتنا مارا ہے کہ ان کی دونوں ٹانگیں اور دونوں بازو توڑ دیئے ہیں۔ یہ بات اڑاتے اُڑتے چک نمبر 138 جھنگ برانچ نزد چنیوٹ جہاں مرے والد صاحب مرحوم مقیم تھے ان تک پہنچ گئی۔ ان کو یہ سن کر انتہائی صدمہ ہوا۔ میری والدہ بتاتی تھیں کہ تمہارے اباجی نے یہ دردناک خبر سن کر 3 ماہ تک تکیہ پر سجدے کی حالت میں راتیں گزاریں۔ انہیں یہ صدمہ سیدھے سونے نہیں دیتا تھا۔ برداشت نہ تھا۔ تین ماہ بعد میرے بڑے بھائی موضع ہری پور ہزارہ سے مجھے ملنے کے لیے حکومت کی اجازت ملنے پر آئے۔ کیمبل پور جیل میں ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں سی آئی ڈی کا انسپکٹر رپورٹنگ کے لیے حکومت کی طرف سے موجود تھا۔ میرے بڑے بھائی گفتگو کرتے ہوئے میرے دونوں بازوؤں ٹانگوں کو بڑے غور سے دیکھتے تھے۔ بار بار ان کے ایسا کرنے پر مجھے کچھ شبہ ہوا' تو میں نے پوچھا کہ بھائی جان آپ بار بار غور سے میرے بازوؤں اور ٹانگوں کو کیوں دیکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شاہی قلعہ میں آپ کی ٹانگ کہاں سے توڑی گئی اور بازو کہاں سے؟ میں نے کہا اللہ کا شکر ہے۔ میری دونوں ٹانگیں اور بازو صحیح سالم ہیں۔ انہوں نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا کہ یہ جھوٹی خبر تھی کہ آپ کو قلعہ میں ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ بالکل جھوٹ ہے مگر آپ تک یہ خبر کیسے پہنچی؟ انہوں نے ساری حقیقتِ حال کہہ سنائی جس کا مجھے بہت دکھ ہوا کہ میرے ضعیف باپ کو کس قدر شدید اذیت اور ذہنی کوفت پہنچائی گئی۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ میں نظر بندی کے دن پورے کر کے گھر رہا ہو کر آ گیا۔ اور اس واقعہ کا شیخ صاحب مرحوم سے تذکرہ تک نہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ شیخ صاحب جیپ کے ایک حادثہ کا سرگودھا روڈ پر شکار ہوئے اور ان کے دونوں بازو اور دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں' جس کی میرے دل میں ہرگز خواہش و تمنا نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عجیب و غریب نظارے سامنے آتے ہیں۔

ذوقِ جنوں کے واقعات

❑ تحریکِ مقدس ختم نبوت 1953ء میں جناب سید مظفر علی شمسی کی روایت کے مطابق سکھر جیل میں جب حضرت امیر شریعت' مولانا ابوالحسنات' مولانا لال حسین اختر اور دوسرے رہنماؤں کو لایا گیا تو ایسی گرمی پڑتی تھی کہ برتن میں پانی اتنا گرم ہو جاتا تھا کہ اس میں انڈا ڈال دیتے تھے تو وہ نیم برشت ہو جاتا تھا اور اگر اسی پانی کو باہر رکھ کر انڈا اس میں رکھ دیتے تھے تو

انڈا ایک جاتا تھا۔

- شمسی صاحب کی روایت ہے کہ اس تحریک میں ایک عورت اپنے بیٹے کی برات لے کر دہلی دروازہ کی جانب آ رہی تھی' سامنے سے تڑ تڑ کی آواز آئی' معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ آقائے نامدار ﷺ کی عزت و ناموس کے لیے لوگ سینہ تانے بٹن کھول کر گولیاں کھا رہے ہیں تو برات کو معذرت کر کے رخصت کر دیا۔ بیٹے کو بلا کر کہا کہ بیٹا آج کے دن کے لیے میں نے تمہیں جنا تھا۔ جاؤ آقا ﷺ کی عزت پر قربان ہو کر دودھ بخشوا جاؤ۔ میں تمہاری شادی اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں کروں گی اور تمہاری برات میں آقائے نامدار ﷺ کو مدعو کروں گی۔ جاؤ پروانہ وار شہید ہو جاؤ تاکہ میں فخر کر سکوں کہ میں بھی شہید کی ماں ہوں۔ بیٹا ایسا سعادت مند تھا کہ تحریک میں ماں کے حکم پر آقائے نامدار ﷺ کی عزت کے لیے شہید ہو گیا۔ جب لاش لائی گئی تو گولی کا کوئی نشان پشت پر نہ تھا۔ سب سینہ پر گولیاں کھائیں۔ فرحمة اللہ رحمة واسعةً
- تحریک ختم نبوت میں ایک طالب علم کتابیں ہاتھ میں لیے کالج جا رہا تھا۔ سامنے تحریک کے لوگوں پر گولیاں چل رہی تھیں۔ کتابیں رکھ کر جلوس کی طرف بڑھا۔ کسی نے پوچھا یہ کیا۔ جواب میں کہا کہ آج تک پڑھتا رہا ہوں آج عمل کرنے جا رہا ہوں۔ جاتے ہی ران پر گولی لگی' گر گیا۔ پولیس والے نے آ کر اٹھایا تو شیر کی طرح گرجدار آواز میں کہا کہ ظالم گولی ران پر کیوں ماری ہے۔ عشق مصطفیٰ ﷺ تو دل میں ہے یہاں دل پر گولی مارو تاکہ قلب و جگر کو سکون ملے۔
- مولانا عبدالستار نیازی راوی ہیں کہ اس تحریک میں جو آدمی بھی شریک ہوتا تھا' یہ طے کر کے آتا تھا کہ وہ ناموس مصطفیٰ ﷺ کے لیے جان دے دے گا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ لوگ لاٹھیاں کھاتے رہے۔ ایک نوجوان کے پاس حمائل شریف تھی۔ فردوس شاہ ڈی ایس پی نے ٹھوکر ماری' نوجوان گر گیا' حمائل شریف دور جا گری اور پھٹ گئی۔ فردوس شاہ کو لوگوں نے موقع پر قتل کر دیا۔ قرآن مجید کی بے حرمتی کرنے والا اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔
- نیازی صاحب فرماتے ہیں کہ دہلی دروازہ کے باہر چار نوجوانوں کی ڈیوٹی تھی' پولیس نے چاروں کو باری باری گولی کا نشانہ بنا دیا۔
- نیازی صاحب کے بقول ہمارا ایک جلوس مال روڈ سے آ رہا تھا۔ لا الہ الا اللہ کا ورد' نعرۂ تکبیر' ختم نبوت زندہ باد کے نعرے ورد زبان تھے۔ وہاں پر زبردست فائرنگ ہوئی۔ لیکن نوجوان

سینہ کھول کھول کر سامنے آتے رہے اور جام شہادت نوش کرتے رہے۔

- معلوم ہوا کہ اسی تحریک میں کرفیو لگ گیا۔ اذان کے وقت ایک مسلمان کرفیو کی خلاف ورزی کر کے آگے بڑھا' مسجد میں پہنچ کر اذان دی، ابھی اللہ اکبر کہہ پایا تھا کہ گولی لگی' ڈھیر ہوگیا۔ دوسرا مسلمان آگے بڑھا۔ اس نے اشہدان لا الہ اللہ کہا تھا کہ گولی لگی' ڈھیر ہوگیا۔ تیسرا مسلمان آگے بڑھا' ان کی لاشوں پر کھڑا ہوکر اشہدان محمد رسول اللہ کہا کہ گولی لگی' ڈھیر ہوگیا۔ چوتھا آدی بڑھا' تین کی لاشوں پر کھڑے ہوکر کہا حی علی الصلوۃ کہ گولی لگی' ڈھیر ہوگیا۔ پانچواں مسلمان بڑھا۔ غرضیکہ باری باری نو مسلمان شہید ہوگئے۔ مگر اذان پوری کر کے چھوڑی۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

- تحریک ختم نبوت میں ایک مسلمان دیوانہ وار لاہور کی سڑکوں پر ختم نبوت زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا۔ پولیس نے پکڑ کر تھپڑ مارا۔ اس پر اس نے پھر ختم نبوت زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ پولیس والے نے بندوق کا بٹ مارا' اس نے پھر نعرہ لگایا۔ وہ مارتے رہے' یہ نعرہ لگاتا رہا۔ اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا' یہ زخموں سے چور چور پھر بھی ختم نبوت زندہ باد کے نعرے لگاتا رہا۔ اسے گاڑی سے اتارا گیا تو بھی وہ نعرہ لگاتا رہا۔ اسے فوجی عدالت میں لایا گیا اس نے عدالت میں آتے ہی ختم نبوت کا نعرہ لگایا۔ فوجی نے کہا ایک سال سزا۔ اس نے سال کی سزا سن کر پھر ختم نبوت کا نعرہ لگایا۔ اس نے سزا دو سال کر دی اس نے پھر نعرہ لگا دیا غرضیکہ فوجی سزا بڑھاتا رہا اور یہ مسلمان نعرہ ختم نبوت بلند کرتا رہا۔ فوجی عدالت جب بیس سال پر پہنچی' دیکھا کہ بیس سال کی سزا سن کر یہ پھر بھی نعرہ سے باز نہیں آ رہا تو فوجی عدالت نے کہا کہ باہر لے جا کر گولی مار دو۔ اس نے گولی کا سن کر دیوانہ وار رقص شروع کر دیا۔ اور ساتھ ختم نبوت زندہ باد' ختم نبوت زندہ باد کے فلک شگاف ترانہ سے ایمان پرور وجد آفریں کیفیت طاری کر دی۔ یہ حالت دیکھ کر عدالت نے کہا کہ رہا کر دو کہ یہ دیوانہ ہے۔ اس نے رہائی کا سن کر پھر نعرہ لگایا۔ ختم نبوت زندہ باد

(قارئین کرام! میں لکھتے ہوئے نعرہ لگاتا ہوں اور آپ پڑھتے ہوئے نعرہ لگائیں۔)

ختم نبوت زندہ باد

- تحریک ختم نبوت 53ء میں دہلی دروازہ لاہور کے باہر صبح سے عصر تک جلوس نکلتے رہے اور دیوانہ وار سینوں پر گولیاں کھا کر آقائے نامدار ﷺ کی عزت و ناموس پر جان قربان کرتے رہے عصر کے بعد جب جلوس نکلنے بند ہوگئے تو ایک 80 سالہ بوڑھا اپنے معصوم پانچ سالہ

بچے کو اپنے کندھے پر اٹھا کر لایا۔ باپ نے ختم نبوت کا نعرہ لگایا معصوم بچے نے جو باپ سے سبق پڑھا تھا اس کے مطابق زندہ باد کہا۔ دو گولیاں آئیں' 80 سالہ بوڑھے باپ اور پانچ سالہ معصوم بچے کے سینہ سے شائیں کر کے گذر گئیں' دونوں شہید ہو گئے۔ مگر تاریخ میں اس نئے باب کا اضافہ کر گئے کہ اگر آقائے نامدار ﷺ کی عزت و ناموس پر مشکل وقت آئے تو مسلمان قوم کے 80 سالہ بوڑھے خمیدہ کمر سے لے کر پانچ سالہ معصوم بچے تک سب جان دے کر اپنے پیارے آقا کی عزت و ناموس کا تحفظ کرتے ہیں۔

- آغا شورش کاشمیری نے فرمایا ''ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس نے خود راقم سے بیان کیا تھا کہ ہر روز کے مظاہروں کو سمیٹنے کے لیے تشدد کی نیو اٹھا کر تحریک کو ختم کیا گیا۔ چنانچہ حکام نے اپنے سفید پوش اہل کاروں کی معرفت پولیس پر پتھراؤ کرایا۔ اس طرح پر فائرنگ کی بنیاد رکھی۔ بعض منچلے قادیانی اپنی جیپوں میں سوار ہو کر مسلمانوں پر گولیاں داغتے اور انہیں شہید کرتے رہے۔ راقم نے لاہور میں چیئرنگ کراس ہوم مال روڈ پر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ 15 سے 22 سال کی عمر کے نوجوانوں کا ایک مختصر سا جلوس کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے جا رہا تھا۔ وہ ایک بے ضمیر سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ ڈی۔ سی۔ آئی ملک حبیب اللہ کے حکم پر کسی وارننگ کے بغیر فائرنگ کا ہدف بنا۔ آٹھ دس نوجوان شہید ہو گئے۔ ان کی لاشوں کو ملک صاحب نے اپنے ماتحتوں سے ٹرکوں میں اس طرح پھینکوایا جس طرح جانور شکار کیے جاتے ہیں۔ یہ نظارہ انتہائی دردناک تھا۔ لاہور چھاؤنی میں ایک قادیانی افسر نے گولیوں کی بوچھاڑ کی' لیکن گولی کھانے والوں نے انتہائی استقامت اور کردار کی پختگی کا ثبوت دیا۔ ایک نوجوان ملٹری ہسپتال میں زخموں سے چور چور بے ہوش پڑا تھا۔ جب اسے قدرے ہوش آیا تو اس نے پہلا سوال سرجن سے یہ کیا کہ میرے چہرے پر کسی خوف یا اضمحلال کے نشان تو نہیں ہیں جب اسے کہا گیا کہ نہیں تو اس کا چہرہ وفور مسرت سے تمتما اٹھا۔ جن لوگوں کو علماء سمیت گرفتار کر کے لاہور کے شاہی قلعہ میں تفتیش کے لیے رکھا گیا ان کے ساتھ پولیس نے اخلاق باختگی کا سلوک کیا۔ ایک انتہائی ذلیل ڈی۔ ایس۔ پی کو ان پر مامور کیا وہ علماء کو اس قدر فحش و فاش گالیاں دیتا اور عریاں فقرے کستا کہ۔

خود خوف خدا تھرا رہا تھا

(تحریک ختم نبوت ص 137)

- کہا جاتا ہے کہ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ مولانا تاج محمودؒ کی زندگی ایسے

واقعات سے بھی پُر نظر آتی ہے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ 1953ء کی تحریک کا بھی ہے جب مولانا جامع مسجد کچہری بازار لائلپور (فیصل آباد) میں شمع رسالت کے پروانوں کے ایک بے انتہا مجمع سے خطاب کر رہے تھے۔ وہ قادیانی امت اور اس کے تحفظ کے لیے حکومت وقت کے کیے گئے اقدامات کے خلاف بھرے ہوئے اس مجمع سے خطاب کرتے ہوئے لوگوں کو سول نافرمانی کی ترغیب دے رہے تھے۔ مولانا تاج محمودؒ کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی یہ آواز مسجد کی گیلری میں کھڑی ایک خاتون بھی ہمہ تن گوش ہو کر سن رہی تھی کہ مولانا کے شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی گود کے بچہ کو منبر کی طرف اوپر سے (جہاں مولانا کھڑے ہو کر تقریر کر رہے تھے) مولانا کی طرف اچھال دیا اور پنجابی میں کہا کہ مولوی صاحب میرے پاس ایک یہی سرمایہ ہے' اسے سب سے پہلے حضور کی آبرو پر قربان کر دو۔ یہ کہہ کر وہ عورت الٹے پاؤں باہر کی طرف چل پڑی۔

اس وقت سارا مجمع دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ خود مولانا کی آواز گلوگیر اور رندھی ہوئی تھی۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ لوگو! اس بی بی کو جانے نہ دینا۔ اسے بلاؤ' بلاؤ۔ چنانچہ اس خاتون کو بلایا گیا اور مولانا نے اپنے قدموں میں بیٹھے اپنے معصوم اکلوتے بیٹے طارق محمود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ بی بی سب سے پہلی گولی تاج محمود کے سینے سے گزرے گی' پھر میرے اس بچے کے سینے سے' پھر اس مجمع کے تمام افراد گولیاں کھائیں گے اور جب یہ سب قربان ہو جائیں تو اپنے بچے کو لے کر آنا اور اللہ کے پیارے نبی ﷺ کی عزت پر قربان کر دینا۔ یہ کہا اور وہ بچہ اس عورت کے حوالے کر دیا۔

- حضرت مولانا خلیل احمد قادریؒ فرماتے ہیں کہ تحریکِ ختم نبوت 1953ء میں مجھے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور مجھ پر مصائب کے پہاڑ توڑے گئے۔ میرے کمرے میں زہریلے سانپ چھوڑے گئے۔ کئی کئی دن کھانا نہ دیا جاتا۔ نماز پڑھنے کی اجازت نہ ہوتی۔ پیٹ اور سینے میں شدید درد ہونے کی وجہ سے کراہتا۔ مگر جیل والوں پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ ایک دفعہ میں نے درود شریف پڑھنا شروع کیا' جس کی وجہ سے کافی افاقہ ہوا۔ اس عالم میں آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بہت بڑا کمرہ ہے جس میں سبز رنگ کی روشنی ہے۔ اس کمرے کی سیڑھیوں پر والد محترم حضرت علامہ ابوالحسنات' جو اس وقت سکھر جیل میں تھے' کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے سینے سے لگا لیا اور میں نے ان سے پوچھا' آپ کا کیا حال ہے۔ انہوں نے جواباً فرمایا کہ مجھے بھی انہوں نے رات بھر کھڑا رکھا ہے۔ اس گفتگو

کے بعد میں ان سیڑھیوں سے نیچے کمرے میں اترا تو میں نے دیکھا کہ شمالی جانب ایک دروازہ ہے جو کہ کھلا ہوا ہے' میں اس کمرے میں دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک بزرگ سپید نورانی چہرہ' کشادہ پیشانی' درمیانہ قد' سفید داڑھی' کھلی آستینوں کا سبز کرتہ زیب تن کیے میری طرف تشریف لائے اور پیچھے سے آواز آئی۔ سرکار شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے دست بستہ حضرت سے عرض کیا: ''حضور ان کتوں نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔'' آپ نے میری داہنی طرف پشت پر تھپکی دی اور فرمایا' شاباش بیٹا۔ گھبراؤ نہیں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے دوبارہ عرض کی۔ حضور انہوں نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ رُخِ انور پر مسلسل شگفتگی تھی۔ فرمایا کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہے اور یہ کہہ کر آپ واپس تشریف لے گئے اور اس واقعہ کے بعد میرا حوصلہ بہت زیادہ بلند ہو گیا۔

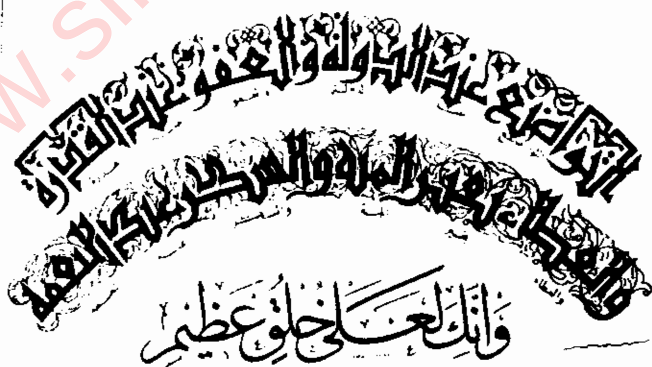
- مولانا خلیل احمد قادریؒ فرماتے ہیں کہ 1953ء میں تحریکِ ختم نبوت میں جیل میں مجھ پر بے شمار سختیاں کی گئیں۔ ایک دفعہ مغرب کے بعد میں اپنی بیرک میں بیٹھا ہوا تھا کہ معاً دل میں یہ خیال آیا کہ یہاں خشک روٹی اور چنے کی دال کے سوا کچھ نہیں مل رہا۔ اگر اپنے گھر میں ہوتے تو حسب منشا کھانا کھاتے لیکن دوسرے ہی لمحے ضمیر نے ملامت کی اور صحابہ کرامؓ کی قربانیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ میں نے سربسجود ہو کر توبہ کی اور اس وسوسے کا ازالہ چاہا لیکن خدا کی قدرت دیکھئے کہ چند لمحے بعد اندھیرے میں ایک ہاتھ آگے بڑھا اور آواز آئی۔ شاہ جی! یہ لے لو اور پھر ایک لفافہ مجھے دے دیا گیا۔ جس میں کچھ پھل اور مٹھائی تھی۔ میں حیران رہ گیا کہ اتنے سخت پہروں کے باوجود یہ سب کچھ مجھ تک کیسے پہنچ گیا' لیکن میرے دل کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ غیبی دعوت ہے۔ وہ پھل اور مٹھائی تین روز تک میں استعمال کرتا رہا۔

- جناب مولانا خلیل احمد قادریؒ بیان کرتے ہیں کہ 1953ء کی تحریک ختم نبوت میں جب میں جیل میں تھا تو مجھے پھانسی کی سزا سنائی گئی اور بعد میں مجھے غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا لیکن میرے بارے میں مشہور ہو گیا کہ مجھے پھانسی دے دی گئی ہے اور کراچی جیل میں میرے والد محترم حضرت ابوالحسنات شاہ قادری صاحبؒ جو اس وقت تحریک کی کمان فرما رہے تھے' کو یہ خبر دی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور سید مظفر علی شمسی کا بیان ہے کہ چند روز تک ہم نے یہ خبر علامہ ابوالحسنات سے چھپائے رکھی اور پھر آخر کار ایک روز ہم نے انہیں بتا ہی دیا کہ آپ کے صاحبزادے کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ علامہ ابوالحسنات یہ سنتے ہی سجدے میں گر

گئے اور انہوں نے فرمایا: ''میرے آقا! گنبدِ خضریٰ کے مکین ﷺ کو میرے اکلوتے بیٹے خلیل کی قربانی قبول ہے تو میں بارگاہِ ربی میں سجدہ شکر ادا کرتا ہوں۔ ناموسِ رسالت پر ایک خلیل تو کیا میرے ہزاروں فرزند بھی ہوں تو اسوۂ شبیری پر عمل کرتے ہوئے سب کو قربان کردوں۔

- مولانا خلیل احمد قادریؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں نے سکھر جیل کے پتہ پر والد محترم حضرت ابوالحسنات شاہ قادریؒ کو اپنی خیریت کا خط لکھا جس کا جواب مجھے پندرہ روز کے بعد موصول ہوگیا۔ والد صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا: ''مجھے یہ جان کر بے حد افسوس ہوا کہ تم رُتبہ شہادت حاصل نہیں کرسکے۔ لیکن بہر حال یہ جان کر دل کو اطمینان ہوا کہ تم ناموس مصطفےٰ ﷺ کی خاطر لڑ رہے ہو۔'' خط کے آخر میں لکھا تھا۔'' کاش اللہ تعالیٰ میرے بیٹے کی قربانی قبول کرلیتا۔''





پاکستان میں تحریکِ ناموس رسالت ﷺ

محمد اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ

مسلم دل آزاری امتِ عیسیٰ کی صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں پے در پے شکستوں کی وجہ سے ہزیمت خوردہ ذہنیت کی غماز تھیں، لیکن یہ بھی ایک اندوہناک حقیقت ہے کہ لاہور کے ایک اشتراکیت زدہ ایڈووکیٹ مشتاق راج نے سال 1983ء میں ''آفاقی اشتمالیت'' نامی ایک کتاب لکھی، جس کا انگریزی میں ترجمہ (Heavenly Communism) کے نام سے کیا گیا۔ یہ کتاب راقم الحروف کو جسٹس میاں صادق اکرام نے لاکر دی اور فرمایا کہ اس کا جواب دینا چاہیے مگر یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کتاب میں کمیونزم کا مذہبی نقطہ نظر سے کس طرح جائزہ لیا گیا ہے، میں نے کتاب کو پڑھنا شروع کیا۔

جیسے جیسے میں کتاب کو پڑھتا گیا، میری قوتِ برداشت جواب دیتی چلی گئی اور کتاب پڑھنے کے بعد مجھ پر غم و غصہ کی جو کیفیت طاری ہوئی، وہ ناقابل بیان ہے۔ کتاب میں نہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمسخر کیا گیا تھا، بلکہ مذاہب اور ادیان کا بھی مذاق اڑایا گیا۔ دینی پیشواؤں کو ''مذہبی شیطان'' کہا گیا، انبیائے کرام پر نہایت گھٹیا اور سوقیانہ حملے کیے گئے اور انتہا یہ کہ حضور رسالت مآب ﷺ کی جناب میں بھی گستاخی کی جسارت کی گئی۔ میں نے انتہائی صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے ورلڈ ایسوسی ایشن آف مسلم جیورسٹس (پاکستان) کا ہنگامی اجلاس طلب کیا۔ حسن اتفاق سے اس وقت عالم اسلام کے دو ممتاز

سکالر ڈاکٹر ربیع المدخلی اور جناب سعید صالح پروفیسر اسلامک یونیورسٹی مدینہ منورہ بھی پاکستان میں موجود تھے۔ انہوں نے بھی ہماری دعوت پر اس اجلاس میں علامہ احسان الٰہی ظہیر اور پاکستان کے دیگر علماء کے ساتھ شرکت کی۔ ان سب کی یہ رائے تھی کہ یہ انتہائی دل آزار کتاب ہے۔ میں نے اس اجلاس میں کتاب اور اس کے مصنف کے خلاف قرارداد مذمت پیش کرتے ہوئے حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا کہ کتاب کی ساری کاپیاں ضبط کر لی جائیں اور گستاخ رسول ﷺ کو سزائے موت دی جائے۔ اس قرارداد کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ اس کے بعد راقم الحروف نے ایک ریزولیوشن لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن میں بھی پیش کیا کہ مشتاق راج کی بار ایسوسی ایشن سے رکنیت فوری ختم کر دی جائے اور اس کی پریکٹس کا لائسنس ضبط کرنے کے لیے بار کونسل کو تحریک کی جائے اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اسے عبرتناک سزا دی جائے' جس کو پاکستان کی مقتدر بار ایسوسی ایشن نے اپنے ہنگامی اجلاس میں' جس میں پانچ سو سے زائد اراکین موجود تھے' متفقہ طور پر منظور کر لیا اور اسے بار ایسوسی ایشن سے خارج کر دیا گیا' جس پر مشتاق راج چراغ پا ہو کر دشنام طرازیوں پر اتر آیا اور اس نے پریس کو ایک بیان جاری کیا' جس میں عذر گناہ پیش کرتے ہوئے مجھے اور ان تمام ساتھیوں اور معزز اراکین بار کو جنہوں نے متفقہ طور پر اس قرارداد کو منظور کیا تھا' ''بہیمانہ جذبات کے علم بردار'' اور ''موروثی جہالت کے وارث'' کے خطابات سے نوازا' جس سے اس کی بوکھلاہٹ صاف ظاہر ہوتی تھی اور اس طرز تخاطب سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ موصوف کو گالیاں دینے کا سلیقہ بھی نہیں۔

ورلڈ ایسوسی ایشن آف مسلم جیورسٹس اور لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی قرارداد کے بعد حکومت نے یہ کارروائی کی کہ مشتاق راج کی کتاب ''آفاقی اشتمالیت'' کو ضبط کر لیا۔ ہم نے مصنف کے خلاف قانونی کارروائی کے لیے انارکلی پولیس سٹیشن لاہور میں رپٹ درج کرائی' جس پر پولیس نے مشتاق راج کے خلاف ''توہین مذہب'' کے جرم میں زیر دفعہ 295 الف تعزیرات پاکستان مقدمہ درج کر لیا کیونکہ تعزیرات پاکستان میں ''توہین رسالت'' جیسے سنگین اور انتہائی دل آزار جرم کی کوئی سزا مقرر نہیں تھی۔ ابتدائی رپورٹ کے باوجود مشتاق راج کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی' جس کی وجہ سے مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ ورلڈ ایسوسی ایشن آف مسلم جیورسٹس کی تحریک پر تمام مکاتب فکر شیعہ' سنی' دیوبندی' بریلوی اور اہل حدیث کے مقتدر علماء اور ممتاز قانون دانوں کی کانفرنس اسی سال 1983ء میں منعقد ہوئی' جس میں ورلڈ اسلامک مشن کے نائب صدر مولانا عبدالستار خان نیازی' جمعیت اہل حدیث کے سربراہ علامہ احسان الٰہی ظہیر' فقہ جعفریہ کے معروف مجتہد جناب علی غضنفر کراروی' جمعیت علمائے اسلام کے نامور عالم دین مولانا محمد اجمل خان' علوم اسلامی کے ممتاز سکالر مولانا سید محمد متین ہاشمی

اور دیگر لائق احترام دینی رہنماؤں نے شرکت کی۔ تلاوت کلام مجید کے بعد جناب مظفر وارثی نے جن کا شمار صف اول کے نعت گو شعراء میں ہوتا ہے' بارگاہ رسالت میں ہدیہ نعت پیش کیا اور اس سے قبل انہوں نے ایک قطعہ پڑھا جو فی الحقیقت شرکائے کانفرنس کے دل کی آواز تھی' جسے سن کر سب بے قرار ہو گئے۔ قطعہ حسب ذیل ہے:

نہیں بنا کوئی قانون اب تک ایسا مگر
تو آج بھیک میں دے دو ہمیں خدا کے لیے
کوئی خدا کو نہیں مانتا نہ مانے مگر
سزائے موت ہو گستاخ مصطفی ﷺ کے لیے

اس کانفرنس میں علمائے دین' قانون دان حضرات اور شرکائے کانفرنس نے حکومت سے متفقہ طور پر مطالبہ کیا کہ اسلام میں توہین رسالت کی سزا' سزائے موت ہے۔ اس لیے گستاخ رسول ﷺ کو سزائے موت دی جائے۔ پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب انوار الحق اور لاہور ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج جناب ذکی الدین پال نے بھی اس مطالبہ کی تائید اور حمایت کی۔ پاکستان کے قومی اخبارات نے جن میں روزنامہ "جنگ" "نوائے وقت" "مشرق" اور "امروز" قابل ذکر ہیں' نہ صرف اس مطالبہ کے حق میں مقالات شائع کیے' بلکہ اداریے بھی لکھے۔ بالآخر اسلامی نظریاتی کونسل نے ہماری قرارداد اور اسلامیانِ پاکستان کے اس مطالبہ کا نوٹس لیا۔ شیخ غیاث محمد سابق اٹارنی جنرل کی تحریک پر کونسل نے حکومت سے سفارش کی کہ توہین رسالت اور ارتداد جیسے جرائم کی سزا سزائے موت مقرر کی جائے۔ اس کے باوجود حکومت وقت نے اس نازک مسئلہ کو مستحقِ توجہ نہ سمجھا جس کی وجہ سے وکلاء اور بالخصوص نوجوانوں میں اضطراب اور ہیجان بڑھنے لگا۔ لاہور کے نوجوانوں کا ایک گروہ انتہائی مشتعل حالت میں میرے پاس پہنچا۔ ان میں سے دو نوجوانوں کے نام جو ذہن میں محفوظ رہ گئے' وہ یہ ہیں: طارق طفیل اور محمد خلیل بھٹی۔ ان سب نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس ملعون شخص کی نشاندہی کروں' جس نے ان کے آقا اور مولا کی شان میں ایسی گستاخی کی جسارت کی ہے۔ وہ ایسے شخص کے وجود کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ میں نے انہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن ان کے اصرار اور اضطراب کو دیکھ کر غالب کی ہم نوائی پر مجبور ہو گیا۔

"یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟"

مجھ سے کوئی تسلی بخش جواب نہ پا کر سرفروشوں کا یہ گروہ مشتاق راج کی تلاش میں نکل پڑا۔ حکومت کو بھی اس کی اطلاع مل گئی تھی' اس لیے اس خطرہ کے پیش نظر پولیس نے مشتاق راج کو گرفتار

کرلیا۔ جب ان نوجوانوں کو یہ معلوم ہوا کہ مشتاق راج کو حراست میں لے لیا گیا ہے' تو وہ پھر میرے پاس واپس آئے اور دھاڑیں مار کر رونے لگے کہ وہ شہادت جیسی نعمت عظمیٰ سے محروم ہوگئے۔ مشتاق راج کی گرفتاری کے بعد ایک عجیب تر واقعہ رونما ہوا۔ مشتاق راج کے چند ساتھیوں نے لاہور ہائی کورٹ میں اس کی ضمانت کے لیے درخواست پیش کی جس کی وجہ سے وکلاء سخت برہم ہوگئے۔ رشید مرتضی قریشی' محمد شاہ نواز خان اور محمد عبدالعزیز قریشی ایڈووکیٹ اتنے بے قابو ہوگئے کہ ایک مرحلہ پر وہ مرنے مارنے کے لیے تیار ہوگئے۔ وکلاء کی ایک کثیر تعداد درخواستِ ضمانت کی مخالفت کے لیے مسٹر جسٹس میاں اسلم کی عدالت میں پیش ہوئی۔ ہم نے قانونی دلائل پیش کرتے ہوئے درخواست ضمانت کو مسترد کرنے پر زور دیا۔ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ اتنے میں شیر پیشہ قانون رشید مرتضیٰ قریشی ایڈووکیٹ روسٹرم کی طرف بڑھے۔ ان کی گھن گرج سے سارا کمرہ عدالت گونج اٹھا اور دفعتاً ایسا جوش اور جذبہٴ بے اختیار کا طوفان امڈ آیا جس نے ایک بار پھر مولانا محمد علی جوہر کی خالق دینا ہال کراچی والے مقدمہ بغاوت کی یاد از سر نو تازہ کردی۔ شاید حالات کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا' لیکن اس وقت کے ایڈووکیٹ جنرل اور موجودہ جج لاہور ہائی کورٹ جسٹس راشد عزیز خان نے ہائی کورٹ کو بتلایا کہ حکومت پنجاب نے مشتاق راج کا مقدمہ عام فوجداری عدالت سے واپس لے کر ملٹری کورٹ کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مشتاق راج کے وکلاء نے بھی عافیت اسی میں سمجھی کہ اس کی درخواست ضمانت واپس لے لی جائے' اس لیے موصوف جیل سے باہر نہ آسکے۔ جیل کے اندر جب قیدیوں کو یہ معلوم ہوا کہ ان میں ایک ایسا شخص بھی موجود ہے جس نے سرکار رسالت مآب ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے تو وہ بھی اسے مارنے کے لیے دوڑے۔ اس لیے وہاں پر بھی اسے قیدیوں سے علیحدہ کوٹھڑی میں رکھا گیا۔

مسلمانوں کے ان مشتعل جذبات اور احساسات کے باوجود حکومت وقت نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اگرچہ اس وقت کے صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے علماء کنونشن منعقدہ 21 اگست 1981ء میں یہ اعلان کردیا تھا کہ حضور ختمی مرتبت ﷺ اور ان کے صحابہ کرام یا دیگر مذہبی اکابرین کے متعلق ہتک آمیز' گستاخانہ تحریر و تقریر کی حوصلہ شکنی کے لیے جلد ہی ضروری قانون بنایا جائے گا اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سخت سزا مقرر کی جائے گی۔ اس یقین دہانی کے باوجود اس سلسلہ میں کوئی قانون سازی نہیں کی گئی۔ بالآخر راقم الحروف نے وفاقی شرعی عدالت میں صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق اور تمام صوبوں کے گورنروں کے خلاف پٹیشن دائر کی' جس میں کہا گیا کہ تعزیرات پاکستان میں پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں گستاخی' اہانت' توہین' تنقیص جیسے سنگین اور ناقابل معافی جرم کے بارے میں کوئی سزا مقرر نہیں' اس لیے توہین رسالت اور توہین مذہب کے جرائم کی سزا قرآن اور سنت کی روشنی میں

سزائے موت مقرر کی جائے۔ یہ درخواست ایک سو پندرہ سربرآوردہ مسلمان شہریوں کی جانب سے دائر ہوئی جن میں تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام' سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج صاحبان' سابق وزرائے قانون' سابق اٹارنی جنرل' ایڈووکیٹ جنرل اور ممتاز قانون دان شامل ہیں' جن میں سے چند کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

مولانا عبیداللہ انور مرحوم صدر جمعیت علمائے اسلام' مولانا عبدالستار خان نیازی نائب صدر ورلڈ اسلامک مشن' مولانا سید عبدالقادر آزاد خطیب بادشاہی مسجد لاہور و صدر مجلس علمائے پاکستان' مولانا مفتی محمد حسین نعیمی ناظم دارالعلوم جامعہ نعیمیہ' علامہ احسان الٰہی ظہیر صدر جمعیت اہل حدیث' جناب سید علی غضنفر کراروی' نائب صدر مجلس تحفظ حقوق شیعہ' مولانا محمد اجمل مرکزی نائب صدر جمعیت علمائے اسلام' مولانا گلزار احمد مظاہری صدر جمعیت اتحاد علمائے پاکستان' سید افضل حیدر صدر لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن' چودھری محمد فاروق وائس چیئرمین پنجاب بار کونسل' جناب ایس ایم ظفر سابق وزیر قانون' جناب بدیع الزمان کیکاؤس سابق جج سپریم کورٹ پاکستان' جناب بشیر الدین خان سابق چیف جسٹس پشاور ہائی کورٹ' جناب محمد صدیق سابق جج لاہور ہائی کورٹ' شیخ غیاث محمد سابق اٹارنی جنرل پاکستان' جناب جسٹس محمد عارف سابق ایڈووکیٹ جنرل' میاں شیر عالم سابق نائب صدر لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن' جناب افتخار علی شیخ جنرل سیکرٹری پنجاب مسلم لیگ' جناب ملک عبدالکریم چیئرمین لاء ریفارم کمیٹی پاکستان بار کونسل' جناب بدرالدین قادری پروفیسر یونیورسٹی لاء کالج' ڈاکٹر ظفر علی راجا سیکرٹری جنرل ورلڈ ایسوسی ایشن آف مسلم جیورسٹس' ملک وقار سلیم صدر ینگ لائرز فورم' جناب شیخ مقبول احمد سینئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان اور دیگر معززین جن کے نام طوالت کے خوف سے درج نہیں ہو سکے۔

یہ پٹیشن وفاقی شرعی عدالت کے فل بنچ کے سامنے جو چیف جسٹس شیخ آفتاب حسین' جسٹس فخر عالم' جسٹس چودھری محمد صدیق' جسٹس ملک غلام علی اور جسٹس عبدالقدوس قاسمی پر مشتمل تھا' 18 جولائی 1983ء کو پیش ہوئی۔ فاضل عدالت نے ابتدائی بحث کی سماعت کے بعد اٹارنی جنرل پاکستان اور تمام صوبوں کے ایڈووکیٹ جنرلز کے نام نوٹس جاری کر دیئے اور پٹیشن برائے سماعت منظور کر لی۔ اس کے بعد پھر پٹیشن کی باقاعدہ سماعت اسی فیڈرل شریعت کورٹ کے فل بنچ نے کی' جو چیف جسٹس جناب گل محمد خان' جسٹس جناب فخر عالم' جسٹس مولانا عبدالقدوس قاسمی' جسٹس مفتی شجاعت علی قادری اور جسٹس جناب فخرالدین ایچ شیخ پر مشتمل تھا۔ اس کی سماعت 13 نومبر کو شروع ہوئی اور 21 نومبر 1985ء تک مسلسل روزانہ جاری رہی' پٹیشن پر بحث کا آغاز راقم الحروف کے دلائل سے

شروع ہوا۔

دوران سماعت ورلڈ اسلامک مشن کے سربراہ مولانا عبدالستار خان نیازی‘ اتحاد علماء کے صدر مولانا گلزار احمد مظاہری مرحوم‘ مولانا منظور احمد چنیوٹی‘ قائد تحریک ختم نبوت‘ پاکستان کے معروف محقق جناب سید ریاض الحسن نوری‘ ایران کے سکالر ڈاکٹر سہراب مالی‘ جامعہ اشرفیہ کے مہتمم مولانا صاحبزادہ عبدالرحمٰن اور شیخ الحدیث مولانا عبدالمالک کاندھلوی مرحوم بھی موجود رہے۔ ان حضرات کے علاوہ پاکستان کے معروف قانون دان اور یونیورسٹی‘ کالجوں‘ دینی درسگاہوں کے اساتذہ کی کثیر تعداد عدالت میں آتی رہی۔ خاص طور پر جناب احسن علیگ مرحوم اور جناب فضل محمود روزانہ عدالت کی کارروائی کی سماعت کے لیے باقاعدگی سے آتے رہے۔

کمرۂ عدالت کے باہر بھی بوڑھے بچے اور نوجوانوں کا ہجوم وقتِ عدالت کے ختم ہونے تک موجود ہوتا۔ اس پٹیشن کی سماعت کے دوران شیخ غیاث محمد سابق اٹارنی جنرل پاکستان‘ ریٹائرڈ جسٹس زیڈ بی کیکاؤس جج سپریم کورٹ‘ ڈاکٹر ظفر علی راجا ایڈووکیٹ وسیکرٹری جنرل ورلڈ ایسوسی ایشن آف مسلم جیورسٹس‘ ملک وقار عظیم ایڈووکیٹ چیئرمین ینگ لائرز فورم نے راقم الحروف‘ درخواست گزار کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا اور ڈاکٹر ظفر علی راجا نے شب و روز اس کیس کی تیاری میں راقم الحروف کی معاونت کی۔ فیڈرل گورنمنٹ کی جانب سے ڈاکٹر سید ریاض الحسن ڈپٹی اٹارنی جنرل‘ حکومت پنجاب کی جانب سے جناب خلیل رمدے ایڈووکیٹ جنرل پنجاب‘ حکومت سرحد کی جانب سے میاں اجمل اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل اور صوبہ سندھ کے ایڈووکیٹ جنرل نے اپنی اپنی حکومتوں کا موقف پیش کیا۔ تمام علمائے کرام نے جنہوں نے بحث میں حصہ لیا‘ اپنے اپنے تحریری دلائل بھی عدالت میں داخل کیے۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے نمائندوں نے بھی بیک زبان اس کی تائید کی کہ شاتم رسول کی سزا قرآن اور سنت کی روشنی میں سزائے موت مقرر ہے لیکن دوران بحث ڈپٹی اٹارنی جنرل سید ریاض الحسن گیلانی نے یہ موقف اختیار کیا کہ گستاخ رسول کو پولیس یا عدالت سے رجوع کیے بغیر موقع پر قتل کر دیا جائے۔

اس کے بعد ماہ جولائی 1986ء میں ایک خاتون ایڈووکیٹ عاصمہ جہانگیر نے اسلام آباد میں منعقدہ ایک سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے معلم انسانیت حضور ختمی مرتبت ﷺ کے بارے میں ناخواندہ (Illiterate) اور تعلیم سے نابلد جیسے نازیبا اور توہین آمیز الفاظ استعمال کیے‘ جو سامعین اور تمام امت مسلمہ کی دل آزاری کا باعث تھے‘ جس پر راولپنڈی بار ایسوسی ایشن کے معزز اراکین میں سے عبادالرحمٰن لودھی اور ظہیر احمد قادری ایڈووکیٹ نے سخت احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ وہ ان توہین آمیز الفاظ کو واپس لے کر اس گستاخی پر معافی مانگے لیکن اس کے انکار پر سیمینار میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جب یہ

خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو راقم الحروف کی تجویز پر ورلڈ ایسوسی ایشن آف مسلم جیورسٹس کا ایک غیر معمولی اجلاس لاہور میں منعقد ہوا' جس میں عاصمہ جہانگیر کی اس قابل اعتراض تقریر پر انتہائی غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ فوری طور پر توہین رسالت کی سزائے حد کو پاکستان میں نافذ کرے اور اس جرم کے مرتکب افراد کو قرار واقعی سزا دے ورنہ اس کے سنگین نتائج کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر عائد ہوگی۔ راقم الحروف کی درخواست پر لاہور میں وکلاء اور علماء کا ایک مشترکہ اجلاس ماہ جون 1986ء میں منعقد ہوا' جس میں تمام مکاتب فکر کے سربرآوردہ علماء اور ممتاز قانون دان حضرات نے شرکت کی اور متفقہ طور پر حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

''ہم دین اور قانون سے وابستہ لوگ برملا اس کا اعلان کرتے ہیں کہ سرزمین پاکستان کا کوئی مسلمان اس ملک میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں کسی قسم کی اہانت آمیز بات کو کسی نوع برداشت نہیں کرسکتا اور نہ ہی سیکولر ذہن رکھنے والے عناصر کو یہ اجازت دینے کے لیے تیار ہے کہ وہ اپنی مذموم اور شرانگیز سرگرمیوں کو جاری رکھے اور فتنہ و فساد پھیلانے کی کوشش کرے۔ ہم واشگاف الفاظ میں ان عناصر کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کرنے سے باز آجائیں ورنہ اس کے نہایت سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔''

اس قرارداد پر مولانا عبدالستار خان نیازی' علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید' علامہ غضنفر کراروی صدر اتحاد بین المسلمین' ڈاکٹر خالد محمود صدر جمعیت علمائے برطانیہ' میاں محمد اجمل قادری امیر انجمن خدام الدین' مولانا مفتی محمد حسین نعیمی ناظم دارالعلوم جامعہ نعیمیہ لاہور' مولانا عبدالمالک شیخ الحدیث جامعہ علوم اسلامیہ منصورہ' مولانا گلزار احمد مظاہری مرحوم صدر جمعیت اتحاد علمائے پاکستان اور دیگر علمائے کرام نے دستخط کیے۔ ان کے علاوہ ممتاز وکلاء نے بھی اس قرارداد پر اپنے دستخط ثبت کیے' جس کے بعد یہ قرارداد حکومت پاکستان' صوبائی حکومتوں اور اراکین قومی اسمبلی کو بھیجی گئی۔

عاصمہ جہانگیر کی اس قابل اعتراض تقریر کا نوٹس سب سے پہلے قومی اسمبلی میں اسلامی جذبہ سے سرشار خاتون ایم این اے محترمہ نثار فاطمہؒ نے لیا اور انہوں نے وہاں پوری قوت کے ساتھ آواز اٹھائی کہ عاصمہ جہانگیر کے ان توہین آمیز الفاظ کے خلاف حکومت فوری کارروائی کرے لیکن چونکہ اس وقت قانون میں توہین رسالتؐ کے جرم کی کوئی سزا مقرر نہیں تھی' اس لیے اس کے خلاف کوئی مؤثر کارروائی نہ ہوسکی۔

اس بندۂ عاجز کے مشورے سے قومی اسمبلی میں اسی مجاہدہ خاتون نثار فاطمہؒ نے ایک بل پیش کیا' جس میں توہین رسالت کی اسلامی سزا سزائے موت تجویز کی گئی لیکن اس وقت کے وزیر انصاف

جناب اقبال احمد خان نے جن سے ہمارے پیشہ وکالت کے تعلق سے دیرینہ مراسم تھے' اس تجویز سے اختلاف کیا۔ ان کے خیال میں اس جرم کی کوئی سزا قرآن میں مقرر نہیں۔ اس لیے انہوں نے اس بل کی حمایت سے معذرت کا اظہار کیا۔

حیرت اس بات پر ہوئی کہ وزیر موصوف علامہ اقبال جیسے عاشق رسول ﷺ کے نام سے منسوب مجلس اقبال کے رکن رکین بھی تھے۔ یہ معلوم کر کے اور بھی حیرت ہوئی کہ ان موصوف کے علاوہ مولانا وصی مظہر ندوی' جناب لیاقت بلوچ' شاہ بلیغ الدین اور کچھ اسلامی ذہن رکھنے والے اراکین اسمبلی بھی اس تجویز سے پوری طرح متفق نہیں۔ وہ حضرات بوجہ صرف عمر قید کی سزا کو کافی سمجھتے تھے' جس پر محترمہ نثار فاطمہؒ اور اس فقیر نے فرداً فرداً ہم خیال اراکین اسمبلی سے مل کر ان کے سامنے قرآن وحدیث' ائمہ کرام اور اجماع امت کے فیصلے پیش کیے اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس بل کی حمایت کر کے اسے قومی اسمبلی سے منظور کرائیں۔ پھر ہمت مردانہ سے کام لیتے ہوئے محترمہ نثار فاطمہؒ نے جب یہ بل قومی اسمبلی میں پیش کیا تو اراکین کی اکثریت کو اس کی حمایت میں دیکھ کر کسی کو اس بل کی مخالفت کی جرأت نہ ہو سکی اور بالآخر 2 اکتوبر 1986ء کو پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر اس بل کو منظور کر لیا۔ اس طرح رسول پاک ﷺ کے لیے اسلامیان پاکستان کا جذبۂ محبت وعقیدت اور احترام غالب آ کر رہا۔ حق سبحانہ تعالیٰ کا فضل بے پایاں اور نبی کریم ﷺ کا کرم خاص تھا کہ محترمہ بہن نثار فاطمہ اور اس فقیر کی حقیر کوششوں سے پاکستان میں پہلی مرتبہ توہین رسالت کے جرم کی سزا' سزائے موت مقرر ہوئی اور تعزیرات پاکستان میں دفعہ 295 (ج) کا اضافہ کیا گیا لیکن اس دفعہ میں پھر بھی ایک سقم باقی رہ گیا۔ دفعہ مذکور میں توہین رسالت کی سزا سزائے موت یا اس کی متبادل (Alternative) سزا' سزائے عمر قید رکھی گئی۔ حالانکہ اہانت رسول اکرم ﷺ کی سزا بطور حد سزائے موت مقرر ہے اور کسی کو حد کی سزا میں کمی بیشی یا اس کی متبادل سزا مقرر کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ اس لیے ایک مرتبہ پھر "من وگرز ومیدان وافراسیاب" والا معرکہ درپیش تھا۔ اس لیے میں نے پھر فیڈرل شریعت کورٹ میں صدر پاکستان اور حکومت پاکستان کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا اور دفعہ 295 (ج) کی اس شق کو چیلنج کیا جس کی رو سے عدالت کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ توہین رسالت کے مجرم کو سزائے موت کی بجائے عمر قید کی سزا بھی دینے کی مجاز ہے۔ اس پٹیشن میں وفاقی شرعی عدالت سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ سزائے عمر قید کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے صدر پاکستان کو ہدایت جاری کی جائے کہ وہ توہین رسالت کی سزا بطور حد صرف سزائے موت مقرر کریں کیونکہ سزائے حد میں صدر' گورنر' پارلیمنٹ بلکہ پوری امت مسلمہ کو بھی کسی قسم کی ترمیم' تبدیلی' تخفیف کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ پٹیشن فیڈرل شریعت کورٹ کے فل بنچ کے سامنے یکم اپریل 1987ء کو

پیش ہوئی۔ فاضل عدالت نے ابتدائی سماعت کے بعد وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے نام نوٹس جاری کر دیئے۔اس کے بعد اسلام آباد' پھر لاہور میں اس مقدمہ کی سماعت ہوتی رہی۔ سماعت کا آغاز راقم الحروف کی بحث سے ہوا۔اس میں مختلف مکاتب فکر کے علماء جن میں سید ریاض الحسن نوری' مولانا حافظ صلاح الدین یوسف اور مفتی غلام سرور قادری نے توہین رسالت کی سزا پر سیر حاصل بحث کی۔ وفاقی حکومت کی جانب سے ڈپٹی اٹارنی جنرل عبدالستار نجم اور صوبائی حکومت پنجاب کی جانب سے عزیزان گرامی نذیر غازی اور جلال الدین خلد پیش ہوئے۔ حکومت سرحد کی نمائندگی میاں محمد اجمل نے کی' جو اب پشاور ہائی کورٹ کے فاضل جج ہیں۔

بحث کی سماعت لاہور میں ماہ مارچ 1990ء کے پہلے ہفتہ میں فل بنچ کے سامنے ہوئی جو چیف جسٹس جناب گل محمد خان' جناب جسٹس عبدالکریم خان کندی' جناب جسٹس عبادت یار خان' جناب جسٹس ڈاکٹر فدا محمد خان اور جناب جسٹس عبدالرزاق تھیم پر مشتمل تھا۔ وفاقی حکومت کا وقف تھا کہ توہین رسالت کی سزا' سزائے موت کی بجائے صرف سزائے عمر قید کافی ہے' کیونکہ اس جرم کی سزا کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں۔ اس لیے یہ سزا بطور حد نہیں دی جا سکتی۔ اس کے علاوہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ پر توہین رسالت کا الزام عائد کر کے سزائے موت کا مطالبہ کرے گا۔ مولانا مفتی غلام سرور قادری کی رائے میں حنفی نقطہ نظر سے توہین رسالت کے جرم کی سزا' سزائے موت بوجہ ارتداد دی جائے گی لیکن ارتداد ناقابل معافی جرم ہے۔ اہل حدیث مکتب فکر کے مذہبی سکالر مولانا صلاح الدین یوسف نے بھی مفتی صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ توبہ سے سزا موقوف ہو جائے گی لیکن باغی اور سرکردہ مجرموں کی توبہ قابل قبول نہ ہوگی۔

راقم الحروف نے ڈپٹی اٹارنی جنرل اور ان علماء حضرات کے دلائل کی سختی سے تردید کی۔ قرآن مجید کی متعلقہ آیات اور صحاح ستہ کی احادیث کے حوالہ سے بتلایا کہ توہین رسالت کی سزا بطور حد سزائے موت دی جائے گی۔ خود سرکار رسالت مآب ﷺ کے حکم سے سزائے موت ان لوگوں کو بھی دی گئی جو یہودی اور غیر مسلم تھے اور جنہوں نے حضور کی اہانت کر کے آپ ﷺ کو ایذا دی تھی۔ اس لیے اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں۔ اگر مسلمان اس جرم کا ارتکاب کرے تو وہ مرتد ہونے کی وجہ سے بھی سزائے موت کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ امام احمد بن حنبلؒ' امام شافعیؒ اور دیگر ائمہ حدیث وفقہ امام ابن حزمؒ' امام ابن تیمیہؒ کے فتاویٰ کے مطابق توہین رسالت کے جرم کی سزا بطور حد سزائے موت ہے اور یہ ناقابل معافی جرم ہے' جس کے مرتکب کی توبہ بھی قابل قبول نہیں۔ خود فقہ حنفی کی مستند کتب البحر الرائق' شرح کنز الدقائق' للمولف ابن نجیم الحنفی' ردالمحتار علی الدرالمختار شرح تنویر الابصار اور فتح القدیر

سے بھی یہ ثابت کیا کہ شاتم رسول کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور اسے بطور حد قتل کیا جائے گا۔ ہمارے اس موقف کی تائید صوبہ پنجاب کے نمائندے اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل صاحبان نے کی۔ اس کے بعد فیڈرل شریعت کورٹ نے اس مقدمہ کا تاریخی فیصلہ 30 اکتوبر 1990ء کو سنا دیا۔

اس فیصلہ کے بعد پھر ایک عجیب مرحلہ پیش آیا۔ فیڈرل شریعت کورٹ کے اس فیصلہ کے خلاف اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت نے جو نفاذ اسلام اور قرآن وسنت کے قانون کی بالادستی کا منشور دے کر برسر اقتدار آئی تھی، سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی اور راقم الحروف کے نام وفاقی حکومت کے ایڈووکیٹ آن ریکارڈ چودھری اختر علی کا نوٹس بھی موصول ہو گیا۔ جس پر راقم نے اس وقت کے وزیر اعظم (میاں نواز شریف) کو پیغام بھجوایا کہ حکومت اس اپیل کو فوری طور پر سپریم کورٹ سے واپس لے ورنہ مسلمانوں کے جذبات اس حکومت کے خلاف بھی مشتعل ہو جائیں گے اور اس حکومت کا بھی وہی انجام ہوگا جو اس کی پیش رو حکومت کا ہو چکا ہے۔ جس نے اسلامی قوانین کو اپنی کابینہ میں ظالمانہ اور فرسودہ قرار دے کر قانونِ قصاص و دیت کو روکنے کی کوشش کی تھی لیکن سپریم کورٹ نے راقم کی درخواست پر کابینہ کی اس کارروائی کا سختی سے نوٹس لے کر قانونِ قصاص و دیت کے خلاف گورنمنٹ کی اپیل کو مسترد کر دیا اور پھر یہ حکومت غضب الٰہی کا شکار ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ میاں محمد نواز شریف نے اس انتباہ پر برسر عام اعلان کیا کہ اس اپیل کا انہیں قطعی علم نہیں تھا ورنہ ایسی غلطی کبھی سرزد نہ ہوتی اور اس جرم کی سزائے موت بھی کم تر سزا ہے۔ اس لیے یہ اپیل سپریم کورٹ سے فوری طور پر واپس لے لی گئی۔ جس کے بعد بفضل تعالیٰ اب پاکستان میں توہین رسالت کی سزا بطور حد سزائے موت حتمی اور قطعی طور پر جاری ہو چکی ہے اور اسی قانون کے تحت سرگودھا کے ایڈیشنل سیشن جج نے گستاخ رسالت مآب ﷺ کو اسی ماہ نومبر میں سزائے موت سنا دی تھی، جس میں ملزم کو صفائی کا پورا پورا موقع دیا گیا۔ اس قانون کی بدولت اب کوئی شخص شاتم رسول ﷺ کو خود کیفر کردار تک پہنچانے کی بجائے عدالت سے رجوع کرے گا، جہاں فریقین سے شہادت لی جائے گی۔ ملزم کو صفائی کا موقع دیا جائے گا۔ اس کے بعد اگر جرم ثابت ہو تو پھر مجرم کو سزا دی جائے گی۔



شہدائے اسلام آباد

محمد اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ

پاکستان میں انفرادی اور اجتماعی کوششوں کی بدولت جب توہین رسالت کے جرم کی سزائے موت کا قانون قومی اسمبلی نے منظور کر لیا تو اس پر یورپ' امریکہ' بھارت اور خود پاکستان کا سیکولر ذہن تلملا اٹھا۔ یہودی لیڈروں کے یہ عزائم جیوئش کرانیکل کے ذریعہ کھل کر سامنے آ گئے تھے' جس میں انہوں نے ببانگ دہل اعلان کیا تھا: ''ہم پاکستان میں اسلامی نظام کبھی قائم نہیں ہونے دیں گے۔'' اس کے علاوہ یورپ اور امریکہ میں اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے بھی وہ خوف زدہ ہو گئے تھے اور انہیں ڈر تھا کہ اسلام پھر ایک زندہ قوت بن کر دنیا پر نہ چھا جائے۔ ان کے خیال میں جب تک مسلمانوں کے دل و دماغ سے ذاتِ مصطفوی ﷺ کا رشتۂ محبت و عقیدت اور جذبۂ احترام و تکریم ختم نہ کیا جائے وہ اس اٹھتے ہوئے طوفان کو روک نہیں سکتے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک نہایت گھٹیا اور انتہائی گھناؤنی سکیم تیار کی۔ انہوں نے ایک آبرو باختہ' ضمیر فروش اور رسوائے زمانہ شیطان صفت ملعون ملحد رشدی کی خدمات حاصل کیں اور اس خبیث سے ''شیطانی آیات'' نامی ایک کتاب لکھوائی' جو عفونت میں سنڈاس سے بدتر تھی۔ یہ کتاب وائی کنگ پبلی کیشنز کے یہودی ادارے نے اکتوبر 1988ء میں شائع کی۔ اس کتاب کو ناول کی شکل دے کر اس میں ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ التحیہ والسلام' ختم الرسل امام الانبیاء حضور رسالت مآب ﷺ' اہل بیتؓ ' ازواج مطہراتؓ اور اصحاب رسولؓ کی شان میں جو زبان استعمال کی گئی ہے' وہ شیطان کا ایجنٹ ہی استعمال کر سکتا ہے۔ ان ذوات قدسی پر جس فحش انداز میں حملے

کیے گئے ہیں' آج تک دنیا کے کسی ذلیل اور رذیل ترین شخص کو ایسی جسارت نہیں ہوئی۔ پہلے تو شیطانی خرافات سمجھ کر مسلمانوں نے اس کا نوٹس نہیں لیا کیونکہ اس مجہول النسب نے اس سے پہلے اپنی کتاب ''مڈنائٹ چلڈرن'' (Mid-Night Children) میں اپنے ''حسب نسب'' اپنی ''مادر زاد'' اولاد اور حاشیہ نشینوں کو نشانہ تضحیک بنایا اور ایک دوسری کتاب شیم (Shame) میں جس پرلے درجہ کی بے حیائی اور بے شرمی کا مظاہرہ کیا تھا' اس پر اردو کے مقبول شاعر اور انگریزی ادب کے معروف نقاد فیض احمد فیض نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ مغرب کی اس سے بڑھ کر بدنصیبی اور کیا ہوگی کہ رشدی جیسے شخص کو برطانیہ کے ناول نگاروں میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں بھی یہی سمجھا گیا کہ اس میں بھی کچھ اسی قسم کی خرافات ہوں گی لیکن کسے خبر تھی کہ گندگی اور غلاظت اس بری طرح اس کے منہ کے راستے خارج ہوگی کہ اس کا تعفن دنیا میں ہر پاکیزہ اور طہارت پسند انسان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ گندگی اور غلاظت کے کیڑے ایسی گندگی کے ڈھیر میں پلتے بڑھتے ہیں اور اسی سے اپنی خوراک حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اگر اتفاقاً انہیں اس ڈھیر سے علیحدہ کر لیا جائے تو وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ ''شیطانی آیات'' میں اس نے اہل یورپ کو بے حد ننگی اور انتہائی فحش گالیاں دی ہیں' جس کو وہ شیر مادر سمجھ کر بڑی آسانی سے ہضم کر گئے ہیں۔

ان کے آبرو باختہ معاشرے میں اخلاق' تہذیب' شرافت' شائستگی' نفاست اور پاکیزگی نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ شاید اس لیے غلیظ اور گندی گالیاں کھا کر وہاں کی اکثریت کو نفسیاتی طور پر لذت اور ایک گونہ خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اس کتاب کے 547 صفحات ایسی فحش گالیوں سے بھرے پڑے ہیں جو زبان قلم پر نہیں لائے جاسکتے۔ سفید فام عورت کے بارے میں یہ فحش نگار لکھتا ہے ''سفید فام عورت کو ''جنسی اختلاط'' کے بعد اٹھا کر پھینک دینا چاہیے۔'' ''جنسی اختلاط'' کے الفاظ ہم نے انگریزی زبان میں استعمال ہونے والے ایک عامیانہ لفظ کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھے ہیں' جسے اس شیطان نے بطور گالی استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک انگریز عورت ''پامیلا'' (Pameela) کو بطور داشتہ استعمال کرنے کے بعد شادی کا ڈھونگ رچا کر چھوڑ دیا۔ پھر اس نے ایک امریکی عورت میرین وگنز (Marrine Wiggins) سے ناجائز تعلقات قائم کر لیے لیکن قانونی مجبوریوں کی وجہ سے اسے منکوحہ بنا کر اس سے بھی گلوخلاصی حاصل کر لی۔ برطانیہ اور امریکہ کو اپنے اس ناول نگار داماد پر فخر ہے' جس نے ان کے عصمت فروش معاشرے کو برسر عام ننگا کر کے دنیا کو دکھلایا ہے' اس پر طرفہ تماشا یہ ہے کہ اپنے گھٹیا بازاری ناول میں اس نے برطانیہ کی وزیر اعظم مسز تھیچر کو ''شہوت برانگیختہ کتیا'' کہہ کر پکارا ہے اور اس کی ہوس ناکی سگِ مختون کی طرح رال ٹپکاتے شاہی محل کے اندر کوئین الزبتھ کا پیچھا کرتی

ہے۔"حرام زادہ" (Bastard) "رنڈی" ماں اور بہن کی گالیوں کا جس آزادانہ طور پر استعمال اس کتاب میں کیا گیا ہے اس کا حوصلہ تو شاید شیطان بھی نہ کر سکے۔ بہرحال انگریزوں اور امریکیوں کا یہ حوصلہ قابل داد ہے کہ ایسی ننگی، شرمناک اور فحش گالیاں اپنے اور اپنے لیڈروں کے بارے میں سن کر وہ مشتعل یا منفعل نہیں ہوئے، بلکہ اس فحش نگاری کو ادب عالیہ یا لٹریچر سمجھ کر اس کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب یہ کتاب شائع ہونے کے بعد یورپ اور امریکہ کے بازاروں میں فروخت ہونے کے لیے پہنچی اور مسلمانوں کو اپنے محبوب آقا اور مولا، ان کی ازواج مطہرات، اہل بیت اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کی شان میں اہانت اور گستاخیوں کا علم ہوا تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ تو ان کے اپنے پیارے رسول ﷺ، آل رسول ﷺ، ازواج و اصحاب رسول ﷺ کی عزت و ناموس کا معاملہ تھا۔ وہ تو یہودیوں اور عیسائیوں کے پیغمبروں کی توہین بھی برداشت نہیں کر سکتے جن کی وہ اپنے پیارے نبی ﷺ کی طرح ہی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ان کی ذات پر بھی جابجا سوقیانہ اور رکیک حملے کیے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا، جو سال 1988ء میں میرے قیام لندن کے دوران پیش آیا، جو یہودی ذہنیت کا مظہر ہے۔

ان دنوں لندن کے سینما گھروں میں ایک یہودی فلم ساز مارٹن اسکورسس کی ایک انتہائی شرمناک فلم "The Last Temptation of Christ" نمائش کے لیے پیش کی جانے والی تھی، جس میں (نعوذ باللہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک طوائف کے ساتھ سرگرم اختلاط دکھلایا گیا تھا۔ مسلم جیورسٹس لندن آفس کے چیئرمین جناب ریاض احمد نے برٹش فلم انسٹی ٹیوٹ کو نوٹس دیا کہ اس فلم کی نمائش برطانیہ کے قانون بلاس فیمی کی خلاف ورزی ہے۔ اگر اس فلم کی نمائش کو نہ روکا گیا تو پھر اس کے فلم ساز اور مالکان سینما کے خلاف لندن کے مسلمان شہریوں کی جانب سے قانونی کارروائی کی جائے گی۔ اس پر وہاں کے عیسائی شہریوں کو بھی غیرت آئی اور کیتھولک چرچ کے رہنماؤں نے ان کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کا نوٹس دیا۔ اس کے بعد لندن میں اسلامی ملکوں کے مقیم مسلمان نوجوانوں نے برطانیہ کی جماعت اسلامی کے تعاون سے پلازہ سینما کے سامنے، جہاں اس شرم ناک فلم کی نمائش ہو رہی تھی، جمعہ 12 ستمبر 1988ء کو پکٹنگ شروع کی، جس میں عیسائی فرقوں کے رہنماؤں کے خلاف خود یہودیوں کا ایک مذہبی گروہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ جس کے نتیجہ میں لندن کے زیر زمین سٹیشنوں میں جہاں جہاں جناب مسیحؑ کے ساتھ اس طوائف کے نیم برہنہ قد آدم پوسٹر لگائے گئے تھے، ہٹا لیے گئے اور فلم بُری طرح فلاپ ہوئی۔ اس واقعہ کے ذکر سے یہ اظہار مقصود تھا کہ مسلمان تو دوسرے مذاہب اور ادیان کے پیغمبروں کے بارے میں گستاخی اور شرارت برداشت نہیں کر سکتے، تو پھر وہ کیونکر اور کیسے اپنے محبوب

پیغمبر ﷺ کی شان میں کسی بےادبی اور شر انگیزی کو برداشت کر لیتے۔

شیطان رشدی کی کتاب جیسے ہی لندن کی مارکیٹ میں فروخت کے لیے پہنچی تو وہاں کے مسلمانوں نے فوری طور پر اس کا نوٹس لیا اور انہوں نے اس کے خلاف احتجاجی مظاہرے شروع کر دیئے۔

29 نومبر 1988ء کو لندن میں اسلامی ملکوں کے سفیروں کا اجلاس ہوا' جس میں پاکستان' کویت اور صومالیہ کے سفیروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس کے ذمہ یہ کام سونپا گیا کہ وہ حکومت برطانیہ سے سفارتی سطح پر مذاکرات کر کے اس کتاب کی فروخت پر پابندی عائد کرائے۔

28 جنوری 1989ء کو لندن میں برطانیہ کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے کئی لاکھ مسلمانوں نے اپنے شدید غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے ایک بہت بڑا مشتعل' مگر منظم جلوس نکالا جو برطانیہ کی تاریخ میں سب سے بڑا مظاہرہ تھا' جس میں نہ صرف اس شیطانی کتاب کو ضبط کرنے کا مطالبہ کیا گیا بلکہ اس کے مصنف کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ بھی کیا گیا اور مسلم ایکشن فرنٹ (The Muslim Action Front) کی تشکیل بھی عمل میں آئی تا کہ ان مطالبات کی تکمیل کے لیے عملی اقدام کیے جائیں۔ ان مظاہروں اور اس کتاب کے مندرجات کا نوٹس لیتے ہوئے پوپ نے بھی ویٹی کن سٹی میں اس کتاب کی اشاعت' خرید اور فروخت کو ممنوع قرار دیا۔

اس کتاب کے اقتباسات جب منظر عام پر آئے تو مسلمان سراپا اضطراب بن گئے۔ پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے دل ودماغ' زبان وقلم اور رگ وپے سے اس شیطانی کتاب اور اس کے شیطان مصنف کے خلاف غم وغصہ اور نفرت کا لاوا ابلنے لگا' جس کے ہولناک نتائج کا اندازہ کرتے ہوئے ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے اس کتاب کی فوری ضبطی کا حکم دیا جس پر بلا تاخیر عمل درآمد ہوا۔ پاک وہند کے علاوہ ملائشیا' جنوبی افریقہ' مصر' سوڈان' عمان اور سعودی عرب کی حکومتوں نے بھی اس کتاب کو قابل ضبطی قرار دیا لیکن یہ کارروائی بھی مسلمانوں کے لیے وجہ تسلی نہ ہو سکی اور اس کے خلاف شدید رد عمل کے طور پر ہندوستان' پاکستان' بنگلہ دیش کے طول وعرض میں مظاہروں اور احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ برطانیہ اور امریکہ میں اس کتاب کی اشاعت روک دی جائے اور اس کتاب کے خبیث مصنف کو عبرت ناک سزا دی جائے۔ امریکہ میں بھی اس بے ہودہ اور شیطانی کتاب کے مصنف اور اس کے ناشروں کے خلاف نہ صرف وہاں کے مقیم مسلمانوں نے کھل کر احتجاج کیا' بلکہ بعض مقامات پر' جن دکانوں میں یہ کتاب فروخت ہو رہی تھی' انہیں بھی نذر آتش کرنے کی کوشش کی گئی۔ امریکہ میں یہودی لابی کے غیر معمولی کنٹرول کے باوجود غیر متعصب تعلیم یافتہ طبقہ نے

بھی وہاں کے کثیرالاشاعت اخبارات' جرائد اور رسائل میں اس کی مذمت کی۔ چنانچہ 19 جنوری 1989ء کو روزنامہ نیویارک ٹائمز اور اس کے بعد واشنگٹن ٹائمز نے اس کتاب کے خلاف تبصرے شائع کیے اور لکھا کہ یہ کتاب نہ صرف سطحی اور گھٹیا ہے بلکہ شرانگیز بھی ہے۔ اس بات سے اہل یورپ اور امریکہ ہی نہیں بلکہ ساری دنیا واقف ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک انسانی اقدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ ذاتِ ختمی مرتبت ﷺ ہے' جن کے نام و ناموس کا تحفظ ان کی اپنی ذات' جان و مال اور ملک و قوم' سب سے بڑھ کر ہے۔ مسلمان ملک و قوم اس کی حفظ و پاسبانی اس لیے کرتے ہیں کہ ان دونوں کا تعلق براہ راست اس ذاتِ گرامی سے ہے' جو انہیں ہر چیز سے عزیز تر ہے۔

یوں تو اس شیطانی کتاب نے دنیا کے تمام مسلمانوں کے جذبات کو سخت مجروح کیا تھا' لیکن ایران اور اسلامیان پاک و ہند ایک نہایت ہی اذیت ناک کرب و ابتلا سے گزر رہے تھے۔ پاکستان کے بزرگ سیاستدان نواب زادہ نصراللہ خان خبیث رشدی کی اس کمینہ حرکت پر تڑپ اٹھے۔ 7 فروری 1989ء کو ان کی تحریک استحقاق پر قومی اسمبلی نے متفقہ طور پر "شیطانی خرافات" اور اس کے مصنف کے خلاف قراردادِ مذمت منظور کی اور یہ تجویز پاس کی کہ پاکستانی حکومت برطانیہ اور امریکہ سے اس کتاب کی ضبطی اور اس کی اشاعت کو رکوانے کے لیے سفارتی سطح پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے۔

ان ہی دنوں میں مجلس تحفظِ ناموس رسالت کے سرگرم اراکین اور قائدین نواب زادہ نصراللہ خان' مولانا عبدالستار خان نیازی' مولانا فضل الرحمان' مولانا کوثر نیازی' میجر (ریٹائرڈ) محمد امین منہاس' مولانا قاری عبدالعزیز جلالی' مولانا محمد عبداللہ اور دیگر دردمند کارکنوں کا اجتماع ہوا' جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ حکومتِ امریکہ کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کرنے اور اسلامی ملکوں کو اس صورت حال سے واقف کرانے کے لیے اراکین اسمبلی' دانشوروں اور معروف دینی اور سماجی شخصیتوں کی رہنمائی میں ایک پرامن احتجاجی مظاہرہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مجلس نے ایک پروگرام بنایا کہ اسلام آباد میں ایک پرامن جلوس امریکن سنٹر تک جائے گا' جس کی وساطت سے حکومتِ امریکہ کو اسلامیان پاکستان میں اس کتاب کی اشاعت سے پیدا ہونے والے اندوہ ناک اضطراب اور گہری تشویش سے آگاہ کیا جائے گا اور اس سے یہ مطالبہ بھی کیا جائے گا کہ وہ اس فحش کتاب کی اشاعت اور فروخت پر پابندی عائد کرے جو ساری دنیا میں مسلمانوں کی دل آزاری کا باعث بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق یہ جلوس حکومت پاکستان سے اجازت حاصل کرنے کے بعد 12 فروری 1989ء کو لال مسجد آب پارہ سے نکل کر بلیو ایریا امریکن سنٹر کے قریب پہنچا تو وہاں پر متعین پولیس نے مرکزی حکومت کی ہدایات پر شرکائے

جلوس کو امریکن سنٹر میں داخل ہو کر اپنے مطالبات پہنچانے سے روکنے کے لیے درمیان میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ بالآخر حکومت اور انتظامیہ کی بے تدبیری اور سہل انگاری کی وجہ سے پولیس نے نہتے معصوم شہریوں پر اندھا دھند فائرنگ کی' جس کے نتیجہ میں سمن زارِ مصطفیٰ کے سات نونہال خونِ شہادت سے رنگین قبا ہوئے' جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

1- نوجوان طالب علم ظفر اقبال فرزند مرزا سلطان محمد پرنسپل قندیل انسٹی ٹیوٹ راولپنڈی

2- جواں سال طالب علم حافظ نوید عالم فرزند مظفر خان ساکن ایبٹ آباد

3- جواں سال طالب علم نور الہدیٰ فرزند محمد شعیب سواتی

4- جواں سال طالب علم محمد شاہد فرزند محمد یونس سکنہ راولپنڈی

5- شیر دل نوجوان حق نواز فرزند عظیم اللہ ساکن مانسہرہ

6- جان نثار نوجوان محمد ارشد فرزند محمد صادق ساکن اٹک

7- جان باز نوجوان محمد فاروق فرزند عبد اللہ خان ساکن راولپنڈی

ان کے علاوہ بے شمار جاں نثارانِ مصطفیٰ ﷺ اس فائرنگ سے زخمی اور مضروب ہوئے۔

یہ قافلۂ بلاکشانِ محبت لال مسجد سے روانہ ہوا تھا اور سینوں پر گولیاں کھا کر ساری ملت کو سرخرو کیا۔ ان میں سے کسی کی پشت پر ایک خراش تک نہیں پائی گئی۔ ان معصوم نوجوانوں کی شہادت کی خبر سارے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی۔

حکومت نے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہوئے اس المناک سانحہ کی تحقیقات کے لیے لاہور ہائی کورٹ کے فاضل جج جناب جسٹس اعجاز نثار کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا' جس نے 20 فروری 1990ء سے اس بارے انکوائری شروع کی۔ کمیشن نے 156 گواہوں کے بیانات قلم بند کیے۔ جن میں اکابرین اور شرکائے جلوس کے علاوہ انتظامیہ اور پولیس کے گواہ بھی شامل تھے۔ کمیشن کے سامنے کل 289 دستاویزات جن میں موقع واردات کی تصاویر کے علاوہ اخبارات کے تراشے اور ویڈیو فلم بھی تھی' پیش کیے گئے۔ فاضل جج نے تمام حالات اور واقعات کا انتہائی حزم و احتیاط سے جائزہ لینے کے بعد 146 صفحات پر مشتمل رپورٹ تیار کی' جو اب منظر عام پر آ چکی ہے۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس سے قبل فاضل جج موصوف نے راقم الحروف کی رٹ پٹیشن پر' جو ایسی ہی ایک قابل اعتراض کتاب (A Lamp Spreading Light) کی اشاعت کے خلاف تھی۔ اس کے مصنف راتق لوتھر اور پرنٹر پبلشرز کے خلاف توہین رسالت کے جرم میں دفعہ 295-C تعزیرات پاکستان کے تحت مقدمہ درج کرنے کا حکم صادر کیا تھا۔

سانحہ اسلام آباد کے بارے میں جو تحقیقاتی رپورٹ شائع ہوئی ہے' اس میں قانون اور انصاف کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے کمیشن جس نتیجہ پر پہنچا ہے اس کے چند اہم پہلو حسب ذیل ہیں:

یہ کہ جلوس مذہبی نوعیت کا تھا' اس کے پیش نظر کوئی سیاسی مقصد حاصل کرنا نہ تھا۔ کمیشن کی نظر میں مسلمانوں کا یہ جائز حق تھا کہ وہ ایسی شیطانی کتاب اور اس کے مصنف کے خلاف اپنے گہرے غم و غصہ اور تشویش کا اظہار کرتے۔ درحقیقت وہ جس کاز کو لے کر نکلے تھے وہ عظیم تر اور لائق ستائش تھا۔ وہ تو اپنے محبوب پیغمبر ﷺ کے حضور جذبۂ سپاس و عقیدت پیش کرنے کے لیے گئے تھے کہ ختم المرسلین ﷺ کی شان میں کسی قسم کی گستاخی ان کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

کمیشن نے پولیس کے اس موقف کو مسترد کر دیا کہ اس نے صرف ہوائی فائرنگ کی تھی اور قرار دیا کہ پولیس کو صورت حال قابو میں رکھنے کے لیے کوئی کارروائی ناگزیر تھی تو پھر بھی مظاہرین کے سینوں کا نشانہ لے کر فائرنگ کا کوئی جواز نہ تھا۔

کمیشن نے آخر میں کہا ہے کہ اس سانحہ میں جو قربانیاں دی گئی ہیں وہ بلاشبہ بہت عظیم ہیں۔ ان کے خون کی کوئی بھی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔ تاہم کمیشن نے حکومت کو یہ سفارش کی ہے کہ ان شہیدوں کے ورثاء کو کم از کم پچاس ہزار فی کس معاوضہ ادا کیا جائے' لیکن چونکہ یہ معاملہ سیاسی نوعیت کا نہ تھا اس لیے سفارش پر حکومت نے کوئی توجہ نہیں دی اور تادم تحریر مضروبین کو اور شہیدوں کے ورثاء کو کوئی خون بہا یا معاوضہ نہیں دیا گیا۔

آفرین ہے ان شہیدوں کے ماں باپ اور ورثاء پر اور مضروبین راہِ وفا پر کہ جن کا تعلق غریب اور متوسط گھرانوں سے ہونے کے باوجود حکومت کی اس بے حسی پر جب صاحب دل حضرات نے انہیں مالی امداد کی پیش کش کی تو انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ آخر ان شہیدوں کا لہو رنگ لائے بغیر نہیں رہا۔ ملت کے یہ تابندہ ستارے ہماری نظروں سے اوجھل تو ضرور ہوئے لیکن اپنے پیچھے افق پر روشنی کی ایک ایسی تابندہ لکیر چھوڑ گئے' جس کے سامنے شفق کی سرخی بھی ماند پڑ گئی۔ پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں بھی اس ملعون رشدی کے خلاف بمبئی میں' جو اس مردود کی جنم بھومی ہے' ایک عظیم الشان جلوس نکلا۔ وہاں کی پولیس نے بھی اس کی مزاحمت کی اور نہتے شہریوں کے جلوس پر فائرنگ کی' جس کے نتیجہ میں چھ سرفروشان اسلام رتبۂ شہادت سے سرفراز ہوئے اور کئی جاں نثار مضروب اور زخمی ہو گئے۔



تخت رہا نہ تاج

شاہ بلیغ الدین

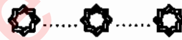
یہ 6 ہجری کی بات ہے خسرو پرویز کو اطلاع دی گئی کہ مدینے سے ایک قاصد آیا ہے۔ نوشیروان کے پوتے نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ ''مدینہ سے؟ بتایا گیا' ہاں!''

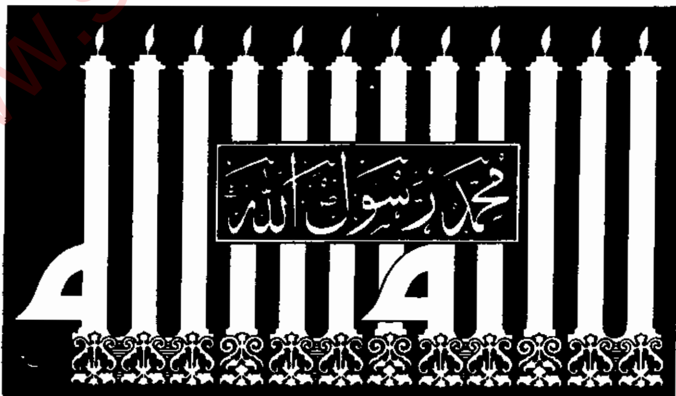
شہنشاہوں کے دربار میں سفیر' شہنشاہوں' بادشاہوں اور امیروں کی طرف سے آتے ہیں۔ یہ مدینے میں کون سی سلطنت قائم ہوئی ہے جہاں سے اب سفیر بھی آنے لگے؟ حکم دیا ''اچھا اس قاصد کو ہمارے حضور پیش کیا جائے'' عبداللہ بن خذافہؓ پیش ہوئے عرب کے صحرا نشینوں کا حلیہ...... ڈھیلے ڈھالے کپڑے' پیوند زدہ جوتیاں' شان و طمطراق کا کوئی شائبہ بھی عبداللہؓ کو چھو کر نہ گیا تھا' یہ سفیر تھا یا فقیر! دربارِ عجم کے حاضر باش خود بھی اس ہیئت سے کچھ خوش نہ تھے اور شہنشاہ کے غصے کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ پہلی ہی نظر میں بے شمار سلوٹیں اس کے ماتھے پر ابھر آئی تھیں۔ شہنشاہ نے ایک درباری سے مخاطب ہو کر کہا ''پوچھو کیا عرض کرنا چاہتا ہے؟'' درباری نے وہ الفاظ دہرائے ''کیا عرض کرنا چاہتے ہو؟'' عبداللہ بن خذافہؓ خسرو پرویز کی ذہنی کشمکش سے بالکل لاپروا آگے بڑھے اور حضور اکرم ﷺ کا نامۂ مبارک اس کے حوالے کیا۔

کیا ہے؟ خسرو نے پوچھا۔ بتایا گیا عرب میں ایک نبی ﷺ مبعوث ہوئے ہیں انہوں نے آپ کے نام ایک خط بھیجا ہے۔ نبی ﷺ! خط!!...... ہمارے نام!!! خسرو پرویز کا غصہ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ پوچھا ''کیا لکھا ہے اس میں''! خط پڑھ کر سنایا گیا۔ ''خدائے رحمٰن و رحیم کے نام سے محمد ﷺ

پیغمبر کی طرف سے کسریٰ والیٔ فارس کے نام...... یہاں تک خط پڑھا جاسکا تھا کہ خسرو کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ غصے سے کانپنے لگا۔ بولا! ''شہنشاہ فارس کا نام اپنے نام کے بعد! ہم سے یہ گستاخی! شہنشاہ عجم کی یہ تحقیر! یہ ہمارے دست نگریوں ہمارے منہ آنے لگے؟ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ عرب میں خط کا یہی طریقہ رائج ہے لیکن وہ خدائی خوار تو ادھار کھائے بیٹھا تھا کہ کسی طرح مسلمان سفیر کو شکوہ سلطانی کا جلوہ دکھائے۔ بولا بادشاہ یمن کو آج ہی حکم بھیجا جائے کہ ان پیغمبر صاحب کو جنہوں نے ہمیں یہ خط بھیجنے کی جرأت کی ہے فوراً ہمارے دربار میں پیش کیا جائے۔ نامۂ مبارک اپنے ہاتھ میں لے کر چاک کیا اور اس کے پرزے اڑا دیئے۔ ملائک نے ان پرزوں کو آنکھوں سے لگایا۔

پھر تھوڑے ہی دنوں میں دنیا نے دیکھ لیا کہ پیغام حق کس قدر قوت والا تھا۔ دس برس سے بھی کم عرصے میں اس سلطنت عجم کے پرزے اڑ گئے۔ اس کی گستاخی کی قدرت کی طرف سے یہ سزا ملی کہ چند ہی دنوں میں اس کے بیٹے شیرویہ نے اسے تخت سے اتار کر قتل کر دیا اور سولہ ہجری میں شان کسریٰ کے اس قلعہ سفید کے فرش کو عبداللہ بن خذافہؓ کے بھائی بند اپنے پیوند زدہ جوتوں سے روند رہے تھے۔ نہ وہ تخت رہا تھا نہ تاج۔





تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ

اہمیت اور تقاضے

پروفیسر محمد اکرم رضا

حضور سلطانِ دو عالم، افتخار آدم و بنی آدم جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ گرامی حسنِ صورت اور جمالِ سیرت کے لحاظ سے اس قدر اکمل اور جامع ہے کہ ازل سے ابد تک کے تمام شخصی و تہذیبی محاسن ایک جگہ پر جمع کر دیے جائیں تو پھر بھی ان کا موازنہ محبوب خدا علیہ التحیۃ والثناء کی جامع الصفات شخصیت کی ہمہ جہتی فضیلت کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے آپ کا اسم گرامی محمد (صلی اللہ وآلہ وسلم) رکھا گیا کہ آپ سے بڑھ کر کسی اور شخصیت کی تعریف و مدحت ممکن ہی نہیں ہے اور اسی لیے آپ کو "احمد" (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صفاتی نام سے پکارا گیا کہ آپ سے زیادہ اور کوئی ہستی اپنے خالق کی توصیف کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ جب ایک مسلمان عشق و عقیدت کو اپنا راہنما تسلیم کر کے اپنے آقا و مولا (علیہ التحیۃ والثناء) کی عظمتوں کا تصور کرتا ہے تو ورطہ حیرت میں کھو جاتا ہے کہ ہمارا نبی ﷺ کس قدر ارفع و اعلیٰ ہے، کس قدر بلند مرتبت اور عالی نسب ہے۔ کس قدر فضیلت مآب ہے، کس قدر محترم، مکرم اور اکرم ہے، کس قدر رحمت شعار اور ہر عالم کے لیے وجہِ افتخار ہے، کس درجہ مظہرِ الطاف کردگار ہے۔ فکر انسانی عاجز ہو کر اسی پر اکتفا کرتی ہے کہ

لَا یُمْکِنُ الثناء کما کان حقہ،
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

محبوب جس قدر بے مثال اور بے نظیر ہوگا' اس کے چاہنے والوں کے دلوں میں محبت کا جذبہ اسی قدر تیز تر اور سربلند ہوگا اور جب اس محبوب کی شخصیت اور احترام کے روشن نقوش محبِ صادق کے قلب و جان میں نقش ہو جائیں گے تو پھر یہ چاہت اپنی انتہائی سربلندیوں کو چھوتے ہوئے اس عشقِ سرمدی کا روپ اختیار کر لے گی جس کی بدولت محبوب کے ناموس اور اس کے مقام و مرتبہ پر تصدق ہو جانا ایک فطری تقاضا تصور کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سلطانِ اقالیم دو عالم جناب محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام محبوب خدا بھی ہیں اور محبوبِ خلائق بھی۔ آپ جامع الخصائل بھی ہیں اور مجمع الکمالات بھی۔ آپ نورِ خدا کا مظہر بھی ہیں اور عشاق کی چاہتوں کا مرکز بھی۔ آپ کے جمالِ جہاں آرا کو جس نے ایک مرتبہ دیکھا' دیکھتا ہی رہ گیا۔ آپ کے کمالِ سیرت کو جس نے ایک بار دل میں بسا لیا' پھر ہمیشہ کے لیے انہی کے در کا ہو کر رہ گیا۔ آپ کی حیثیت اس شمع لازوال کی تھی جس کی تب و تاب میں جملہ انبیاء و رسل کے محامد و محاسن کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ پروانے شمع کی ایک جھلک دیکھ کر قربانی و ایثار کے نام پر ایک لمحہ کے لیے بھی جھجک کا شکار نہیں ہوتے بلکہ اس کے حسن جہاں افروز پر قربان ہونے کو ہی اپنی سب سے بڑی کامرانی سمجھتے ہیں۔ حضور سرور کائنات (علیہ الصلوٰۃ والسلام) جب شمع انوارِ توحید کی صورت میں جلوہ گر ہوئے تو پھر جاں نثاریوں اور فدا کاریوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ صحابۂ کرامؓ کے دورِ سعید سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے اور انشاء اللہ ابد کی آخری ساعتوں تک ناموسِ مصطفوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر پروانہ وار نثار ہونے کا یہ جذبہ اہلِ ایمان کے دلوں کی دھڑکن بن کر سلامت رہے گا۔

تحفظِ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کی اصل روح حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ فرمانِ اقدس ہے کہ "تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا' جب تک میں اسے مال' جائیداد' اولاد' ماں باپ حتیٰ کہ اس کی اپنی زندگی سے عزیز تر نہ ہو جاؤں۔"

حفیظ جالندھری کے لفظوں میں:

محمدؐ کی محبت دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو ایماں نامکمل ہے
محمدؐ کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی
خدا کے دامنِ توحید میں آباد ہونے کی

تحفظِ ناموسِ رسالت (ﷺ) ہر صاحب ایمان کے دل کی آواز اور اس کی عقیدت کا اعزاز ہے۔ ہر مسلمان اپنے آقا و مولا (علیہ الصلوٰۃ والثناء) کی عزت و توقیر پر فدا ہونا ایمان کی بنیاد سمجھتا ہے۔

یہی تعلیماتِ قرآنی کی تاثیر ہے اور یہی احکام ربانی کی تفسیر ہے۔ عترتِ رسول (ﷺ) پر کٹ مرنا اور ناموس رسالت پر جان لٹا دینا ابدی کامرانی کی دلیل ہے۔

میں پندرھویں صدی ہجری کے پہلے عشرہ میں مادیت کی ظاہری چکاچوند اور باطل فلسفوں کی بے اساس روشنیوں سے جان بچا کر تخیل کے راہوار پر سوار عشق وعقیدت کو خضر راہ بناتے ہوئے حیاتِ مصطفوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ان ایمان افروز ادوار کا احاطہ کرتا ہوں جب مہر عالمتاب نبوت اپنے چاہنے والوں کے درمیان بنفس نفیس جلوہ گر تھا۔ ہر طرف انوار کی ضوباری تھی' فضائیں تجلی ریز تھیں تو ہوائیں عطر بیز' ہر ساعت حاصلِ زندگی تھی تو ہر لمحہ پیامِ کمالِ شوق۔ عشاق کی آنکھیں تھیں کہ سلطانِ خوبانِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلوؤں کو دیکھ کر سیری نہیں ہوتی تھیں۔ میں تاریخ کی اوٹ میں جھانکتا ہوں تو غزوۂ بدرؓ کا آوازہ میرے کانوں میں گونجتا ہے۔ یہ میرے لاشعور کی آواز ہے جو نسلاً بعد نسلاً میری سانسوں اور یادوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ میرے آقا ومولا ﷺ کفار کے مقابلے کی دعوت دیتے ہوئے انصار کے احسانات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ کفارِ مکہ کی لڑائی ہم سے ہے' تم اگر پیچھے ہٹنا چاہو تو میری طرف سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا' سب دم بخود ہیں' سانسیں رک چکی ہیں۔ معاً حضرت سعد بن عبادہؓ کی آواز گونجتی ہے:

''خدا کی قسم آپ فرمادیں تو ہم سمندر میں کود جائیں۔''

ابھی سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرحبا ہی کہا تھا کہ حضرت مقدادؓ گویا ہوئے:

''ہم قوم موسیٰ کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں۔ ہم آپ کے دائیں سے' بائیں سے' سامنے سے اور پیچھے سے لڑیں گے۔''

پھر تحفظِ ناموسِ رسالت کے نام پر بدر کا معرکہ بپا ہوتا ہے۔ نہتے افراد لوہے میں غرق افراد کو تہ تیغ کر رہے ہیں۔ دو ننھے شاہین حضرت معاذؓ اور حضرت معوذؓ مجاہدانہ یلغار کے ساتھ آگے بڑھ کر ابوجہل پر جھپٹتے ہیں اور قبل اس کے کہ وہ موت کے ان معصوم پیامبروں کے جذبے کا امتحان لینے کے لیے خود کو آمادہ کر سکے' یہ شاہین ننھی تلواروں کے ساتھ اسلام کے سب سے بڑے دشمن اور سلطانِ دو عالم (ﷺ) کے سب سے بڑے بدخواہ کو فنا فی النار کر دیتے ہیں۔ اس کا انعام انہیں یوں عطا ہوتا ہے کہ شہادت کی خلعت لہو رنگ انہیں اپنے دامن میں ڈھانپ لیتی ہے۔

یہ عقل کی نہیں' عشق کی جنگ تھی۔ یہ خرد کا نہیں' جذبے کی تپش کا معرکہ تھا' جس میں جذبۂ محبت رسول (ﷺ) کی روشن مثالیں اس کثرت کے ساتھ نظر آتی ہیں کہ عقل دم بخود ہو کر عشق کی قد آوری کے پیچھے پناہ ڈھونڈنے لگتی ہے۔ اس غزوہ میں سیدنا صدیق اکبرؓ تحفظ ناموس رسول (صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم) کے نام پر اور آپ کے بیٹے ابو جہل کی زیر قیادت لڑ رہے تھے۔ جب اس بیٹے نے اسلام قبول کر لیا تو ایک دن سیدنا صدیق اکبرؓ سے عرض کیا:

"ابا جان! آپ غزوۂ بدر میں متعدد مرتبہ میری تلوار کی زد میں آئے مگر میں نے محبت پدری سے مغلوب ہو کر تلوار کو پیچھے ہٹا لیا۔"

سیدنا صدیق اکبرؓ نے فرمایا:

"بیٹے! مجھے ربِ کعبہ اور شانِ مصطفوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قسم، تو ایک مرتبہ بھی میری تلوار کی زد میں آ جاتا تو مقام مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تحفظ کے نام پر تیری گردن اڑا دیتا۔"

تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ خدا کو کس قدر عزیز ہے؟...... میں خود سے سوال کرتا ہوں۔ معاً میرا باطن پھر مجھے اس دورِ قدسی میں لے جاتا ہے جب جنت کے گلزاروں کی بشارت دینے والے آقا ﷺ تبلیغ اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق کے مقدس مشن کو عام کرتے ہوئے مکی زندگی میں دشمنان تیرہ باطن کی طرف سے مسلط کردہ ہر قسم کے شدائد برداشت کر رہے تھے۔ ایک روز سلطانِ دوعالم (ﷺ) نے قریش مکہ کے ہجوم کو بلایا، پہلے اپنے کردار کے بارے میں دریافت کیا۔ جب بدترین مخالفین نے بھی انہیں امین اور صادق تسلیم کر لیا تو پھر انہیں توحید خداوندی اور اپنی رسالت کا سرمدی پیغام سنایا۔ بس پھر کیا تھا، آپ کے چند جاں نثاروں کے علاوہ پورا مجمع آپ پر آوازے کسنے لگا، جن میں سے بدترین آوازہ آپ کے بدبخت چچا ابولہب کا تھا جس نے ذلت کی انتہا کو چھو کر کہا:

"اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے وہ ہاتھ ٹوٹ جائیں جن سے تو نے ہمیں یہاں بلایا ہے۔"

ابولہب کے اس خبث باطن، دریدہ دہنی اور انتہائی ذلیل طرز گفتگو نے زمین و آسمان کو لرزا دیا، کرسی و عرش کپکپا اٹھے۔ وہ جس کے لبوں سے جنت کی بشارت اور شفاعت کا مژدہ عطا ہو، جس کے ہاتھ اپنے اندازِ بخشش سے گداؤں کو غنی کر دیں، اس کے بارے میں اس درجہ خرافات۔ ہر شخص مہر بہ لب تھا۔ میرے آقا خاموش تھے۔ بہت کچھ کہہ سکتے تھے مگر شان رحمۃ للعالمینی آڑے آ رہی تھی۔ آپ کے صبر اور خاموشی کا انتقام آوازۂ خداوندی نے لیا۔ اور رب کریم نے ناموسِ مصطفیٰ (ﷺ) کے مخالف سے اس درجہ سخت انداز میں خطاب کیا کہ پورے قرآن میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابولہب اور اس کے خاندان پر ابدی اور دوائمی لعنتوں کے سلگتے ہوئے پتھر برس رہے ہوں۔ خدائے جبار و قہار مصروف ارشاد تھا:

"ٹوٹ گئے ہاتھ ابولہب کے۔ اور ٹوٹ گیا وہ آپ --- کام نہ آیا اس کو مال اس کا اور نہ جو اس نے کمایا۔ اب پڑے گا ڈیک مارتی آگ میں۔ اور اس کی بیوی جو سر پر لیے پھرتی ہے ایندھن۔ اس کی گردن میں رسی ہے مونجھ کی۔" (سورۃ اللھب)

اور چشم عالم نے دیکھا کہ وہی کچھ ہوا جو ارشادِ خداوندی تھا' ابولہب ذلت و رسوائی کی موت مرا اور اس کی بیوی اس قدر عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئی کہ موت کے وقت دنیا میں ہی اس کی نظروں میں عذاب جہنم کا نقشہ کھنچ گیا۔ سچ تو یہ ہے:

مثالِ بولہب گستاخ دربارِ رسالت کے
نبیؐ سے بچ بھی جائیں تو خدا سے کیسے بچتے ہیں

(اکرم رضا)

قرآن حکیم نے جس قدر زور عظمت و شانِ مصطفوی (ﷺ) پر زور دیا ہے اور احترام محبوبِ خدا ﷺ کی جتنی تاکید کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کو ناموس حضور (ﷺ) کا تحفظ کس قدر عزیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدائے کریم قرآن میں حضور نبی کریم (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کے غیر معمولی محامد و محاسن بیان کر کے ہی آپ کے ناموسِ کے تحفظ کو ایمان کا لازمی جزو قرار دے سکتا تھا۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو قرآن حکیم حضور محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے ظاہری و باطنی کمالات کا اعلانِ عام ہے۔ آپ کی رحمت عام' آپ کی شفاعت انس و جاں کا پیغام' کہیں یٰسٓ وطٰہٰ اور مزمل و مدثر کے خطاب' کہیں آپ کے شہر مقدس کی قسم' کہیں آپ کی پسندیدہ اشیاء کی قسم' کہیں آپ کی دلی خواہش پر تبدیلی قبلہ کا حکم' کہیں آپ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دینا' کہیں آپ کو ہر قسم کے فیوض و برکات کی کثرت کا مژدہ سنانا' کہیں آپ کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کرنا اور ابتر بتانا' کہیں آپ کو "**ورفعنالک ذکرک**" کا تاج پہنانا' کہیں آپ کی اطاعت و خوشنودی بتانا' کہیں آپ کو عرش علیٰ پر بلا کر مہمان خاص کا خلعت دوام پہنانا' کہیں آپ کے ہاتھوں دین اسلام کا اکمال کر کے آپ کو رہتی دنیا تک کے لیے محسنِ اعظم کی مسند خاص پر بٹھانا اور تمام اعزازات و اکرامات عطا کر کے خود ہی آپ کی محافظت کا ذمہ اٹھانا کہ

"کافر ارادہ کرتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر خدا اپنے نور کو اکمال پذیر کر کے رہے گا۔ کفار اور منکرین شانِ رسالت اس کو نقصان پہنچانے کے لیے جو چاہے کرتے رہیں گے۔"

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اب ظاہر ہے کہ ایک صاحب ایمان اس ہستی عظیم کے ناموس اور عزت کے لیے جان لڑا سکتا ہے جو خدا کو بھی عزیز ہو اور مخلوق خدا کو بھی، جو افضل الخلائق بھی ہو اور ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' کا مصداق بھی۔ خدا اپنے ملائکہ کی جمعیت کے ساتھ جس کی شان میں رطب اللسان ہو کر فخر محسوس کر رہا ہو، ایسی عدیم النظیر ہستی پر اپنی متاع حیات لٹا کر بھی مسلمان سمجھتا ہے کہ اس نے بہت سستا سودا کیا ہے کیونکہ جس زندگی کو وہ قربان کر رہا ہے وہ تو خدا کی دی ہوئی امانت ہے جب کہ اس فدا کاری کے بدلے میں جو القابات سرمدی عطا ہو رہے ہیں، وہ ایک جان کیا ہزاروں زندگیوں کی مجموعی قدر و قیمت سے کہیں زیادہ افضل و سربلند ہیں۔

اس لیے جب ہم تحفظِ ناموسِ رسالت کے جذبے کی اصل، مقام مصطفیٰ (علیہ التحیۃ والثناء) کی رفعتوں کو قرار دیتے ہیں تو یہ عقدہ ایک آن میں حل ہو جاتا ہے کہ تحفظِ مقام حضور (ﷺ) پر قربان ہونے والے کیوں مسکراتے ہوئے موت کی وادیوں کی طرف چلتے رہے۔ موت اس کائنات کی سب سے بھیانک حقیقت ہے مگر عشاقِ مصطفیٰ (علیہ الصلوٰۃ والثناء) کے لیے موت کی حیثیت فقط ایک پُل کی تھی جسے عبور کر کے حبیب اپنے حبیب سے جا ملتا تھا۔

تحفظِ ناموسِ رسالت مآب ﷺ کا احساس دل کی خلوتوں سے ابھرتا، آنکھوں سے عقیدت کے آنسوؤں کا خراج لیتا، جذبات کو ناموس حضور (ﷺ) پر مر مٹنے کے لیے آمادہ کرتا اور سر کو درگاہِ رسول (ﷺ) پر فدا کاری کے آداب سکھاتا ہے۔ ماضی ہو یا حال، یا حال کی کوکھ سے ابھرنے والا مستقبل، ہر لحظہ ہر آن امتِ مصطفوی (ﷺ) کے پیش نظر اپنے آقا و مولا (علیہ التحیۃ والثناء) کی عزت و ناموس پر کٹ مرنے کا جذبہ موجود رہا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا، عشق و عقیدت کی کٹھن راہوں پر وہی چل سکتا ہے جس کے دل میں مقام مصطفیٰ (ﷺ) کی شمع پوری ایمانی تب و تاب کے ساتھ جل رہی ہو۔ ہم عقیدت و احترام کے حوالے سے عشاقِ رسول (ﷺ) کے کارواں کے سالار سیدنا امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ایک تاریخی حقیقت کا جائزہ لیتے ہیں:

''ایک مرتبہ خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی نے رسول (ﷺ) کی مسجد میں امام مالکؒ سے مناظرہ کیا۔ اثنائے مناظرہ میں آواز بلند کی۔ حضرت امام نے فرمایا اے امیر المومنین! اس مسجد میں اپنی آوازوں کو بلند مت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یوں ادب سکھایا ہے کہ اپنی آواز حضور نبی کریم ﷺ کی آواز سے پست رکھا کرو۔ حضور ﷺ کا احترام وفات شریف کے بعد بھی ویسا ہی ضروری ہے جیسا حالتِ حیات میں تھا۔ یہ سن کر ابو جعفر دھیما پڑ گیا اور کہنے لگا۔ امام مالکؒ! کیا میں قبلہ رُو ہو کر دعا مانگوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب منہ کروں۔ امام مالکؒ نے جواب دیا کہ تم رسول ﷺ کی طرف

سے اپنا منہ کیوں پھیرتے ہو حالانکہ وہ قیامت کے دن تمہارے اور تمہارے باپ آدم کے وسیلہ ہیں' بلکہ تم حضور ﷺ ہی کی طرف منہ کرو اور آپ ہی کے وسیلے سے دعا مانگو اللہ تعالیٰ قبول کرے گا۔ کیونکہ ارشاد باری ہے "اور اگر یہ لوگ جس وقت اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں' آپ کے پاس آتے اور خدا سے بخشش مانگتے اور پیغمبر ان کے لیے بخشش مانگتے تو وہ اللہ کو معاف کرنے والا مہربان پاتے۔" (شفا شریف۔ وفاء الوفا جزو اول)

اسی طرح ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اگر مسجد نبوی (ﷺ) کے گرد کسی مکان میں میخ ٹھونکنے کی آواز سنتیں تو کہلا بھیجتیں کہ رسول کریم (ﷺ) کو اذیت نہ دو۔ سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے اپنے گھر کے دونوں کواڑ مناصع میں بند کرائے کہ مبادا لکڑی کی تیاری میں اس کی آواز سے رسول (ﷺ) کو اذیت پہنچے۔ (وفاء الوفا جزو اول)

حضرت نافع روایت کرتے ہیں کہ عشاء کے وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسجد نبوی (ﷺ) میں تھے۔ ایک شخص کے ہنسنے کی آواز کان میں آئی۔ آپ نے اسے بلا کر پوچھا' تم کون ہو؟ اس نے اپنا تعلق بنو ثقیف سے بتایا۔ سیدنا عمرؓ نے پھر پوچھا کیا تم اس شہر کے رہنے والے ہو؟ اس نے کہا کہ میں طائف کا رہنے والا ہوں۔ یہ سن کر آپ نے اسے دھمکایا کہ اگر تم مدینہ کے رہنے والے ہوتے تو میں تمہیں سزا دیتا۔ اس مسجد میں آوازیں بلند نہیں کی جاتیں۔ (وفاء الوفا)

سیدنا امام مالک علیہ الرحمہ نے تمام عمر مدینہ منورہ میں بسر کی۔ بپاسِ ادب کبھی مدینہ شریف کے حرم کی حد میں بول و براز نہیں کیا۔ (شفاء شریف)

غرضیکہ کس کس صاحب نظر کا تذکرہ کیا جائے۔ وہاں تو حیات مصطفیٰ (ﷺ) کا تصور ہی احترام وعقیدت کی حد تھا کہ حضور (ﷺ) ہماری آوازوں کو اسی طرح سماعت فرما رہے ہیں جس طرح حیات ظاہری میں فرماتے تھے۔ اور اسی لیے وہ بلند آہنگ لہجے میں بات کرتے ہوئے اس احساس کے ساتھ لرز اٹھتے تھے کہ کہیں گستاخی کا ارتکاب نہ ہو جائے کیونکہ یہاں تو یہ تمنا مچل رہی ہوتی ہے کہ

اپنی پلکوں سے در یار پہ دستک دینا
اونچی آواز ہوئی' عمر کا سرمایہ گیا

اس تناظر میں یہ امر مسلمہ ہے کہ محب اسی محبوب پر اپنی جان قربان کرتا ہے جو صورت و سیرت میں اکمل ترین ہے اور جو اس کی ظاہری آنکھوں سے نہاں ہو کر بھی اس کے قلب و جاں میں عیاں ہے' جس نے ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کے لیے عشاق کی نگاہیں ہمیشہ ہجر کی نمی سے وضو کرتی رہتی ہیں مگر جب قرآن حکیم کے مقدس متن کے پیش منظر میں جھانکتے ہیں تو اس محبوب رب لم یزل کا نوری سراپا' نگاہ

باطن کو خیرہ کرنے لگتا ہے۔ دراصل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ باطنی اور آپ کی بے عیب شخصیت کا تصور ہی وہ قوت ہے جو چاہنے والوں کے دلوں میں ہر آن موجزن رہتی ہے۔ یہی قوت کبھی عشق و عقیدت کا روپ اختیار کرتی ہے اور کبھی محبت و وارفتگی کے نام پر جاں سپردگی کے آداب سکھاتی ہے۔ کبھی مردہ رگوں میں خونِ زندگی بن کر دوڑتی اور کبھی بنجر دلوں کی کھیتیوں کو شہیدِ الفت مولانا کفایت علی کافی رحمۃ اللہ علیہ کے جذبۂ شہادت کے نام پر احساسات عشق حضور (ﷺ) کے اس گلاب کی تازگی عطا کرتی ہے کہ

کوئی گل باقی رہے گا' نے چمن رہ جائے گا
پر رسولؐ اللہ کا دینِ حسن رہ جائے گا

اس وقت جب کہ میں تحفظِ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کے نام پر تاریخ و احادیث کے حوالے سے جگمگاتے ہوئے ستاروں کو یکجا کر کے انہیں ایک کہکشاں کا روپ دینے کی کوشش کر رہا ہوں تو میرے سامنے نکہت و نور کی اس طرح جلوہ گری نظر آتی ہے کہ میری باطنی نگاہیں تاریخ کی اوٹ میں پناہ لے کر بھی اس کی لمعہ افشانیوں کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ میں ماضی' حال اور مستقبل کے حوالے سے تاریخی حقائق کو ترتیب کا روپ دینا چاہتا ہوں مگر عشق و عقیدت کے ایمان افروز نظائر اپنی اپنی اولیت اور زمانی و مکانی فوقیت ثابت کرنے کے لیے میرے خامۂ عاجز اور ذہن ناپختہ کی سعی کو آزمائش میں ڈال دیتے ہیں۔ عشاقِ حضور (ﷺ) واقعات اور تحفظ مقام مصطفیٰ (علیہ التحیۃ والثناء) کے نام پر قربانیوں کو ترتیب دینا مجھے اپنے بس سے باہر نظر آتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ چودہ صدیوں کے ایمان افروز افق پر تواتر سے بکھری ہوئی داستانِ عقیدت کو ترتیب دینا کیسے آتا ہے۔ یہاں تو قدم قدم پر جان کی بازی لگتی ہے' دل و جان نذر کرنے پڑتے ہیں' خرد کی تیرہ شبی سے جان چھڑا کر جنوں کی فداکاری کو شعار بنانا پڑتا ہے۔ یہاں لفظوں کی مناجات نہیں بلکہ عمل کی سوغات مقبول ہوتی ہے' یہاں اشعار کے بے رنگ گجرے نہیں بلکہ شہادت کے لہو رنگ گلدستے باریاب ہوتے ہیں:

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

میں تخیل کو پھر خضرِ راہ بناتا ہوں' مجھے کہیں سیدنا زیدؓ اور کہیں سیدنا خبیبؓ کفار کے نرغے میں نظر آتے ہیں۔ ایک منظم سازش ہے کہ مسلم مبلغین' حفاظ اور شارحینِ دین مصطفیٰ (ﷺ) کو کسی نہ کسی بہانے مدینہ منورہ سے دور دراز کی بستیوں میں لے جا کر شہید کر دیا جائے۔ یہ عشاق سرمست اپنے آقا و مولا (علیہ التحیۃ والثناء) سے اجازت طلب کر کے جاتے ہیں مگر نگاہوں میں ہمہ وقت آپ ہی کے

جلوے ہیں۔ کفار سیدنا زیدؓ کو اپنی بستی میں لے جا کر ظلم و تشدد کی انتہا کر دیتے ہیں' انہیں کانٹوں پر گھسیٹا جاتا ہے' پتھروں کی بارش کی جاتی ہے' لباس تار تار ہے تو جسم فگار' ہر بن مو سے لہو رس رہا ہے' میلوں تک گھسیٹ کر لے جانے کے بعد ایک میدان کو ان کا مقتل بنا دیا جاتا ہے' سولی گاڑ دی جاتی ہے۔ کفار کا سردار نہایت تکبر سے پوچھتا ہے کہ

''زید! اب تو تم کہتے ہو گے کہ میں نے اسلام قبول کیوں کیا اور کاش اس وقت پھانسی کے پھندے میں میری گردن نہ ہوتی بلکہ محمد کی گردن ہوتی'' (نعوذ باللہ)

تو اس وقت زیدؓ نے اپنے جسم کی بکھرتی ہوئی قوتوں کو یکجا کیا' پھانسی کے پھندے کو راہِ وفا کا نذرانہ سمجھ کر قبول کرتے ہوئے جو جواب دیا وہ قیامت تک ناموسِ مصطفیٰ (ﷺ) کے لیے جان لٹانے والوں کو عقیدت کا چلن سکھاتا رہے گا۔ میں پلکوں کے کناروں پر لرزاں آنسوؤں کو روک کر تاریخ کی زبان سے سیدنا زید کا یہ جواب سن کر اپنی نامسلمانی پر پشیماں ہونے لگتا ہوں کہ

مجھے ہو ناز قسمت پر اگر نام محمدؐ پر
یہ سر کٹ جائے اور تیرا سر پا اس کو ٹھکرائے
یہ سب کچھ ہے گوارا' پر یہ دیکھا جا نہیں سکتا
کہ ان کے پاؤں کے تلوے میں اک کانٹا بھی چبھ جائے

اور پھر تاریخ کے حوالے سے تحفظِ ناموسِ مصطفیٰ (ﷺ) کا زرّیں عنوان بن کر مجھے غزوۂ احد کا وہ مجاہد یاد آتا ہے جو زخموں سے چور ہے۔ اس کے جسم کا کوئی عضو ایسا نہیں جہاں تیروں اور تلواروں کے زخم نہ لگے ہوں' اس پر نزع کا عالم طاری ہے۔ اس کے ساتھی اسے پانی پلانے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ کہتا ہے کہ میری آخری تمنا رخِ مصطفیٰ (علیہ التحیۃ والثناء) کی زیارت ہے کہ جس کے لیے قربان ہو رہا ہوں' آخری سانسوں میں وہ سامنے ہو۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملتی ہے۔ آپ اس مجاہد کی طرف چلتے ہیں۔ ادھر سے وہ اپنی بکھرتی ہوئی سانسوں کی ڈوری کو سمیٹتے ہوئے محبوب دو عالم (ﷺ) کی طرف لپکتا ہے۔ گھسٹتے گھسٹتے وہ سلطانِ دو عالم ﷺ کے قریب پہنچ گیا۔ میرے آقا (علیہ التحیۃ والثناء) کی چشمِ رحمت نواز نے اس کی طرف دیکھا۔ اس بجھتے ہوئے چراغ میں زمانے بھر کی روشنی سمٹ آئی۔ اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے حضور (ﷺ) کی طرف دیکھا۔ محبوب و محب کی نگاہیں ملیں۔ دونوں طرف آنسو تھے۔ ایک طرف کے آنسوؤں میں رحمتِ بے کراں کی جلوہ سامانی تھی تو دوسری طرف کے اشکوں میں سرخروئی کی شادمانی۔

پھر اسی غزوۂ اُحد کے حوالے سے مجھے وہ جواں ہمت' بلند بخت اور سعید قسمت خاتون تحفظِ

ناموسِ سرکار ﷺ کا ایک نیا عنوان رقم کرتی نظر آتی ہے جو اس غزوہ میں سلطانِ دو عالم کی شہادت کی افواہ سن کر مدینہ سے روتی ہوئی چل پڑی تھی۔ راستے میں لوگ ملتے گئے۔ کسی نے کہا تمہارا باپ شہید ہو گیا' کسی نے خاوند اور بھائیوں کی شہادت کی خبر سنائی تو کسی نے بیٹوں کی شہادت کے بارے میں آگاہ کیا۔ وہ خاتون ان سب کی شہادت پر ''الحمدللہ' الحمدللہ' کا آوازہ بلند کرتی ہوئی فقط یہی سوال کرتی رہی کہ

''میرے لیے خوشی کا مقام ہے کہ میرے خاندان کا ہر فرد ناموسِ رسالت ﷺ پر تصدق ہو گیا۔ مگر میں نے تم سے ان کے بارے میں پوچھا ہی کب ہے۔ مجھے تو یہ بتاؤ کہ حضور رحمۃ للعالمین (ﷺ) کیسے ہیں؟''

اور پھر اسے سامنے سے آقائے دو عالم ﷺ تشریف لاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ادبار کے بادل چھٹ گئے ہوں' رنج و آلام مٹ گئے ہوں' مصائب کا خاتمہ ہو گیا ہو---اس کی بے چین روح کو یکلخت قرار آ گیا ہو۔ بے قرار ساحلِ تمنا کو سکون کی دولت عطا ہو گئی' اس کے آنسوؤں کے جھرنے یکلخت تھم گئے۔ اس مقام پر حفیظ جالندھری میرے اور اس محسنِ اسلام خاتون کے درمیان حائل ہو کر ترجمانی کا فریضہ سنبھال لیتے ہیں:

نظر آیا کہ ہاں جلوہ فگن نورِ تجلی ہے
پکار اٹھا کہ اب میری تسلی ہی تسلی ہے
تسلی ہے' پناہِ بے کساں زندہ سلامت ہے
کوئی پرواہ نہیں' سارا جہاں زندہ سلامت ہے

ماضی اور حال میرے سامنے گڈمڈ ہو رہے ہیں۔ میں دبی ہوئی راکھ میں چنگاریاں تلاش کر رہا ہوں۔ میں خرد گزیدہ ہوں اس لیے اس کوشش میں ہوں کہ انگلیاں جھلسنے نہ پائیں۔ عصر حاضر کا کتنا بڑا فریب ہے۔ تحفظِ ناموسِ مصطفیٰ (ﷺ) کی صدا بھی بلند کی جائے اور قربانی و ایثار کو قصہ پارینہ سمجھ کر صرف چند الفاظ کو ہی متاعِ سرخروئی تصور کر لیا جائے۔ مصلحت کو امام اور خرد کو چراغِ راہ سمجھ لیا جائے۔ کتنا بہادر' وجیہ اور تاریخ ساز تھا نواسۂ رسولؐ جو اپنے تمام خاندان کی زندگیوں کے سرمائے کو ایک مالا میں پرو کر کربلا کی تپتی ہوئی سرزمین پر لے آیا تھا۔ جسے نجانے کس کس نے روکا ہو گا مگر وہ تو راکبِ دوشِ نبوت تھا' جگر گوشۂ مصطفیٰ (ﷺ) اور نورِ فاطمۃ الزہراؓ تھا۔ اسے فقط ایک ہی احساس دامن گیر تھا کہ یہ وقت امتحان ہے۔ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ پر اس سے زیادہ کٹھن وقت اور کیا آئے گا کہ شعائرِ اسلام کی حرمت کو پامال کر دیا جائے۔ ملوکیت کے ٹوٹے ہوئے بت پھر سے کعبہ کی پاسبانی کا فریضہ سنبھال لیں۔ اس شہزادۂ گلگوں قبا شہسوارِ کربلا نے' جسے دنیا حسین (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے نام سے پکارتی ہے' اپنی جان

ہی قربان نہیں کی بلکہ گلستان نبوت کی ایک ایک کلی نذرِ خزاں کر دی۔ ناموس مصطفیٰ (ﷺ) کے لیے یہ اتنی بڑی قربانی ہے کہ میں چاہوں بھی تو اس کی تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ یہاں تو قلم لرزنے اور وجدان کانپنے لگتا ہے۔ تصور دم توڑنے اور تخیل فریاد کناں ہونے لگتا ہے اور میں روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ''صلوا علیہ وآلہٖ'' کا ورد کرتا ہوا عہدِ حال میں لوٹ آتا ہوں کیونکہ

تھی داستان طویل بھی اور دل گداز بھی
لیکن کہاں یہ دل کہ دیا جائے اس کو طول

ماضی سے حال کی جانب تاریخ کا سفر جاری ہے۔ یہ روشنی کا سفر ہے۔ کہیں کہیں ایسے فرعونوں کی آوازیں ابھرتی ہیں جو''انا ولا غیری'' کے طلسم کا شکار ہو کر ناموسِ مصطفیٰ (علیہ التحیۃ والثنا) پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں مگر فوراً ہی وقت کی بساط پر ایسے فدا کاران ﷺ بھی ابھرتے ہیں جو ان فرعونوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ناموسِ مصطفیٰ (ﷺ) کا پرچم اس بلندی پر لہرا دیتے ہیں کہ طاغوتی قوتوں کا ہر جھگڑا اسے سرنگوں کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ جیسی شخصیات ناموسِ رسالت (ﷺ) کے چراغ کو ایک لحظہ کے لیے بھی گل نہیں ہونے دیتیں۔ حتیٰ کہ انگریزی استبدادیت کے مہیب سائے برصغیر پاک و ہند کے مسلم تشخص کو ختم کر کے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

برطانوی سامراج نے اگرچہ 1857ء کی جنگ آزادی جیت لی تھی مگر وہ اس حقیقت سے بہرہ ور ہو چکا تھا کہ اس کے مظالم مسلمانوں کو تو کچل سکتے ہیں مگر ان کے باطن میں پوشیدہ روحِ اسلام کو مٹا نہیں سکتے۔ وہ مولانا کفایت علی کافی، مولانا غلام امام شہید، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا عنایت اللہ کاکوروی، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا احمد اللہ مدراسی اور جنرل بخت خاں (رحمہم اللہ تعالیٰ) کی صورت میں شمع ناموسِ رسالت ﷺ کے پروانوں کی فدا کاری کا لافانی جذبہ دیکھ چکا تھا اور اس نے سمجھ لیا تھا کہ

وہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

یہی ''روحِ محمدؐ '' ہے جسے ہم تحفظِ ناموسِ رسالت کے جذبے کا دوسرا نام دے سکتے ہیں۔ اس مقصد کی خاطر اس نے تہذیب و تمدن کے کتنے ہی جال پھیلائے۔ حرص و آز اور مصلحت اندیشی کے سبق پڑھائے۔ ہندو عفریت نے برطانوی سامراج کا پورا پورا ساتھ دیا۔ ہر دو باطل قوتوں کی ایک ہی تمنا تھی کہ مسلمان اپنے ماضی سے دستبردار ہو کر ہندو قومیت سے رشتہ استوار کر لیں۔ مگر یہاں شیخ احمد

سرہندی، امام احمد رضا فاضل بریلوی، حضرت علامہ محمد اقبال (رحمہم اللہ تعالیٰ) کی تعلیمات دلوں کو اسلامی نظریاتی تشخص کی قدر و قیمت سے بہرہ ور کر رہی تھیں۔ مسلمانوں پر انتہائی کٹھن وقت تھا۔ ایک طرف برطانوی استعماریت کی قہر سامانیوں اور دوسری طرف ہندو سامراج کی ازلی اسلام دشمنی --- ان سب کے ساتھ ساتھ، قومیت پرست علماء کا نظریۂ وطنیت اور پھر اس پر مستزاد آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کی خانہ ساز نبوت --- کلمۂ حق کہنے پر زبان کٹتی تھی، غلامانِ رسول (ﷺ) پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ ان تمام اسلام دشمن قوتوں کا ایک ہی مدعا تھا کہ اسلامیانِ ہند کے باطن سے اس جذبے کو کھرچ کر ختم کر دو جو ناموسِ رسالت ﷺ پر معمولی سا حرف بھی برداشت نہیں کر سکتا اور جب میدانِ وفا میں آگے بڑھتا ہے تو قلت و کثرت، نتائج اور انجام و عواقب سے بے نیاز ہو کر فقط محبت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ناموسِ مصطفیٰ (ﷺ) ہی کو مقدم جانتا ہے۔

اس جذبۂ محبت رسول (ﷺ) کو ختم کرنے کے لیے اور مسلمانوں کی پرسکون زندگی کو تہ و بالا کرنے کے لیے انگریزوں اور ہندوؤں نے وقت کے سمندر میں کتنے ہی پتھر پھینکے مگر وہ مسلمانوں کے جذبۂ عشقِ رسول (ﷺ) کو ختم نہ کر سکے۔ مختلف ادوار میں غیرتِ اسلامی سے بہرہ ور اصحابِ ایمان آگے بڑھتے رہے اور ہر ایک شاتم رسولؐ کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرتے رہے، حتیٰ کہ راجپال نے ''رنگیلا رسول'' کی صورت میں بحرِ سکون پذیر میں ایک بہت بھاری پتھر دے مارا۔

اگر محبان رسول ﷺ اس چوٹ کو برداشت کر جاتے تو پھر ناموس رسالت پر پے بہ پے حملوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ مگر غازی خدا بخشؒ اور غازی عبدالعزیزؒ کے بعد ناموسِ رسالت ﷺ کے عظیم پاسدار غازی علم الدینؒ شہید نے راجپال کو اس طرح سے کیفر کردار تک پہنچایا کہ پھر کسی کو راجپال کہلانے یا کسی گستاخ رسولؐ کو ناموسِ مصطفیٰ (ﷺ) کے تقدس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اس ایک مردِ حق نے وہ کام کر دکھایا جو بعض اوقات ایک منظم سپاہ سے بھی ممکن نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی ناموسِ رسالتؐ کی بالاتری کا اعجاز ہے کہ اس دورِ پُر آشوب میں

ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

غازی علم الدین شہیدؒ تو عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے نام پر فدا ہو گئے مگر ہمارے لیے پیغام چھوڑ گئے کہ محبت رسول (ﷺ) فقط زبانی دعاوی کا نام نہیں یہ تو موت کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا دوسرا نام ہے۔ آج غازی علم الدین شہیدؒ کا نام محض ایک شخص کا نام نہیں بلکہ یہ تو جرأت و ہمت کا استعارہ ہے، حمیت اسلامی کا شہپارہ ہے، شوکت ایمان کی تنویر ہے، تحفظِ ناموسِ رسالت کی عملی تفسیر ہے۔ وقت کے قرطاس پر خون کی دھاروں سے نقش لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ رقم کرنے کا فسانہ ہے، اپنے آقا و مولا صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غلاموں کی وابستگی کا جذبہ بیکراں ہے۔

تاریخ اسلام کے بطل جلیل غازی علم الدین شہیدؒ کی وساطت سے عہد حال کے ظلمت کدوں کو منور کرتے ہوئے جہاں میں اس فخر سے سرشار ہوتا ہوں کہ میں نے غازی علم الدین علیہ الرحمہ کی صدی پائی ہے وہاں یہ احساس مجھے انتہائی مضمحل اور میرے فکری اعصاب کو بوجھل اور خستہ کر دیتا ہے کہ غازی علم الدین شہیدؒ نے اپنی لہو رنگ قربانی سے تحفظِ ناموسِ مصطفوی (ﷺ) کی جو داستان رقم کی تھی اس کے اجالے ماند نہ پڑ جائیں۔ غازی علیہ الرحمہ نے تو اس وقت سامراجی قوتوں کے قلعے میں شگاف ڈال دیا تھا جب مسلمان انتہائی مجبور و بے بس اور محکوم و لاچار تھے۔ مگر آج تو ہم ایک آزاد مملکت کے شہری ہیں۔ مملکت خداداد پاکستان غازی علم الدین شہیدؒ اور ان جیسے دوسرے عشاقِ مصطفیٰ (علیہ التحیۃ والثناء) کی قربانیوں کا ثمرہ ہے--- مگر اس ملک میں جو کہ فقط اور فقط اسلام اور حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر حاصل کیا گیا تھا' تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے لیے ہم نے اب تک کیا کیا ہے؟؟

O--- کیا اب بھی ایسی دل آزار تحریریں نہیں لکھی جا رہیں جس سے ناموس رسالتمآب (ﷺ) پر زد پڑتی ہے؟

O--- کیا وقت کے راجپالوں نے اپنے لیے نئے نئے روپ اور چہرے تلاش نہیں کر لیے؟

O--- شرار بولہبی کے مقابلے میں ہم اپنی مصلحت اندیشیوں کی بدولت چراغ مصطفوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی لو کو مدھم کرنے کا باعث تو نہیں بن رہے؟

O--- تقسیم ہند سے قبل کوئی غیر مسلم حضور (ﷺ) کی شان میں معمولی گستاخی کرتا تھا تو پوری امت اسلامیہ کا غیض و غضب آتش فشاں بن جاتا تھا۔ آج اس سے بڑا ظلم اپنوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ مگر ہم ہیں کہ دلوں سے عشق کی آگ کے بجھنے کا آخری منظر دیکھنے کے متمنی بنے بیٹھے ہیں!

O--- پہلے تحفظِ ناموسِ رسالتؐ پوری امت مسلمہ کی غیرت کا امتحان تھا مگر اب ہم نے اسے بھی فرقہ واریت کی نذر تو نہیں کر دیا؟

O--- ایک شیطان رُشدی شیطانی خرافات لکھ کر مسلمانوں کے جذبات اور ناموس و عزتِ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کھیل کر ہماری حمیت کے لٹنے کا تماشا دیکھ رہا ہے اور ہم بے بسی کے آنسوؤں میں ڈوب کر سوچ رہے ہیں کہ کیا غازی علم الدین شہیدؒ ہی ہماری اسلامی حمیت کے ترکش کا ''خدنگِ آخریں'' تھا اور کیا اپنی اس بے چارگی کو من حیث القوم تسلیم کر کے اپنی صدیوں کی غیرت مندانہ روایات سے دستکش تو نہیں ہو چکے؟

کتنے ہی سوالات ہیں جو تحفظِ ناموسِ مصطفیٰ (ﷺ) کے حوالے سے ہمیں جھنجھوڑتے ہیں۔ مگر ہم نے اپنی خرد کو رہن غیر کر کے اپنی متاعِ فکر کو متاعِ رائیگاں سمجھ لیا ہے۔ ہمارے احساسات پر آہستہ آہستہ مصلحت اندیشی کا کہر جمتا جا رہا ہے۔ لیکن تاریخ اس حقیقتِ ازلی کی شاہد ہے کہ عشقِ سرورِ کونین (ﷺ) محض وقتی جذبہ نہیں بلکہ یہ تو لاہوتی اور سرمدی نغمہ ہے جو زمان و مکان کے فاصلوں اور تاریخی مسافتوں کو ایک آن میں ختم کر کے غلاموں کا رشتہ اس آقا و مولا (علیہ التحیۃ والثناء) سے جوڑ دیتا ہے جس کی رحمۃ للعالمینی ہر دور کے خستہ سامانوں کو جینے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ عشقِ رسول (ﷺ) کبھی فنا نہیں ہوتا۔ ہمارا رسول (ﷺ) لافانی ہے۔ اس کے اقوال و ارشادات' فرمودات اور احکام غیر فانی ہیں۔ اس کی سیرت کے نقوش دائمی اور اس کے وجود کا احساس ہمارے اپنے وجود کے ہونے کی دلیل ہے۔۔۔ وہ ہے تو سب کچھ ہے۔ اس سے کٹ کر ہماری حیثیت ذرۂ ریگ سے بھی کمتر ہے۔ اسی مظہرِ انوارِ خدا ﷺ کی محبت' اس کی لاثانی شخصیت کا اظہار اور اس کے لطف فرماتے ہوئے باطنی وجود کا اقرار ہی تشکیک و اوہام کے سایوں کو ختم کر کے ہمیں اس کے ناموس کی حفاظت کے انداز عطا کر سکتا ہے۔



ادب گاہیست زیرِ آسماں ، از عرش نازک تر
نفس گُم کردہ می آید ، جُنید و بایزید ایں جا

حفاظت ناموسِ حضور ﷺ کی اہمیت

سید محمد سلطان شاہ

ہر انسان کو اپنی عزت و ناموس بڑی عزیز ہوتی ہے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے مال و دولت تو در کنار، جان کی بھی پروا نہیں کرتا۔ لوگ تو ان کی آبرو کا تحفظ بھی اپنی ذمہ داری گردانتے ہیں جن سے ان کا کوئی نسبی تعلق ہو یا جن سے انہوں نے رشتۂ محبت و عقیدت استوار کر لیا ہو۔ محب اپنے محبوب کی شان میں ذرا سی گستاخی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر اس کو یہ علم ہو کہ اسے جو عزت ملی ہے وہ اس ذات کی وجہ سے ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ ہستی دنیا و عقبیٰ میں کبھی اس کی عزت پر آنچ نہیں آنے دے گی۔ تو ایسی ہستی کے تحفظِ ناموس کی خاطر وہ کیوں نہ کٹ مرے۔ روح و قالب کا رشتہ توڑ کر ایسی ہستی سے رشتہ جوڑ لینا انسانیت کی معراج ہے۔

جس طرح ہم اپنے پیاروں کی شان میں کی گئی گستاخی برداشت نہیں کرتے، اسی طرح اللہ تعالیٰ جل شانہٗ بھی اپنے حبیب مکرم، رسولِ معظم، احمدِ مجتبیٰ، محمدِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی توہین و تضحیک برداشت نہیں کرتے۔ اس کا ارتکاب کرنے والے شخص کے لیے دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

سورۂ توبہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

والذین یُؤْذُونَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (التوبہ:9:61)

(جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایذا دیتے ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے)

ایک اور مقام پر رسولِ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اذیت دینا اللہ تعالیٰ کو اذیت دینا قرار دیا گیا

اور ایسے شخص کو "عـذابًا مُّهِينًا" کے لیے تیار رہنے کا حکم ہے۔ آخرت میں ہی نہیں دُنیا میں بھی لعنت کا طوق ایسے شخص کے زیب گلو رہے گا۔

اِنَّ الـذين يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّلَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا (الاحزاب 57:33)

(بے شک جو ایذا دیتے ہیں اللہ کو اور اس کے رسول (ﷺ) کو ان پر اللہ کی لعنت ہے دنیا میں اور آخرت میں اور اللہ نے ان کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے)

اللہ تعالیٰ تو اپنے محبوبِ مکرم، حبیب معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سے اونچی آواز بھی پسند نہیں کرتے اور مومنوں کو حکم دیتے ہیں:

لَاتَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (الحجرات 2:49)

(اپنی آواز اونچی نہ کرو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز سے)

صرف یہ حکم ہی نہیں دیا بلکہ یہ وعید بھی سنا دی کہ اگر تم نے اس کا ارتکاب کیا تو اعمال ضائع کروا بیٹھو گے۔

جس شخص نے اپنے قول یا فعل سے آنحضرت (ﷺ) کو تکلیف دی، اللہ تعالیٰ نے اس سے بدلہ ضرور لیا۔ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے صاحبزادے حضرت قاسم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مکہ میں اور حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا مدینے میں انتقال ہو گیا تو عاص بن وائل نے کہا کہ ان کی اولادِ نرینہ زندہ نہیں رہی۔ اس لیے آپ (ﷺ) کے بعد آپ کا نام ختم ہو جائے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورہ کوثر نازل فرمائی اور عاص بن وائل کے "اَبْتَرْ" ہونے کی خبر دی۔ دیکھیے حضور سید المرسلین رحمۃ للعالمین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو لاولد ہونے کا طعنہ دینے والے کو اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے منقطع النسل بنا دیا۔ اسی طرح ابولہب آپ (ﷺ) سے بڑی عداوت رکھتا تھا۔ جب حضور ختمی المرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوہ صفا پر چڑھ کر لوگوں کو پکارا۔ اور انہیں توحیدِ باری تعالیٰ کا درس دیا تو ابولہب نے کہا۔ "تو برباد ہو جائے۔ کیا تو نے ہمیں یہی سنانے کو جمع کیا تھا؟" اس پر خالقِ ارض وسما نے اس کی تباہی و بربادی کا یوں اعلان فرمایا:

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ . (سورہ لہب: 1)

(ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ برباد ہو جائے)

چنانچہ ابولہب غزوۂ بدر کے ایک ہفتہ بعد ایک متعدی بیماری کا شکار ہو گیا۔ مرنے کے بعد تین دن تک اس کی نعش بے گور و کفن پڑی رہی۔ کوئی عزیز رشتے دار قریب نہ آیا۔ یہاں تک کہ اس کی نعش سے بدبو آنے لگی اور گھر والوں نے مزدوروں کو بلا کر اس کی نعش کو ایک گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال

دی۔ ابولہب کے دو بیٹوں سے حضور سرورِ کونین ﷺ کی دو صاحبزادیوں کا نکاح ہوا تھا۔ جنہوں نے آپ ﷺ کو دکھ پہنچانے کے بعد طلاق دے دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ نے اپنے پیارے حبیبؐ کو دکھ پہنچانے والے فرزندانِ کفر کو بھی ذلیل و خوار کیا اور ان میں سے ایک' عتبہ کو شیر نے پھاڑ ڈالا۔ اسی طرح ابولہب کی بیوی جنگل سے کانٹے لا کر حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ افضل التحیۃ واجمل الثناء کے راستے میں بچھایا کرتی تھی۔ ایک دن کانٹوں کا بوجھ لاتے ہوئے راستے میں کھجور کی چھال کا رسہ اس کے گلے میں پھنس گیا' جس سے وہیں واصلِ جہنم ہو گئی۔

ولید بن مغیرہ نے رحمتِ مجسم' محسنِ اعظم' رسولِ اکرم ﷺ کو ''مجنون'' کہہ دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا کہ اے میرے محبوب! آپ ہرگز مجنون نہیں اور پھر ولید لعین کے تمام خصائلِ سیاہ گنوائے۔ اس کی تمام خامیاں گنوانے کے بعد "بَعْدَ ذٰلِکَ زَنِیْم" کہہ کر اس کے ولد الزنا ہونے کا برملا اعلان کر دیا۔

شہنشاہِ ایران خسرو پرویز کو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ایک مکتوب کے ذریعے اسلام کی دعوت دی۔ وہ آپ (ﷺ) کا نامہ مبارک پڑھ کر برہم ہو گیا اور بے ادبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مکتوبِ گرامی کو پھاڑ ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے ہی بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل کروا کر رسوا کیا۔
حضورِ اکرم ﷺ کے خاندان بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور کرنے کے لیے دستاویز بغیض بن عامر نے لکھی تھی۔ اس پر عتابِ الٰہی نازل ہوا اور اس کے ہاتھ شل ہو گئے۔

دراصل ایمان نام ہے محبتِ رسول (ﷺ) کا۔ حُبِ رسول (ﷺ) کے بغیر ایمان کی تکمیل ناممکن ہے بلکہ مسلمان ہونے کی شرطِ اوّلین' محبتِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء ہے۔ بخاری شریف کتاب الایمان میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ o

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین اور اولاد اور سب لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔

بخاری شریف ہی میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ ایک روز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا۔ بے شک آپ سوائے میری جان کے جو دونوں پہلوؤں میں ہے' میرے نزدیک ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں۔ حضور خیر الانام علیہ التحیۃ والتسلیم نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی شخص ہرگز مومن نہیں بن سکتا' جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کی جان سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ یہ سن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر کتاب

نازل فرمائی' آپ میرے نزدیک میری جان سے جو میرے دونوں پہلوؤں میں ہے' زیادہ محبوب ہیں۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا۔ ''اے عمرؓ! اب تمہارا ایمان کامل ہو گیا۔'' اس سے پتا چلا کہ حضور سید المرسلین ﷺ کو جان سے زیادہ محبوب رکھے بغیر ہم مسلمان نہیں ہو سکتے اور جو ہستی جان سے بھی عزیز ہو' اس کی شان میں دریدہ دہنی کیونکر برداشت کی جا سکتی ہے۔ اسی لیے عشاقِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء نے وقت آنے پر اپنی جانوں کی پروا نہیں کی اور اپنے آقا و مولا (ﷺ) کے خلاف بھونکنے والے کتوں کا خاتمہ کر کے دم لیا ہے۔ بے شک انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں' انہیں تختۂ دار پر بھی لٹکنا پڑا۔ لیکن انہوں نے کبھی اپنے آقا و مولا (ﷺ) کی توہین و تضحیک برداشت نہ کی۔

سنن ابوداؤد میں ہے کہ ایک نابینا صحابی نے اپنی بیوی کو اس لیے قتل کر دیا کہ وہ سرکارِ دو جہاں کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کرتی تھی۔ حضورِ اقدس نے اس صحابی کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اس عورت کا خون رائگاں ہے۔ اسی طرح عبداللہ بن خطل حضور سرورِ کونین کی ہجو میں اشعار کہتا تھا۔ فرتنا اور قریبہ اس کی دو باندیاں تھیں جو اس کے اشعار گایا کرتی تھیں۔ فتح مکہ کے دن اس نے مسجد حرام میں پناہ لی اور کعبہ کے پردوں سے لٹک گیا۔ لیکن اسے مسجد حرام ہی میں قتل کر دیا گیا۔ اور اس کی ایک باندی قریبہ کو بھی اس جرم کی سزا میں لقمۂ اجل بننا پڑا کہ وہ اہانت رسول (ﷺ) کا ارتکاب کرتی تھی۔

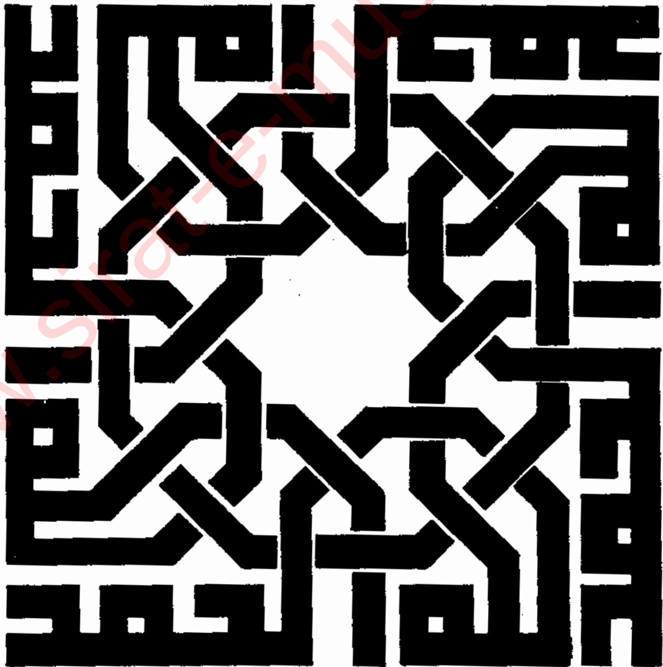
شفاء شریف میں قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا کہ مدینہ طیبہ کی مٹی خراب ہے۔ حضرت امام مالک رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے فتویٰ دیا کہ اسے تیس دُرے مارے جائیں اور قید کیا جائے اور فرمایا کہ ایسا شخص تو اس لائق ہے کہ اس کی گردن ماری جائے۔ وہ زمین جس میں رسول اللہ ﷺ آرام فرما رہے ہیں' اس کی نسبت وہ گمان کرتا ہے کہ وہ خراب ہے۔

اسی طرح امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے ایک شخص نے کدُو کے بارے میں کہا۔ انا ما احبہ' (میں اس کو پسند نہیں کرتا) یہ سن کر امام موصوف نے تلوار کھینچ لی اور فرمایا۔ ''تجدید ایمان کرو ورنہ میں تمہیں ضرور قتل کروں گا۔''

اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ اپنے محبوب بندوں سے عداوت رکھنے والوں کے لیے اعلانِ جنگ فرماتے ہیں۔ حضورِ اکرم تو رب ذوالجلال کو سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ ان سے عداوت رکھنے والے' ان کی اہانت و تضحیک کرنے والے سے جنگ کرنا سنت اللہ ہے جس پر عمل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ حضور سرورِ کونین کی شان سے فروتر الفاظ کہنے یا لکھنے والے کو ہرگز معاف نہیں کرنا چاہیے لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں ناموسِ رسالت کے لیے چلنے والی تحریکیں درحقیقت کسی اور مقصد کے حصول کے لیے چلتی

ہیں۔ میں شاتم رسولؐ سلمان رشدی کے خلاف تحریک چلانے اور انتظامیہ کے ہاتھوں بے گناہ مسلمانوں کا خون ضائع کروانے والوں سے سوال کرتا ہوں' کیا سلمان رُشدی لعین اب زندہ نہیں ہے؟ اس تحریک کے رہنما وزیر بننے کے بعد تحفظِ ناموسِ رسالت کیوں بھول گئے ہیں؟ کیا اس تحریک کا اصل مقصد تحفظِ ناموسِ رسالت ہے یا حصول اقتدار؟ برادران اسلام ذرا غور فرمایئے اور غیرت ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے غازی علم دینؒ بن کر شاہین کی طرح رشدی پر جھپٹیے اور اس کا قلع قمع کر کے دم لیجئے ورنہ تمہارے تحفظ ناموس رسالت کے دعوے اور تحریکیں بے سود ہیں' بالکل بے سود۔





توہینِ رسالت ﷺ کی سزا

حاجی نواب الدین گولڑوی

- إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَ رَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا o (الاحزاب 57)
- وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ o (التوبہ 61)

مندرجہ بالا آیات کی رو سے رسول اللہ ﷺ کو ایذا پہنچانے والے کی سزا دنیا میں لعنت و رسوائی اور آخرت میں دردناک عذاب۔ اور یہ عذاب خواہ بے ادبی، گستاخی، سب وشتم کی صورت میں ہو یا جنگ وجدل کی صورت میں اور جمہور اہل اسلام کے نزدیک ایسے شخص کی سزا دنیا میں قتل ہے خواہ وہ شخص کلمہ گو ہو، کافر و مشرک ہو یا کتابی۔ یہاں پر چند ایک فتوے لکھنا مناسب ہوگا۔

مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے اپنی کتاب "الشہاب الثاقب" صفحہ 50 پر بحوالہ لطائف رشیدیہ صفحہ 22 درج کیا ہے:

1۔ "جو الفاظ موہم[1] تحقیر سرور کائنات علیہ السلام ہوں، اگرچہ کہنے والے نے نیت حقارت کی نہ

---

[1] يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ o (سورہ البقرہ 104) لفظ راعنا کا معنی "ہماری رعایت فرماؤ" ہے۔ مگر یہودی اور منافق راعنا کی ع کو کھینچ کر پڑھتے (راعینا) جس کا معنی "ہمارا چرواہا" ہوتا ہے۔ چونکہ اس لفظ کا ایک معنی توہین رسالت پر مبنی تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے راعنا کی بجائے لفظ انظرنا استعمال کرنے کو کہا اور فرمایا اب کوئی راعنا کہے گا تو کافر ہو جائے گا اور کافر کے لیے دردناک عذاب ہے۔

کی ہو مگر ان سے بھی کہنے والا کافر ہو جاتا ہے۔"

آخر میں فرمایا کہ بس ان کلماتِ کفر کے بکنے والے کو منع کرنا شدید چاہیے اگر مقدور رہو اور اگر باز نہ آئے قتل کرنا چاہیے کہ موذی گستاخ شانِ جناب کبریا تعالیٰ شانہ اور اس کے رسولِ امین (ﷺ) کا ہے۔ انتہی کلامہ الشریف

2۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کاشمیری تحریر فرماتے ہیں: "بارگاہِ انبیاء میں گستاخی کفر ہے' چاہے اس سے قائل کی مراد توہین کی نہ بھی ہو۔" (بحوالہ مقدمہ دعوتِ فکر ص 20)

3۔ "کل امت کا اس پر اجماع ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ناروا الفاظ کہنے والا کافر ہے اور جو شخص اس کے کفر میں شک کرے' وہ بھی کافر ہے۔"

(انور شاہ کشمیری' مولانا: اکفار الملحدین فی ضروریات الدین ص 43 مطبوعہ دہلی 1350ھ)

4۔ "انبیاء علیہم السلام کی تعظیم کرنی اور توہین نہ کرنا ضروریاتِ دین سے ہے۔"

(جناب مولوی مرتضیٰ حسن صاحب دربھنگی ناظم تعلیمات دار العلوم دیوبند "اشد العذاب" ص 9) نیز ص 10 پر لکھتے ہیں کہ "ضروریاتِ دین سے انکار کرنے والا' انبیاء کی توہین کرنے والے کو کافر نہ کہنا اور احتیاط کرنا خود کفر ہے۔ مسلمان خوب سمجھ لیں کہ اکثر لوگ اس میں احتیاط کرتے ہیں حالانکہ احتیاط یہی ہے کہ منکر ضروریاتِ دین اور انبیاء کی توہین کرنے والے منافقین کو کافر کہا جائے ورنہ کیا حضور علیہ السلام کے زمانہ کے منافقین سب کچھ فرائض و واجبات ادا نہ کرتے تھے اور کیا وہ اہلِ قبلہ نہ تھے۔ بس حکم یہی ہے کہ ایسے لوگوں کو کافر کہا جائے آسمان ٹلے' زمین ٹلے' یہ حکم نہیں ٹل سکتا۔"

5۔ ان تمام تصریحات کے بعد اب کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ یہ بات واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ ضروریاتِ دین کا منکر کافر ہے۔ ایک بات تفصیل طلب رہ جاتی ہے کہ ضروریاتِ دین کی تاویل کرنے والا کس زمرہ میں ہے؟ آیا وہ بھی کافر ہوگا یا نہیں؟ اس سلسلے میں مولانا انور شاہ کشمیری کی رائے یہ ہے کہ ضروریاتِ دین کا منکر کافر ہے اور اس میں تاویل کرنے والا بھی کافر ہے۔

(محمد رضوان اللہ پروفیسر: مولانا انور شاہ کشمیری ص 227 مطبوعہ علی گڑھ 1974ء) شفاء شریف میں ہے: "صریح لفظ میں تاویل کا دعویٰ نہیں سنا جاتا۔"

شرح شفا قاری میں ہے: "ایسا دعویٰ شریعت میں مردود ہے۔"

نسیم الریاض میں ہے: "ایسی تاویل کی طرف التفات نہ ہوگا اور وہ ہذیانا سمجھی جائے گی۔"

اب ایسے ہی لوگوں کا حشر ملاحظہ ہو:

1۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک پیش امام ہمیشہ قرأت جہری میں سورۃ عبس وتولی کی تلاوت کرتا۔ مقتدیوں کی شکایت پر اسے طلب کیا گیا اور پوچھا کہ تم ہمیشہ یہی سورۃ تلاوت کیوں کرتے ہو؟ کہنے لگا۔ ''مجھے حظ آتا ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جھڑکا ہے۔'' اس پر اس کا سر قلم کر دیا گیا۔

علامہ حقی لکھتے ہیں کہ ''حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ ایک امام ہمیشہ نماز میں اسی سورت (عبس وتولی) کی قرأت کرتا ہے تو آپ نے ایک آدمی بھیجا' جس نے اس کا سر قلم کر دیا۔ چونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ عالیہ کی تنقیص کے ارادے سے اس کی قرأت کیا کرتا تاکہ مقتدیوں کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کم ہو جائے۔ اس لیے نگاہِ فاروقی میں وہ مرتد تھا اور مرتد واجب القتل ہوتا ہے (بحوالہ روح البیان)

اسی طرح بخاری جلد سوم کے باب 1029 میں حضرت ابن عمرؓ زہری اور ابراہیم رضی اللہ عنہم نے کہا کہ مرتد مرد اور مرتد عورت قتل کر دی جائے اگر توبہ نہ کرے۔ ان میں نادہندگانِ زکوٰۃ بھی شامل ہیں' جیسا باب 1030 بخاری جلد سوم میں تحریر ہے۔ اور اسی طرح حدیث 1815 ایک یہودی کو قتل کر دیا گیا جو اسلام لانے کے بعد پھر یہودی ہو گیا۔

2۔ زیر آیت 60 سورۃ النساء کے حاشیہ صدر الافاضل میں درج ہے کہ:

بشر نامی ایک منافق کا ایک یہودی سے جھگڑا تھا۔ یہودی نے کہا کہ چلو سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے طے کرالیں۔ منافق نے خیال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بے رعایت محض حق فیصلہ دیں گے۔ اس کا مطلب حاصل نہ ہوگا۔ اس لیے اس نے باوجود مدعیِ ایمان ہونے کے کہا کہ کعب بن اشرف یہودی کو پنچ بناؤ (قرآن کریم میں طاغوت سے اس کعب بن اشرف یہودی کے پاس فیصلہ لے جانا مراد ہے۔) یہودی جانتا تھا کہ کعب رشوت خور ہے۔ اس لیے اس نے باوجود ہم مذہب ہونے کے اس کو پنچ تسلیم نہ کیا۔ ناچار منافق کو فیصلہ کے لیے سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور آنا پڑا۔ حضور علیہ السلام نے جو فیصلہ دیا' وہ یہودی کے موافق ہوا۔ یہاں سے فیصلہ سننے کے بعد پھر منافق یہودی کے درپے ہوا اور اُسے مجبور کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لایا۔ یہودی نے آپ سے عرض کیا کہ میرا اس کا معاملہ سید عالم ﷺ طے فرما چکے ہیں لیکن یہ حضور کے فیصلہ سے راضی نہیں۔ آپ سے فیصلہ چاہتا ہے۔ فرمایا۔ ہاں میں ابھی آ کر اس کا فیصلہ کرتا ہوں۔ یہ فرما کر مکان میں تشریف لے گئے اور تلوار لا کر اس کو قتل کر دیا اور فرمایا جو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ سے راضی نہ ہو اس کا میرے پاس یہ فیصلہ ہے اور ایسا ہی تفسیر مظہری میں درج ہے۔

3۔ ضیاء القرآن میں سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 28 کے تحت لکھا ہے

مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ عقبہ بن ابی معیط جب کبھی سفر سے واپس آتا تو دعوتِ عام کرتا جس میں اہل مکہ شریک ہوتے۔ یہ اکثر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا حضور کی باتیں سنتا اور انہیں پسند کرتا۔ ایک دفعہ وہ سفر سے واپس آیا تو اس نے حسب دستور دعوتِ عام کا اہتمام کیا اور حضور علیہ السلام کو بھی دعوت دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ جب تک تُو مشرف باسلام نہ ہو میں تیری دعوت قبول نہیں کروں گا۔ چنانچہ اس نے کلمہ شہادت پڑھا اور اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ ابی بن خلف سے عقبہ کا بڑا یارانہ تھا۔ اس نے سنا تو آ کر کہا۔ اے عقبہ! سنا ہے تو مرتد ہو گیا ہے۔ اس نے کہا ہرگز نہیں' میں نے محض ایک غرض کے لیے اسلام کا اظہار کیا ہے۔ ابی کہنے لگا' میں تم سے اس وقت تک راضی نہیں ہوں گا' جب تک تو اس کے پاس جا کر ایسی ایسی گستاخیاں نہ کرے۔ عقبہ اپنے یار کو خوش کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گیا اور وہ ساری گستاخیاں کیں جن کی فرمائش اس کے یار نے کی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے رخ انور پر تھوک دیا۔ (معاذ اللہ) لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی تھوک کو آگ کا انگارا بنا کر لوٹایا اور اس کے منہ پر دے مارا جس سے اس کا منہ جل گیا اور مرتے دم تک گالوں پر داغ رہا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ جب سرزمین مکہ سے باہر تیری ملاقات ہو گی تو علوت راسک بالصیف تیرا سر تلوار سے اُڑا دوں گا۔ یہ بات اس کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گئی۔ کئی سال بعد جب اہل مکہ' بدر کی طرف جانے لگے تو اس نے پہلو تہی کرنا چاہی۔ اور کہا تم کو معلوم ہے اس شخص نے مجھے جو دھمکی دی تھی اور جو بات ان کے منہ سے نکلتی ہے' پوری ہو کر رہتی ہے۔ مجھے یہیں رہنے دو۔ انہوں نے کہا تم بھی عجیب آدمی ہو۔ پہلے تو اس کے غالب آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر بالفرض محال کوئی ایسی صورت پیش آ بھی گئی تو تمہارے پاس تیز رفتار سرخ اونٹ ہے اور اس پر سوار ہو کر جانا۔ چنانچہ اسے اپنی بدبختی لے گئی۔ کفر کو شکست ہوئی' یہ اپنے اونٹ کو لے کر بھاگا لیکن وادیوں کے پیچ و خم میں الجھ کر رہ گیا اور گرفتار کر لیا گیا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ' نے اس کا سر قلم کر دیا۔ قیامت کے روز یہ جب قبر سے اٹھے گا تو اس کی حسرت و ندامت کی یہ حالت ہو گی جو اس آیہ مذکور میں ہے: یٰوَیۡلَتٰی لَیۡتَنِیۡ لَمۡ اَتَّخِذۡ فُلَانًا خَلِیۡلًا ٥ (الفرقان 28) ہائے افسوس! کاش نہ بنایا ہوتا میں نے فلاں کو دوست اپنا۔

آگے مدارج النبوت II ص 224 سے نقل ذیل ہے:

4۔ اب رہا ابی بن خلف کا قصہ! تو کسی وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ تیرا قاتل میں ہوں گا۔ یہ خوف اس کے دل میں یقین کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ لہذا قریش کے مکہ سے

خروج کے وقت اُحد کی جانب وہ آنا نہ چاہتا تھا کہ کہیں وہ مارا نہ جائے۔ ابوسفیان اسے اصرار کر کے لایا تھا۔ اس کا قصہ یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ اسیرانِ بدر میں شامل تھا۔ جب اس کا فدیہ قبول کیا گیا تو اس نے مکہ جانے کی اجازت پائی تا کہ وہ فدیہ ادا کرے۔ اس بے حیا نے لوٹتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روبرو بکواس کی کہ اے محمد (ﷺ) میرا ایک گھوڑا ہے۔ میں اسے خوب دانہ پانی دوں گا تا کہ فربہ ہو جائے۔ پھر اس گھوڑے پر سوار ہو کر آپ سے جنگ کروں گا اور آپ کو (خاک بدہن) قتل کروں گا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا بلکہ اس گھوڑے پر سوار ہونے کی حالت میں ہی میں تجھے قتل کروں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ علما فرماتے ہیں کہ بدترین خلق اور بدترین مخلوق وہ ہے جسے حضور قتل کریں۔

روزِ اُحد حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''ابی بن خلف سے ہوشیار رہو کیونکہ یہ ناخلف' بے خبری میں پیچھے سے نہ آ جائے۔ اگر تمہیں وہ نظر آ جائے تو مجھے بتا دینا۔'' اچانک جنگ کے آخر میں وہ اپنے گھوڑے پر سوار نمودار ہوا۔ جب اس کی نظر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پڑی' تو اس نے نالائقی کی باتیں کہنی شروع کر دیں۔ اس نے کہا' اے محمد (ﷺ) آپ ابی کے ہاتھ سے نہ بچ سکیں گے۔ اگر آج آپ میرے ہاتھ سے بچ گئے تو......'' یہ کتنا بے حیا اور بے شرم تھا کہ باوجود اس اعتقاد کے کہ خود حضور علیہ السلام کے ہاتھ سے مارا جائے گا' پھر بھی لاف زنی کرتا تھا۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! ہمیں اشارہ فرمایئے' ہم اس پر حملہ کریں اور اسے دوزخ میں پہنچائیں۔'' جب یہ ملعون قریب پہنچا۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ حضور علیہ السلام کے پاس قریب ہی کھڑے تھے۔ حضور علیہ السلام نے ان سے نیزہ لیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حارث بن الصمہ سے نیزہ لیا اور ابی کی طرف پھینکا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اسی کا نیزہ اس کے ہاتھ سے لے کر اس پر پھینکا' یہ اس شقی کی گردن پر پڑا۔ اسی وقت اس نے اپنے گھوڑے کی لگام پھیری اور اپنی قوم سے مل گیا اور خود کو گھوڑے سے گرا دیا۔ اور گائے بیلوں کی مانند ڈکرانے لگا۔ اس کی قوم نے اس سے کہا۔ ''تیرا زخم تو ایک معمولی سی خراش سے زیادہ نہیں۔ اتنی چیخ و پکار اور واویلا کیوں کرتا ہے؟ اس نے کہا تمہیں معلوم ہے کہ یہ زخم کس کی مار کا ہے؟ میں واقف ہوں کہ اس زخم سے میری جان نہ بچ سکے گی۔ اگر یہ زخم جو مجھ اکیلے کو لگا ہے تمام حجاز والوں کو لگ جائے تو وہ یک بارگی سب کے سب مر جائیں۔ اس لیے کہ محمد (ﷺ) میرے منہ پر کھجور کو گٹھلی بھی مار دیتے تو بھی میں مارا جاتا۔ وہ یونہی چیختا چلاتا رہا۔ پھر وہ ملعون مشرکوں کے مکہ مکرمہ پہنچنے سے پہلے مرالظہران میں جو مکہ سے ایک منزل پر ہے' واصلِ جہنم ہو گیا۔

(مدارج النبوۃ حصہ دوم صفحہ 224 تا 225 'مدینہ پبلشنگ کمپنی ایم اے جناح روڈ کراچی)

5۔ محدث کبیر امام ابویعلیٰ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کی تخریج

فرمائی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مدینے میں ایک بڑا عابد وزاہد نوجوان تھا۔ ہم نے ایک دن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپ اسے نہیں جان سکے۔ پھر اس کے حالات واوصاف بیان کیے، جب بھی آپ اسے نہیں پہچان سکے۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ اچانک سامنے آ گیا۔ جیسے ہی اس پر نظر پڑی ہم نے حضور علیہ السلام کو خبر دی کہ یہ وہی نوجوان ہے۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا اور ارشاد فرمایا۔ "میں اس کے چہرے پر شیطان کی خارش کے دھبے دیکھ رہا ہوں۔ اتنے میں وہ آپ کے قریب آ گیا اور سلام کیا۔ حضور علیہ السلام نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کیا یہ بات صحیح نہیں کہ تو ابھی اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ تجھ سے بہتر یہاں کوئی نہیں۔ اس نے جواب دیا ہاں۔ اس کے بعد جیسے ہی وہ مسجد کے اندر داخل ہوا، حضور علیہ السلام نے آواز دی کہ کون اسے قتل کرتا ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ میں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ جب اس ارادے سے وہ مسجد میں داخل ہوئے تو اسے نماز پڑھتے دیکھ کر واپس لوٹ آئے، اور اپنے دل میں خیال کیا کہ ایک نمازی کو کیسے قتل کردوں جبکہ حضور علیہ السلام نے نمازی کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ پھر حضور علیہ السلام نے آواز دی۔ کون اسے قتل کرتا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ میں یارسول اللہ۔ جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تو اس وقت وہ نوجوان سجدے کی حالت میں تھا۔ وہ بھی اسے نماز پڑھتا دیکھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح واپس لوٹ آئے۔ پھر حضور علیہ السلام نے آواز دی کہ کون اسے قتل کرتا ہے؟ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جواب دیا۔ میں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا تم اسے ضرور قتل کرو گے بشرطیکہ وہ تمہیں مل جائے۔ لیکن جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ مسجد کے اندر داخل ہوئے، وہ جا چکا تھا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اگر تم اسے قتل کر دیتے تو میری امت کے جملہ فتنہ پردازوں میں سے یہ پہلا اور آخری شخص ثابت ہوتا۔ میری امت کے دو افراد بھی آپس میں کبھی نہ لڑتے۔ (بحوالہ ابریز شریف ص 227)

حضور علیہ السلام نے فتح مکہ پر اہل مکہ کو امان دے دی۔ مگر ایک جماعت کے لیے حکم صادر فرمایا کہ حل وحرم میں جہاں بھی پائے جائیں قتل[1] کر دیئے جائیں۔ اگر چہ غلاف کعبہ میں لپٹے ہوں۔ آج کے دن حرم بھی میرے لیے حلال ہے۔ ان میں چار مرد قتل کیے گئے، اور سات نے پناہ مانگ لی اور چار

---

[1] اس موقع پر آپ نے خطبہ فرمایا کہ اللہ نے مکہ کو حرم بنایا ہے، لوگوں نے نہیں بنایا ہے کہ جب جی چاہا حلال کر لیا اور جب جی چاہا حرام اور جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے مکہ میں خونریزی کرنا اور درخت کاٹنا جائز نہیں۔ اگر کوئی رسول اللہ ﷺ کے فتح مکہ کے دن قتال سے استدلال کرے تو تم اسے یہ جواب دو کہ اللہ نے اپنے رسول کو اس کی اجازت دی تھی اور تمہیں اجازت نہیں دی اور مجھے بھی صرف بہت تھوڑی دیر کے لیے اجازت دی تھی اور پھر آج اس کی حرمت ویسی ہی لوٹ آئی جیسی کل تھی اور یہ بات موجود لوگوں اور غیر موجودوں کو پہنچا دیں۔ (بخاری شریف 2/639 دینی کتاب خانہ لاہور)

عورتیں ماری گئیں اور دو کو پناہ دے دی گئی۔

(مدارج النبوت حصہ دوم ص 494 بحوالہ مواہب الدنیا)

6۔ابن خطل کا قتل

یہ فتح مکہ سے پہلے مدینہ آیا اور مسلمان ہو گیا۔اس کے بعد حضور علیہ السلام نے اسے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بعض قبیلوں کی طرف بھیجا۔اس کے ساتھ ایک انصاری تھا اور اس کے ساتھ ایک خزاعی مسلمان خدمتگاری میں تھا۔وہ ایک منزل میں اترا اور خزاعی کو حکم دیا کہ ایک بکری کو ذبح کر کے اس کے لیے کھانا تیار کرے اور وہ خود سو گیا۔اس خزاعی نے بھی خدمت میں کوتاہی کی' وہ بھی سو گیا اور کھانا تیار نہ کر سکا۔جب دیکھا کہ کھانا تیار نہیں ہوا تو غصہ میں آ کر خزاعی کو قتل کر دیا اور صدقہ کے جانور لے کر اہل مکہ (کفار) سے جا ملا اور ان سے کہا کہ تمہارے دین کو میں نے محمد (ﷺ) کے دین سے بہتر پایا۔ اور وہ اپنی باندیوں سے حضور علیہ السلام کی ہجو سنا کرتا۔جب مکہ فتح ہوا تو اس نے خانہ کعبہ میں پناہ لی اور غلاف کعبہ سے لپٹ گیا۔جس وقت حضور علیہ السلام طواف فرما رہے تھے' کسی صحابی نے اسے دیکھ لیا۔ اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ ابن خطل ہے اور غلافِ کعبہ سے لپٹا ہوا ہے۔فرمایا! جہاں ہو قتل کرو۔تو فرمان کے مطابق قتل کر دیا گیا۔سعید بن خریث نے بروایت ابو عثمان نہدی ابن ابی شیبہ سے نقل کیا ہے کہ اسے ابو برزہ رضی اللہ عنہ نے قتل کیا۔(مدارج النبوت ص 494 و بخاری شریف 2/614 مطبوعہ اسلام آباد 2/631 دینی کتاب خانہ اردو بازار لاہور و تاریخ طبری' ص 399 مطبع نفیس اکادمی کراچی)

7۔حویرث بن نقید کا قتل

یہ ایک شقی شاعر تھا اور بارگاہِ رسالت کی بڑی ہجو کرتا تھا۔روزِ فتح مکہ جب اپنا مباح الدم ہونا سنا تو گھر میں بیٹھ گیا اور گھر کا دروازہ بند کر لیا۔علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے اس کے گھر آ کر اسے تلاش کیا' لوگوں نے کہا' صحرا چلا گیا ہے۔حویرث نے جب جانا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس کی طلب میں آئے ہیں تو ٹھہرا رہا' یہاں تک کہ علی مرتضیٰؓ اس کے گھر سے دور چلے گئے تو وہ گھر سے نکلا اور چاہا کہ کسی دوسرے گھر میں جا چھپے۔حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو وہ ایک کوچہ میں مل گیا اور اس کی گردن اڑا دی۔(مدارج النبوۃ 92/499 و تاریخ طبری 1/399)

8۔مقیس بن صبابہ کا قتل

اس نے اپنے بھائی کی دیت لینے کے باوجود انصاری کو شہید کر دیا اور مرتد ہو کر مکہ چلا گیا۔ روزِ فتح مکہ وہ مشرکوں کی ایک جماعت کے ساتھ کسی گوشہ میں شراب پینے میں مشغول تھا۔حضور علیہ

السلام نے اس کے قتل کا حکم فرمایا۔ اس پر تمیلہ بن عبداللہ لیثی نے اسے قتل کر دیا۔
(مدراج النبوۃ 500/2 وتاریخ طبری 399/1)

9۔ حارث بن طلاطلا کا قتل

یہ بھی حضور علیہ السلام کو ایذا دینے والوں میں سے تھا۔ فتح مکہ کے دن سیدنا علی مرتضی کرم اللہ وجہہٗ نے اس پر قابو پا کر قتل کیا۔ (مدارج النبوۃ 501/2)

10۔ قریبہ اور ارنب کا قتل

یہ دونوں باندیاں ابن خطل کی گانے والیاں تھیں جو حضور علیہ السلام کی ہجو گایا کرتی تھیں، قتل کر دی گئیں۔ اس کی ایک باندی قرتنا بھاگ گئی۔ لوگوں نے اس کے لیے حضور علیہ السلام سے امان مانگی۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے امان دے دی۔ پھر وہ آئی اور مسلمان ہو گئی۔ (مدارج النبوۃ 506/2)

11۔ سارہ بنی المطلب کی باندی

بعض کے نزدیک یہ عمرو بن ہشام کی باندی تھی۔ یہ وہ عورت ہے جس کے ہاتھ حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش کے نام خط لکھ بھیجا تھا۔ یہ مرتد ہو کر مکہ میں آ گئی تھی اور روزِ فتح مکہ حضرت علیؓ کے ہاتھ سے ماری گئی تھی۔ (مدارج النبوۃ 507/2 حوالہ روضۃ الاحباب)

12۔ اُم سعد کا قتل

یہ عورت بھی قتل کی گئی۔ (مدارج النبوۃ 507/2)

13۔ 70 اسیران بدر میں سے صرف عقبہ بن ابی معیط جس کا ذکر اوپر گزرا اور نضر بن حارث دشمن رسول کو بحکم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل کیا گیا۔ (سیرۃ النبیؐ 329/1 طابع سعید اینڈ کمپنی کراچی)

گستاخ یہودیوں کا قتل

14۔ عصماء بنت مروان زوجۂ یزید بن خطمی یہودی

یہ بہت زبان دراز تھی۔ اسلام اور اہلِ اسلام کی برائیاں اور مذمت کرتی رہتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم کو برابر ایذا پہنچاتی رہتی تھی۔ آپ نے حضرت عمیر بن عدی نابینا صحابی رضی اللہ عنہ کو اس کے قتل کے لیے بھیجا۔ حضرت عمیرؓ رات کو عصماء کے گھر پہنچے جو مدینہ سے باہر تھا۔ وہ اپنے

بچوں کو دودھ پلا رہی تھی۔ حضرت عمیرؓ نے اپنی تلوار اس کے سینہ پر رکھ کر پشت سے گزار دی اور اسی رات لوٹ آئے۔ (مدارج النبوۃ 176/2)

15۔ ابی عفکہ

یہ یہودی بہت بوڑھا جس کی عمر 120 سال کو پہنچ چکی تھی۔ یہ حضور علیہ السلام کے خلاف لوگوں کو ورغلاتا اور ابھارتا تھا اور ایسے شعر پڑھتا تھا جس میں لوگوں کو حضور ﷺ سے نفرت ہو جانے کی ترغیب ہوتی تھی۔ حضور علیہ السلام نے حضرت سالم بن عمیر رضی اللہ عنہ کو اس کے قتل کے لیے بھیجا۔ حضرت سالم اس کی طرف گئے اور اپنی تلوار اس کے جگر کے نیچے گھونپی اور اسے چرخ کر دیا۔ وہ دشمن خدا چیخا اور جان دے دی۔ (مدارج النبوۃ 178/2 بحوالہ مواہب الدنیا)

16۔ کعب بن اشرف کا قتل

یہ شاعر تھا جو رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی ہجو میں مشغول رہتا تھا اور کفار قریش کو جنگ کی ترغیب دیتا تھا۔ حضور ﷺ نے دعا کی' یا اللہ! ابن اشرف کے شر سے ہمیں بچا۔ امام بخاری نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کون ہے جو کعب بن اشرف کو قتل کرنے کے لیے تیار ہے اس لیے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتا ہے۔ چنانچہ حضرت محمد بن مسلمہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا' یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ پسند فرماتے ہیں کہ میں اسے ہلاک کروں؟ فرمایا ہاں۔ آپ کے ساتھ حضرت حارث بن اوس رضی اللہ عنہ بھی گئے' جنہوں نے اسے قتل کیا اور اس کا سر کاٹ کر حضور علیہ السلام کے قدموں پر ذلت اور حقارت کے ساتھ ڈالا۔

(مدراج النبوۃ 185/2 تا 187)

17۔ ابو رافع کا قتل

یہ بھی حضور علیہ السلام اور مسلمانوں کو ایذا پہنچانے میں مشغول رہتا اور نبی کریم ﷺ کے خلاف جنگ میں مشرکوں کی اعانت کرتا تھا حضرت عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کے فرمان پر رات کو اس کے قلعہ میں جا کر تلوار کی نوک اس کے پیٹ میں گھونپ دی جو اس کی پشت سے باہر نکل گئی اور ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ حضرت عبداللہ بن عتیک نے قلعہ سے چھلانگ لگائی' جس سے آپ کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ساتھیوں نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں پہنچایا۔ آپ نے اپنا دستِ مبارک پھیرا جس سے ٹوٹی ٹانگ درست ہو گئی۔

(مدراج النبوۃ 188 تا 190 جلد 2)

گستاخانِ رسول ﷺ کے لیے خدائی فیصلے اور سزائیں

ابی لہب

یہ حضور علیہ السلام کا سگا چچا تھا اور آپ کا سخت دشمن تھا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوہ صفا پر اہل مکہ کو دعوتِ توحید دی تو اس پر اس نے حضور علیہ السلام سے کہا کہ تم تباہ ہو جاؤ تم نے ہمیں اس لیے یہاں جمع کیا تھا۔ جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَھَبٍ وَّ تَبَّ ٥ تباہ ہو جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ ہو ہی گیا۔ چنانچہ دنیا میں تو اس کا یہ حشر ہوا کہ اس کے زہریلی قسم کا ایک چھالہ (العدسہ) نکلا جو سارے جسم میں پھیل گیا۔ ہر جگہ سے بدبودار پیپ بہنے لگی گوشت گل گل کر گرنے لگا تو اس کے بیٹوں نے گھر سے باہر پھینک دیا اور اس نے تڑپتے تڑپتے جان دے دی۔ اس کی نعش تین دن یونہی پڑی رہی اور لوگ اس کے تعفن اور بدبو سے تنگ آ گئے اور اس کے بیٹوں کو لعنت ملامت کی تو انہوں نے چند حبشی غلاموں سے ایک گڑھا کھدوایا اور لکڑیوں سے اس کی لاش کو دھکیل کر اس گڑھے میں پھینک دیا اور اوپر سے مٹی ڈال دی۔ اس کا یہ حشر اللہ تعالیٰ کے غضب کا ہی نتیجہ تھا کہ مکہ کے چار رئیسوں میں سے ایک رئیس کا یہ حشر ہوا۔ اور قیامت کے روز سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ ٥ عنقریب وہ جھونکا جائے گا شعلوں والی آگ میں۔

ابولہب کی بیوی اروہ اور کنیت ام جمیل جو ابوسفیان کی بہن تھی، جس کے دل میں حضور علیہ السلام کی عداوت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ دشمنی رسالت میں اپنے خاوند سے کم نہ تھی۔ جنگل سے خاردار لکڑیاں چن کر رات کو اس راستے میں بچھا دیتی جس سے حضور علیہ السلام کا گزر ہوتا۔ ایک روز بوجھ اٹھا کر لا رہی تھی کہ تھک کر آرام کرنے کے لیے ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ ایک فرشتے نے بحکم الٰہی اس کے پیچھے سے اس کے گٹھے کو کھینچا، وہ گری اور رسی سے گلے میں پھانسی لگ گئی اور مر گئی۔ وَامْرَاَتُہٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ٥ فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ٥ اور اس کی جورو لکڑیوں کا گٹھا سر پر اُٹھاتی اس کے گلے میں کھجور کی چھال کا رسہ اور قیامت کے روز بفرمانِ نبوی ﷺ اس کا یہ حشر ہوگا۔ جس آگ میں اس کا گستاخ خاوند جلایا جائے گا، اسی آگ میں وہ بھی جھونکی جائے گی۔ (ضیاء القرآن)

ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کے ساتھ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں رقیہ اور ام کلثوم کی شادی ہوئی تھی۔ جب حضور علیہ السلام نے اس کی تبلیغ شروع کی تو ابولہب کے کہنے پر دونوں بیٹوں نے طلاق دے دی۔ عتیبہ نے اپنے خبث باطن کا کچھ زیادہ ہی مظاہرہ کیا کہ اس ناپاک

نے روئے انور پر تھوکنے کی جسارت کی' جولوٹ کر اسی کے قبیح منہ پر آ پڑی۔ حضور علیہ السلام کی زبان سے نکلا ''الٰہی! اپنے کتوں میں سے ایک کتا اس نا ہنجار پر مقرر فرما دے۔ چنانچہ ایک سفر میں ایک شیر نے اسے پھاڑ ڈالا۔ مگر نہ اس کا ناپاک گوشت کھایا اور نہ خون پیا' جس کی تفصیل حکایاتِ صحابہ ص 157 مصنفہ مولانا محمد زکریا میں یوں درج ہے۔ جب عتیبہ نے طلاق دی اور حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں آ کر نہایت گستاخی' بے ادبی اور نا مناسب الفاظ بھی زبان سے نکالے۔ حضور علیہ السلام نے بددعا کی یا اللہ! اپنے کتوں میں سے ایک کتا اس پر مسلط فرما۔ ابو طالب نے اسے کہا۔ اس کی بددعا سے تجھے خلاصی نہیں۔ چنانچہ عتیبہ ایک مرتبہ شام کے سفر میں جا رہا تھا۔ اس کا باپ ابولہب باوجود ساری عداوت اور دشمنی کے کہنے لگا کہ مجھے محمد (ﷺ) کی بددعا کا فکر ہے۔ قافلہ کے سب لوگ ہماری خبر رکھیں۔ ایک منزل پر پہنچے' وہاں شیر زیادہ تھے۔ رات کو تمام قافلہ کا سامان ایک جگہ جمع کیا اور اس کا ٹیلہ بنا کر اس پر عتیبہ کو سلایا اور قافلہ کے تمام آدمی چاروں طرف سوئے۔ رات کو ایک شیر آیا' اور سب کے منہ سونگھے۔ اس کے بعد ایک زقند لگائی اور اس ٹیلے پر پہنچ گیا اور عتیبہ کا سر بدن سے جدا کر دیا۔ اس نے ایک آواز دی مگر ساتھ ہی کام تمام ہو چکا تھا۔ اس کے دوسرے بھائی عتبہ نے چونکہ حضور علیہ السلام کی توہین نہیں کی تھی' اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے دولتِ اسلام سے نوازا۔

(نشر الطیب طابع تاج کمپنی ص 106 پر بھی یہ واقعہ درج ہے)

ابوجہل

ولید بن مغیرہ کا بھتیجا تھا جو رؤسائے قریش میں شمار ہوتا تھا۔ یہ بھی حضور علیہ السلام کا سخت دشمن تھا۔ اس نے آپ کی ایذا رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ یہی حضور علیہ السلام کے معجزات کو جادو کہتا۔ اس نے ہی دارالندوہ میں مشورہ دیا تھا کہ محمد (ﷺ) کو سب مل کر یکبار حملہ کر کے قتل کر دیا جائے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ ہر قوم کا ایک فرعون ہوتا ہے۔ میری امت کا فرعون ابوجہل ہے۔ حضور علیہ السلام نے اسے دعوت اسلام میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی مگر وہ ایمان نہ لایا۔ جس کی تفصیل سورۃ القیامۃ آیت 33 تا 36 میں دیکھیں۔ ابوجہل کا انجامِ بد سیرۃ النبی مصنفہ شبلی نعمانی 325/1 طابع محمد سعید اینڈ کمپنی کراچی میں یوں درج ہے:

ابوجہل کی شرارت اور دشمنی کا عام چرچا تھا۔ اس بناء پر انصار میں سے دو بھائیوں معاذ اور معوذ نے عہد کیا تھا کہ یہ شقی جہاں نظر آئے گا اس کو مٹا دیں گے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا بیان ہے کہ غزوہ بدر میں صف میں تھا کہ دفعتہً مجھ کو دائیں بائیں دو نو جوان نظر آئے۔ ایک نے مجھ سے کان میں

پوچھا کہ (چچا جان) ابوجہل کہاں ہے؟ میں نے کہا' برادرزادہ! ابوجہل کو پوچھ کر کیا کرے گا؟ بولا میں نے خدا سے عہد کر رکھا ہے کہ ابوجہل کو جہاں دیکھ لوں گا' اسے قتل کر کے چھوڑوں گا۔ میں ابھی جواب نہیں دے پایا تھا کہ دوسرے نوجوان نے بھی مجھ سے کانوں میں یہی باتیں کہیں۔ میں نے دونوں کو اشارے سے بتایا کہ ابوجہل وہ ہے۔ بتاتا تھا کہ دونوں باز کی طرح جھپٹے اور ابوجہل خاک پر تھا۔ یہ جوان عفرا کے بیٹے تھے۔ غزوہ ختم ہونے پر حضور علیہ السلام نے حکم دیا کہ کوئی جا کر خبر لائے ابوجہل کا کیا انجام ہوا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (جو قد میں چھوٹے تھے) نے جا کر لاشوں میں دیکھا تو زخمی پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ بولے! تو ابوجہل ہے؟ اس نے کہا۔ ایک شخص کو اس کی قوم نے قتل کر دیا تو یہ فخر کی کیا بات ہے۔ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی گردن پر پاؤں رکھا اور چھلانگ لگا کر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھے۔ ابوجہل نے کہا۔ او بکری چرانے والے! دیکھ تُو کہاں پاؤں رکھتا ہے۔ فرمایا کیا تُو وہ وقت بھول گیا جب میں بفرمان نبویؐ تیرے لیے وعید کی آیت لے کر تیرے پاس گیا تھا تو تُو نے مجھے تھپڑ مارا تھا اور لاتوں سے خوب پیٹا تھا' اب تیری ذلت کا سامان میرے ہاتھوں ہی ہوگا۔ طبری 87/1 پر ہے۔ ''ابوجہل نے پوچھا فتح کس کی ہوئی۔ میں (ابن مسعود) نے کہا۔ ''اللہ اور اس کے رسول کی۔'' ابوجہل کہنے لگا' اپنے نبی سے کہنا کہ میں اپنے مذہب پر ابھی تک قائم ہوں اور تجھ پر ایمان نہیں لایا اور کہا کہ میرا سر ذرا گردن کے نچلے حصہ سے کاٹنا تا کہ قریش کے بقیہ سروں سے میرا سر اونچا دکھائی دے۔ اور کہا کاش میرا سر کوئی ہاشمی جوان کاٹتا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کا سر کاٹ کر اس کے ناک میں رسی ڈال کر اور پیشانی کے بل گھسیٹتے ہوئے حضور علیہ اسلام کے قدموں میں ڈال دیا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی اس کیفیت کو پہلے ہی بیان فرما دیا تھا۔ ''ہاں' ہاں اگر باز نہ آیا تو ضرور ہم پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے۔ کیسی پیشانی' جھوٹی خطا کار۔''

یہ تو تھی اس دشمن رسولؐ کی ذلت و رسوائی۔ آخرت میں جو اس کی حالت ہوگی' سورۃ القیامۃ آیت 32 تا 36 میں دیکھیں۔ اس کے علاوہ ابوجہل' ولید بن مغیرہ اور اس کے ساتھیوں کا عذاب آخرت سورۃ الدخان آیت 43 تا 50 میں دیکھیں۔

ولید بن مغیرہ مخزومی کا انجام بد

یہ دشمن رسول ابوجہل کا چچا تھا۔ حضرت خالد کا باپ اور خاندانِ قریش کا رئیس اعظم تھا اور مال دار بھی۔ یہ اپنے بیٹوں اور رشتہ داروں سے کہتا تھا کہ اگر تم میں سے کسی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھا

تو میں اسے اپنے مال میں سے کچھ نہ دوں گا...... اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہتا' یہ تو مجنون ہے اور جادوگر بھی' اور قرآن کو اگلوں کی کہانیاں بتاتا' جس کے جواب میں اللہ تعالی نے اس کے دس عیب گنوائے۔

ترجمہ: اور ہر ایسے کی بات پر توجہ نہ دینا جو بڑا قسمیں کھانے والا ہو' ذلیل' بہت طعنے دینے والا' بہت ادھر کی ادھر لگاتا پھرنے والا' بھلائی سے روکنے والا' حد سے بڑھنے والا' گنہگار' درشت خو' اس سب پر طرہ یہ کہ اس کی اصل میں خطا ہے۔ (سورہ القلم آیت 10 تا 13)

جب یہ آیت نازل ہوئی تو ولید بن مغیرہ نے اپنی ماں سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے میرے حق میں دس باتیں بتائی ہیں۔ نو کو تو میں جانتا ہوں کہ مجھ میں موجود ہیں لیکن دسویں بات اصل میں خطا ہونے کی' اس کا حال مجھے معلوم نہیں۔ یا تو مجھے سچ سچ بتا دے ورنہ تیری گردن ماروں گا۔ اس پر اس کی ماں نے کہا تیرا باپ نامرد تھا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ مر جائے گا تو اس کا مال غیر لے جائیں گے تو میں نے ایک چرواہے کو بلا لیا' تو اس سے ہے۔

اس ولید بن مغیرہ کے متعلق سورۃ مدثر کی آیات 11 تا 30 نازل ہوئیں جو پڑھنے کے قابل ہیں۔ یہ اپنی قوم میں وحید کے لقب سے ملقب تھا۔ غزوۂ بدر میں اس کی ناک کٹ گئی جسے شرم کے مارے چھپائے رکھتا۔ سَنَسِمُهٗ عَلَى الخُرطُوم o (القلم 16) قریب ہے کہ ہم اس کی سور کی تھوتھنی پر داغ دیں گے۔

عتبہ بن ربیعہ

حضرت امیر معاویہ کا نانا' نہایت شریف الطبع اور صاحب ریاست تھا (سیرۃ النبی ص 213) غزوہ بدر میں فوج کا سپہ سالار تھا' مگر اس کا ارادہ لڑائی کا نہ تھا۔ کیونکہ وہ حکیم بن حزام کے مشورہ پر کہ حضرمی کا خون بہا اس کے بھائی عامر کو دے دیتے ہیں جو وجہ جنگ ہے' مگر ابوجہل نے اسے نامردی کا طعنہ دیا' جس پر عتبہ غیرت سے برہم ہوا۔ اور کہا میدان جنگ بتا دے گا کہ نامردی کا داغ کون اٹھاتا ہے۔ چنانچہ عتبہ جو سردار لشکر تھا' ابوجہل کے طعنہ سے سخت برہم تھا۔ سب سے پہلے وہی بھائی اور بیٹے کو لے کر میدان میں نکلا اور مبارزت طلب کی۔ ادھر سے حضرت علیؓ' حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہم نکلے۔ چنانچہ عتبہ حضرت حمزہؓ اور ولید بن عتبہ حضرت علیؓ کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اور عتبہ کا بھائی شیبہ بھی حضرت علیؓ کے ہاتھوں قتل ہوا جس نے حضرت عبیدہ کو زخمی کر دیا تھا۔ ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔

ترجمہ: اور اس (پند ونصیحت) سے وہ بڑا بد بخت دور رہے گا۔ جو سب سے بڑی آگ میں جائے گا۔ پھر نہ اس میں مرے اور نہ جیے۔ (سورۃ الغاشیہ آیت 13,12)

اُمیہ بن خلف کا قتل

امیہ بن خلف بھی آنحضرت ﷺ کا سخت دشمن تھا۔ تنقیصِ رسالت میں پیش پیش تھا۔ اس نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سخت تکلیفیں پہنچائیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو امیہ بن خلف سے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ یہ بھی جنگِ بدر میں شریک تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے کسی زمانہ میں معاہدہ کیا تھا کہ وہ مدینہ میں آئے گا تو یہ اس کی جان کا ضامن ہوگا۔ بدر میں اس دشمن خدا سے انتقام لینے کا خوب موقع تھا لیکن چونکہ عہد کی پابندی اسلام کا شعار ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے چاہا کہ وہ بچ کر نکل جائے۔ چنانچہ آپ اس کو لے کر پہاڑ پر چلے گئے۔ اتفاق یہ ہوا کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے دیکھ لیا۔ انصار کو خبر کر دی۔ دفعۃً لوگ ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے امیہ کے بیٹے علی نامی کو آگے کر دیا جو قتل ہو گیا۔ پھر امیہ کی طرف بڑھے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے امیہ سے کہا تم زمین پر لیٹ جاؤ۔ یہ لیٹ گیا تو حضرت عبدالرحمٰن اس پر چھا گئے کہ لوگ اس کو مار نہ دیں۔ لیکن حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی ٹانگوں کے اندر سے ہاتھ ڈال کر اسے قتل کر دیا۔ اس کی لاش کو کوئی ہاتھ نہ لگاتا کیونکہ وہ تین دن وہیں پڑی رہی اور پھول گئی جس میں سخت بدبو پھیل گئی۔ (سیرۃ النبی 1/320 تاریخ طبری 1/185) اور عامر بن الحضرمی کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام حضرت مہجع رضی اللہ عنہ نے واصلِ جہنم کیا۔ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف کفار مکہ سے مل کر سازشیں کرتا رہتا۔ حضرت مہجع رضی اللہ عنہ نے اس غزوہ میں غیر معمولی بہادری کا مظاہرہ کیا اور شہید ہوئے جس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپ کو سید الشہداء کے اعزاز سے نوازا۔ اسی غزوہ میں 70 دشمنانِ رسول قتل ہوئے جن میں ابوسفیان کا لڑکا حنظلہ' ابوجہل کا بھائی عاص اور چچیرا بھائی مسعود بن امیہ' ولید بن مغیرہ کا بھائی ابوقیس اور اسود کے تینوں بیٹے حارث' زمعہ اور عقیل وغیرہ بھی شامل ہیں۔ مزید فہرست ان مقتولین کی تاریخ ابن خلدون 1/87 میں دیکھیں۔ یہ تو تھی ان کی دنیا میں ذلت و رسوائی اور قیامت میں جو سلوک ان گستاخانِ رسول سے کیا جائے گا وہ سورۃ الحاقۃ کی آیات 25 تا 37 میں دیکھیں۔

مرتدین کا انجام

مشرکینِ مکہ کے ساتھ مسلمانوں کے پانچ آدمی بھی بدر میں لڑنے آئے تھے جن کو مسلمانوں

کی تلواروں نے موت کا مزہ چکھایا۔ یہ مقتولین مشرکین میں شمار ہوئے۔ بنو اسد بن عبدالعزی بن قصی سے حرث بن زمعہ، بنومخزوم سے ابوقیس ابن الفاکہ بن المغیرہ وابوقیس بن الولید بن مغیرہ، بنوجمح سے علی بن امیہ بن خلف، بنوسہم سے عاص بن منبہ۔

یہ لوگ قبل ہجرت کے ایمان لا چکے تھے۔ لیکن جب حکم ہجرت صادر ہوا اور آنحضورﷺ مدینہ ہجرت فرما گئے۔ ان لوگوں کو ان کے اعزہ وخاص اقارب نے مکہ میں روک لیا۔ آخر ان لوگوں نے ان لوگوں کے سمجھانے سے اسلام چھوڑ دیا۔



کشف الدجیٰ بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ

صلوا علیہ وآلہ

توہین رسالت ﷺ کی سزا...... عہد رسالت ﷺ میں

لالہ صحرائی

"جب سے وطن عزیز میں توہین رسالت ﷺ کی سزا کا موضوع زیر بحث آیا ہے' چند حضرات کی جانب سے دانستہ یا نادانستہ یہ غلط فہمی پھیلائی جا رہی ہے کہ حضور ﷺ نے رحمتہ للعالمین کی صفت کی بناء پر اپنی توہین کرنے والے افراد کے بارے میں ہمیشہ عفو و درگزر سے کام لیا تھا اور قوت و اختیار رکھنے کے باوجود انہیں کوئی سزا نہیں دی' حالانکہ حضور ﷺ کی سیرت کے مطالعہ کے دوران اس کے برعکس صورتحال سامنے آتی ہے۔

یہ ایک بین حقیقت ہے کہ اپنی بعثت کے بعد خصوصاً حضور ﷺ نے اپنی ساری زندگی اور اس کے جملہ افعال واقوال کو مکمل طور پر احکام الٰہی کے تابع کر دیا تھا' اور اس اعتبار سے ان ﷺ کی تمام حیات نبوی ﷺ بقول حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا' قرآن کریم سے عبارت ہے۔ اپنی مکمل زندگی کے دوران حضور ﷺ' اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے پابند رہے کہ مشرکین مکہ کی تمام سختیوں کے جواب میں صبر و استقامت سے کام لیا جائے' چنانچہ دشمنوں کے عام ظلم و ستم اور چیرہ دستیوں کے باوجود آپ ﷺ نے ان کے ساتھ مقابلہ و مقاومت سے گریز کیا' کہ حکم خداوندی یہی تھا' تاہم ہجرت کے بعد جب مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا' اور دین حق کے غلبہ و شوکت کا سامان ہو گیا' تو خداوند ذوالجلال نے حضور ﷺ کو کفار کے ساتھ پہلے جنگ کی اجازت (الحج 38) اور پھر جنگ کرنے کا حکم

صادر فرمایا، یعنی حضور ﷺ پر جنگ فرض قرار دے دی (البقرہ: 190 تا 193) جس کے بعد حق و باطل کے درمیان پے بہ پے کئی معرکے بپا ہوئے، جن میں متعدد غزوات شامل ہیں، جو حضور ﷺ کی زیر کمان کفار کے ساتھ محاربوں کی صورت رونما ہوئے۔ علاوہ ازیں شر انگیز دشمنوں کی سرکوبی کے لیے حضور ﷺ نے موقع بہ موقع کئی جنگی مہمیں بھی اطراف و اکناف میں روانہ فرمائیں، جنہیں اصطلاح میں "سرایا" کہا جاتا ہے، ان غزوات و سرایا کے ذریعے حضور ﷺ نے عین ارشادِ خداوندی کی تعمیل میں باطل قوتوں کے ساتھ مسلح کشاکش سے کام لیا، تا آنکہ مدینہ منورہ کی نوزائیدہ اسلامی ریاست ایک مستحکم مملکت کی صورت اختیار کر گئی اور اس مملکت میں شرعی قوانین کا یکے بعد دیگرے نفاذ شروع ہو گیا۔

اس لحاظ سے جب بھی کسی مسلمان معاشرے کو اپنے خطہ زمین پر ایک آزاد مملکت کی نعمت حاصل ہو گی، تو اپنے ہاں شرعی قوانین کی تشکیل کے لیے اسے لامحالہ حضور ﷺ کی مدنی زندگی کو ماڈل بنانا ہو گا۔ جب اسلام ایک مقتدر ریاست (Sovereign State) کی حیثیت پا گیا تھا، نہ کہ مکی زندگی کو جب اسلام محض دعوتی اور تبلیغی دور سے گزر رہا تھا اور اس نے ابھی سیاسی اقتدار حاصل نہیں کیا تھا۔

آیئے اب یہ دیکھیں کہ اپنی مدنی زندگی کے دوران حضور ﷺ نے بحیثیت قانون ساز اور سربراہ مملکت، توہین رسالت ﷺ کے مجرموں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور انہیں کیا سزا دی؟

اس سلسلہ میں سیرت نبوی ﷺ کی کتابوں کے سرسری مطالعہ سے جو نظائر سامنے آتے ہیں، ان کا مختصر تذکرہ ذیل میں کیا جا رہا ہے:

پہلے واقعہ یا نظیر کا تعلق سنہ 2 ھ سے ہے، یعنی ہجرت کے صرف ایک سال بعد کے زمانہ سے جب حضور ﷺ کو غزوہ بدر کی شکل میں حق و باطل کا اولین معرکہ پیش آیا اور آپ ﷺ نے اس میں بفضلِ تعالیٰ شاندار فتح پائی۔ اس موقع پر حضور ﷺ کی سربراہی میں ایک آزاد مملکت کے قیام کا امکان روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا، سیاسی اقتدار حاصل نہیں کیا تھا۔

بدر سے فتحمندانہ مدینہ منورہ لوٹتے ہوئے جب حضور ﷺ اثنائے سفر میں وادی صفرا کے درے سے باہر نکلے، تو آپ ﷺ کو لشکر اسلامی کے ہمراہ آنے والے مشرک اسیران جنگ میں ایک شخص نصر بن حارث نظر آیا، جو حضور ﷺ کو ان کی مکی زندگی کے دوران توہین و ایذا رسانی کا نشانہ بنایا کرتا تھا، حضور ﷺ کے حکم پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس شخص کو فوراً قتل کر دیا۔

اس کے بعد اسی سفر کے دوران آپ ﷺ جب عرق الظبیہ پہنچے تو حضور ﷺ نے انہی اسیران جنگ میں ایک اور شخص عقبہ بن ابی معیط کو دیکھا، جس نے ایک مرتبہ مکہ معظمہ میں حضور ﷺ پر حالت نماز میں اونٹ کی اوجھ ڈال دی تھی، نیز ایک اور مرتبہ حرم کعبہ میں حضور ﷺ کی گردن کے گرد

کپڑا کس کر انہیں ایذا پہنچائی تھی' حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں اس شخص کی بھی گردن ماردی۔

اس سے اگلے سال یعنی سنہ 3ھ میں توہین رسالت ﷺ کے چار مجرموں کو یکے بعد دیگرے قتل کی سزا دی گئی' عصما نامی ایک یہودی شاعرہ جو حضور ﷺ کی شان مبارک میں ہجو یہ شعر کہا کرتی تھی' ایک نابینا صحابی عمیر بن عدیؓ کے ہاتھوں قتل ہوئی' جنہیں بعد میں حضور ﷺ نے بطور تحسین ''بینا'' اور ''بصیر'' کا خطاب دیا' ابوعفک نامی ایک اور شاعر جو حضور ﷺ کے بارے میں دریدہ دہنی سے کام لیتا تھا' حضور ﷺ ہی کے حکم سے ایک بدری صحابی سالم بن عمرؓ کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترا۔

قتل کی سزا کا اگلا نشانہ کعب بن اشرف بنا' جو شاعر ہونے کے علاوہ بڑا مالدار یہودی تھا اور اطراف مدینہ میں ایک مضبوط اور شاندار قلعہ کا مالک تھا' اپنی دولت مندی اور خاندانی وجاہت پر گھمنڈ کے باعث وہ حضور ﷺ کی ذات اقدس کے بارے میں نہایت جارحانہ بدزبانی کیا کرتا تھا' اسے آنحضور ﷺ کے خصوصی حکم کے تحت ایک صحابی حضرت ابو فائلہؓ نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ اس کے قلعہ میں جا کر قتل کیا۔

کعب بن اشرف کے واقعہ قتل نے عہد رسالت ﷺ میں شاتمان رسول ﷺ کے تذکرے میں بہت شہرت پائی ہے' چنانچہ اکثر سیرت نگاروں نے اپنی تالیفات میں اس واقعہ کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ادھر مدینہ منورہ کے مضافات میں اب بھی کعب بن اشرف کے قلعہ کے آثار موجود ہیں۔ سنہ 1985ء میں جب میں سفر حج کی سعادت سے سرفراز ہوا تو ایک واقف کار رفیق کے ہمراہ مجھے بھی اس قلعہ کے آثار دیکھنے کا موقع ملا تھا' پتھریلے نشیب و فراز پر مشتمل یہ ایک لق ودق مقام تھا' جس کے چاروں طرف اب بھی وحشت برس رہی تھی۔

اسلام دشمنی اور حضور ﷺ کی توہین میں کعب بن اشرف کا مددگار ایک اور نہایت امیر تاجر ابورافع بھی تھا' جو خیبر میں واقع اپنی گڑھی میں رہتا تھا' یہ بھی حضور ﷺ کے ایما سے ایک صحابی حضرت عبداللہؓ کے ہاتھوں اپنی خوابگاہ میں موت سے ہمکنار ہوا۔

اسی سال غزوہ احد سے واپسی کے سفر کے دوران حضو کی نظروں میں ایک شخص ابوعزہ جمحی آیا' جو اپنے اشعار کے ذریعہ نبی ﷺ کے خلاف لوگوں کے جذبات برانگیختہ کیا کرتا تھا' گرفتاری کے بعد آنحضور ﷺ کے حکم کی تعمیل میں حضرت عاصم بن ثابتؓ نے اس کو تہ تیغ کر دیا۔

فتح مکہ کے موقع پر جب حضور ﷺ نے کفار و مشرکین کے لیے عفو عام کا اعلان کیا تو اس

کے ساتھ ہی چند (باختلاف روایات 9 تا 16) اشخاص کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ عفوِ عام سے مستثنیٰ ہیں' لہٰذا یہ جہاں بھی ملیں' انہیں قتل کردیا جائے' خواہ وہ غلاف کعبہ ہی سے لپٹے ہوئے کیوں نہ ہوں' ان واجب القتل افراد میں ابن خطل کی دو ہجو گو لونڈیاں ارتب اور ام سعد' نیز مشہور ہجو گو شاعر حارث بن طلال بھی تھا' جسے نبی ﷺ کے حکم کے مطابق حضرت علیؓ نے قتل کردیا۔

جناب محمد اسماعیل قریشی سینیئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان نے اپنی محققانہ اور عالمانہ تصنیف ''ناموس رسول ﷺ اور قانونِ توہین رسالت ﷺ'' میں امام بخاریؒ کے جلیل القدر استاد حضرت عبدالرزاق بن ہمامؒ کے دوسری صدی ہجری میں مرتبہ مجموعہ احادیث ''المصنف'' کے باب ''سب النبی ﷺ'' نیز سنن ابی داؤد اور قاضی عیاضؒ کی کتاب ''الشفاء'' کے حوالہ سے آٹھ ایسے اشخاص کا ذکر کیا ہے' جو حضور ﷺ کی توہین کے جرم میں خود حضور ﷺ ہی کے حکم کے مطابق واجب القتل قرار پائے۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا' توہین رسالت ﷺ کے جرم میں خود رسالت مآب ﷺ کی زبان مبارک سے مستوجب قتل قرار دیئے جانے والے افراد کی یہ کم و بیش ڈیڑھ درجن مثالیں ایسی ہیں' جو کتب سیرت کے سرسری مطالعہ سے نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اگر اہل علم مزید گہرائی سے کتب سیرت و احادیث کا جائزہ لیں' تو عین ممکن ہے' ان مثالوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے' تاہم جیسا کہ معلوم ہے کہ کسی قانون کے تائیدی نظائر کی تعداد اجرائے سزا کے معاملہ میں اضافی اہمیت رکھتی ہے' اصل اہمیت کسی قانون کے وجود اور آئینی جواز کی ہے۔ حضور ﷺ' اللہ تعالیٰ کے بعد اہل ایمان کے نزدیک شرعی آئین و قوانین کا دوسرا مسلمہ ماخذ ہیں۔ اگر حضور ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں توہین رسالت ﷺ کے کسی ایک مجرم کو بھی سزائے موت دی ہوتی' تب بھی یہ تنہا نظیر امت مسلمہ کے لیے ایک واجب التعمیل قانون کی حیثیت رکھتی تھی' چہ جائیکہ اس معاملہ میں تقریباً ڈیڑھ درجن نظائر صفحہ تاریخ پر موجود ہوں۔ اب ان نظائر کی موجودگی میں اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اپنی توہین کرنے والے کسی شخص کو حضور ﷺ نے اپنی مبارک زندگی کے دوران کوئی سزا نہیں دی تو صاف ظاہر ہے کہ اس کا یہ دعویٰ یا تو سراسر لاعلمی پر مبنی ہے یا پھر دیگر محرکات پر' جس کا علم خدائے علیم و خبیر ہی کو ہوسکتا ہے۔

جہاں تک حضور ﷺ کے ''رحمتہ للعالمین'' ہونے کا تعلق ہے' تو ہر شخص جانتا ہے کہ حضور ﷺ کو یہ منفرد و یگانہ خطاب' آنحضور ﷺ کے کسی عقیدت مند یا ان کی امت کے کسی عالم یا دانشور نے نہیں دیا' بلکہ قرآن مجید کے مطابق یہ خطاب براہ راست خدائے بزرگ و برتر کا عطا کردہ ہے' جس نے انہیں بطور خاتم النبیین مبعوث فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خطاب مرحمت فرمانے کے بعد اگر

حضور ﷺ کو اپنی قائم کردہ اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی میں فتنہ پرور کفار و مشرکین کے ساتھ مسلح جہاد و قتال کا حکم دیا اور اپنی داخلی پالیسی میں معاشرتی جرائم کی سزا میں حدود کی صورت میں سزائے موت اور تعزیر کی صورت میں قید و بند کے نفاذ کا فرمان جاری کیا تو ایسے تمام خدائی احکامات کو حضور ﷺ کی صفت رحمتہ للعالمین کا ایک حصہ ہی قرار دیا جائے گا۔ کسی بھی ہلاکت خیز مخلوق پر' خواہ وہ انسان کی نوع سے ہو یا درندوں اور زہریلے کیڑے مکوڑوں کی صورت میں' ترس کھانا یا اس سے چشم پوشی کرنا' اس کی ہلاکت آفرینی کے عمل میں ممد و معاون بننے کے مترادف ہے' جسے ظلم ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس جرم و سزا کا وہ نظام' جو بنی نوع انسان کو خود اس کے مفسدہ پرداز ابنائے نوع کے ظلم و جور اور ایذا رسانی سے محفوظ کرنے کے لیے وجود میں آئے' دراصل رحمت ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کے جرائم کی سزا پر مبنی عدل کے تصور سے مہذب دنیا کا کوئی فلسفہ قانون خالی نظر نہیں آتا۔

حضور ﷺ کی توہین کا ارتکاب اس قبیل کا ایک سنگین جرم ہے' جو معاشرہ میں زبردست فتنہ و فساد پیدا کرنے کی نوبت لا سکتا ہے۔ یہ جرم صریحاً امن و سلامتی کے اس نظام کو منہدم کرنے کی کوشش کے مترادف ہے' جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے نام سے بواسطہ حضور ﷺ بنی نوع انسان کے لیے پسند فرمایا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد کیا کہ ''قتل اگرچہ برا ہے لیکن فتنہ اس سے زیادہ برا ہے۔'' (البقرہ 9) حضور ﷺ کی رسالت سے اگر کوئی شخص انکار کرے' تو ایسے منکر سے کوئی شرعی قانون تعرض نہیں کرتا' لیکن اگر کوئی شخص آنحضور ﷺ کی توہین کا مرتکب ہوا تو اس کا واضح مقصد حضور ﷺ کے منصب نبوت اور اس منصب پر انہیں مامور کرنے والے رب عزوجل کی توہین ہوگا' یہ توہین' منکر کی بجائے ایسے شخص کو باغی کے مقام تک پہنچا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کے کسی معاشرہ یا ریاست کو کسی باغی کا وجود گوارا نہیں ہو سکتا' جو اس کی سلامتی اور عافیت کے درپے ہو' ایسی صورت میں معاشرہ یا ریاست کی سلامتی و عافیت کا تقاضا یہی ہوگا کہ اس کے وجود پر حملہ آور ہونے والے شخص کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ اسی بناء پر حضور ﷺ نے اپنی اہانت کے مرتکب اشخاص کو قتل کرنے کا حکم دیا اور پھر اس جرم کی سزا کی متعدد نظائر عملی طور پر قائم کر کے اپنی امت کو تا قیامت اس جرم کے کما حقہ' استیصال پر مامور کر دیا۔ اس اعتبار سے علوم و معارف کے بے مثال گنجینہ' مجدد الاسلام' امام ابن تیمیہؒ کے اس قول کی صداقت میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا کہ ''اگر شاتم رسول ﷺ کے قتل کے جواز کے باوجود اسے قتل نہ کیا جائے تو یہ صریحاً حد درجہ کی رسوائی اور تحقیر و تذلیل کی بات ہے۔'' ادھر امام مالکؒ کا یہ قول اس موضوع پر حرف آخر ہے کہ ''امت کو زندہ رہنے کا کیا حق ہے' جب اس کے رسول ﷺ کو گالیاں دی جائیں۔''



توہینِ رسالت ﷺ کا اصل قانون

ڈاکٹر سید ریاض الحسن گیلانی ایڈووکیٹ

پاکستان میں رائج قانون توہین رسالت ﷺ کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295 سی میں یوں بیان کیا گیا ہے:

''جو شخص دانستہ طور پر کسی بھی طریقے سے حضرت محمد ﷺ کی توہین کا ارتکاب کرے، اسے موت یا عمر قید کی سزا دی جائے گی۔'' جبکہ گستاخ رسول ﷺ کے بارے میں شریعت کا اصل حکم بیان کرتے ہوئے حضرت امام جعفر صادقؑ کا یہ فرمان علامہ محمد بن یعقوب کلینی نے ''اصول کافی'' میں نقل کیا ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ سبکیؒ نے توہین رسالت ﷺ کے موضوع پر مستقل کتابیں تحریر کی ہیں اور یہی موقف شرح وبسط کے ساتھ ثابت کیا ہے۔

باعث تخلیق کائنات ﷺ کے گستاخ سے دنیا کو پاک کر دینا حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے ہر غلام کا اولین فریضہ ہے۔ اس کے لیے ریاست کے قانون نافذ کرنے والے اداروں کا انتظار کرنا اور ان کا سہارا لینا غیرت ایمانی کے منافی ہے۔ اپنی جان اور اپنے مال کے تحفظ کی خاطر ایک شہری خود اقدام کر سکتا ہے، اس کے لیے ضروری نہیں کہ ریاستی مشینری کی قانونی کارروائی کا انتظار کرے۔ ناموس رسالت ﷺ تو اپنی جان اور مال سے لاکھوں کروڑوں درجہ زیادہ عزیز ہے، لہٰذا اس کو قانون نافذ کرنے والے اداروں کی ذمہ داری قرار دے کر اپنے ہاتھ باندھ لینا ایمان مستقیم اور عقل سلیم کے خلاف

ہے۔

تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کا بغور مطالعہ کرنے سے ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی نے حکومت کے اعلیٰ یا ادنیٰ افسر کے پاس جا کر یہ رپورٹ کی ہو کہ فلاں شخص نے میری موجودگی میں میرے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے‘ لہٰذا آپ اس کے خلاف قانونی کارروائی کریں‘ عہد رسالت ﷺ میں توہین رسالت ﷺ کے ارتکاب کی پانچ مثالیں ملتی ہیں۔ پانچوں واقعات ایسے ہیں کہ جس کسی کے سامنے توہین رسالت ﷺ کا ارتکاب ہوا‘ اس نے خود ہی گستاخ رسول ﷺ کا کام تمام کیا اور بعد میں رسالت مآب ﷺ کے حضور اطلاع کی۔ صحیح نسائی شریف کتاب تحریم الدم باب الحکم فی من سب النبی ﷺ میں ایک صحابی کا ذکر ہے کہ اس کی بیوی گستاخ رسول ﷺ تھی۔ ایک دن اس نے توہین کا ارتکاب کیا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور حضور ﷺ کی خدمت میں جا کر عرض کیا کہ میری بیوی میرے دو بیٹوں کی ماں تھی۔ میری خدمت گزار تھی‘ مگر آپ کی گستاخ تھی۔ اس نے میرے سامنے آپ کے خلاف بدزبانی کی‘ جس پر میں نے اسے قتل کر دیا۔ آپ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ اس آدمی پر میرا حق ہے اور اس نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ نیز آپؐ نے فرمایا‘ گواہ رہیو اس عورت کا خون ساقط ہے۔ اسی طرح حضرت خالد بن ولیدؓ نے ایک ایسی عورت کو قتل کر دیا جو نبی کریم ﷺ کو گالیاں دیتی تھی۔ ایک صحابی نے اپنی گستاخ رسولؐ بہن کو قتل کر کے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا قصہ سنایا‘ تو آپ ﷺ نے اس عورت کا خون ساقط کر دیا۔ اسی طرح حضرت عمر بن خطابؓ نے اس شخص کو قتل کر دیا‘ جس نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا فیصلہ کروایا اور اس کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس آ کر حضور ﷺ کے فیصلہ پر عدم اطمینان کا اظہار کیا اور اپنے معاملے کا فیصلہ حضرت عمرؓ سے کروانا چاہا۔ صحیح ابوداؤد شریف کتاب الحدود باب الحکم فی من سب النبی ﷺ میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ یہودی عورت حضور پاک ﷺ کو گالیاں دیا کرتی تھی‘ ایک صحابیؓ نے گلا گھونٹ کر اسے مار دیا۔ حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی‘ تو آپ ﷺ نے اس کا خون ساقط قرار دیا۔

یہ بات قوم موسیٰ علیہ السلام کے خصائص میں سے ہے کہ مشکل وقت میں وہ کہہ دیتے تھے کہ اے موسیٰؑ! آپ جانیں اور رب! یہ کام ہمارے بس سے باہر ہے۔ اسی طرح یہ بات ہے کہ اپنی جان و مال کا تحفظ تو خود کریں اور بعد میں قانون نافذ کرنے والوں کو اطلاع کر دیں‘ مگر رسول پاک ﷺ کی عزت کے تحفظ کا معاملہ ہو تو پولیس کو رپورٹ کر دیں اور بس! پولیس جانے اور اس کا کام۔ اس طرح عاشق رسول ﷺ بھی کہلوا لیے اور ممکنہ مشکل صورت حال سے دوچار ہونے سے بھی بچ گئے! وہ یہ کہ

توہین رسالت ﷺ کے اصل قانون پر خود عملدرآمد کرنے کی صورت میں قتل کے الزام میں گرفتاری ہوتی' مقدمہ چلتا' مؤقف عدالت تسلیم کر لیتی تو بری ہو جاتے' ورنہ غازی علم الدین کی طرح شہادت سے سرفراز ہوتے۔

پاکستان میں رائج قانون توہین رسالت ﷺ (یعنی تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295 سی) تو ملزموں کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اس طرح وہ حضور پاک ﷺ کے غیرت مند غلاموں کے اقدام سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور بالآخر شک کا فائدہ اٹھا کر عدالت سے بھی عموماً بری ہونے کا اہتمام کر لیتے ہیں۔

مجھے 295 سی تعزیرات پاکستان پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس طرح توہین رسالت کے قبیح فعل کو کئی ہندسوں سے ضرب دینا پڑتی ہے۔ پولیس کے ہاں رپورٹ درج کرانے والا توہین رسالت ﷺ پر مبنی ناقابل بیان الفاظ کو دُہرائے گا۔ پھر پولیس محرران الفاظ کو لکھ کر دہرائے گا۔ پھر پولیس کا تفتیشی افسر اپنی تفتیش میں ضمنیاں لکھتے وقت اور گواہوں کے بیانات زیر دفعہ 161 ضابطہ فوجداری لکھتے وقت اور چالان کی آخری رپورٹ مرتب کرتے وقت توہین آمیز الفاظ دہرائے گا۔ اس کے بعد عدالت اپنی کارروائی کے دوران گواہوں کے بیانات ریکارڈ کرتے وقت اور ملزم پر چارج فریم کرتے ہوئے۔ غرض بے شمار مرتبہ توہین رسالت ﷺ پر مبنی الفاظ کی گردان ہوگی۔ یہ صورتحال کسی بھی صاحب ایمان حضور پاک ﷺ کے کلمہ گو کے لیے قابل برداشت نہیں ہوسکتی۔ خصوصاً جبکہ نتیجہ بھی غیر یقینی ہو!

توہین رسالت ﷺ کے قانون پر سیخ پا ہونے والے وہ لوگ ہیں جو بنی نوع انسان کے عظیم محسنوں یعنی اللہ کے برگزیدہ پیغمبروں کے خلاف بغض رکھتے ہیں اور ان کی بے ادبی اور گستاخی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس لیے وہ توہین رسالت کے قبیح اور گھناؤنے فعل کے مجرموں کے ساتھ ہمدردی کے جوش میں احترام انسانیت اور احترام قانون جیسی اعلیٰ اقدار کو بھی پامال کر دیتے ہیں۔ جب ایک عام انسان کی توہین قانوناً جرم ہے تو کیا مسلمانوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے دل و جان سے عزیز پیغمبر ﷺ کی توہین کو سنگین جرم قرار دیں!

1929ء میں لاہور کے ایک کتب فروش راجپال نے ''رنگیلا رسول'' نامی کتاب شائع کی' جس میں پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی سخت بے ادبی کی گئی تھی۔ راجپال کے خلاف رائج الوقت قانون 153 اے تعزیرات ہند کے تحت کارروائی کی گئی۔ اس قانون کی رو سے معاشرے کے کسی گروہ کے مذہبی جذبات مجروح کرنے کی سزا پانچ سال قید بامشقت ہوسکتی ہے۔ راجپال کو ماتحت عدالت نے مجرم قرار دے کر قید کی سزا دے دی مگر لاہور ہائی کورٹ نے بوجوہ اسے بری کر دیا۔ اس پر مسلمانوں میں سخت ہیجان برپا ہو گیا۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے غلامانِ رسول ﷺ کی غیرت کو للکارا۔

راجپال پر یکے بعد دیگرے تین قاتلانہ حملے ہوئے۔ پہلے دو حملے کامیاب نہ ہو سکے۔ تیسرا حملہ غازی علم الدین نے کیا اور راجپال پر آٹھ ضربات چاقو سے رسید کیں' جن میں سے ایک اس کے دل کے آر پار ہوگئی۔ غازی علم الدین موقع پر گرفتار ہوئے۔ انہوں نے بہ آواز بلند کہا کہ میں نے اپنے پیارے نبی ﷺ کی گستاخی کا بدلہ لے لیا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اس سچے عاشق رسول ﷺ کی وکالت کا فریضہ ادا کیا' مگر لاہور ہائی کورٹ میں بوجوہ کامیابی نہ ہوسکی اور علم الدین شہادت کے بلند مقام پر سرفراز ہوگئے۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو قتل پر اکسانے کے جرم میں دو سال قید کی سزا ہوئی۔

1982ء میں فیڈرل شریعت کورٹ آف پاکستان کا پانچ رکنی فل بنچ لاہور میں ختم نبوت کے مقدمہ کی سماعت کررہا تھا' مجھے حکومت پاکستان کی جانب سے وکالت کا شرف حاصل تھا۔ سابق اٹارنی جنرل حاجی غیاث محمد اور سابق ایڈووکیٹ جنرل پنجاب میاں بدیع الزمان میری معاونت کررہے تھے۔ دوران بحث میں یہ نکتہ بیان کررہا تھا کہ قادیانی مذہب کی ایک غرض وغایت یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں سے عشق رسول ﷺ کا جذبہ محو کردیا جائے کیونکہ جذبۂ جہاد کی اصل قوت محرکہ (Motivating Force) یہی ہے۔ میرا موقف تھا کہ جب کوئی شخص قادیانی مذہب قبول کرلیتا ہے تو اسے حضور پاک ﷺ سے محبت نہیں رہتی بلکہ وہ آپ ﷺ کے ساتھ ایک گونہ بغض رکھتا ہے۔ میں نے اس کے لیے دو حوالوں پر انحصار کیا۔ ایک علامہ اقبالؒ کا پنڈت جواہر لال نہرو کے نام طویل خط ہے' جس میں انہوں نے قادیانی مذہب کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ اس خط میں وہ لکھتے ہیں کہ قادیانیوں کے حضورِ پاک ﷺ کے خلاف بغض رکھنے پر میں نے اس وقت تک یقین نہیں کیا' جب تک میں نے اپنے کانوں سے ایک قادیانی کو حضور ﷺ کے بارے میں ان کی شان کے منافی گفتگو کرتے ہوئے نہیں سن لیا۔ فیڈرل شریعت کورٹ میں اس خط کا اقتباس پڑھ کر سنانے کے بعد دوسرا حوالہ میں نے غازی علم الدین شہید کا دیا۔ جب انہوں نے راجپال کو واصلِ جہنم کردیا تو علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ ہم باتیں ہی کرتے رہے اور ترکھان کا بیٹا بازی لے گیا۔ اس کے برعکس قادیانی سربراہ مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے اخبار ''الفضل'' میں بیان دیا کہ غازی علم الدین نے جہالت کا کام کیا ہے۔ ہم اس کے اس فعل سے اعلان برات کرتے ہیں۔ میں نے ''الفضل'' اخبار کا حوالہ اپنی یادداشت سے دیا۔ اس اخبار کی اصل کاپی میرے پاس موجود نہیں تھی' مگر میں نے دیکھا کہ ''الفضل'' اخبار کا متعلقہ فائل اچانک میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے وہ حوالہ عدالت کو پڑھ کر سنایا اور اصل اخبار دکھا بھی دیا۔ عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ''الفضل'' اخبار کا مجلد فائل مجھ تک کیسے پہنچا۔ عدالت کا اس دن کا وقت ختم ہوا تو

مجھے مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی ملے اور انہوں نے بتایا کہ صبح عدالت کے لیے روانہ ہوا تو میرے دل میں خیال آیا کہ خالی ہاتھ جانے سے بہتر ہے کہ کوئی کتاب لیتا جاؤں۔ قادیانیوں سے متعلقہ کتابوں کی الماری میں ہاتھ ڈالا تو یہ کتاب ہاتھ لگی جو میں نے کھول کر نہیں دیکھی تھی۔ جب تم بحث کر رہے تھے تو کتاب کو کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اخبار ''الفضل'' کی مجلد فائل ہے اور حسن اتفاق سے اس ماہ و سال کا ہے' جس کا تم حوالہ دے رہے تھے۔ کتاب کو کھولا تو وہی حوالہ سامنے آ گیا جو تم بیان کر رہے تھے۔ چنانچہ میں نے اس حوالہ پر نشان لگا کر فوراً کتاب تم تک پہنچا دی۔ حافظ عبدالقادر روپڑی اہلحدیث مسلک سے تعلق رکھتے ہیں' جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی ہے تو میں انہیں یہ واقعہ یاد دلا کر کہا کرتا ہوں کہ آپ بھی غیب کا علم رکھتے ہیں' تو وہ کمال شفقت سے مسکرا دیتے ہیں۔ فیڈرل شریعت کورٹ نے اپنے فیصلے (PLD-1985F.S.C.8) میں مذکورہ بالا دونوں حوالے درج کیے ہیں۔





تحفظِ ناموس رسالت ﷺ

ڈاکٹر محمود احمد غازی

وفاقی وزیر برائے مذہبی امور

اسلام کی اشاعت اور امت مسلمہ کی وحدت اور یکجہتی کی واحد بنیاد ذات رسالت مآب ﷺ سے مسلمانوں کا تعلق اور وابستگی ہے۔ اگر یہ تعلق کمزور پڑ جائے تو اس کے منفی اثرات امت مسلمہ کی وحدت اور یکجہتی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے دین و ایمان پر بھی پڑتے ہیں۔ جس کلمہ کی بنیاد پر انسان اسلام میں داخل ہوتا ہے' اس کا اصل الاصول دو عقیدوں کا اعلان و اعتراف ہے' یعنی ذات باری تعالیٰ کی توحید اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کا غیر مشروط اقرار۔ ذات رسالت مآب ﷺ سے اس وابستگی کو پختہ' بامعنی اور دیرپا بنانے میں جو چیز سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے' وہ عشق رسول ﷺ کی دولت ہے۔ ایک مسلمان دنیا کی ہر چیز کے بارے میں مصالحانہ رویہ اختیار کر سکتا ہے اور اپنے ہر مفاد اور وابستگی کو قربان کر سکتا ہے لیکن وہ سرکار دو عالم ﷺ سے اپنی انتہائی گہری اور انتہائی مضبوط عقیدت کے بارے میں کوئی مصالحت نہیں کر سکتا۔ یہ وابستگی محض کسی جذباتی نوعیت کی نہیں ہے بلکہ اس کا مسلمانوں کے عقیدہ' ثقافت' قانون اور تہذیب و تمدن سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسلام میں ہر چیز کا آخری اور حتمی حوالہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی ہے۔ یہ بات قرآن پاک میں بھی واضح اور غیر مبہم انداز میں بار بار بیان ہوئی ہے۔ سنت رسول ﷺ اور احادیث میں بھی یہی بات ذہن

نشین کرائی گئی ہے اور فقہاء کرام، متکلمین، مفسرین، محدثین بلکہ عامتہ الناس کا بھی اس پر روزِ اول سے اتفاق رہا ہے کہ ہر ایسا قول یا فعل جو سرکار دو عالم ﷺ کی اس حیثیت کو مجروح یا متاثر کرنے کی کوشش کرے، اسلام کے خلاف ایک بغاوت یعنی High Treason کے مترادف ہے جس کی سزا موت ہے۔

توہین رسالت ﷺ کی یہ سزا کسی جذباتی بنیاد پر نہیں بلکہ یہ اسلام کے عقیدہ، قانون اور تہذیب وتمدن کا منطقی تقاضا ہے۔ مسلمانوں کا اس امر پر ہمیشہ سے اتفاق رہا ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں توہین رسالت ﷺ کا ارتکاب ایک سنگین فوجداری جرم ہے، جس کی سزا موت ہے۔ پاکستان کی وفاقی شرعی عدالت، قومی اسمبلی اور سینٹ سب نے متفقہ طور پر اس قانون کی بنیاد پر فیصلے دیئے۔ مزید برآں برصغیر کے مسلمان من حیث المجموع اس اصول کی بار بار اپنے اجتماعی عمل سے تائید کر چکے ہیں۔ غازی علم الدین شہید، غازی عبدالقیوم شہید اور اس پایہ کے دیگر حضرات کے کارناموں کے بارے میں برصغیر کی ملت اسلامیہ کا اجتماعی موقف اور ردعمل کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال، قائداعظم محمد علی جناح اور تحریک پاکستان کے دیگر قائدین کے بیانات ریکارڈ پر موجود ہیں جن میں انہوں نے ان شہداء کے کارناموں کو اسلامی شریعت کے لازمی تقاضے کے طور پر حق بجانب قرار دیا۔

بڑے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ آج بعض لوگ ناواقفیت، اسلام دشمنی، مغربیت سے مرعوبیت یا انسانی حقوق کے نام نہاد مغربی علمبرداروں کے پروپیگنڈہ کی وجہ سے اسلام کے اس حکم کے بارے میں شبہات کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ اگر دشمنان اسلام کے پروپیگنڈے سے ڈر کر اسلام کے احکام کو بدلنے یا منسوخ کرنے کا یہ نامبارک سلسلہ ایک بار شروع ہو گیا تو پھر اس کی کوئی انتہا نہ ہو گی۔ قرآن پاک نے پہلے ہی خبردار کر دیا ہے کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کی طرف سے کسی جزوی انحراف سے مطمئن نہیں ہوں گے بلکہ ان کی رضا جب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب مسلمان مکمل طور پر اسلام سے اپنا ناتا توڑ کر ان کی ثقافتی اقدار، تہذیبی اصول اور ورثہ کو اپنا لیں۔ ظاہر بات ہے کہ اسلام کے عقائد و احکام جن تصورات پر قائم ہیں، وہ دور جدید کے لادینی، مغربی، جمہوری تصورات سے بنیادی طور پر متعارض ہیں۔ اس لیے یہ کوشش فضول ہے کہ اسلامی احکام کی وہ تعبیریں کی جائیں جن کو آج کا لادینی مغربیت زدہ طبقہ چاہتا ہے۔



لے دے کے رہ گئی ہے یہی اپنی کائنات

صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی

حکیم الامت علامہ اقبالؒ سے چند ملاقاتوں کی یادداشت پر مشتمل فقیر سید وحید الدین کی انتہائی دلچسپ اور یقین افروز کتاب ''روز گارِ فقیر'' میں شاعرِ مشرق سے ایک ملاقات کا حال یوں درج ہے کہ ایک صاحب نے حضرت علامہؒ سے پوچھا ''غازی علم الدین کی موت شہادت ہے یا نہیں؟''

ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا ''اس کا انحصار نیت پر ہے۔ اس کے بعد سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ حقیقت ذہن میں ہو کہ حملہ آور کا اصل مقصد پیغمبر کے ذاتی وقار کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اس کے لائے ہوئے پیغام کو مجروح اور اس ایمان محکم کو متزلزل کرنا ہے' جو اس پیغام رشد و ہدایت پر قائم و استوار ہے تو یہ حملہ صرف انسانی یا پیغمبرانہ وقار کا قتل نہیں رہتا بلکہ اس ایمان اور عقیدہ کا قتل بن جاتا ہے۔ اس کوشش یا اقدام کے خلاف ہر مدافعت یقیناً صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہوتی ہے اور وہی اس کا ٹھیک ٹھاک اجر دینے والا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر نہایت رقت آمیز لہجہ میں فرمایا:

''میں تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص میرے پاس آ کر یہ کہے کہ تمہارے پیغمبر نے ایک دن میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔'' آج ملعون رشدی کی خرافات و ہفوات پر مشتمل ''شاتنک ورسز'' جیسی ہذیان زدہ کتاب کے پس منظر میں' عالم اسلام کے جذبات کی' حضرت علامہ کے درج بالا احساسات' بھرپور اور پُر جوش ترجمانی اور عکاسی کر رہے ہیں' وہ جو حضرت علامہؒ نے فرمایا ہے کہ:

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

دراصل یورپ کو اس خاص ترکیب کا ابھی تک ادراک حاصل نہیں ہو سکا ورنہ وہ ملعون رشدی کے مسئلے کو حقوقِ انسانی' آزادی رائے اور جمہوریت کا مسئلہ نہ بناتا۔

یورپ کے مفکرین کے ہاں انسان اور قوم کے اجزائے ترکیبی اس سے بالکل مختلف ہیں' جن کا تصور ایک مسلمان کے ہاں موجود اور مستحکم ہے۔ ان کے ہاں انسان کیا ہے؟ بندر کی ترقی یافتہ شکل' چار چھ گیلن پانی' فاسفورس' کولیسٹرول' آئرن کی مخصوص مقدار اور ایسی ہی چند دوسری دھاتوں کے آمیزہ کا نام انسان ہے' اور بس! اسی طرح قوم یا تو نسل سے وجود میں آتی ہے یا وطن سے اور یا رنگ اور زبان سے' مگر ہمارے ہاں نہ انسان اتنا بے قیمت ہے اور نہ اس کی ساخت اتنی بے ہودہ کہ منڈی یا دکان پر اس کا مول تول چند سو روپوں میں ہو جائے اور اس طرح قوم یا ملت نسل' وطن' رنگ اور زبان جیسے لکڑی کے جالوں سے تشکیل نہیں پاتی بلکہ ہمارے ہاں انسان خلیفتہ اللہ فی الارض اور امانت الٰہی کا حامل اور امین ہے اور انسانوں ہی سے پیغمبر اور رسول مبعوث کیے گئے اور قوم' رنگ و نسل اور وطن اور زبان سے نہیں' عقیدہ و ایمان سے بنتی ہے۔

یورپ یہ سمجھتا ہے کہ پیغمبر بھی تو انسان ہوتا ہے۔ اگر اس کے بارے میں کچھ لکھ دیا جائے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اور اگر کوئی قوم کسی تحریر پر ناراض ہوتی ہے تو یہ کونسی پریشانی کی بات ہے؟ یہ یورپ کی اس کج فہمی اور بدفکری کا شاخسانہ ہے جو انسان اور قوم کے حوالے سے اس کے اندر رائج ہے۔ وہ انسان کو دھات' پانی اور ہوا کا آمیزہ اور قوم کو رنگ' نسل' زبان اور وطن کا مجموعہ سمجھ کر انسانیت کے تقدس اور ملت کے تشخص کو فراموش کر دیتا ہے۔ اس لیے وہ توہین رسالت ایسے فعلِ قبیح کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی زحمت نہیں کرتا اور ہمیں بھی اس سے چنداں غرض نہیں کہ وہ انسان اور ملت کے بارے میں اپنے نظریات میں ضرور تبدیلی لائے لیکن ہم اسے یہ بتانا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایک مسلمان کی سوچ کیا ہے؟

ہر انسان آکسیجن سے سانس لیتا ہے لیکن مسلمان کی سانس کا دوسرا نام عشقِ رسول ﷺ ہے۔ ہر انسان پانی پی کر جیتا ہے لیکن مسلمان حُبِ رسول ﷺ کی آب و ہوا میں زندہ رہتا ہے۔ ہر انسان آنکھ سے دیکھتا ہے لیکن مسلمان کی آنکھ کا سرمہ خاکِ مدینہ و نجف ہے۔ ہر انسان کے پہلو میں دل دھڑکتا ہے لیکن مسلمان کے دل کی دھڑکن یادِ رسول ﷺ ہے۔ ہر انسان کی رگوں میں خون دوڑتا ہے لیکن مسلمان کی رگوں میں محبت آلِ رسول ﷺ گردش کرتی ہے۔ ہر انسان زندگی کو زندگی سمجھ کر بسر کرتا ہے لیکن مسلمان خدا اور رسول ﷺ کی خوشنودی کے لیے زندگی گزارتا ہے۔ ہر انسان آزادی کا خواہاں

ہے لیکن مسلمان غلامی رسول ﷺ کا طلبگار ہے۔ ہر انسان موت سے خوفزدہ رہتا ہے لیکن مسلمان شہادت کی آرزو رکھتا ہے۔ ہر انسان نفع ونقصان کے حوالے سے سوچتا ہے لیکن مسلمان ہر چیز کو عقیدہ و ایمان کے ترازو میں تولتا ہے۔ ہر انسان اپنی ناموس کی فکر میں رہتا ہے لیکن مسلمان اپنی جان کو حرمتِ رسولؐ پر لٹا دینے کو اپنے لیے سعادت سمجھتا ہے۔

نماز اچھی' روزہ اچھا' حج اچھا' زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود اس کے' مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ بطحاؐ کی حرمت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

یورپ رشدی کے واجب القتل ہونے کے فتوے کو حقوقِ انسانی کے منافی قرار دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر لطیفہ کیا ہوگا کہ کون سا انسان؟ جو ان کے نزدیک بندر کی اولاد ہے اور کیسا حق؟ جن کے ہاں کالا اور گورا دیکھ کر حقوق متعین ہوتے ہیں۔ انسان کے مقدس ہونے کا تصور مسلمان کے ہاں ہے اور اس کے حقوق کا تحفظ بھی سب سے پہلے اسلام نے کیا ہے' جس نے انسان کو اشرف المخلوقات اور کالے اور گورے اور بندہ و آقا کی تمیز کو فسادِ آدمیت قرار دیا ہے اور تاریخ نے اپنی آنکھوں سے علیؓ و بلالؓ کو دوش بدوش چلتے اور نواسۂ رسول امام حسنؓ اور غلام زادہ اسامہ بن زیدؓ کو آغوشِ رسول ﷺ میں زانو بہ زانو بیٹھے دیکھا۔

ہم جب رشدی کو واجب القتل قرار دیتے ہیں تو یہ فتویٰ محض ایک فرد' ایک آدمی اور ایک انسان کے خلاف نہیں بلکہ ہر وہ سوچ واجب القتل ہے جو دلوں سے احترامِ رسول ﷺ فنا کرتی ہے' وہ ذہنیت واجب القتل ہے جو گستاخیٔ رسول ﷺ کا سوچتی ہے' واجب القتل ہے جو پیغمبر ﷺ کے خلاف لکھتا ہے اور وہ زبان واجب القتل ہے جو نبی ﷺ کے خلاف بکتی ہے اور پیغمبر بھی ایسا جو محض مسلمانوں کا نبی نہیں' انسانیت کا محسن ہے' حقوقِ انسانی کا نگہبان ہے' ناموسِ آدمیت کا محافظ ہے' جس نے انسان کی حرمت کو کعبے سے افضل اور انسان کی ذات کو رازِ الٰہی قرار دیا۔ ایسے پیغمبر کی توہین' وقارِ انسانی کی توہین ہے' ناموسِ آدمیت پر حملہ ہے' شرفِ آدم کی گستاخی ہے۔ جو شخص انسانیت کی آن کو ملحوظ نہیں رکھتا' کسی کو اس کی جان کا لحاظ کیسے ہو سکتا ہے؟

ملعون رشدی کے اس مکروہ تصنیفیے میں یورپ کا ایک اور نفسیاتی مسئلہ بھی ہے اور بد قسمتی سے عالمِ اسلام کی بعض کمزوریاں اور کوتاہیاں یورپ کو ایسے مسائل پیدا کرنے پر اُبھارتی ہیں۔ اس کا نفسیاتی پرابلم یہ ہے کہ تاریخ کے ہر موڑ پر اسے اگر سابقہ پیش آیا ہے' تو اسلام سے آیا ہے اور اسلام سو بار ڈوب

کر بھی بڑی شان سے پھر طلوع ہوا ہے اور زمانے کی سائنسی کروٹیں' دنیا کے فلسفیانہ مغالطے' ٹیکنالوجی کی بے محابا طاقت' میڈیا کے بے شمار حملے اور کھلی جارحیتیں سب کی سب نہ اسلام کی حقانیت اور آفاقیت کو جھٹلا سکی ہیں اور نہ مسلمانوں کے جوہر کو گلا سکی ہیں' یورپ نے ہر حربہ آزما کر دیکھا۔ صلیبی جنگوں سے لے کر عہدِ حاضر کی سازشوں تک' اسلام اور اہلِ اسلام نے ہر زخم سینے پر کھایا ہے مگر پیٹھ نہیں دکھائی۔

ترکی خلافت کا سقوط' عرب اور ترک محاذ آرائی' ننگی طاقت اور تلبیس سے عالم اسلام کا ایک بڑا حصہ شکنجہ غلامی میں کس دینا اور آج ''جنگجو اسلام'' اور ''بنیاد پرستی'' ایسی اصطلاحات کی آڑ میں مسلمانوں کو وحشی'' بدو' دہشت گرد'' اور نہ جانے کیا کیا باور کرانے کی مہم' یہ ساری کڑیاں اسلام اور اہلِ اسلام کو موم کی ناک بنانے کے سلسلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یورپ نے سوچا کہ جنگ مسلط کر دی جائے تو مسلمان ہار مان جائیں گے' اقتصادی بائیکاٹ کیا جائے تو اہلِ اسلام گھٹنے ٹیک دیں گے' ایٹمی ٹیکنالوجی پر پابندی لگا دی جائے تو عالمِ اسلام جھک جائے گا۔ یورپ نے یہ سارے پاپڑ بیلے' مسلمانوں کا ناک میں دم ہوا لیکن ہر بار اپنے بال و پر جھٹک کر محوِ پرواز ہو گئے۔ یورپ نے بڑے گہرے تفکر اور شیطان کے اپنی مجلس شوریٰ سے خطاب کو خوب سمجھ کر اب یہ رستہ نکالا ہے کہ:

یہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو

ملعون رشدی کی اس کتاب کا لب لباب یہی ہے کہ مسلمانوں کے دل سے حُبِّ نبی ﷺ کی تپش چھین لی جائے تو مسلمان خود بخود راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے اور پھر اس راکھ پر پانی کے چند چھینٹے چھڑک کر اسے زمین کے برابر کر دیا جائے' لیکن یہاں یورپ کو پھر ٹھوکر لگی۔ اس نے حکمرانوں کے آئینے میں عام مسلمان کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ اس نے سمجھا کہ ان میں زندگی کی رمق نہیں رہی' ان کے اعصاب شل ہو گئے ہیں' ان کے دل بجھ گئے ہیں' ان کے جذبات سو گئے ہیں اور اب صورِ اسرافیل پر بھی بڑی مشکل سے اٹھیں گے۔ اسے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ لاریب مسلمان اپنی تہذیب سے ناآشنا ہو گئے ہیں' اپنا نظام حکومت بھول بیٹھے ہیں' اپنی شکل وصورت بگاڑ بیٹھے ہیں' اپنی اقتصادیات گروی رکھ بیٹھے ہیں مگر اس سب کے باوجود دل کا سودا بازارِ عشقِ مصطفیٰ ﷺ میں کرتے ہیں۔ اگرچہ مسلمان ہزار بار سرِ راہ لوٹے گئے' یورپ انہیں لوٹ کر لے گیا' امریکہ لوٹ رہا ہے لیکن خود جب لٹانے پر آتے ہیں تو اپنا سب کچھ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ پر لٹا کر خوش ہوتے ہیں بلکہ اس پر بھی مطمئن نہیں ہوتے اور کہتے رہ جاتے ہیں:

کروں تیرے نام پہ جاں فدا' نہ بس ایک جاں' دو جہاں فدا
دو جہاں سے بھی نہیں جی بھرا' کروں کیا' کروڑوں جہاں نہیں

رشدی ملعون نے تو براہِ راست حملے کیے ہیں' مسلمان تو اشارے اور کنائے کی گستاخی کو بھی ناقابلِ معافی قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک نعلینِ نبی ﷺ کی نوک' تاجِ شاہی سے زیادہ معظم اور محترم ہے' ان کے ہاں آپ کا نقشِ کفِ پا سجدہ گاہِ عشق ہے' اہلِ اسلام' کہکشاں کو آپ کے قدموں کی دھول سمجھتے ہیں' اربابِ عشق کلی کی چٹک کو تبسمِ رسول ﷺ کا صدقہ سمجھتے ہیں' صاحبانِ نظر کے عقیدے میں آبِ حیات' ان کے تلووں کا دھوون ہے' خلعتِ شاہی آپ کے لباس کی اترن ہے' دیارِ حبیب ﷺ کے کوچے' جنت کے باغیچے ہیں بلکہ دردمندانِ عشق ہر اس شخص کو اپنا امام سمجھتے ہیں جو ان کی گلی کا گدا ہو۔ خواجہ فریدؒ نے کہا ہے:

توڑیں دھکڑے دھوڑے کھاندڑی آں
تیڈے نام توں مفت وکاندڑی آں
تیڈے باندیاں دی میں باندڑی آں
ہم در دے کتیاں نال ادب

یورپ نے اس شیطانی کتاب کے ذریعے چاہا ہے کہ مسلمانوں کی سیاست عدمِ استحکام کا شکار ہے' حکمران استعمار کے آلۂ کار ہیں' معیشت مفلوج ہے اور دفاع کمزور ہے۔ لے دے کے ایک حبِ نبی ﷺ کا جذبہ ہے۔ اگر وہ بھی کسی طرح ان کے دلوں سے نکال لیا جائے تو مسلمان ہمیشہ کے لیے غلام بن جائیں گے۔ یورپ ہم سے ہماری یہ کائنات چھین لینا چاہتا ہے۔ اہلِ اسلام اپنے ہر معاملے میں غافل واقع ہوئے ہیں لیکن ناموسِ رسول ﷺ اور حبِ نبی ﷺ ان کو اپنے مال' اپنے وطن' اپنی اولاد اور اپنی جان سے بھی عزیز رہی ہے اور متاعِ عزیز فراموش کرنے والی چیز نہیں ہوتی' اور یہی وہ متاعِ عزیز ہے' جس کے سہارے مسلمان زندہ ہیں ورنہ زندگی کا جواز کیا رہ جاتا ہے؟

اک عشقِ مصطفیٰ ﷺ ہے اگر ہو سکے نصیب
ورنہ دھرا ہی کیا ہے جہانِ خراب میں



بسنت اور توہینِ رسالتؐ

ڈاکٹر اُمِ خولہ

بسنت ہندوؤں کا تہوار ہے لیکن ہندوؤں سے نفرت رکھنے کے باوجود ہم ہر سال یہ تہوار بڑے جوش وخروش سے مناتے ہیں۔ کروڑوں روپے پتنگوں اور ڈوروں پر بے دریغ خرچ کر دیتے ہیں۔ غربت وافلاس کا ہم ڈھنڈورا بھی بہت پیٹتے ہیں لیکن غیروں کی فضول رسموں کو پھر بھی گلے سے لگائے پھرتے ہیں۔ یا تو پتنگ اڑانے سے کوئی فائدہ حاصل ہونے کی امید ہو تو ساری قوم یہ کام شروع کر دے یا ہمارے دین میں اسے لازم قرار دیا گیا ہو۔ اگر یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں تو پھر وہ کون سی بات ہے، جو ہمیں کروڑوں روپے برباد کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ سڑکوں اور بازاروں میں بچے لمبے لمبے ڈھانگے لیے اس بات سے بے خوف دوڑتے پھرتے ہیں کہ وہ کسی گاڑی سے ٹکرا سکتے ہیں یا کسی ٹرک کے نیچے آ کر جان کی بازی ہار سکتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ جنون قوم کے سر پر کیوں سوار ہو گیا؟

ہندو کشمیر میں ہماری بہو بیٹیوں کی آبروریزی کر رہے ہیں۔ دنیا بھر میں ہمیں نیچا دکھانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے لیکن ادھر ہم ہیں کہ اپنے دین کو پسِ پشت ڈال کر، مسجدوں کو ویران چھوڑ کر، والدین کی نافرمانی کر کے یہ تہوار بڑھ چڑھ کر مناتے ہیں۔ میرے ایک رشتہ دار ایسے بھی ہیں، جو عام دنوں میں تین ہزار روپے ماہانہ پتنگ بازی پر خرچ کرتے ہیں۔ بڑے گھروں کے کئی منچلے اس ''کارِ خیر'' میں اس کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ ہر جمعہ کی صبح کا سورج ان کو گھر سے باہر ہی پتنگ

بازی میں نکلتا ہے۔ گھر والے سب پریشان ہیں لیکن وہ نوجوان نہ کسی دوست کی بات مانتا ہے اور نہ گھر والوں کی کسی نصیحت کا ان پر اثر ہوتا ہے۔ یہ کتنے المیے کی بات ہے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ از خود بسنت کے تہوار کی اتنی تشہیر کرتے ہیں کہ "پتنگ باز سجنا" کی شان میں باقاعدگی سے گانے نشر کیے جاتے ہیں جس میں یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ پتنگ باز سجنا پر لڑکیاں زیادہ فدا ہوتی ہیں' کیونکہ یہ کھیل بہاروں کا مانا جاتا ہے۔ اسی گانے میں مکانوں کی چھتوں پر ڈیک لگا کر فحش گانوں کی بلند آواز میں ریکارڈنگ سنائی دکھائی گئی ہے۔ سرعام فائرنگ کی جاتی ہے' سرچ لائٹوں کی مدد لی جاتی ہے' بلکہ پتنگ بوکاٹا ہو جانے کی اتنی خوشی منائی جاتی ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے مل کر ڈانس بھی کرتے ہیں۔

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ یہی عمل ہمارے معاشرے کے ہر گھر میں دہرائے جاتے ہیں۔ اول تو والدین بھی پتنگ بازی کے شوقین ہوتے ہیں وگرنہ اولاد اس معاملے میں والدین کے احکامات کی کھلے عام خلاف ورزی ضرور کرتی ہے۔ جب ہر طرف ایک ہی رسم چل پڑے تو بہت سے ایسے لوگ خود بخود اس میں رنگ جاتے ہیں' جو ابتدا میں اس کو برا سمجھتے تھے۔

آخر وہ بچے بھی تو کسی والدین کے ہوں گے' جو ہر سال بسنت کے موقع پر ہسپتالوں میں ٹانگ یا بازو تڑوا کر بستر پر لیٹے ہوتے ہیں اور کئی بدقسمت والدین ایسے بھی ہیں' جو اپنے بچے اس منحوس تہوار کی نذر کر چکے ہیں اور پوری زندگی کے لیے اپنے دل پر اولاد کی جدائی کا داغ لیے پھرتے ہیں۔ المیہ تو یہ ہے کہ حکومت اور انتظامیہ اس تہوار کی روک تھام کرنے کی بجائے خود اس کی ترویج میں شریک نظر آتی ہے۔ لاہور اور قصور میں بسنت منانے کے لیے بہت اہتمام کیا جاتا ہے۔ سرکاری اور اہلِ ثروت لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے بلکہ یہاں تک کہ غیر ملکی سفیروں کو بھی نظارے کی زحمت دی جاتی ہے۔ وہ لوگ ہماری ان عیاشیوں کو دیکھ کر مسکراتے ہیں کہ اس قوم کا بچہ بچہ ہزاروں کا مقروض ہے لیکن یہ قوم اپنے ملک کو بچانے کی بجائے کروڑوں روپے پتنگ بازی پر اڑا دیتی ہے۔

چند سال پہلے ایک بسنت پر موٹر سائیکل کے آگے بیٹھی بچی کی گردن ڈور سے کٹ کر لٹک گئی تھی' جس کا والد اس بچی کو بٹھا کر شہر میں بسنت کا تہوار دیکھنے کے لیے نکلا تھا۔ زندہ بچی جب مردہ حالت میں گھر پہنچی ہوگی تو والدین پر کیا گزری ہوگی؟ کیا وہ زندگی بھر اس سانحے کو بھلا سکیں گے۔ ایسے کئی واقعات ہر سال رونما ہوتے ہیں لیکن ہماری قوم ان سے کوئی سبق نہیں لیتی۔ مرنے والوں کو دفنا کر' زخمیوں کو ہسپتال میں داخل کروا کر' پھر اسی جذبے کے ساتھ بسنت مناتی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ہم مسلمان ہیں اور ہندوؤں کے ظلم و ستم سے ہمارے بزرگوں کی بے پناہ قربانیوں کے عوض ہمیں یہ آزادی نصیب ہوئی ہے۔ کیا بسنت منا کر ہم تحریکِ پاکستان کے شہیدوں سے غداری نہیں کر

رہے؟ کیا کشمیر کی آزادی کے لیے لڑنے والے مجاہدوں اور شہید ہونے والی بچیوں اور خواتین کے خون سے بے اعتنائی نہیں برت رہے؟ ہمارا ملک دیوالیہ پن کے بالکل قریب ہے۔ ہم وہ رقم ملک کے قرضے اتارنے کے لیے استعمال کرنے کی بجائے پتنگ بازی پر خرچ کر کے اس مٹی کے ساتھ غداری نہیں کر رہے؟ سٹیل وائر اور پتنگوں کی بجلی کے تاروں میں الجھنے سے جو بار بار بجلی کے ٹرانسفارمر جلتے ہیں، جن کی مالیت لاکھوں میں ہے، وہ نقصان جو بجلی کی کمی وبیشی سے گھروں میں موجود الیکٹرونکس مصنوعات میں ہوتا ہے، اس کا کوئی شمار ہے؟

بسنت ایک فضول رسم ہے۔ جن کا تہوار ہے، ان کو ہی اسے منانا چاہیے۔ غیروں کی رسموں کو اپنے گلے لگا کر نہ ہم دین کی نظر میں سرخرو ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ملک وقوم کا کوئی فائدہ کر سکتے ہیں، بلکہ ہر سال کروڑوں روپے خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ کئی انسانی جانوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس پر پابندی لگانا جہاں حکومت اور انتظامیہ کا بھی کام ہے، وہاں والدین کو بھی اولاد کی جان و مال کی حفاظت کی خاطر اس لعنت پر پابندی لگانا ہوگی۔ ورنہ ایک رسم کے ساتھ ساتھ کئی اور رسمیں بھی ہمارے معاشرے میں گھر کر لیں گی اور ہم دیکھتے ہی دیکھتے ہندوازم کی جانب چل پڑیں گے۔

جناب محمد اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ بسنت کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دوسرا اہم مقدمہ مغل حکمرانوں کے آخری دورِ حکومت اور اسی لاہور سے متعلق ہے، جس کا ذکر ایک ہندو مورخ ڈاکٹر بی، ایس نجار (Dr.B.S.Nijjar) نے اپنی کتاب ''پنجاب آخری مغل دورِ حکومت میں'' (Punjab Under the Later Mughals) جبکہ زکریا خان (1707-1759) گورنر پنجاب تھا، اس طرح کیا ہے:

''حقیقت رائے باگھ مل پوری، سیالکوٹ کے کھتری کا پندرہ سالہ لڑکا تھا، جس کی شادی بٹالہ کے کشن سنگھ بھٹہ نامی سکھ کی لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی۔ حقیقت رائے کو مسلمانوں کے سکول میں داخل کیا گیا تھا، جہاں ایک مسلمان ٹیچر نے ہندو دیوتاؤں کے بارے میں کچھ توہین آمیز باتیں کہیں (یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ واقعہ ایک متعصب ہندو مورخ لکھ رہا ہے جس کا مقصد سکھوں اور ہندوؤں کے ذہن کو مسلمانوں کے خلاف زہر آلود کرنا ہے۔ حالانکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے اسلام نے مسلمانوں کو تاکید کی ہے کہ وہ کسی مذہب کے رہنماؤں کو برا بھلا نہ کہیں تاکہ انتقاماً خدا یا رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان میں گستاخی کا امکان ہی پیدا نہ ہو۔ مسلمان تو حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ جو یہودیوں اور عیسائیوں کے پیغمبر ہیں اور ان کے دوسرے تمام پیغمبروں کا، ان کے پیروانِ مذہب سے

بڑھ کر احترام کرتے ہیں اور انہوں نے رام چندر جی یا ان کے اوتار کرشن کی تاریخی عظمت سے کبھی انکار نہیں کیا اور نہ ہندوؤں کو ان کی رسوم و عبادات سے روکا جبکہ ان کے مذہب میں بتوں کی پرستش سب سے بڑا گناہ ہے۔ علاوہ ازیں وہ گرو نانک کو توحید کے مبلغین میں سمجھتے ہیں۔ اس لیے مسلمان استاد پر یہ الزام کہ اس نے ہندو اوتاروں کی توہین کی' قرینِ قیاس نہیں بلکہ خلافِ حقیقت معلوم ہوتا ہے)۔

پھر یہی مصنف اسی سلسلے میں آگے لکھتا ہے:

''حقیقت رائے نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور اس نے بھی انتقاماً پیغمبر اسلام (ﷺ) اور بی بی فاطمہؓ کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کیے۔ اس جرم پر حقیقت رائے کو گرفتار کر کے لاہور عدالتی کارروائی کے لیے بھیجا گیا۔ اس واقعہ سے پنجاب کی ساری غیر مسلم آبادی کو شدید دھچکا لگا۔ کچھ ہندو افسر زکریا خاں (جو اس وقت گورنر لاہور تھا) کے پاس پہنچے کہ حقیقت رائے کو معاف کر دیا جائے۔ لیکن زکریا خاں نے کوئی سفارش نہ سنی اور سزائے موت کے حکم پر نظرثانی سے انکار کر دیا' جس کے اجراء میں پہلے مجرم کو ایک ستون سے باندھ کر اسے کوڑوں کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد اس کی گردن اُڑا دی گئی۔ یہ سال 1734 سن عیسوی کا واقعہ ہے جس پر پنجاب کی تمام غیر مسلم آبادی نوحہ کناں رہی۔ لیکن خالصہ کمیونٹی نے آخر کار اس کا انتقام مسلمانوں سے لے لیا اور سکھوں نے ان تمام لوگوں کو جو اس واقعہ سے متعلق تھے' انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا۔''

اسی کتاب کے صفحہ 279 پر لکھا ہے کہ ''پنجاب میں بسنت کا میلہ اسی حقیقت رائے کی یاد میں منایا جاتا ہے۔''

(''ناموسِ رسولؐ اور قانون توہینِ رسالت'' از محمد اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ سپریم کورٹ' ص 320 تا 332)

روزنامہ ''نوائے وقت'' نے بسنت کے بارے میں اپنی تجزیاتی رپورٹ میں لکھا:

''بسنت خصوصی خالص ہندو تہوار ہے اور اس کا موسم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت میں بسنت کی کہانی ہر سکول میں پڑھائی جاتی ہے لیکن لاعلمی یا بھارتی لابی کی کوششوں سے بسنت اب پاکستان میں مسلمانوں نے موسمی تہوار بنا لیا ہے۔ بسنت کی حقیقت کیا ہے اور اس کا آغاز

کیسے ہوا' اس بارے میں ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ قریباً دو سو برس قبل لاہور کے ایک ہندو طالب علم حقیقت رائے نے محمد مصطفیٰؐ کے خلاف دشنام طرازی کی۔ مغل دور تھا اور قاضی نے ہندو طالب علم کو سزائے موت سنا دی۔ اس فیصلے کے خلاف آخری اپیل مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کو پیش کی گئی۔ اورنگ زیب نے فیصلہ دیا کہ اگر یہ ہندو طالب علم اسلام قبول کر لیتا ہے تو اسے آزاد کر دیا جائے۔ لیکن حقیقت رائے نے اپنا دھرم چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اس ہندو طالبعلم کو جس نے اقرار جرم کر لیا تھا' پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی لاہور میں علاقہ گھوڑے شاہ میں سکھ نیشنل کالج کی گراؤنڈ میں دی گئی۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندوؤں نے اس جگہ یادگار کے طور پر ایک مندر بھی تعمیر کیا لیکن یہ مندر آباد نہ ہو سکا اور قیام پاکستان کے چند برس بعد سکھ نیشنل کالج کے آثار بھی مٹ گئے۔ اب یہ جگہ انجینئرنگ یونیورسٹی (باغبانپورہ لاہور) کا حصہ بن چکی ہے اور کسی کو اس کا علم تک نہیں۔ ہندوؤں نے (اس واقعہ کو تاریخی بنانے کے لیے) اپنے اس ہندو طالبعلم کی ''قربانی'' کو بسنت کا نام دیا اور جشن کے طور پر پتنگ اڑانے شروع کر دیے۔ آہستہ آہستہ یہ پتنگ بازی لاہور کے علاوہ انڈیا کے دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی۔ اب ہندو تو اس بسنت کی بنیاد کو بھی بھول چکے مگر پاکستان میں مسلمان بسنت منا کر اسلام کی رسوائی کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔''

(روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور 4 فروری 1994ء)

''بسنت کا تہوار تاریخ و مذہب کے آئینہ میں''

اس عنوان سے محترم محمد حنیف قریشی لکھتے ہیں:

''یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ بسنت ایک موسمی اور ثقافتی تہوار ہے' جس کا مذہب اور قوم سے کوئی تعلق نہیں تاہم ابھی ایسے بزرگ ہزاروں کی تعداد میں موجود ہوں گے جو اس امر کی شہادت دیں گے کہ آزادی سے قبل بسنت کو عام طور پر ہندوؤں کا تہوار ہی سمجھا جاتا تھا اور لاہور میں ہی زیادہ جوش و خروش سے منایا جاتا تھا۔ جہاں دو تین جگہ بسنت میلہ منعقد ہوتا تھا' ہندو مرد اور عورتیں باغبانپورہ لاہور کے قریب حقیقت رائے (جس کا ذکر تفصیل سے آگے آ رہا ہے) کی سمادھ پہ حاضری دیتے اور وہیں میلہ لگاتے۔ مرد زرد رنگ کی پگڑیاں باندھے ہوتے اور عورتیں اس رنگ کا لباس ساڑھی وغیرہ پہنتیں۔ سکھ مرد اور عورتیں اس کے علاوہ' گوردوارہ گورو مانگٹ پہ بھی میلہ لگاتے۔ ہر جگہ خوب پتنگ بازی ہوتی۔ اندرون شہر بھی پتنگیں اُڑائی جاتیں اور لاکھوں روپیہ اس تفریح پہ خرچ کیا جاتا۔ مسلمان بھی اس میں حصہ لیتے مگر زرد کپڑوں وغیرہ کے استعمال سے گریز کرتے' علاوہ ازیں میلہ کا بھی علیحدہ اہتمام

حضرت مادھولال حسین کی درگاہ پہ کیا جاتا۔ لوگ دور دور سے اس میلہ میں شرکت کے لیے آتے اور نہ صرف اس کی رونق بڑھاتے بلکہ نذرانے بھی پیش کرتے۔ حضرت مادھولال حسین کا اپنا شعر بھی اس سلسلہ میں مشہور ہے:

رُت آئی بسنت بہار دی

سانوں سِک ہے مادھو یار دی

یہ سارا کھیل دن کو ہی ہوتا' رات کو روشنیاں لگانے اور لاؤڈ سپیکر' آتش بازی یا اسلحہ کے استعمال کا رواج نہ تھا۔ دوسرے شہروں میں بھی ہندو سکھ زرد کپڑے پہنتے اور پتنگ بازی کرتے مگر وہاں لاہور جیسا جوش وخروش نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی آج کل جیسی رونق ہوتی۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ''بسنت'' اصل میں ہندوؤں کی عید تھی جو وہ موسم کی تبدیلی پہ مناتے۔ مشہور محقق' سیاح' فاضل اجل علامہ ابوریحان البیرونی جو تقریباً ایک ہزار سال پیشتر ہندوستان تشریف لائے تھے' اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''کتاب الہند'' کے باب 76 میں ''عیدین اور خوشی کے دن'' کے تحت ''عید بسنت'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسی مہینہ میں استوائے ربیعی ہوتا ہے' جس کا نام بسنت ہے' کے حساب سے اس وقت کا پتہ لگا کر اس دن عید کرتے ہیں اور برہمنوں کو کھلاتے ہیں۔ اس میں پتنگ بازی کا ذکر نہیں۔ شاید یہ تفریح بعد میں کسی وقت اس دن کے ساتھ منسلک کر دی گئی ہو۔ آزادی سے پیشتر تقریباً دو سو سال تک لاہور میں خصوصی طور پر بسنت کو حقیقت رائے دھرمی کے یوم شہادت کے طور پر منایا جاتا رہا ہے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں تو اسے سرکاری طور پر بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا تھا۔ مہاراجہ اور ان کے درباری بھی زرد لباس میں قلعہ لاہور سے شالیمار گارڈن کی طرف جلوس کی شکل میں جاتے۔ راستہ میں سرسوں کے کھیت ہوتے' زرد پھولوں کے درمیان زرد پوش جلوس کا منظر نہایت دل فریب ہوتا۔ لیفٹیننٹ الیگزینڈر بریز جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں لاہور آئے تھے' بسنت کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں:

''بسنت کا تہوار جو بہار کا تہوار تھا' 6 فروری کو بڑی شان وشوکت سے منایا گیا۔ رنجیت سنگھ نے ہمیں اس تقریب میں مدعو کیا اور ہم اس کے ہمراہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر اس میلہ کی بہار دیکھنے چلے جو بہار کا خیر مقدم کرنے کے لیے منایا جاتا ہے۔ لاہور سے میلہ تک مہاراجہ کی فوج دورویہ کھڑی ہوتی ہے۔ مہاراجہ گزرتے وقت اپنی فوج کی سلامی لیتا ہے۔ میلہ میں مہاراجہ کا شاہی خیمہ نصب تھا جس پر زرد رنگ کی ریشمی دھاریاں تھیں۔ خیمہ کے درمیان میں ایک شامیانہ تھا جس کی مالیت ایک لاکھ روپیہ تھی جس سے موتیوں اور جواہرات کی لڑیاں آویزاں تھیں۔ اس شامیانہ سے شاندار چیز کوئی نہیں ہوسکتی۔ مہاراجہ

نے بیٹھ کر پہلے گرنتھ صاحب کا پاٹھ سنا' پھر گرنتھی کو تحائف دیئے اور مقدس کتاب کو دس جزودانوں میں بند کر دیا۔ سب سے اوپر والا جزودان بسنتی مخمل کا تھا۔ اس کے بعد مہاراجہ کی خدمت میں پھل اور پھول پیش کیے گئے اور ہر وہ بوٹی جس کا رنگ زرد تھا۔ بعد ازیں امراء' وزراء' افسران آئے جنہوں نے زرد لباس پہن رکھے تھے۔ انہوں نے نذریں پیش کیں۔ اس کے بعد طوائفوں کے مجرے ہوئے' مہاراج نے دل کھول کر انہیں انعامات دیئے۔'' (حوالہ ''نقوش'' لاہور نمبر' ص 763)

اب حقیقت رائے دھرمی جس کا اوپر ذکر کیا ہے اور جس کی سمادھ پہ 1947ء تک ہندو اور سکھ بسنت کے روز میلہ لگاتے' کی شخصیت کے متعلق وضاحت کی جاتی ہے۔ یہ ایک نوجوان لڑکا تھا' جس کا سیالکوٹ سے تعلق تھا۔ وہ اس وقت کے رواج کے مطابق مسلمانوں کے ساتھ مدرسہ میں تعلیم پاتا تھا۔ وہاں اس کا کسی بات پہ کسی مسلمان طالب علم سے جھگڑا ہو گیا۔ جس کے جواب میں حقیقت رائے نے خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخانہ کلمات کہہ دیئے۔ اس پر معاملہ بڑھ گیا اور نوبت قاضی اور حاکم تک پہنچی۔ حتیٰ کہ معاملہ حاکم لاہور کے سامنے پیش ہوا۔ حقیقت رائے کے اعتراف پر اسے موت کی سزا دی گئی اور سن 1803 بکرمی میں اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ وہ دن بسنت پنچمی کا تھا۔ اس واقعہ کا مختصر ذکر گیانی خزان سنگھ سابق لیکچرار اورینٹل کالج لاہور نے اپنی کتاب ''تاریخ گوردوارہ شہید گنج'' میں اس طرح کیا ہے:

''تواریخ کے محقق اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بھائی حقیقت سنگھ جنہیں عام لوگ حقیقت رائے دھرمی کے نام سے یاد کرتے ہیں' امرت دھاری اور تیار بر تیار سنگھ تھے۔ آپ کے ننھیال والے سکھ تھے اور موضع سوہدرہ ضلع گوجرانوالہ میں رہتے تھے۔ آپ کے ماموں بھائی ارجن سنگھ تیار بر تیار سنگھ تھے جو کہ آپ کے ساتھ ہی نخاس چوک میں شہید کر دیئے گئے تھے۔ آپ کے سسرال بھائی کنشن سنگھ وڈالے والہ کے گھر تھے...... لاہور میں اس جگہ (شہید گنج) پر آپ کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ ان کے بوڑھے پتا' ضعیف والدہ اور جوان بیوی کی آہیں اور فریادیں' پتھروں کو بھی موم کر دینے والی چیخیں اور منتیں بھی اس وقت کے حکام کے دل میں رحم اور ترس کے جذبات پیدا نہ کر سکیں اور آپ نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ سن 1803 بکرمی میں پنچمی کے دن دھرم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔ بسنت پنچمی کے روز آپ کی سمادھ پر بڑا بھاری میلہ لگتا ہے۔''

یہی واقعہ ڈاکٹر سر گوکل چند نارنگ سابق منسٹر لوکل گورنمنٹ پنجاب نے اپنی انگریزی تصنیف ''ٹرانسفرمیشن آف سکھ ازم'' میں اس طرح بیان کیا ہے:

''...... فیصلہ سنا دیا گیا اور فوراً ہی لاہور کے عین مرکز میں تمام ہندو آبادی کی

آہوں اور بددعاؤں میں شریف لڑکے کا سرقلم کردیا گیا۔ اس کی کریا کرم میں
سب امیروغریب شامل ہوئے اوراس کی راکھ لاہور کے مشرق میں چار میل دُور
دبادی گئی' جہاں اس کی یادگار ابھی تک قائم ہے جس پر ہر سال بسنت پنچمی کے
روز جواس کی شہادت کا دن ہے' میلہ لگتا ہے۔

حقیقت رائے کی یادگار کوٹ خواجہ سعید (کھوجے شاہی) لاہور میں ہے۔ اب یہ جگہ ''یادے دی مڑھی'' کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں ہندو رئیس کالورام نے بسنت میلے کا آغاز کیا جس کی یادگار قبرستان کے ساتھ اب بھی موجود ہے۔

(سنڈے میگزین روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور 7 مارچ 1999ء)

عیسوی سن کے مطابق یہ واقعہ 1747ء میں پیش آیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو لاہور اور پنجاب میں اقتدار اس کے کافی عرصہ بعد حاصل ہوا۔ مہاراجہ کا انتقال 1839ء میں ہوا۔ ان تاریخی حقائق سے بسنت کی اہمیت اوراس کی ہندوؤں' سکھوں سے مذہبی اور قومی وابستگی بالکل واضح ہے۔

گزشتہ سطور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسنت کے تہوار کے دو پہلو تھے۔ ایک مذہبی اور قومی اور دوسرا موسمی اور ثقافتی۔ جہاں تک مذہبی اور قومی پہلو کا تعلق ہے' تو جیسا کہ اوپر واضح کردیا گیا ہے کہ بسنت بلاشبہ خالصتاً ہندوؤں کا تہوار تھا جو اپنی رسوم کے مطابق اسے ہمیشہ مناتے رہے۔ البتہ غالباً رواداری' دباؤ یا کسی اور وجہ سے مسلمانوں نے اسے موسمی اور ثقافتی تفریح سمجھ کر پتنگ بازی میں شرکت کرنا شروع کردی اوراپنا علیحدہ میلہ لگانے کا بندوبست کرلیا۔ یہ بھی مناسب نہ تھا کیونکہ ایک تو اس میں غیر قوم کے ساتھ مشابہت تھی' جو منع ہے۔ دوسرے اسلام میں کسی موسمی یا ثقافتی تہوار کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ہر شہر' ہر گاؤں میں علاقائی روایات اور رسم ورواج کے مطابق سارا سال پورا وقت میلوں ٹھیلوں میں ہی صرف ہو جاتا۔ ویسے اسلام میں مذہبی تہوار بھی دو ہی ہیں۔ یعنی عیدالفطر اور عیدالضحیٰ' باقی سب رسومات اور تقریبات ہی ہیں۔ ان دونوں موقعوں پر بھی زہدوعبادت' صدقہ اور قربانی کا ہی حکم ہے۔ موسمی اور ثقافتی سرگرمی کے نام سے عام طور پر جو کچھ کیا جاتا ہے' وہ اکثر قومی دولت اور قیمتی وقت کا ضیاع ہی ہوتا ہے اور بسنت میں تو جانوں کے تلف ہونے اور ہمیشہ کے لیے معذور ہو جانے کا خدشہ بھی ہے۔ ہمیں ایسی خطرناک تفریح سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔



مرزا قادیانی کی پیدا کردہ مذہبی منافرت اور تحریکِ شماتت رسول ﷺ

ایچ ساجد اعوان

مرزا غلام قادیانی کی پہلی کتاب ''پرانی تحریریں'' کے نام سے 1879ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مرزا غلام قادیانی نے آریہ مذہب کی خوب خوب تردید کی اور دل کھول کر مخالفت کی اور ہر وہ حربہ آزمایا گیا جو کسی کی دل شکنی کا موجب ہوسکتا تھا۔

اس کے بعد 1881ء میں ''براہینِ احمدیہ'' کی پہلی جلد شائع ہوئی اور یوں 1884ء تک اس کتاب کی چار جلدیں پے در پے چھاپ ڈالیں۔

ان کتب کے الفاظ کیا تھے نشتر تھے جو ہندوؤں کے سینے میں اترتے جاتے تھے۔ قرآن کہتا ہے:

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظہ الحسنۃ و جادلھم بالتی ھی احسن (سورۃ النحل، آیت 125)

ترجمہ: ''اللہ کے راستے کی طرف حکمت اور نیک نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور اس چیز کے ساتھ ان سے جدال کرو جو بہت اچھی ہے''۔

تبلیغ اسلام کے اس طریقہ کار کی قطعی مخالفت کرتے ہوئے مرزا قادیانی نے جاہلانہ طرز اپنایا اور ہر ممکن طریقے سے ہندوؤں کو مخالفت پر اکسانے کی سر توڑ کوشش کی۔

مرزا قادیانی کی یہ کوششیں غیر مسلم اقوام کو مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار کرنے کے لیے ہی نہ تھیں بلکہ اسلام اور بانیِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کے اسباب بھی تیار کیے جا رہے تھے۔

مرزا قادیانی کی دیگر اشتعال انگیزیاں رقم کرنے سے پہلے مرزا قادیانی کا ایک اصول بیان کیا جاتا ہے تاکہ اتمامِ حجت ہو جائے۔

مرزا قادیانی مقدمہ براہینِ احمدیہ میں لکھتا ہے:

- ''جس میں کسی بزرگ یا پیشوا کسی فرقے کی کسرِ شان لازم آوے اور خود ہم ایسے الفاظ کو صراحتاً یا کنایتاً اختیار کرنا خبثِ عظیم سمجھتے ہیں اور مرتکب ایسے امر کو پرلے درجے کا شریر النفس خیال کرتے ہیں''۔ (مقدمہ براہینِ احمدیہ بحوالہ ستیارتھ پرکاش اور مرزا قادیانی، ص 70)

ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:

- ''غلط بیانی اور بہتان طرازی راست بازوں کا کام نہیں بلکہ نہایت شریر اور بدذات آدمیوں کا کام ہے''۔ (آریہ دھرم از مرزا قادیانی، ص 13)

اور سنیئے:

- ''گالیاں دینا سفلوں اور کمینوں کا کام ہے''۔ (ست بچن، از مرزا قادیانی، ص 21)
- ''گالیاں دینا اور بدزبانی کرنا طریقِ شرافت نہیں''۔ (ضمیمہ براہینِ احمدیہ نمبر 4، از مرزا قادیانی، ص 5)

قادیانیوں کے ایک جلسے میں مرزا قادیانی نے یہ خوب کہی:

- ''ایک بزرگ کو کتے نے کاٹا (اس کی) چھوٹی لڑکی بولی، آپ نے کیوں نہ کاٹ کھایا؟ اس نے جواب دیا بیٹی انسان سے ''کت پن'' نہیں ہوتا، اس طرح جب کوئی شریر گالی دے تو مومن کو لازم ہے کہ اعراض کرے، نہیں تو وہی ''کت پن'' کی مثال لازم آئے گی''۔ (تقریر مرزا اور جلسہ قادیانی 1897ء رپورٹ ص 99)

مرزا قادیانی کے مندرجہ بالا اصولوں کو ذہن میں رکھیے اور اس کے الفاظ بھی پڑھیے، یہاں تو وہی مثل صادق آتی ہے کہ ''مرزا کی جوتی مرزا کے سر''۔

آریوں کو مرزا قادیانی کی گالیاں!

- ''کیا قادیان کے احمق اور جاہل اور کمینہ طبع بعض آریہ......'' (نزول المسیح، از مرزا قادیانی، ص 9)
- ''ان لوگوں (آریوں) کے نزدیک جھوٹ بولنا شیرِ مادر ہے، شیاطین ہیں نہ انسان'' (نزول المسیح،

ازمرزا قادیانی'ص 11)

- ''پس اے آریو...... اے بے خوف اور سخت دل قوم...... وہ اول درجہ کا خبیث فطرت اور ناپاک طبع ہوتا ہے''۔(تتمہ حقیقۃ الوحی'ازمرزا قادیانی'ص 156)
- ''سفلہ طبع لیکھ رام۔ افسوس کہ یہ بے باکی اور ، گوئی کا تخم بدقسمت دیانند اس ملک میں لایا...... لیکھ رام پشاوری جو محض نادان اور ابلہ تھا''۔(چشمۂ معرفت جلد 1'ص 3)
- ''اس قسم کی شوخ چشمی اور بدزبانی اور بے باکی خاص آدمیوں کا حصہ ہے''۔(چشمۂ معرفت جلد 1'ص 6)
- ''چوروں اور خیانت پیشہ لوگوں......''۔(آریہ دھرم'ص 12)
- ''یہ کمینہ طبع لوگ' نکتہ چینی کے لیے تو حریص تھے ہی'اس پر چند شریر اور نادان عیسائیوں کی کتابیں ان کو مل گئیں اور شیطانی جوش نے یہ تلقین دی کہ یہ سب سچ ہے'لہٰذا اس روسیاہی اور ندامت کا انہوں نے بھی حصہ لیا جو اب نادان پادریوں کے منہ پر نمایاں ہے''۔(آریہ دھرم'ص 43)
- ''اے نادان آریو!کسی کنوئیں میں پڑ کر ڈوب مرو''۔(آریہ دھرم'ص 62)
- ''لیکھ رام کی طبیعت میں افتراء اور جھوٹ کا مادہ تھا''۔(استفتاء'ص 7)
- ''درحقیقت یہ شخص (دیانند) سخت دل سیاہ اور نیک لوگوں کا دشمن تھا......اس ناحق شناس اور ظالم پنڈت نے......''۔(ست بچن'ص 8)
- ''اس نادان پنڈت کی اشتعال دہی کی وجہ سے یہ حق رکھتا ہے...... یہ خشک دماغ پنڈت بکلی' بے نصیب اور بے بہرہ تھا...... وہ نہایت ہی موٹی سمجھ کا آدمی تھا اور باایں ہمہ اول درجہ کا متکبر بھی تھا''۔(ست بچن'ص 9)
- ''وہ خود ایسے موٹے خیالات اور غلطیوں میں گرفتار تھا کہ دیہات کے گنوار بھی اس سے بمشکل سبقت لے جاسکتے تھے''۔(ست بچن'ص 13)
- ''اے نالائق آریو!''۔(ست بچن'ص 36)
- ''مہاراج شریر النفس بولے۔شریر پنڈت......''۔(آریہ دھرم'ص 31-34)
- ''یہ نالائق ہندو وہی شخص ہے جس نے اپنے پنڈت ہونے کی شیخی مار کر......''۔(ست بچن'ص 6)
- ''لیکن دیانند ایسے زمانے میں بھی نابینا رہا جب کہ انگلستان اور جرمن وغیرہ میں ویدوں کے ترجمے ہو چکے ہیں''۔(ست بچن'ص 19)

اور یوں مرزا قادیانی نے ایک تو اپنا سودا بکوانے اور دوسرے مخالفوں کو اکسانے کی سبیل

تلاش کرلی' براہینِ احمدیہ صفحہ 12' اشاعت سوم میں ان کا دس ہزار انعامی اشتہار اب شائع کر دیا گیا ہے' تبلیغِ رسالت میں بھی درج ہے۔

عیسائیوں اور آریوں نے اس کا جواب دیا۔ مرزا قادیانی کا مطلوبہ ہدف قریب تھا اور جواباً اپنے ترکش کا پہلا تیر آزمایا! ملاحظہ فرمایئے:

□ ''کئی ایک پادری صاحبوں اور ہندو صاحبوں نے جوش میں آ کر اخبار ''سفیر ہند'' اور ''نور افشاں'' اور رسالہ ''برایا پرکاشک'' میں ہمارے نام طرح طرح کے اعلان چھپوائے ہیں' جن میں وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ضرور ہم اس کتاب کا جواب لکھیں گے اور بعض صاحب ڈوموں کی طرح ایسے صریح ہجو آمیز الفاظ استعمال میں لائے ہیں کہ جن سے ان کی طینت کی پاکی خوب ظاہر ہوتی ہے گویا وہ اپنی اوباشیانہ تقریروں سے ہمیں ڈراتے اور دھمکاتے ہیں۔ مگر انہیں معلوم نہیں ہم تو ان کی تہ سے واقف ہیں اور ان کے جھوٹے اور ذلیل اور پست خیال ہم پر پوشیدہ نہیں'' سو ان سے ہم کیا ڈریں اور وہ کیا ہمیں ڈرائیں گے''۔ (بحوالہ ستیارتھ پرکاش اور مرزا قادیانی از مولانا مظہر علی اظہر' ص 23)

مقدمہ براہینِ احمدیہ میں مرزا قادیانی نے کیا کیا گل کھلائے' ملاحظہ فرمایئے:

□ ''سو اگرچہ یہ دعویٰ تو اس کتاب میں ایسا رد کیا گیا کہ وید موجودہ کا قصہ ہی پاک ہو گیا ہے''۔ (مقدمہ براہینِ احمدیہ' بحوالہ ستیارتھ پرکاش اور مرزا قادیانی' از مولانا مظہر علی اظہر' ص 73)

نیز

□ ''پھر اپنے پرمیشر پر بھی یہ بدظنی جو اس کو غافل یا مدہوش یا مخبوط الحواس تصور کیا ہے کہ جو اس قدر بے خبر ہے گو بعد وید کے ہزار ہا طور کی نئی نئی بدعتیں نکلیں اور لاکھوں طرح کے طوفان آئے اور اندھیریاں چلنے لگیں اور رنگارنگ کے فساد برپا ہوئے اور اس کے راج میں ایک بُری طرح کی گڑبڑ پڑ گئی اور دنیا کو اصلاحِ جدید کی سخت سخت حاجتیں پیش آئیں' پر وہ کچھ ایسا سویا کہ پھر نہ جاگا اور کچھ ایسا کھسکا کہ پھر نہ آیا' گویا اس کے پاس اتنا ہی الہام تھا جو وید میں خرچ کر بیٹھا اور وہی سرمایہ تھا جو پہلے کہ بانٹ چکا اور پھر ہمیشہ کے لیے خالی ہاتھ رہ گیا اور منہ پر مُہر لگ گئی''۔ (مقدمہ براہینِ احمدیہ مصنفہ مرزا قادیانی بحوالہ ستیارتھ پرکاش اور مرزا قادیانی' از مولانا مظہر علی اظہر' ص 73)

مرزا قادیانی کا پنڈت جی کو گرمانا:

□ ''سارا باعث ان واہیات باتوں کا اور بے ہودہ چالاکیوں کا یہ ہے کہ پنڈت صاحب نہ عربی جانتے ہیں نہ فارسی اور نہ بجز سنسکرت کے کوئی اور بولی بلکہ اردو خوانی سے بھی بالکل بے بہرہ اور بے

نصیب ہیں اور ایک اور بھی باعث ہے جو ان کی نو تصنیف کتابوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ علاوہ کم فہمی اور بے عملی کے تعصب کے ان کی فطرتی سمجھ بھی سودائیوں اور وہمیوں کی طرح وضع استقامت پر قائم ہونے اور صراط مستقیم پر ٹھہرنے سے نہایت لاچار ہے اور نیک کو بدخیال کرتا اور بد کو نیک سمجھنا اور کھرے کو کھوٹا اور کھوٹے کو کھرا اقرار دینا اور الٹے کو سیدھا اور سیدھے کو الٹا جاننا ان کی ایک عام عادت ہوگئی ہے جو ہر جگہ برملا اختیار ان کے ظہور میں آتی ہے''۔(ستیارتھ پرکاش اور مرزا قادیانی' از مولانا مظہر علی اظہر' ص 77-78)

مرزا قادیانی پے در پے متعدد وار کرنے کے بعد زخمی سانپ کے زہر اور اس کی پھنکار کی پیش بندی خود ان الفاظ میں کرتے ہیں اور یہی ان کا مطمح نظر تھا:

□ ''منہ سے فضول باتیں بکنا کوئی بڑی بات نہیں۔ جو جی چاہے' بک لیا' کون روکتا ہے لیکن معقول طور پر مدلل بات کا مدلل جواب دینا شرطِ انصاف ہے یوں تو ہمارے سارے مخالفین گالیاں دینے اور توہین کرنے کو بڑے چالاک ہیں اور ہجو اور اہانت کرنا کسی استاد سے خوب سیکھے ہیں''۔(ستیارتھ پرکاش اور مرزا قادیانی' از مولانا مظہر علی اظہر' ص 86-87)

مرزا قادیانی کی کتاب براہینِ احمدیہ کے تین حصے تو 1880ء میں سفیر ہند پریس امرتسر میں چھپے مگر جلد چہارم مطبع ریاض ہند امرتسر میں 1884ء میں طبع ہوئی۔ اب تک مرزا قادیانی مسلسل اشتعال انگیزیوں میں مصروف تھے۔ حوالے نوٹ فرمائیے:

□ ''ہندوؤں کا پرمیشر آپ ہی لوگوں کو بدفعلی اور پلیدی میں ڈالنا چاہتا ہے''۔(براہینِ احمدیہ' حصہ چہارم' ستیارتھ پرکاش اور مرزا قادیانی' از مولانا مظہر علی اظہر' ص 116)

نیز

''مگر افسوس کہ پنڈت صاحب نے اس ذلیل اعتقاد سے دست کشی اختیار نہ کی اور اپنے بزرگوں اور اوتاروں وغیرہ کی اہانت اور ذلت جائز رکھی مگر اس ناپاک اعتقاد کو نہ چھوڑا''۔(براہینِ احمدیہ' حصہ چہارم' بحوالہ ستیارتھ پرکاش اور مرزا قادیانی' از مولانا مظہر علی اظہر' ص 119)

آریہ مذہب سے بدتر کوئی مذہب نہیں:

مرزا قادیانی لکھتا ہے:

□ ''ان کے مذہب اور اعتقاد کا سراسر باطل ہونا براہینِ قطعیہ سے ان پر ظاہر کیا اور نہایت عمدہ اور کامل دلائل سے باادب تمام ان پر ثابت کر دیا کہ دہریوں کے بعد دنیا میں آریوں سے بدتر اور کوئی

مذہب نہیں''۔(براہینِ احمدیہ جلد چہارم ستیارتھ پرکاش اور مرزا قادیانی ص 118)

''پنڈت صاحب جو مرزا قادیانی کی تحریروں میں زیر عتاب ہیں 30 اکتوبر 1883ء کو اس عالمِ فانی سے رخصت ہوگئے''(ستیارتھ پرکاش اور مرزا قادیانی از مولانا مظہر علی اظہر ص 125)

مرزا قادیانی اس اعتراف میں براہینِ احمدیہ حصہ چہارم مطبوعہ 1884ء میں لکھتے ہیں:

''مگر ان کی طرف سے (یعنی پنڈت صاحب کی طرف سے) کبھی صدا نہ اٹھی یہاں تک کہ خاک میں یا راکھ میں جا بسے''۔(ستیارتھ پرکاش اور مرزا قادیانی از مولانا مظہر علی اظہر ص 125)

کچھ پنڈت صاحب کے بارے میں

''آریہ سماج کے بانی تھے! سوامی دیانند سرسوتی کے نام سے مشہور تھے جب کہ ان کا اصل نام مول شنکر تھا۔ وہ 1824ء کو گجرات (کاٹھیاواڑ) میں پیدا ہوئے۔ 1845ء میں گھر بار چھوڑ کر نکلے۔ قریہ قریہ در بدر پھرے۔ جدید علوم سے سوجھ بوجھ حاصل کی۔ ازاں بعد ان کے گرو نے جدید علوم اور فنون کی کتب پھینکوا کر ویدک کی تعلیمات پر غور و فکر کا حکم دیا''۔(ماہنامہ ''نعت'' لاہور جلد 4 شمارہ 2 ص 32)

1875ء میں بدنامِ زمانہ کتاب 'ستیارتھ پرکاش'' شائع کروائی جس کے کل باب 12 تھے۔

مرزا قادیانی کی ان اشتعال انگیز تحریروں اور پنڈت جی کی وفات کے بعد 1884ء میں ستیارتھ پرکاش کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا جس میں تیرھواں اور چودھواں باب آ شامل ہوا اور ان دو ابواب میں خصوصاً چودھویں باب میں رحمت للعالمین ﷺ کی شان میں گستاخیاں لکھی گئیں۔

میاں قمرالدین مہتمم شعبہ تبلیغ مجلسِ احرار اسلام ہند رئیس اچھرہ ضلع لاہور نے مولانا مظہر علی اظہر کی کتاب ''ستیارتھ پرکاش اور مرزا قادیانی'' پر تقریظ رقم کی ہے اس میں آپ لکھتے ہیں:

''مصنفِ کتاب ''ستیارتھ پرکاش اور مرزا غلام قادیانی'' نے اپنی کتاب میں اس شخص یعنی مرزا غلام قادیانی کی تبلیغی اور دینی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے اور اس کی مختلف کتابوں کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ کس طرح مرزا غلام قادیانی نے دانستہ دوسرے مذاہب اور ان کے پیروؤں پر کیچڑ اچھالا اور ان کو اسلام اور بانی اسلام علیہ السلام کے خلاف گندہ اور زہر آلودہ مواد شائع کرنے پر اکسایا''۔ (ستیارتھ پرکاش اور مرزا غلام احمد از مولانا مظہر علی اظہر ص 504)

''کتاب البریہ'' میں مرزا صاحب نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اسلام اور بانی اسلام (صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف دوسرے لوگوں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اس سلسلے میں اس کتاب کی اشاعت دوئم میں جو دسمبر 1932ء میں ہوئی، صفحہ 11 پر عنوان یوں ہے:

''ستیارتھ پرکاش مصنفہ پنڈت دیانند 1875ء ماخوذ از ترجمہ ستیارتھ پرکاش مطبع کشن چند کمپنی لاہور''۔

اس عنوان سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ گویا 1875ء کے ایڈیشن میں پنڈت صاحب نے چودھواں باب تحریر کیا۔ مگر مرزا قادیانی نے 1875ء (ستیارتھ پرکاش اور مرزا غلام احمد، ص 138) پر نشان لگا کر بیرون حاشیہ درج کیا ہے کہ ''یہاں 1884ء پڑھنا چاہیے''۔

گویا 1875ء غلطی سے لکھا گیا ہے۔ دراصل اسے 1884ء پڑھنا چاہیے''۔ (ستیارتھ پرکاش اور مرزا غلام احمد، ص 128)

گویا مرزا صاحب خود معترف ہیں کہ ستیارتھ پرکاش کے پہلے ایڈیشن میں چودھواں باب نہیں تھا اور یہ مرزا صاحب کی نوازشات سے 1884ء میں ضبط تحریر میں آیا ہے:

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے جال میں صیاد آ گیا

مرزا قادیانی کی شاعرانہ حسن کلامی ملاحظہ فرمائیے۔ موصوف اس میدان میں بھی کسی سے کم نہ تھے:

چھپکے چھپکے حرام کروانا آریوں کا اصول بھاری ہے
نام اولاد کے حصول کا ہے ساری شہوت کی بے قراری ہے
بیٹا بیٹا پکارتی ہے غلط یار کی اس کو آہ و زاری ہے
دس سے کروا چکی ہے زنا لیکن پاک دامن ابھی بے چاری ہے
زنِ بیگانہ پر یہ شیدا ہیں جس کو دیکھو وہی شکاری ہے
ہے قومی مرد کی تلاش انہیں خوب جورو کی حق گزاری ہے
تاکہ کروائیں پھر اسے گندی پاک ہونے کی انتظاری ہے

(آریہ دھرم مصنفہ مرزا قادیانی، ص 76-77)

آریوں کا پرمیشر

مرزا غلام قادیانی آریوں کے سینے میں ایک اور زہر آلود نشتر یوں گھونپتے ہیں:

''آریوں کا پرمیشر ناف سے دو ہاتھ نیچے ہے''۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولاتسبّو الذین یدعونَ مِن دُونِ اللّٰہِ فَسَبُّوا اللّٰہَ عَدوًا بِغیرِ عِلمٍ (سورۃ انعام:109)

ترجمہ: ''اور نہ برا کہو ان لوگوں کو کہ پکارتے ہیں سوائے اللہ کے' پس برا کہنے لگیں گے خدا کو زیادتی سے بے سمجھے''۔

قرآن تعلیم دیتا ہے کہ کسی کے غلط خدا کو بھی بُرا نہ کہو تا کہ اس کے پیرو تمہارے سچے خدا کو بے علمی سے برا نہ کہیں۔قرآن کا منشاء خدائے بزرگ و برتر کی عظمت اور شان میں سبّ سے منع کرنا ہے جب کہ مرزا قادیانی اپنی کوتاہ فکری اور قرآن دشمنی کا اعلان ان الفاظ میں کرتا ہے:

> ''اور سخت الفاظ کے استعمال کرنے میں ایک یہ بھی حکمت ہے کہ خُفتہ دل اس سے بیدار ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں کے لیے جو مداہنہ کو پسند کرتے ہیں' ایک تحریک ہو جاتی ہے۔مثلاً ہندوؤں کی قوم ایک ایسی قوم ہے کہ اکثر ان میں سے ایسی عادت رکھتے ہیں کہ اگر ان کو اپنی طرف سے نہ چھیڑا جائے تو وہ مداہنہ کے طور پر تمام عمر دوست بن کر دینی امور میں ہاں سے ہاں ملاتے رہتے ہیں' بلکہ بعض اوقات تو ہمارے نبی ﷺ کی تعریف و توصیف اور اس کے دین کے اولیاء کی مدح و ثناء کرنے لگتے ہیں (جی ہاں! مرزا قادیانی جیسے اسلام دشمن کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا۔ناقل) لیکن دل ان کے نہایت درجہ کے سیاہ اور سچائی سے دور ہوتے ہیں۔ان کے روبرو سچائی کو اس کی پوری حرارت اور تلخی کے ساتھ ظاہر کرنا اس نتیجہ خیز کا منتج ہوتا ہے کہ اسی وقت ان کا مداہنہ دور ہو جاتا ہے اور بالجبر یعنی واشگاف اور اعلانیہ اپنے کفر کو بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں گویا ان کی رف کی بیماری محرقہ کی طرف انتقال کر جاتی ہے۔سو یہ تحریک جو طبیعتوں میں سخت جوش پیدا کر دیتی ہے اگر چہ ایک نادان کی نظر میں سخت اعتراض کے لائق ہے مگر ایک فہیم آدمی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ یہی تحریک رو بحق کرنے کے لیے پہلا زینہ ہے''۔(ازالۂ اوہام مصنفہ مرزا قادیانی' اشاعت پنجم' ص 15)

شیطنت کے یہ زینے مرزا قادیانی اس رفتار سے چڑھے کہ:

ابلیس کہتا تھا اس کے یہ کرتب دیکھ کر
بازی لے گیا مجھ سے مقدر تو دیکھئے

''بعض غیر جانبدار محققین کا خیال ہے کہ رسالہ مذکور کا چودھواں باب سوامی دیانند سرسوتی کا لکھا ہوا نہیں ...... اور اس شیطانی مواد کا اضافہ بہت بعد میں ہوا جب قادیانی مولویوں (پادریوں) نے انگریز آقا کی شہہ پر آریہ سماجیوں سے اور آریہ سماج کے قائدین نے مرزائی پروہتوں سے چپقلش شروع کی۔ مناظرے کے نام پر گالی گلوچ اور اشاعتِ اسلام کے پردے میں توہینِ رسالت (ﷺ) کا سامان کیا گیا۔ چودھویں باب کے بارے میں یہ رائے بعض معتبر حوالوں سے سچ ثابت ہوتی ہے باوجودیکہ آریہ سماجی تنظیم بھی برٹش گورنمنٹ کی تائید سے وجود میں آئی تھی۔ انہوں نے اپنے سیاسی مفادات کی خاطر سوامی مذکور کی شخصیت کو پردۂ گمنامی سے اٹھا کر منظرِ عام پر لا کھڑا کیا۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ موقف قطعاً غلط نہیں ٹھہرتا کہ تحریکِ شاتت رسول بھی مرزا قادیانی' جہنم مکانی کے سبب سے پیدا ہوئی ہے۔ گویہ دونوں طبقے انگریز شاطر کے مہرے تھے اور اسی کے اشارے پر فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دے رہے تھے مگر ظاہری سبب کچھ یوں پیدا ہوا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے آریہ سماجیوں کو اپنے رجحان طبعی کے موافق مسلسل غلیظ گالیاں سنائیں اور ہندو دھرم پر قابلِ اعتراض انداز میں جملے کسے''۔ (ماہنامہ ''نعت'' لاہور جلد 4' شمارہ 2' ص 33)

''اور بقول آغا شورش کاشمیری نتیجتاً آریہ سماج نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن و اسلام کے خلاف دریدہ دہنی کا آغاز کیا''۔ (تحریکِ ختم نبوت از آغا شورش کاشمیری' ص 24)

ہندوؤں کے ہردلعزیز لیڈر گاندھی جی کا ایک معتبر حوالہ یہاں سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

گاندھی جی فرماتے ہیں:

''اس فتنے کا آغاز مرزائی مولویوں (پادریوں) نے کیا ہے جنہوں نے اپنے لٹریچر میں ہندو مذہب کو ہمیشہ نشانہ طنز بنایا۔ سوامی دیانند سرسوتی کو غلیظ سے غلیظ گالیاں دی گئیں اور ہندوانہ رسوم پر سفیہانہ تمسخر کیا۔ اس پر بعض نادان آریہ سماجیوں نے انتقاماً حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی توہین شروع کر دی'' (ینگ انڈیا 9 جون 1924ء 24 ستمبر 1927ء)

اس بحث سے مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

1- مرزا قادیانی کی مذہبی چھیڑ چھاڑ سے پہلے ہندوستان کے اکثر ہندو دانشور' لیڈر' مذہبی سکالر اور شعراء آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح سرائی میں کسی سے کم نہ تھے۔

2- مرزا قادیانی نے ہندوؤں کے خلاف 1879ء میں لکھنا اور بولنا شروع کیا اور غلیظ تر الفاظ استعمال

کر کے اسلام اور بانیِ اسلام ﷺ کے خلاف دریدہ دہنی کا سامان کیا۔

3- ''ستیارتھ پرکاش'' کا پہلا ایڈیشن 1875ء میں شائع ہوا' اس میں چودھواں باب موجود نہیں تھا۔ مرزا قادیانی کی تبرابازی کے نتیجے میں 1884ء میں ''ستیارتھ پرکاش'' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا جس میں چودھواں باب مغلظات سے پُر تھا۔

4- مرزا قادیانی کا اقرار کہ جب تک ہندوؤں کو اپنی طرف سے نہ چھیڑا جائے بالجہر' واشگاف اور اعلانیہ اپنے کفر کا اظہار نہیں کرتے۔

5- ہندوؤں کی طرف سے جب حضور ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو مرزا قادیانی کا اس عمل کو عین اپنی تحریک کے حق میں گردانتا۔

6- غیر جانبدار محققین کا تجزیہ کہ حضور ﷺ کی شانِ مقدسہ میں ہندوؤں کو گستاخی کرنے پر مرزا قادیانی کی اشتعال انگیز تحریروں اور تقریروں نے اکسایا۔

مرزا قادیانی نے سرورِ کونین ﷺ کی شان میں ہرزہ سرائی کرنے کی ایسی قبیح بنیاد رکھی کہ اس خبیث عمارت پر کبھی تو ستیارتھ پرکاش اور کبھی مہاشے راجپال کے بدنماد ھبے دکھائی دیتے ہیں۔

مرزا قادیانی ہی کے کانٹے بونے کا یہ نتیجہ تھا کہ امتِ مسلمہ کو رام گوپال' نتھورام' شردھانند' پالامل سنار اور چلچل سنگھ جیسے خاردار اور زہر آلود درخت کاٹنے پڑے۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مذکورہ بالا گستاخانِ نبی ﷺ کی گستاخیوں کا مصدر قادیانی مذہب تھا۔ یونہی اس حقیقت سے بھی انکار ناممکن ہے کہ گستاخانِ رسول ﷺ کا مہا گرو خود مرزا غلام قادیانی تھا۔



إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

شماتت سرکار ﷺ کی کوششیں اور مسلمان حکمران

سید محمد سلطان شاہ

جب بھی کسی شاتم نے رسولِ مکرم، نبی معظم، نورِ مجسم، احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی شانِ اقدس میں سرِمو گستاخی کا ارتکاب کیا، عشاقِ مصطفیٰ ﷺ کے قلوب میں ایسی آتش غضب بھڑکی جس نے توہین و تضحیک کے مرتکب لعنتی کو بھسم کر دیا۔ تاریخ اسلام کی ورق گردانی سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ جب بھی کسی ملک میں شماتت رسول کی کوئی تحریک چلی تو محبانِ رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے اس فتنے کی سرکوبی کے لیے جہاد بالقلم کے علاوہ جہاد بالسیف کا عملی مظاہرہ کیا اور منبروں پر اشتعال انگیز تقاریر کرنے اور لوگوں کو سڑکوں پر لانے کے بجائے خدا تعالیٰ کے بے عیب محبوب (ﷺ) کی تنقیص کرنے والوں کو واصلِ جہنم کر کے دم لیا۔ انہوں نے سرورِ کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف بھونکنے والے کتوں کے گلے کاٹ دیئے اور ہر اس بدبخت قلمکار کو فنافی النار کیا جس نے ایسی کوئی نامعقول جسارت کی۔ شماتت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تحریک صرف ہندوستان میں نہیں چلی بلکہ اس سے قبل بھی اس فتنے نے اندلس میں سر اٹھایا تھا۔ ہاں یہ برصغیر پاک و ہند کا تخصص ہے کہ یہاں شاتمیت کے بھوتوں کا قلع قمع کرنے والوں نے خود بھی جامِ شہادت نوش کیا۔ جبکہ بلادِ اسلامیہ میں جب بھی کسی بدبخت نے آنحضرت ﷺ کی توہین و تضحیک کی یا ان کی حیاتِ طیبہ کو غلط رنگ دے کر تمسخر اُڑایا تو مسلم حکمرانوں نے ایسے اشخاص کو قتل کروا کر اپنے مومن ہونے کا ثبوت دیا۔ ناموسِ رسالت کے تحفظ کے لیے مسلمان خلفاء و فقہا سبھی کا یہ موقف رہا ہے کہ جب کسی نے حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ

واکمل التحیات کی شان میں گستاخی کی تو فوراً اس کے قتل کا حکم صادر کیا گیا۔ زیرِ نظر مضمون میں مختلف ادوار کے مسلم حکمرانوں کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے جنہوں نے اپنے زمانے کے "رُشدیوں" کو ان کی ناپاک جسارتوں کے باعث قتل کرا دیا تھا۔

عہدِ نبوی (ﷺ) میں گستاخانِ رسول کا انجام

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے عہد سعید میں گستاخی رسول (ﷺ) کا ارتکاب کرنے والے کئی افراد کو قتل کیا گیا۔ ایک نابینا صحابی نے اپنی بیوی کو اس لیے قتل کر دیا کہ وہ سرکارِ دو جہاں ﷺ کی شان میں گستاخی کیا کرتی تھی۔ حضورِ اقدس ﷺ نے اس صحابی کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اس عورت کا خون رائیگاں ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں تشریف فرما تھے کسی نے عرض کی حضور ﷺ ابن خطل کعبہ سے لپٹا ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "اقتلو" اسے قتل کر دو۔ یہ عبداللہ بن خطل رسول اللہ ﷺ کی ہجو میں شعر کہہ کر آپ (ﷺ) کی شان میں توہین و تنقیص کیا کرتا تھا۔ اس نے دو گانے والی لونڈیاں (فرتنا اور قریبہ) اس لیے رکھی ہوئی تھیں کہ وہ حضور ﷺ کی ہجو میں اشعار گایا کریں۔ جب حضورِ اکرم ﷺ نے اس کے قتل کا حکم دیا تو اسے غلافِ کعبہ سے باہر نکال کر باندھا گیا اور مسجد حرام میں مقامِ ابراہیم اور زم زم کے درمیان اس کی گردن اڑا دی گئی۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الشفاء میں یہ واقعہ بھی رقم کیا ہے کہ ایک شخص نے سرورِ عالم ﷺ کی بارگاہ میں گستاخی کی۔ حضورِ اقدس ﷺ نے اس کی اس حرکت پر فرمایا کہ کون غیور ہے جو اس دریدہ دہن گستاخ کو اس حرکت کا مزہ چکھائے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا "میری خدمات اس کام کے لیے حاضر ہیں اور اس مردِ مجاہد نے اس گستاخ کو گستاخی کی سزا دی۔"

صحابہ کرامؓ اور شاتمانِ رسول (ﷺ)

تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کسی نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سامنے سرکارِ مدینہ ﷺ کی توہین و تضحیک کی یا آپ ﷺ پر سب و شتم کیا تو انہوں نے ایسے بدبخت شخص کو قتل کر دیا۔ حضرت سیف اللہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مالک بن نویرہ کو اس لیے قتل کر دیا کہ اس نے گفتگو میں سرکارِ دو عالم ﷺ کے لیے "صاحبکم" (تمہارے ساتھی) کا لفظ استعمال کر کے تعریض کی تھی۔

ابن وہب نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ ایک راہب نے

سرکارِ دوعالم ﷺ کی بارگاہ میں گستاخی کی۔ جب ابن عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ سامعین نے اس کو قتل کیوں نہیں کیا خلیفہ اوّل ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنی خلافت کے زمانے میں اطلاع ملی کہ آپ کے ماتحت ایک والی نے ایک عورت کے دانت اکھیڑ دیے ہیں' کیونکہ اس عورت نے حضور ﷺ کی شان میں ناروا کلمات بکے تھے۔ آپ نے فرمایا ''اب سزا دی جا چکی ہے۔ ورنہ میں حکم دیتا کہ عورت کو قتل کر دیا جائے۔ اس لیے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی شان اقدس میں ذرا بھی گستاخی کا ارتکاب کرنے والے کی سزا قتل ہے۔''

مندرجہ بالا واقعات سے مترشح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ہمیشہ گستاخِ رسول (ﷺ) کو واجب القتل سمجھا۔ اور اپنے پیارے آقا و مولا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ اقدس میں ذرا بھی گستاخی کرنے والے کو سزا دی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک شاتمِ رسولؐ کی سزا

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کا مختصر دورِ خلافت بنوامیہ کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ انہوں نے اپنے پیشرو حکمرانوں کے طرزِ عمل سے ہٹ کر حکومت کی اور ملوکیت کو ایک بار پھر خلافت میں بدل دیا۔ اسی لیے بعض مورخین انہیں پانچویں ''خلیفۂ راشد'' کے لقب سے موسوم کرتے ہیں۔ آپ سرکارِ مدینہ ﷺ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کرنے والے کو واجب القتل سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ کوفہ کے عامل کے استفسار پر آپ نے تحریر فرمایا کہ سوائے اس شخص کے جو سرورِ عالم ﷺ کی بارگاہ میں گستاخی کا مرتکب ہو' کسی دوسرے کو گالی دینے کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا۔

موسیٰ بن مہدی عباسی اور گستاخِ پیغمبر خدا (ﷺ)

عباسی خلیفہ موسیٰ بن مہدی الملقب بہ ہادی کے عہد میں ایک شخص نے قبیلہ قریش کو برا بھلا کہا۔ اس سلسلے میں حضور نبی کریم ﷺ کی ذاتِ پاک کے متعلق بھی گستاخی کی۔ وہ ہادی کے سامنے لایا گیا۔ اس نے علماء و فقہاء کو جمع کر کے اس کے متعلق فتویٰ لیا۔ انہوں نے اس کے قتل کا فتویٰ صادر کیا۔ اس پر خلیفہ نے کہا کہ اس کی سزا کے لیے قریش ہی کی اہانت کافی تھی (کیونکہ یہ سرکار مدینہ ﷺ کا خاندان ہے)' اس دشمن خدا نے رسول اللہ ﷺ کو بھی شامل کر لیا۔ چنانچہ اس کا سر قلم کر دیا گیا۔

خلیفہ ہارون الرشید اور امام مالکؒ

ہارون الرشید عباسی نے امام مالکؒ سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا جو سرکار ﷺ کی بارگاہ میں گستاخی کرتا ہو۔ ہارون الرشید نے لکھا تھا کہ علماء نے شاتمِ رسولِ عربی ﷺ کے لیے

کوڑوں کی سزا تجویز کی ہے' آپ کا اس سلسلے میں کیا فتویٰ ہے؟ امام مالکؒ نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ جو شخص حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو گالی دے' وہ ملت اسلامیہ کا فرد نہیں رہتا' ایسا شخص واجب القتل ہے۔ امام مالکؒ کا موقف یہ تھا کہ جو شخص آنحضرت ﷺ کی ذرا بھی اہانت کرے' اس کی گردن اڑا دی جائے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ایک نے کہا تم اُمی (ان پڑھ) ہو۔ اس نے کہا ''اُمی تو حضور اکرم ﷺ بھی تھے۔'' اس پر امام صاحب نے اس کے قتل کا فتویٰ صادر فرما دیا۔

شاتمِ رسولؐ ریجی نالڈ اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ

شیطان صفت پرنس ارطاۃ والیٔ کرک ریجی نالڈ نے جزیرہ نمائے عرب پر لشکر کشی کا قصد کیا تاکہ مدینہ منورہ میں آنحضرت ﷺ کے مزار کو منہدم اور مکہ معظمہ میں خانہ کعبہ کو مسمار کردے۔ جب وہ سمندری راستے سے حملہ آور ہوا تو مسلمان مقابلے کے لیے مدینہ پاک سے روانہ ہوئے۔ اس کی فوج اسلامی لشکر کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ اپنے جہازوں کو چھوڑ کر پہاڑوں کی جانب بھاگی۔ مسلم سپاہ کے جیالوں نے انہیں پہاڑوں اور باغ سے پکڑ کر ان کے ٹکڑے کر دیئے۔ ریجی نالڈ جیسا شاتم رسول (ﷺ) خود بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن ابلیس کا یہ فرزند اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا اور مسلمانوں کو دکھ پہنچانا اور حضور ﷺ کی توہین کا ارتکاب کرنا اس کی فطرت کا جزو لاینفک بن گیا۔ لین پول کا بیان ہے کہ ریجی نالڈ نے 1179ء میں مسلمانوں کا ایک کارواں لوٹ لیا اور اس کے تمام آدمی گرفتار کر لیے۔ بادشاہِ یروشلم نے اس پر اعتراض کیا اور کارواں کے لوگوں کی رہائی اور لوٹے ہوئے مال کی واپسی کے لیے سفیر بھیجے۔ ریجی نالڈ نے ان کا مذاق اُڑایا۔ 1183ء میں پھر یہی حرکت کی۔ 1186ء میں مسلمان تاجروں کے ایک قافلے کو لوٹ کر اہلِ قافلہ کو گرفتار کیا۔ جب ان لوگوں نے اس سے رہائی کے لیے کہا تو اس نے یہ طعن آمیز جواب دیا ''تم محمد (ﷺ) پر ایمان رکھتے ہو۔ اس سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ آ کر تم کو چھڑائے۔'' جس وقت سلطان صلاح الدین ایوبی کو ریجی نالڈ کی اس گستاخانہ گفتگو کی خبر ملی تو اس نے قسم کھا کر کہا۔ اس صلح شکن کافر کو خدا نے چاہا تو میں اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گا۔

صلیبی لڑائیوں کے سلسلے میں ایک موقع پر فرنگیوں کو شکست ہو گئی۔ فرنگی شہنشاہ اور شہزادے قید کر کے سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے سامنے لائے گئے۔ ان میں ریجی نالڈ بھی تھا۔ سلطان کو دیکھ کر اسے اپنی بداعمالیاں یاد آ گئیں اور ساتھ ہی سلطان کی قسم بھی یاد آ گئی' جس نے ریجی نالڈ کا خون خشک کر دیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے اس کو تمام بداعمالیاں گنائیں اور یہ بھی کہا کہ اس وقت میں محمد

رسول اللہ ﷺ سے مدد چاہتا ہوں اور یہ کہہ کر اپنے ہاتھوں سے اس موذی کا سر قلم کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ہم مسلمانوں کا یہ دستور نہیں ہے کہ لوگوں کو خواہ مخواہ قتل کرتے رہیں۔ ریجی نالڈ تو صرف حد سے بڑھی ہوئی بداعمالیوں اور حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ گستاخی کی پاداش میں قتل کیا گیا ہے۔

اسی سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے قبلۂ اوّل بیت المقدس کو عیسائیوں کے قبضے سے آزاد کرایا تھا۔ وہ اسلام کا عظیم سپوت تھا اور اس کا دل عشقِ مصطفیٰ علیہ التحیتہ والثناء کی دولت سے مالا مال تھا۔ اس نے اس عیسائی حکمران کو جس نے اہانت رسول (ﷺ) کا ارتکاب کیا تھا' اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کیا۔

سلطان نورالدین زنگیؒ اور دو بدبخت نصرانی

577ھ میں سلطان نورالدین زنگیؒ کے زمانے میں روضۂ پاک میں نقب زنی کی ناپاک جسارت کی گئی۔ مگر اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ نے شرپسندوں کا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ سلطان کو خواب میں حضور سرورِ کونین ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی اور آپ ﷺ نے دو نیلی آنکھوں والے آدمیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان سے میری حفاظت کرو۔ سلطان کو سخت تشویش ہوئی' اٹھ کر وضو کیا۔ نفل ادا کیے مگر جونہی لیٹے پھر وہی خواب دیکھا۔ غرضیکہ تین دفعہ ایسا ہوا تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنے وزیر جمال الدین کے مشورے پر فوراً مدینہ کی تیاری شروع کر دی۔ سولھویں دن مدینہ طیبہ پہنچا۔ ریاض الجنتہ میں تحیتہ المسجد ادا کرنے کے بعد سوچنے لگا کہ حصولِ مقصد کے لیے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔ آخر وزیر نے اعلان کیا کہ بادشاہ مدینہ منورہ میں تشریف لائے ہیں' وہ اہلِ مدینہ کو انعامات سے نوازیں گے۔ ہر شخص حاضر ہو کر اپنا حصہ لے لے۔ ایک ایک آدمی آتا گیا' بادشاہ انعامات تقسیم کرتا رہا۔ وہ ہر شخص کو بغور دیکھتا اور خواب میں نظر آنے والی شکلوں کو تلاش کرتا رہا۔ حتیٰ کہ مدینہ کے تمام لوگ گزر گئے مگر مجرمین کا کھوج نہ لگایا جاسکا۔ بادشاہ نے استفسار کیا کہ کوئی رہ گیا ہو تو حاضر کیا جائے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد شاہ کو بتایا گیا کہ صرف دو مغربی باشندے ہیں جو نہایت متقی ہیں اور انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر رکھی ہے۔ ہر وقت عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے ہیں۔ بادشاہ نے انہیں بھی طلب کر لیا اور انہیں ایک نظر دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ''کون ہو؟ اور یہاں کیوں پڑے ہو؟'' انہوں نے بتایا کہ ہم مغرب کے رہنے والے ہیں۔ حج کے لیے آئے تھے۔ روضۂ انور کی زیارت کے لیے مدینہ آئے تو حضور ﷺ کے پڑوس میں رہنے کے شوق میں یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بادشاہ ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر ان کی رہائش گاہ پر پہنچا جو ایک قریبی سرائے میں تھی۔ مگر وہاں کوئی مشکوک چیز نظر نہ آئی جس کی وجہ سے بادشاہ

اور پریشان ہوگیا۔

مدینۂ پاک کے لوگوں نے ان کی صفائی میں بہت کچھ کہا کہ یہ تو نہایت پرہیزگار ہیں۔ ریاض الجنۃ میں نماز پڑھتے ہیں۔ روزانہ جنت البقیع کی زیارت کرتے ہیں اور ہر شنبہ کو قبا میں نفل ادا کرتے ہیں۔ یہ قائم اللیل اور صائم النہار ہیں۔ اس سے بادشاہ کی تشویش میں اور اضافہ ہوگیا۔ دفعتاً بادشاہ کے دل میں کچھ خیال آیا اور اس نے ان آدمیوں کے مصلیٰ کو الٹ دیا۔ بوریہ کا مصلیٰ ایک پتھر کے اوپر تھا۔ پتھر اٹھایا گیا تو نیچے سرنگ نمودار ہوئی جو دور تک روضہ انور کے قریب پہنچ چکی تھی۔

بادشاہ نے اس کمینہ حرکت کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ نصرانی ہیں اور عیسائی بادشاہوں نے انہیں بیش بہا دولت دے کر اس کام پر مامور کیا ہے کہ کسی طرح وہ حضور نبی کریم ﷺ کے حجرۂ مقدسہ میں داخل ہوکر آپ کا جسم عنبریں یہاں سے نکال کر لے جائیں۔ ان کا طریقۂ واردات یہ تھا کہ رات بھر سرنگ کی کھدائی کرتے اور مشکوں میں مٹی بھر کر بقیع کے مضافات میں ڈال آتے۔

سلطان نور الدین زنگیؒ یہ باتیں سن کر آتشِ غضب سے بھڑک اٹھا۔ ساتھ ہی رقت بھی طاری ہوگئی کہ اسے اس کام پر مامور کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان دو عیسائیوں کو صبح کے وقت قتل کرا دیا اور شام کے وقت ان کی ناپاک نعشوں کو نذر آتش کر کے خاکستر کر دیا گیا۔

اس کے بعد اس بیدار بخت بادشاہ نے حجرۂ پاک کے چاروں طرف اتنی گہری بنیادوں کو سطح زمین تک بھر دیا تاکہ آئندہ کسی ملعون کو نبی پاک ﷺ کی لحدِ مبارک کے قصد کا موقع نہ مل سکے۔

فقہائے اندلس اور گستاخِ رسول ﷺ

ابراہیم فرازی ماہرِ علوم اور اپنے زمانے کا مشہور شاعر تھا۔ وہ قاضی ابوالعباس بن طالب کی علمی مجلس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ جب اس کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ خداوند تعالیٰ انبیاء علیہم السلام اور خاتم الانبیاء ﷺ کی بارگاہ میں گستاخیاں کرتا ہے اور استخفاف اور استہزاء کے کلمات استعمال کرتا ہے تو قاضی بن عمرو اور دیگر فقہاء نے اس کو عدالت میں طلب کیا اور اس کی کوتاہیوں کے ثبوت کے بعد اس کے قتل اور پھانسی کا حکم دیا۔ چنانچہ پہلے اس کے پیٹ میں چھری ماری گئی اور اس کے بعد اس کو اٹھا کر سولی پر لٹکایا گیا۔ بعد میں اس کی نعش سولی سے اتار کر جلا دی گئی۔

سپین میں تحریکِ شماتت رسول (ﷺ)

جہاں بھی دو مختلف مذاہب کے پیروکار موجود ہوں اور ایک کا مذہب دوسرے کی مکمل طور پر نفی کرتا ہو وہاں باہمی چپقلش ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اگر ایک گروہ اصنام پرست اور دوسرا بت شکن ہو اور وہ

ایک ہی خطے کے مکین ہوں تو ان کا برسر پیکار ہونا لازمی امر ہے۔ چنانچہ توحید کے پرچارک تثلیث یا ثنویت کے حامیوں کے ساتھ اپنی کوشش کے باوجود صلح وآشتی سے نہیں رہ سکتے۔ اس لیے جب مسلمان مشرق کو زیرِنگیں بنا لینے کے بعد مغرب میں وارد ہوئے اور وہاں کے عیسائیوں کے ساتھ ایک ہی وطن میں رہنے لگے تو دونوں اقوام کے متصادم نظریات نے ایک چپقلش کو جنم دیا۔ مسلمان اندلس میں حکمران تھے تو انہوں نے عیسائیوں سے رواداری کا سلوک کیا۔ عبدالرحمٰن الاوسط انتہائی رحم دل حکمران تھا۔ اس کے عہد میں سپین میں بہت سے نصرانی حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے۔ مسلمانوں کے عمدہ اخلاق نے عیسائیوں کو بہت متاثر کیا اور وہ عربی زبان اور اسلامی تمدن کی طرف مائل ہوگئے۔ نصرانی پادریوں کو اس پر سخت غصہ اور رنج ہوا۔ اسی زمانے کا ایک متعصب عیسائی الوارو رقمطراز ہے۔ ''میرے ہم مذہب عیسائی عربوں کی شاعری اور افسانوں سے حظ اٹھاتے ہیں۔ وہ مسلمان فقیہوں اور فلسفیوں کی کتابیں مطالعہ کرتے ہیں۔ اس غرض سے نہیں کہ ان کی تردید کریں بلکہ اس لیے کہ صحیح اور نفیس عربی لکھنی آجائے۔ پادریوں کو چھوڑ کر آج کون سا عیسائی ہے جو کتبِ مقدسہ کی تفسیریں لاطینی زبان میں مطالعہ کرتا ہو۔ کون سا عیسائی ہے جو انجیل یا انبیاء اور حواریوں کے حالات پڑھتا ہو۔ افسوس کہ ایسے نوجوان عیسائی جو ذہانت اور لیاقت میں اونچا درجہ رکھتے ہیں' ان کو سوائے عربی کے کسی اور زبان سے واقفیت نہیں۔''

جونہی عیسائیوں میں مشرقیت بڑھتی گئی' پادریوں کی تشویش میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور مسلمانوں کے خلاف ان کے نفرت بھرے جذبات بڑھتے گئے۔ امیر عبدالرحمٰن کی رواداری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے شاتت رسول (ﷺ) کی تحریک شروع کی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے لین پول لکھتا ہے:

''اندلس میں عیسائیوں کو اپنے مذہبی مراسم آزادی سے انجام دینے کی جو رعایتیں حاصل تھیں' ان کی طبائع کی کج روی سے اس کا عجیب برعکس قسم کا نتیجہ ظاہر ہوا۔ اندلس کے پادری' کلیساؤں کے پچھلے اقتدار کو بحال کرنے کے خواہاں تھے لیکن اسلامی حکومت کی اس روادارانہ روش سے ان کو عیسائیوں کے جذبات کے برانگیختہ کرنے کا موقع نہ مل سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے چند غالی مسیحیوں میں یہ خیالات پیدا کیے کہ مذہب کی اصل روح تکلیفیں اٹھانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے حکمرانوں کو مشتعل کر کے انسانی جسم اور گوشت پوست کو تکلیفیں پہنچائی جائیں تاکہ روح کا تزکیہ وتقدیس ہو سکے۔ اس تحریک کا بانی قرطبہ کا ایک راہب یولوجیس تھا۔ وہ مجاہدے کی راہبانہ زندگی کی وجہ سے عیسائیوں میں عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس نے چند نوجوانوں میں فدائیت کا جذبہ پیدا کیا کہ اپنی روح کو پاک کرنے کے لیے اس نئے دین اسلام اور اس کے داعی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر سب وشتم کریں۔

اسلامی قانون کی رو سے اسلامی حکومت میں شاتم رسول (ﷺ) کی سزا قتل ہے۔ گویا یہ نوجوان حضرت مسیح (علیہ السلام) کی پیروی کریں گے اور اپنی جانوں کو قربان کر کے جام "شہادت" نوش کریں گے۔"

حضور نبی کریم ﷺ پر سب وشتم کی اس تحریک کے متعلق محمد احسان الحق سلیمانی رقم طراز ہیں۔

"امیر (عبدالرحمان) کے عہدِ دولت کے آخری ایام عیسائیوں پر سختی اور تشدد کے سبب بہت بُرے گزرے۔ عیسائی مذہبی دیوانے بے ہودہ شہرت اور لغو شہادت کی خاطر مسجدوں کو ناپاک بنا دیتے اور نبی اکرم ﷺ کی شان عالی میں بے ہودہ باتیں کہتے۔ سختی سے کام لیا گیا اور نرمی سے بھی لیکن یہ سلسلہ بند نہ ہوا۔ ان واقعات نے امیر کی صحت پر برا اثر ڈالا اور وہ مرض سکتہ کے سبب 852ھ میں اللہ میاں کو پیارے ہو گئے۔"

شاتت رسول (ﷺ) کی یہ تحریک امیر عبدالرحمان الاوسط کے دور میں شروع ہوئی اور اس کے فرزند ارجمند امیر محمد بن عبدالرحمان کے عہد میں اپنے انجام کو پہنچی۔ دونوں باپ بیٹوں نے توہین رسول (ﷺ) کا ارتکاب کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا حکم دیا۔ یہ تحریک 234ھ ((850ء) میں شروع ہوئی اور 246ھ (860ء) میں ختم ہوئی۔

اس دوران بہت سے شاتمانِ مصطفیٰ (ﷺ) کو واصلِ جہنم کیا گیا۔ سٹینلے لین پول کے بقول 851ء کے موسم گرما کے دو مہینے سے کم عرصے کے اندر گیارہ گستاخوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ ہیرلڈ لیور مور تعداد بتائے بغیر بہت سے عیسائی ظالموں کے قتل کیے جانے کا ذکر کرتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں 53 افراد کے شاتت رسول (ﷺ) کی پاداش میں قتل کیے جانے کا تذکرہ ملتا ہے۔ این میری شمل بھی عیسائی گستاخوں کی دانستہ طور پر پیغمبر اسلام ﷺ کی بے ادبی کرنے کی سزا میں قتل ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

اب ان بدبختوں کا ذکر کیا جاتا ہے جنہوں نے جھوٹی شہرت کے لیے اپنی آخرت برباد کر لی۔

1- یولوجیئس

اندلس میں چلائی جانے والی تحریکِ شماتت رسول (ﷺ) کا بانی پادری یولوجیئس تھا۔ وہ قرطبی خاندان کا آدمی تھا۔ یہ خاندان جس قدر عیسائی مذہب سے شغف رکھتا تھا' اسی قدر اسلام سے عداوت رکھنے میں مشہور تھا۔ یولوجیئس کا دادا (اس کا نام بھی یولوجیئس ہی تھا) جس وقت مسجد کے مینار

سے مؤذن کی آواز سنتا تھا تو اپنے جسم پر نشانِ صلیب بناتا تھا اور داؤد نبی کا یہ زبور گانے لگتا تھا۔ ''اے خدا! چپ نہ ہو۔ اے خدا! چین نہ لے' کیونکہ دیکھ تیرے دشمن اُودھم مچاتے ہیں اور ان لوگوں نے جو تجھ سے کینہ رکھتے ہیں' سر اٹھایا ہے۔'' یولوجیئس کی تعلیم شروع ہی سے اس غرض سے ہوئی تھی کہ پادری بنے۔ خانقاہ سینٹ زولوس کے پادریوں کی شاگردی میں اس نے رات دن اس قدر محنت کی کہ اپنے ہم مکتبوں ہی سے نہیں بلکہ استادوں سے بھی (مسلم دشمنی میں) بڑھ گیا۔ اس کے بعد وہ پوشیدہ طور پر قرطبہ کے مشہور و معروف علمائے مسیحی بالخصوص رئیسِ راہبان اسپرا کے درس میں شریک ہونے لگا جو انتہائی متعصب اور اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ اس نے یولوجیئس پر اپنا اثر دکھایا اور اسی رئیسِ راہبان نے اس کے دل میں اسلام کی طرف سے وہ عداوت پیدا کر دی جو بعد میں یولوجیئس کی طبیعت کا خاصہ ہو گئی۔

یولوجیئس شروع میں سینٹ زولوس کے گرجا میں شماس کے عہدے پر مقرر ہوا' پھر وہاں کا پادری ہو گیا۔ عیسائی اس کی نیکیوں کی تعریف کرنے لگے۔ یہ بدبخت جہاں پیغمبر اسلام ﷺ سے عداوت رکھتا تھا' وہاں جب بھی کوئی مہوش اور پری جمال چہرہ دیکھتا' اس کی زلفِ پُر پیچ کا اسیر ہو کر رہ جاتا۔ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی نے کئی موقعوں پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یولوجیئس دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ لکھتا ہے ''راہبات کی خانقاہوں کا جا کر معائنہ کرنے میں اس کو خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔'' ایک اور مقام پر لکھتا ہے ''باوجود اس سخت اور افسردہ زندگی کے' عشقِ مجازی کی ایک نازک شعاع نے اس کے دل کو روشن کر دیا۔''

قرطبہ کے اسی پادری نے 850ء میں سرِ عام پیغمبر اسلام علیہ الصلوۃ والسلام کی گستاخی اور بے ادبی کرنے کی تحریک کا آغاز کیا۔ یہ امیر عبدالرحمٰن کا دور تھا۔ یولوجیئس نے لاطینی زبان میں کسی عیسائی کی لکھی ہوئی پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کی کتاب کا مطالعہ کیا جس میں معجزاتِ مصطفیٰ ﷺ کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا تھا۔ اس سے اس کے دل میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اتفاق سے اس کی ملاقات رسولِ اکرم ﷺ پر سب و شتم کرنے کی سزا میں کوڑے کھانے والی فلورا سے ہو گئی۔ پہلی مقالات ہی میں اس نے یولوجیئس کو اپنے دامِ محبت میں اسیر کر لیا۔ ایک خط میں پہلی مقالات اور کوڑوں کے زخموں کا ذکر کرتے ہوئے یولوجیئس اپنی محبوبہ فلورا کو لکھتا ہے:

''ایک زمانہ تھا کہ تم نے اپنی مجروح گردن جس پر تازیانے کے نشان تھے' مجھے دکھانے کی عزت بخشی تھی۔ افسوس اس وقت وہ خوبصورت لمبے لمبے بال جن میں حسین گردن چھپی رہتی تھی' موجود نہ تھے...... نرمی سے میں نے اپنا ہاتھ تمہارے زخموں پر رکھا۔ اے کاش مجھ کو یہ مسرت نصیب ہوئی ہوتی کہ

ایک بوسے سے ان زخموں کو اچھا کر دیتا۔ مگر ہمت نہ پڑی...... جس وقت تم سے رخصت ہوا تو زمین پر میرے قدم اس طرح پڑتے تھے جیسے کوئی خواب میں چلتا ہو اور میری آہوں کا یہ حال تھا کہ بند ہونا نہ جانتی تھیں۔''

یہ ہے اس رسوائے زمانہ شخص کا ذاتی کردار جو خلاصۂ موجودات اور دیباچۂ کائنات ﷺ جیسی ہستی کے متعلق نازیبا باتیں گھڑتا اور عیسائیوں کو ان کی توہین و تضحیک پر اکساتا تھا۔ امیر عبدالرحمٰن نے تحریکِ شاتمِ رسول (ﷺ) کے سرگرم ارکان کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ ان میں یولوجیئس بھی تھا۔ جب فلورا کو بھی زنداں میں ڈالا گیا تو یہاں بچھڑے دلوں کو ایک بار پھر وصل کی گھڑیاں میسر آئیں، جس کا یولوجیئس بے چینی سے منتظر تھا۔ یہاں اس نے اپنا رسالہ ''یادگارِ شہدا'' مکمل کیا اور 24 نومبر 851ء کو اپنی محبوبہ فلورا کے قتل پر ایک پُر درد گیت لکھا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن کی وفات سے ایک سال قبل اسے رہا کیا گیا۔ لیکن یہ اپنی مجنونانہ حرکتوں سے باز نہ آیا اور عبدالرحمٰن کے فرزند ارجمند کے ہاتھوں کیفرِ کردار کو پہنچا۔ اس کے قتل کے بعد اس کی چلائی ہوئی تحریک خود بخود ختم ہوگئی۔ لیورمور نے لکھا ہے کہ 859ء میں یولوجیئس کا سر قلم کیا گیا۔

2۔ فلورا

فلورا قرطبہ کی ایک نوجوان اور حسین دوشیزہ تھی۔ اس نے تحریکِ شاتمِ رسول (ﷺ) میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خود کو جہنم کا ایندھن بنا کر، اپنی جوانی کی خواہشات کو دل میں بسائے یولوجیئس کی آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہوگئی۔ فلورا کا باپ مسلمان اور ماں عیسائی تھی۔ باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا۔ ماں نے اسے عیسائیت کی تعلیم دی۔ بائبل کی اس عبارت سے کہ ''وہ شخص جو لوگوں کے سامنے میرا انکار کرے گا، میں اس باپ کے سامنے، جو آسمان میں ہے، اس سے انکار کردوں گا۔'' اس کے جذبات برانگیختہ ہوئے۔ وہ بھائی کے گھر سے نکل بھاگی اور عیسائیوں میں جا کر پناہ گزین ہوگئی۔ جب اس کے فرار ہونے کی ذمہ داری عیسائی پادریوں کے سر ڈالی گئی تو وہ گھر واپس آئی اور دینِ مسیحی قبول کرنے کا اعلان کیا۔ بھائی نے اس کو سمجھایا مگر وہ عیسائیت پر قائم رہی۔ اس کا معاملہ شرعی عدالت میں لایا گیا۔ اس کے بھائی نے قاضی سے کہا ''یہ میری بہن ہے۔ ہمیشہ اسلام کی عزت کرتی تھی اور میرے ساتھ نماز، روزہ کرتی تھی مگر عیسائیوں نے اسے گمراہ کردیا، ہمارے رسولِ مقبول ﷺ کی طرف اس کے دل میں نفرت پیدا کی اور اس بات کا یقین دلایا کہ عیسیٰ خدا ہے۔'' قاضی نے فلورا سے پوچھا۔ ''تمہارا بھائی جو کچھ کہتا ہے، کیا یہ سچ ہے؟'' فلورا نے جواب دیا۔ ''قاضی! کیا تُو اس بے دین کو میرا

بھائی کہتا ہے۔ یہ میرا بھائی نہیں ہے۔ میں اس کو اب اپنا بھائی نہیں سمجھتی۔ جو کچھ وہ کہتا ہے' سب جھوٹ ہے۔ میں کبھی مسلمان نہ تھی۔ میں نے بچپن سے ہمیشہ مسیح پر ایمان رکھا اور مسیح ہی میرا خدا ہے۔''

قاضی نے فلورا کی کم سنی کے باعث اس کے قتل کا حکم جاری کرنے کے بجائے اس کی گردن پر کوڑے لگوائے اور اسے بھائی کے حوالے کر کے کہا ''اس کو دین برحق کی تعلیم دو۔ اگر پھر بھی وہ اس حالت کو نہ بدلے تو اسے میرے پاس لاؤ۔'' اسے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ چند دن بعد وہ چھت پر چڑھ کر وہاں سے گلی میں کود گئی اور ایک عیسائی کے گھر میں روپوش ہوگئی۔ یہیں اس کی ملاقات یولوجیکس پادری سے ہوگئی جو اس کے عشق میں پھنس گیا۔ کافی عرصہ کے بعد ایک دن کلیسا گئی اور وہاں میری نامی عیسائی لڑکی سے ملی۔ وہ بھی اس کی طرح آنحضرت ﷺ کی شان میں نازیبا الفاظ کہتی تھی چنانچہ دونوں قاضی کے پاس آئیں اور آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخانہ کلمات پے در پے کہے۔ قاضی نے ان کو باز رہنے کی تلقین کی۔ پھر گرفتار کر کے قید خانہ میں بھیج دیا جہاں یولوجیکس پہلے ہی قید تھا۔ یہ دونوں لڑکیاں گستاخی کا ارتکاب کرتی رہیں۔ چنانچہ 24 نومبر 851ء کو انہیں قتل کر دیا گیا۔ لین پول اس کے قتل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ فلورا اگر کسی جائز مقصد پر اپنی جان قربان کرتی تو اس سے زیادہ ناموری کی مستحق ہوتی۔

3۔ پرفیکٹس

پرفیکٹس سینٹ ایکس کلوس کے گرجا کا ایک پادری تھا۔ عربی زبان پر مہارت رکھتا تھا۔ ایک دن بازار میں کچھ خریدنے نکلا۔ وہاں چند مسلمانوں سے گفتگو کرنے لگا۔ معمولی بات چیت کے بعد مذہب کا ذکر چھڑا۔ مسلمانوں نے پادری سے کہا ''تم ہمارے رسول مقبول ﷺ اور مسیح علیہ السلام کے متعلق کیا رائے رکھتے ہو'' پادری نے کہا۔ ''مسیح میرا خدا ہے۔ تم اپنے پیغمبر کی نسبت نہ پوچھو کہ ہم عیسائی ان کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں۔'' جب مسلمانوں نے قاضی کو اس کی گفتگو نہ بتانے کا یقین دلایا تو اس نے آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہے اور ان پر سب وشتم کیا۔ ایک دن جب وہ سڑک پر جا رہا تھا تو ان لوگوں نے جن کے سامنے اس نے بے ہودہ الفاظ کہے تھے' مسلمانوں کو اس کی نازیبا حرکت کی اطلاع دے دی۔ لوگ اسے پکڑ کر قاضی کے پاس لے گئے اور قاضی سے فریاد کی کہ اس پادری نے ہمارے نبی کریم ﷺ کی شان میں نہایت بے ادبی کے الفاظ کہے ہیں۔ قاضی نے پادری سے پوچھا تو اس نے کانپتے ہوئے قطعی انکار کر دیا۔ لیکن قاضی نے شرع کے مطابق اس کے قتل کا حکم سنایا اور اسے بیڑیاں پہنا کر جیل بھیج دیا' جہاں اس شاتم رسول (ﷺ) نے پھر اپنی سابقہ روش کا اعادہ کیا۔

چنانچہ مقرر دن اس کا سر قلم کر دیا گیا۔

4-یوحنا

یوحنا ایک عیسائی سوداگر تھا۔ وہ اپنا مال بیچنے کے لیے یہ صدا لگایا کرتا تھا "قسم ہے محمد ﷺ کی' میرے مال سے بہتر کہیں مال نہ ملے گا۔ چاہے کتنا ہی ڈھونڈو گے۔" اس کے ہم پیشہ مسلمان تاجروں نے اس سے کہا "یوحنا! تُو ہمارے پیغمبر خدا ﷺ کا نام ہر وقت لیتا رہتا ہے کہ جو لوگ تجھ سے ناواقف ہیں وہ تجھے مسلمان سمجھیں۔ ہم ہرگز اس بات کو برداشت نہیں کرتے کہ جھوٹی باتوں پر تو ہمارے رسولِ مقبول ﷺ کا نام لے کر ان کی قسمیں کھائے۔" یوحنا نے معذرت کی کہ اس کی نیت یہ نہ تھی کہ مسلمانوں کے دل کو کسی طرح تکلیف پہنچے۔ جھگڑا زیادہ بڑھا تو اس نے کہا "اچھا اب میں تمہارے پیغمبر (ﷺ) کا نام کبھی نہ لوں گا۔ اور لعنت ہے اس پر جو نام لے۔"

لوگ یوحنا کو پکڑ کر قاضی کے پاس لائے' جس نے اسے چار سو درے لگانے کا حکم دیا۔ اس سزا کے بعد یوحنا کو گدھے کی دم کی طرف منہ کر کے سوار کرایا گیا اور اس صدا کے ساتھ اس کی تشہیر کی گئی کہ "دیکھو! یہ ہے سزا اس کی جو ہمارے پیغمبر (ﷺ) کی جناب میں بے ادبی کرتا ہے۔" اس کے بعد اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر زنداں میں ڈال دیا گیا۔

5-راہب اسحاق

اسحاق قرطبہ کے عیسائی ماں باپ کا بیٹا تھا۔ عربی زبان خوب جانتا تھا۔ ابھی نو عمر ہی تھا کہ امیر عبدالرحمٰن کے دربار میں اس کو کاتب کی جگہ مل گئی۔ لیکن 24 برس کی عمر میں دنیا سے کنارہ کش ہو کر حبانوسس کی مسیحی خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گیا' جہاں متعصب پادریوں کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے اس کے دل میں جوش پیدا ہوا کہ وہ اپنی جان دے کر بزرگی حاصل کرے۔ ایک دن وہ خانقاہ سے نکل کر قرطبہ پہنچا اور قاضی کے سامنے آ کر کہا "میں آپ کا دین قبول کرنا چاہتا ہوں۔ مہربانی کر کے آپ مجھے اس کی ہدایات کریں۔" قاضی اس سے خوش ہو کر اسے دین اسلام کے متعلق بتانے لگا تو اس نے برملا حضور نبی کریم ﷺ پر سب و شتم کیا۔ جب قاضی نے سمجھایا تو اس کو بھی برا بھلا کہا۔ قاضی نے اسے جیل بھیج دیا۔ امیر عبدالرحمٰن نے اس گستاخ رسول (ﷺ) کی بابت حکم جاری کیا کہ اسے پھانسی دی جائے اور اس کی لاش کو کئی دن تک پھانسی پر اس طرح لٹکا رہنے دیا جائے کہ سر نیچے ہو اور پاؤں اوپر ہوں۔ اس کے بعد لاش جلا کر اس کی راکھ دریا میں بہا دی جائے۔ چنانچہ جون 851ء میں ان احکام کی تعمیل ہوئی۔

6-سانکو

اسحاق کے قتل کے دو دن بعد ایک افرنجی عیسائی نے' جس کا نام سانکو تھا اور امیر عبدالرحمٰن کی محافظ فوج کا ایک سپاہی اور پادری یولوجیئس کا شاگرد تھا' پیغمبر اسلام (ﷺ) کو گالیاں دیں اور قتل ہو کر واصلِ جہنم ہوا۔ رائن ہارٹ ڈوزی کے علاوہ لین پول کی کتاب کے ترجمے میں اس کا نام سانچو لکھا ہے۔ شاید اصل نام سینکو تھا۔

7-جرمیاس اور جانبتوس سمیت چھ راہب

سانچو کے قتل کے بعد اتوار کے دن (7 جون 851ء) چھ راہب جن میں ایک اسحاق کا چچا جرمیاس اور دوسرا ایک راہب جانبتوس تھا' جو اپنے حجرے میں ہمیشہ تنہا پڑا رہتا تھا' قاضی کے سامنے آئے اور کہا "ہم بھی اپنے دینی بھائیوں سانکو اور اسحاق کے الفاظ کا اعادہ کرتے ہیں۔ اور پھر پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سب وشتم کرنے لگے۔ یہ چھ کے چھ قتل کر دیئے گئے۔ لین پول نے بھی ان کے نام بتائے بغیر ان کے توہینِ رسول (ﷺ) کے ارتکاب کرنے اور قتل کر دیئے جانے کا ذکر کیا ہے۔

8- سیسی نند

سینٹ ایکس کلوس کے گرجا کا ایک پادری جس کا نام سیسی نند تھا' نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی گستاخی کا مرتکب ہو کر واصلِ جہنم ہوا۔

9-پولوس

پولوس سینٹ ایکس کلوس کے گرجا میں شماس تھا۔ سیسی نند نے قتل ہوتے وقت اسے اس ذلت کی موت مرنے کی وصیت کی تھی۔ چنانچہ یہ لعین بھی سیسی نند کے قتل کے چار دن بعد 20 جولائی کو حضور سیدِ عالم ﷺ کے خلاف نازیبا کلمات کہنے کے باعث قتل کر دیا گیا۔

10- تھیودومیر

تھودومیر شہر قرمونہ کا ایک جوان راہب تھا۔ توہینِ رسول (ﷺ) کا مرتکب ہو کر مسلم حکومت کے حکم سے قتل ہوا۔

11- آئیزک

پرفیکٹس کی طرح آئیزک بھی قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جیسے ہی اس کو مسلمان کرنے کے لیے دینی عقائد اس کے سامنے بیان کیے گئے' اس نے بھی

سب وشتم شروع کر دیا۔ قاضی کے لیے برداشت کرنا دشوار ہو گیا۔ اس نے اس ذلیل کو ایک طمانچہ رسید کر کے کہا کہ جانتا ہے کہ اسلام میں اس کی سزا قتل ہے۔ اس نے کہا کہ وہ جان بوجھ کر یہاں آیا ہے اس لیے کہ خدا فرماتا ہے کہ مبارک ہیں وہ لوگ جو دین داری کے لیے ستائے گئے۔ آسمان کی بادشاہت انہی کے لیے ہے۔ اس شاتم رسول (ﷺ) کو بھی قتل کر دیا گیا۔ شاید آئیزک جرمیاس اور جانتوس کا ساتھی تھا کیونکہ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی نے میری کے ذکر میں آئیزک کو مذکورہ بالا چھ راہبوں میں شمار کیا ہے۔

12- میری

میری، آئیزک کی بہن تھی جو بھائی کے قتل کے بعد رات دن رویا کرتی تھی۔ وہ بھی قرطبہ کی ایک مسیحی خانقاہ کی راہبہ تھی۔ اتفاقاً اس کی ملاقات فلورا سے ہو گئی۔ دونوں نے قاضی کے سامنے پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں بے ادبی کی۔ میری نے قاضی سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں ان چھ "شہیدوں" میں سے ایک کی بہن ہوں جو تیرے پیغمبر (ﷺ) کو دشنام دے کر قتل ہوا ہے۔ پھر وہ انتہائی گھٹیا الفاظ زبان پر لائی۔ چنانچہ اسے بھی فلورا کے ساتھ 24 نومبر 851ء کو قتل کر دیا گیا۔

یہ اُن بدنصیب مردوں اور عورتوں کا ذکر تھا جنہوں نے حضرت محمد ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کا ارتکاب کیا اور ان کو امیر عبدالرحمٰن اور اس کے بیٹے محمد بن عبدالرحمٰن کے عہد میں قتل کیا گیا۔ شاید ان کے علاوہ بھی کچھ اور لوگوں کو پیغمبر اسلام ﷺ کی گستاخی کے جرم میں مصلوب کیا گیا ہو۔ مجھے صرف مذکورہ بالا نام مل سکے جن کا مختصراً ذکر کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مسلم مورخین نے اوّل تو ان کا ذکر کرنا ہی مناسب نہیں سمجھا اور اگر ان کے متعلق کچھ لکھا بھی ہے تو انتہائی مختصر لکھا ہے۔ تاہم مسیحی مورخین نے خوب بڑھا چڑھا کر ان گستاخوں کا تذکرہ کیا ہے۔

تحریکِ شماتت رسول (ﷺ) کا اختتام

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس تحریک کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور زیادہ تر پادری ہی لقمۂ اجل بنے۔ کیونکہ عیسائی امراء امیر عبدالرحمٰن کے اس قدر گرویدہ اور جاں نثار تھے کہ انہوں نے اپنی متحدہ کوشش سے عوام الناس کو پادریوں کے زہریلے اثر سے محفوظ رکھا۔ سب ان خود غرض پادریوں کو یہ جواب دیتے تھے کہ عربوں کی حکومت سے ہم کو کیا نقصان پہنچا ہے جو ہم بلاوجہ تمہارا ساتھ دیں اور اپنی جانوں اور آزادی کو کھو دیں۔ ہم ہر طرح آزاد اور ہماری جان اور مال ہر طرح محفوظ ہے۔ عرب ہمارے مذہب میں بالکل دخل نہیں دیتے۔ ہم بالکل مطلق العنان اور خوش حال ہیں۔ ان فوائد کے عوض محض حکومت کی تمنا میں (جیسا کہ پادری چاہتے تھے) اپنی جان اور مال تلف کر دینا عقل و دانش سے بالکل بعید

ہے۔ لین پول لکھتا ہے۔ ''ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ مسیحی ''شہدا'' راہِ راست سے بھٹکے ہوئے تھے۔ بے شک انہوں نے اپنی عزیز جانوں کو مفت ضائع کیا اور انہوں نے جو کچھ کیا' فی الجملہ بُرا کیا۔''

امیر عبدالرحمٰن نے اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے ایک کلیسائی کونسل بٹھانے کا فیصلہ کیا جو عیسائیوں کو پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بے ادبی سے روکے۔ چنانچہ تمام اساقفہ کو ایک مجلس میں جمع کیا گیا اور بادشاہ کی طرف سے ایک عیسائی سرکاری عہدے دار نے اس مجلس میں شرکت کی جس کا نام قومس بن انطونیاں تھا۔ لین پول اس کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے ''تمام مجتہدین کی ایک کونسل جس کا صدر نشین اشبیلیہ کا مجتہد اعظم تھا' منعقد ہوئی اور اس میں یہ فیصلہ ہوا کہ اس وقت تک جس قدر لوگ ''شہید'' ہو چکے ہیں چونکہ تمام کلیساؤں نے بالاتفاق ان کو ''شاہِ ولایت'' تسلیم کیا ہے لہٰذا وہ ہر قسم کے جرم و سزا سے بری کیے جائیں مگر آئندہ جو شخص ان کا اتباع کرے گا' وہ مجرم اور خارج از مذہب سمجھا جائے گا۔

لیکن مفسد و مجنون طبیعتوں نے اساقفہ کے اس حکم سے سرتابی کی اور پادری' جن کا سرغنہ یولوجیئس تھا' اپنی روش سے نہ ہٹے۔ امیر عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد محمد بن عبدالرحمٰن کے عہد میں پادری یولوجیئس کے قتل کے ساتھ یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا۔

ہر دریدہ دہن کو اس کی دریدہ دہنی اور ہر کذاب و لعین مصنف کو جو ایک جملہ بھی حضورِ اکرم (ﷺ) کے خلاف لکھے' اس کی تحریر کا مزہ چکھانا صرف حکومتوں ہی کا نہیں' ہر مسلمان کا فرض ہے اور جب بھی کوئی بدبخت ایسی گستاخی کا ارتکاب کرے' مسلمان کو اپنے دل سے فتویٰ لینا چاہیے اور جب مفتیٔ اعظم حضرتِ دل فتویٰ دے دیں تو پھر اپنی جان کی پروا کیے بغیر توہینِ رسالت مآب (ﷺ) کے مرتکب کو جہنم رسید کر دینا چاہیے' خواہ انہیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی جان اس کے پیارے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے قربان ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے مکرم و محترم حبیب (ﷺ) سے وفا کرنا سیکھ لے' اسے اپنے خون سے محبت کی داستان رقم کرنا پڑتی ہے اور جو ایسا کر لیتا ہے' وہ نہ صرف قربِ الٰہی سے سرفراز ہوتا ہے بلکہ لوح و قلم تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا' لوح و قلم تیرے ہیں



رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں کی نفسیاتی تحلیل

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

نفسیاتی تحلیل ایک نیا علم ہے۔ اس میں اس کا تو ذکر نہیں ہوتا کہ بیج سے کس طرح درخت نکل کر پھلتا پھولتا ہے، بلکہ اس کے برعکس کسی تناور اور بار آور درخت کو دیکھ کر یہ پتہ چلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں انسان کی کسی روش، کسی خلافِ توقع طرزِ عمل کے اسباب معلوم کرنے کی سعی ہوتی ہے، خاص کر وہ اسباب جن کو شاید متعلقہ شخص خود بھی بھول چکتا ہے کم از کم اسے اس کا احساس نہیں ہوتا کہ اس کے اعمال کا باعث وہ واقعہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس تحقیق میں جو معلوم سے نامعلوم کی طرف جانے پر مشتمل ہوتی ہے، بہت کچھ مفروضات سے کام لینا پڑتا ہے اور نتیجے میں ریاضیاتی صحت ہو نہیں سکتی، لیکن اس کی اہمیت اور اس پر اعتماد اب اتنا بڑھ گیا ہے کہ شاید ہی کوئی بڑا طبیب ہوگا جو اب تشخیص میں اس سے مدد نہ لیتا ہو۔

مجھے اس علم سے کوئی خصوصی واقفیت نہیں۔ حال میں قرآنِ مجید کا فرانسیسی ترجمہ نیز سیرت النبی ﷺ پر فرانسیسی میں دو جلدوں میں ایک تالیف مرتب اور شائع کرنے کا موقع ملا تو اس ''قصے'' کے بعض کردار بے اختیار اپنی طرف توجہ منعطف کراتے رہے اور سوچنا پڑا کہ یہ کیا بوالعجبی ہے؟ کچھ چیزیں معلوم ہوئیں۔ شاید وہی ان ''خاردار درختوں'' کے بیج ہوں۔ یہاں ان کا ذکر کرتا ہوں۔ ماہرین نفسیات ان سے فائدہ اٹھا سکتے اور فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

بادشاہت تلاش کرنے والے کسی شخص کے لیے قدم قدم پر دشمنوں سے سابقہ پڑنا ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ وہ کیوں بادشاہ بنے' میں کیوں نہیں؟ حسد فطری چیز ہے اور انسان جتنا زیادہ فطری یعنی حیوانی اساس سے قریب ہوگا' اتنا ہی وہ اس برائی پر قابو کم پا سکے گا لیکن کسی نبی' کسی مصلح سے دشمنی کا سبب اتنا آسان نہیں کیونکہ وہ نہ کوئی مالی معاوضہ چاہتا ہے اور نہ اپنی [illegible] سرداری جتاتا ہے۔ وہ تو بے غرضانہ دوسروں کی بھلائی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھتا [illegible] بھی وہی گزرا ہوگا جو نبی عربی ﷺ پر۔ فی الحال رسول اکرم ﷺ کے بعض ہم عصر دشمنوں کا مطالعہ [illegible]رنا مقصود ہے۔

ابولہب:

یہ آنحضرت کا حقیقی چچا ہے۔ عرب میں ہم قبیلہ شخص کا ساتھ دینے میں ظالم ومظلوم کا بھی امتیاز نہ کیا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ اپنی مرنجان مرنج طبیعت' بزرگوں کے ادب' چھوٹوں پر رحم' محتاجوں سے حسن سلوک کے لیے بچپن سے امتیاز رکھتے تھے' پھر ان میں کیوں نہ نبھی؟ عمومی تبلیغ سے بھی قبل جب آنحضرت ﷺ نے صرف اپنے قریبی رشتہ داروں کو جمع فرمایا اور "وانذر عشیرتک الاقربین" سے اپنی ربانی مہم کا آغاز کیا تو واحد شخص جس نے مخالفت کی اور کھنڈت ڈالی وہ یہی ابولہب تھا۔ اس کی دشمنی مرتے دم تک باقی رہی بلکہ روز افزوں ہی ہوتی چلی گئی۔ کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

شاید ذیل کا واقعہ (جو انساب الاشراف للبلاذری مطبوعہ قاہرہ 1959ء جلد اول صفحہ 130 تا 131 میں درج ہے) اس پر کچھ روشنی ڈالے:

ایک دن ابولہب اور ابوطالب میں کسی سلسلے میں بات بڑھ گئی۔ ابوطالب کو پچھاڑ کر ابولہب سینے پر چڑھ بیٹھا اور طمانچے مارنے لگا۔ جب آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھا تو رک نہ سکے اور ابولہب کو پہلوؤں سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا۔ اب ابوطالب نے اس کے سینے پر بیٹھ کر طمانچے لگانے شروع کیے۔ اس پر ابولہب نے آنحضرت سے کہا: "وہ تیرا چچا ہے تو میں بھی تیرا چچا ہوں۔ تو نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟ اللہ کی قسم میرا دل تجھ سے پھر کبھی محبت نہ کرے گا۔"

ابوجہل:

اس کا اصلی نام ابوالحکم عمرو تھا۔ یہ مکے کے ایک ممتاز گھرانے کا فرد تھا۔ وہاں بلدیہ (دارالندوہ) میں ہر شہری چالیس سال کی عمر میں رکن بن سکتا تھا لیکن "لجود رأیہ" (اپنی عمدہ رائے اور معاملہ فہمی کے باعث) اسے تیس سال ہی کی عمر میں رکن بنا لیا گیا تھا (دیکھو الاشتقاق لابن دُرَید' صفحہ 7) ذیل کے دو واقعے جو آغازِ اسلام کے وقت کے بیان کیے جاتے ہیں' قابلِ ذکر معلوم ہوتے ہیں:

بلاذری (انساب الاشراف جلد اول، صفحہ 130) نے لکھا ہے:

"یمن کے قبیلہ زبید کا ایک شخص مسجد کعبہ میں آیا اور فریاد کرنی شروع کی: اے قریشیو! تمہارے پاس غذائی اور دیگر رسد کیسے آیا کرے گی جبکہ تم لانے والوں پر ظلم بھی کرتے ہو؟ لوگوں نے توجہ نہ کی تو وہ حلقہ بہ حلقہ آنحضرت ﷺ تک بھی پہنچا۔ آپ ﷺ نے پوچھا تجھ پر کس نے ظلم کیا؟ کہا، ابوالحکم (ابوجہل) نے، مجھ سے اس نے تین سب سے اچھے اونٹ مانگے اور چاہتا ہے کہ گھاٹے سے بیچوں؟ اور اس کی خاطر اور بھی مجھ سے نہیں خریدتا۔ اس نے میرا سودا خراب کر کے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے منہ مانگے مول پر اس کے تینوں اونٹ خرید لیے۔ ابوجہل وہیں بازار میں کھڑا دیکھتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے اس کے پاس جا کر کہا: اے عمرو! ایسا پھر نہ کرنا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ ابوجہل نے جواب دیا: ہاں میں پھر کبھی ایسا نہ کروں گا۔

آنحضرت ﷺ کے جانے کے بعد امیہ بن خلف اور دیگر مشرکوں نے طعنہ دیا کہ محمد ﷺ نے تجھے ذلیل کر دیا، معلوم ہوتا ہے کہ تو بھی اس کی اتباع کرنی چاہتا ہے؟ ابوجہل نے کہا: "ہرگز نہیں، میں نے تو صرف اس لیے کہا کہ اس کے جادو سے اس کے ساتھ دائیں بائیں نیزہ برداروں کی ایک جماعت نظر آئی جو نیزے میری طرف جھکا رہی تھی۔ اگر میں مخالفت کرتا تو وار پار کر دیتے۔"

اس کا کم وبیش ہم عصر واقعہ ابن ہشام (سیرت رسول اللہ ﷺ، صفحہ 257) اور بلاذری (انساب الاشراف جلد اول، صفحہ 128 تا 129) نے بیان کیا ہے:

"یمن کے قبیلہ اراش (یا اراشتہ) کا ایک فرد کچھ اونٹ لایا کہ مکے میں بیچے۔ ابوجہل نے خرید لیے مگر قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول کی۔ اس پر تاجر نے قریش کی ایک مجلس میں پہنچ کر کہا کہ میں ایک مسافر ہوں، ابوالحکم (ابوجہل) نے مجھ سے اونٹ تو مول لیے مگر رقم ادا نہیں کرتا، جس سے میں اٹکا ہوا ہوں۔ یہ مجھ پر بار گزر رہا ہے۔ کیا کوئی اس سے میرا حق دلائے گا؟ قریش نے ٹھٹھول سے کہا: دیکھو وہ شخص جو کونے میں بیٹھا ہے (یعنی آنحضرت ﷺ) اس کے پاس جاؤ، وہ تمہارا حق دلائے گا۔ جب اس نے دکھڑا سنایا تو آنحضرت ﷺ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور ابوجہل کے گھر جا کر دروازے پر دستک دی۔ اس نے اندر

سے پوچھا: کون ہے؟ آنحضرتؐ نے نام بتایا اور کہا: باہر آ ؤ۔ آنے پر اس سے فرمایا: ''اس کا حق فوراً ادا کرؤ ادائی تک میں ٹلوں گا نہیں۔'' اس نے فوراً رقم ادا کردی۔ اراشی تاجر نے قریش کی مجلس میں آ کر کہا: خدا محمد ﷺ کو جزائے خیر دے' کس آسانی سے اس نے میرا حق دلا دیا۔ پھر وہ چلا گیا۔ بعدازاں جب ابوجہل وہاں آیا تو لوگوں نے حیرت سے کہا: ہم نے تو محمد ﷺ سے ٹھٹھول کرنا چاہا تھا۔ ابوجہل نے کہا: چھوڑو بھی' جیسے ہی اس نے دستک دی۔ میرا دل دہل گیا۔ باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ محمد ﷺ کے ساتھ خوفناک ڈیل ڈول کا ایک سانڈ اونٹ منہ پھاڑے کھڑا ہے اگر میں ذرا بھی انکار کرتا تو مجھے نوالا کرلیتا۔ اسی لیے میں نے رقم ادا کردی۔''

ابو عامر راہب:

مدینہ کے قبیلہ اوس کا فرد تھا۔ اس کے فرزند حضرت حنظلہ غسیل الملائکہؓ مسلمان ہوگئے تھے اور نوجوانی میں شب زفاف میں بیوی کو چھوڑ کر فوج میں آ شامل ہوئے اور صبح کو غزوۂ احد میں شہید ہوگئے۔ باپ مشرکین کی صف میں تھا۔ جنگ تھمی تو بیٹے کی لاش پر کھڑے ہو کر کہا: اسی لیے تو میں تجھے اس شخص (آنحضرت ﷺ) سے روکا کرتا اور اس طرح مار پڑنے سے ڈرایا کرتا تھا۔ خدا کی قسم تو شریف اخلاق کا مالک اور والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کیا کرتا تھا۔ (بلاذری' انساب الاشراف' جلد اول صفحہ 329) اگر بچوں کا اچھا کردار والدین کی اچھی تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے اور اگر اچھی تربیت وہی دے سکتے' خاص کر آزادئ رائے وہی پیدا کرسکتے ہیں جو خود بھی عمدہ کردار کے مالک ہوں تو گمان کرنا پڑتا ہے کہ خود ابو عامر بھی بھلا مانس ہی رہا ہوگا۔ یہ جویائے حق بھی تھا۔ مشرک گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود (بلاذری' ایضاً صفحہ 281 کے مطابق) اہل کتاب سے مناظرے کرتا اور عیسائی راہبوں کی طرف بہت مائل تھا اور اکثر شام و فلسطین جا کر ان سے ملتا' پھر کیوں نہ نبھی؟ اور راہب ہونے کے باوجود کیوں آنحضرت ﷺ کے خلاف تلوار کھینچ کر جنگ میں عملی حصہ لیتا رہا؟ اور کیوں مرتے دم تک یہ مخالفت جاری رہی؟

مورخ الہیثم بن عدی نے (جسے بلاذری نے صفحہ 282 پر نقل کیا ہے) لکھا ہے: ابو عامر چاہتا تھا کہ خود نبوت کا دعویٰ کرے مگر آنحضرت ﷺ کی دعوت شروع ہوئی اور ترقی کرگئی تو ابو عامر کو حسد ہوگیا۔ ابن ہشام (سیرت رسول اللہ ﷺ' صفحہ 411 تا 412) نے اس کی مزید تفصیل دی ہے:

جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو ابو عامر مکہ بھاگنے سے قبل آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دونوں میں یوں بات چیت ہوئی۔ وہ: ''تو یہ کیا دین لایا ہے؟'' آپ ﷺ: ''حنیفیت' حضرت ابراہیمؑ کا دین۔'' وہ: ''یہی تو میرا دین ہے۔'' آپ: ''نہیں یہ تیرا دین کہاں؟'' وہ: ''ہے تو' محمد ﷺ' اصل میں تو نے ہی اس میں وہ چیزیں داخل کی ہیں جو اس میں نہ تھیں۔'' آپ ﷺ: ''ہرگز نہیں' بلکہ میں تو اسے میل کچیل سے صاف کر کے نکھار لایا ہوں۔'' وہ: ''خدا جھوٹے کو وطن سے دور تنہائی کی موت مارے۔'' آپ ﷺ: ''ضرور' خدا جھوٹے کے ساتھ ایسا ہی کرے۔''

کازانووا کی فرانسیسی تالیف (''محمد ﷺ اور اختتام کائنات۔'' صفحہ 28) کے مطابق عیسائیوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ کے بعد پانچ سو برس ختم ہوں تو مسیحا آئے گا (جس کا ذکر انجیلِ یوحنا' باب اول جملہ 19 تا 28 میں بھی ہے) آنحضرت ﷺ کی بعثت 610ء میں ہوئی۔ ان حالات میں الہیثم بن عدی کے بیان پر شبہ کرنے کی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

عبداللہ بن اُبی بن سلول:

مدینے کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں کئی نسلوں سے اوس و خزرج کے رشتہ دار قبیلوں میں خانہ جنگیاں چلی آ رہی تھیں۔ ابنِ ہشام (سیرت رسول اللہ ﷺ صفحہ 411) نے لکھا ہے کہ ''اوس و خزرج نے عبداللہ بن اُبی سے نہ پہلے اور نہ بعد کبھی کسی مشترکہ فرد کی اطاعت پر اتفاق نہ کیا' بجز عبداللہ بن اُبی کے۔ یہ غیر معمولی ہر دلعزیزی' اعلیٰ کردار اور منصف مزاجی وغیرہ کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی مگر تاریخ اسلام میں اسے ''راس المنافقین'' کا لقب دیا گیا ہے۔ حضرت عائشہؓ پر تہمت و بہتان کا آغاز بھی اسی سے ہوا تھا۔ ساری زندگی اس نے مسلمانوں میں اندرونی فتنہ برپا کرنے میں صرف کی۔ وجہ؟

صحیح بخاری (کتاب 79' باب 20) تفسیر طبری (بر سورہ 63' آیت 8)' تاریخ طبری (سلسلہ اول صفحہ 1511)' سیرت ابن ہشام (صفحہ 413-727) روض الانف للسہیلی (جلد دوم صفحہ 51) بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ہجرت فرما کر مدینہ آنے سے عین قبل یہ طے کیا گیا تھا کہ عبداللہ بن اُبی کو اوس و خزرج کا مشترکہ بادشاہ بنایا جائے اور تخت نشینی کے لیے تاج بنانے کا کام سناروں اور جوہریوں کے سپرد بھی کر دیا گیا تھا۔ پھر جب مدینے والے مسلمان ہو گئے تو پرانی تجویز منسوخ ہو گئی۔

کعب بن الاشرف:

مدینہ کے یہودی قبیلہ بنی النضیر کا سردار تھا۔ ابن ہشام (سیرت رسول اللہ ﷺ' صفحہ

552) نے لکھا ہے کہ جس دن اسے قتل کیا گیا وہ تازہ بیاہا ہوا تھا۔ "دوستوں" نے رات کو گھر پہنچ کر آواز دی تو جلدی میں کپڑے پہننے کی جگہ لحاف ہی میں اپنے کو لپیٹ کر نیچے اترا۔ بیوی نے کہا: مجھے اس آواز میں شر بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ جواب دیا: "لو یُدعیٰ الفتی الصعنة لاجاب" (جواں مرد کو نیزہ بھونکنے کے لیے بھی بلائیں تو وہ انکار نہیں کرتا۔) ابن ہشام (سیرت رسول اللہ ﷺ، صفحہ 351) ہی کے مطابق اس کا باپ شمالی عرب کے قبیلہ طے کی شاخ نبہان کا فرد تھا اور ماں بنی النضیر کی۔ اس طرح نیم غیر ملکی ہونے کے باوجود قوم کا سردار خاص کر پنچ اور حاکم عدالت بننا اعلیٰ ذہنی قابلیتوں کے بغیر ممکن نہیں۔ بگاڑ کی وجہ؟

مقاتل (فوت 150) مشہور مفسر (مخطوطہ کتب خانہ حمیدیہ، استنبول، ورق 96/الف، سورہ 5 آیت 44) میں لکھا ہے کہ مدینے میں بنی النضیر بڑی ذات کے اور بنی قینقاع نیچ ذات کے یہودی سمجھے جاتے تھے اور اگر کوئی نضیری کسی قینقاع کو قتل کرتا تو اس کے لیے آدھا خون بہا دیا کرتا۔ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینے آئے اور ایک قتل کا مقدمہ پیش ہوا تو آپ ﷺ نے حکم صادر فرمایا کہ نضیری قاتل قینقاعی مقتول کا سالم خون بہا ادا کرے۔ اس پر نضیرہ سردار کعب بن الاشرف چیخنے لگا: "ہم تیرا فیصلہ نہیں مانتے اور نہ تیرا حکم تسلیم کرتے ہیں۔ ہم تو اپنے پرانے رسم و رواج ہی پر عمل کریں گے۔"





شاتمانِ رسول ﷺ کا عبرتناک انجام

آغا ثاقب سلیمانی

قرآنِ کریم نے اپنی سچی اور بے باک تعلیمات کی بنا پر ساری باطل اور مشرک دنیا سے جنگ مول لے لی۔ سب سے پہلے توحید کے عقیدہ نے مشرکوں پر کاری ضرب لگائی، پھر یہود کو زیر کیا۔ نصاریٰ بھی محکوم ہو گئے مگر اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر سبھی تلملا اٹھے اور خفیہ ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو گئے۔ اگرچہ حضور ﷺ کی انقلابی دعوت اور ان کے فیضانِ صحبت سے صحابہ کرامؓ کی سیرت و کردار میں نکھار پیدا ہو گیا تھا اور جاں نثاروں کی ایک ایسی جماعت وجود میں آ گئی تھی جو موت سے ڈرتی، نہ جنگ کی آگ سے بلکہ ہر وقت شہادت کی طلبگار رہتی تھی۔ قرآن مجید میں اس جماعت کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

> ترجمہ: ”نہ پاؤ گے ان لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں اللہ (تعالیٰ) اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ان سے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے مخالفت مول لی۔ اگرچہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبے والے ہوں۔ یہ ہیں جن کے دلوں میں ایمان نقش فرما دیا اور اپنی طرف کی روح سے ان کی مدد کی۔ انہیں باغوں میں لے جایا جائے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ان میں ہمیشہ رہیں (گے) اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی

جماعت ہے۔ سنتا ہے اللہ تعالیٰ' ان کی ہی جماعت کامیاب ہے۔'' المجادلہ

آیت:64)

ان کی روشن مثالیں جنگ بدر اور احد میں نظر آتی ہیں۔

حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح نے جنگ احد میں اپنے باپ جراح کو قتل کیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے روزِ بدر اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو مبارزت کے لیے طلب کیا لیکن رسول اکرم ﷺ نے اس جنگ کی اجازت نہ دی اور مصعبؓ بن عمیر نے اپنے بھائی عبداللہ بن عمیر کو قتل کیا' اور حضرت عمرؓ بن خطاب نے اپنے ماموں عاص بن ہشام بن مغیرہ کو موت کے گھاٹ اتارا اور حضرت علیؓ بن ابی طالب' حمزہؓ وابوعبیدہؓ نے ربیعہ کے بیٹوں عتبہ'شیبہ اور ولید بن عقبہ کو قتل کیا جو ان کے رشتہ دار تھے۔

ایمان اور اسلام ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں' یقین قلبی کا نام ایمان ہے اور اس کا اثر' جو اعمال وافعال میں ظاہر ہو'وہ اسلام ہے۔ اسلام کے معنی اطاعت کے ہیں۔ اسلام کی دعوت کو قبول عام حاصل ہونے لگا تو مشرکین مکہ نے اپنی مخالفانہ سرگرمیوں کو تیز کر دیا اور حضور ﷺ کی ایذا رسانیوں پر اتر آئے۔ کبھی آپؐ کے قتل کے مشورے ہوتے۔ کبھی آپ ﷺ کے خاندان اور باقی ماندہ مسلمانوں کا معاشی ومعاشرتی مقاطعہ کیا جاتا۔ آپ ﷺ اپنے حامیوں اور ساتھیوں کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور بھی کر دیئے گئے۔ غرضیکہ مکہ میں آپ ﷺ کے لیے زندگی دوبھر کر دی گئی۔ طائف گئے تو وہاں بھی پناہ نہ ملی۔ گالیاں کھائیں۔ طنز و تشنیع کا نشانہ بنے۔ آپ ﷺ پر پتھروں کی بارش ہوئی اور جسم اطہر سے اتنا خون بہا کہ نعلین پاک خون سے بھر گئے۔ مگر آپ شدید مزاحمتوں کے مقابلہ میں بھی تبلیغ رسالت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آپ ﷺ کی تبلیغ کے اثر سے مکہ کے نواحی قبائل اسلام قبول کرنے لگے' لیکن قوم بحیثیت مجموعی اسلام دشمنی پر تلی رہی اور جو کوئی شخص اسلام کی طرف میلان ظاہر کرتا' وہ ملامت کا ہدف اور جسمانی اذیت کا نشانہ بنتا۔ اسے معاشی ومعاشرتی مقاطعہ کا شکار بھی ہونا پڑتا۔ قریش کی مزاحمت اور جفا کاری اتنی شدت اختیار کر چکی تھی کہ مسلمانوں کی ایک جماعت حبش کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئی مگر وہاں بھی انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا۔

ہجرت کے بعد منافقت کا عنصر بھی پیدا ہوگیا تھا۔ اس میں وہ منافق بھی داخل ہیں جنہوں نے اظہار ایمان تو کیا مگر دل میں کفر رکھ کر اقرار کی روشنی کو ضائع کر دیا۔ سردار المنافقین عبداللہ بن اُبی بھی اسی زمرہ میں آتا ہے۔ اس کے بارے میں قرآن مجید میں یہ وعید نازل ہوئی:

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے کچھ ہدایت دی۔ پھر انہوں نے اس کو ضائع کر دیا' اور ابدی دولت کو حاصل نہ کیا۔ ان کا مال حسرت وافسوس اور عبرت وخوف ہے۔''

مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو ان الفاظ میں تسلی دی:

ترجمہ: ''تو علانیہ کہہ دو جس بات کا تمہیں حکم ہے اور مشرکوں سے منہ پھیر لو۔ بے شک ان ہنسنے والوں پر ہم تمہیں کفایت کرتے ہیں۔''

(سورۂ حجر آیت: 104)

اب ہم ان معاندین کا نام بنام ذکر کرتے ہیں' جنہوں نے ساری عمر اسلام و رسول ﷺ دشمنی میں گزاری اور انجام کار اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔

ابولہب:

یہ وہ بد بخت ازلی ہے' جس کا ذکر قرآن پاک میں تَبَّتْ یَدَا (تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں) کے الفاظ سے آیا ہے۔ یہ حضور ﷺ کا دشمنِ جان تھا۔ طاعون میں مبتلا ہو کر واصلِ جہنم ہوا۔ دوستوں اور عزیزوں نے بھی لاش کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس کے اقارب نے لاش پر اتنے پتھر پھینکے کہ لاشہ ان میں چھپ گیا اور یہی ڈھیر اس کی قبر بنا۔

ام جمیل بنت حرب بن امیہ:

ابوسفیان کی بہن اور ابولہب کی جورو' حضور اکرم ﷺ سے نہایت عناد اور دشمنی رکھتی تھی اور باوجودیکہ دولت مند تھی لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ کی عداوت میں انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ خود اپنے سر پر کانٹوں کا گٹھا لا کر حضور ﷺ کے راستہ میں ڈالتی تاکہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کو تکلیف ہو۔ وہ اس کام میں کسی دوسرے سے مدد لینا بھی گوارا نہ کرتی۔

ایک روز یہ بوجھ اٹھا کر لا رہی تھی کہ تھک کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ ایک فرشتے نے بحکم الٰہی اس کے پیچھے سے اس گٹھے کو کھینچا۔ وہ گرا اور اسی سے گلے میں پھانسی لگ گئی اور جہنم واصل ہوئی۔ ان دونوں کے بارے میں سورۂ تبت یدیٰ نازل ہوئی۔

ابوجہل:

یہ بھی راس الاشرار تھا اور حضور ﷺ کی دشمنی میں سب سے بڑھ کر تھا۔ اس کے بارے میں جناب سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ ہر امت کا ایک فرعون ہوتا ہے اور میری امت کا فرعون ابوجہل ہے۔

سورۂ قیامہ میں جب یہ آیت نازل ہوئی اَولٰی لکُ فاولٰی ثُمَّ اَولٰی لک فاولٰی یعنی تیری خرابی آ لگی' پھر تیری خرابی آ لگی' اب آ لگی' تو حضور ﷺ نے بطحا میں ابوجہل کے کپڑے پکڑ کر یہی آیت دہرائی اور اس سے فرمایا: تیری خرابی آ لگی' اب آ لگی' تیری خرابی آ لگی' تو ابوجہل نے کہا: اے

محمد ﷺ کیا تم مجھے دھمکاتے ہو۔تم اور تمہارا رب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔مکہ کے پہاڑوں کے درمیان میں سب سے زیادہ قوی اور زور آور ہوں اور صاحب شوکت ہوں......مگر قرآنی خبر ضرور پوری ہونی تھی اور حضور ﷺ کا فرمان بھی پورا ہونے والا تھا' چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جنگ بدر میں ابوجہل ذلت وخواری کے ساتھ بری طرح مارا گیا۔

آیۂ مذکورہ میں اس کی خرابی کا ذکر چار مرتبہ آیا ہے۔پہلی خرابی بے ایمانی کی حالت میں موت' دوسری خرابی قبر کی سختیاں اور وہاں کی شدتیں' تیسری خرابی مرنے کے بعد جی اٹھنے پر مصائب میں گرفتاری اور چوتھی خرابی عذابِ جہنم۔

ولید بن مغیرہ:

شاتمانِ رسول ﷺ میں سرفہرست تھا۔صاحب مال و اولاد بھی تھا۔اپنے بیٹوں اور رشتہ داروں سے کہتا: ''اگر تم میں سے کسی نے اسلام قبول کیا تو میں اسے اپنے مال میں سے کچھ نہ دوں گا۔'' حضور ﷺ پر عیب لگاتا اور انہیں ''مجنون'' کہتا۔اس جھوٹے کلمہ کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اس کے دس عیوب ظاہر فرما دیئے۔

ترجمہ: ''بڑی قسمیں کھانیوالا' ذلیل' طعنے دینے والا' ادھر سے ادھر کی لگانے والا' بھلائی سے بڑا روکنے والا' حد سے بڑھنے والا' گنہگار' درشت خو (ان سب پر طرہ یہ کہ) اس کی اصل میں خطا۔''

جب سورۂ قلم کی یہ آیات نازل ہوئیں تو ولید بن مغیرہ نے اپنی ماں سے جا کر کہا: ''محمد مصطفیٰ ﷺ نے میرے بارے میں دس باتیں فرمائی ہیں۔نو کو میں جانتا ہوں کہ مجھ میں موجود ہیں لیکن دسویں بات (اصل میں خطا ہونے کی) اس کا حال مجھے معلوم نہیں' یا تو مجھے سچ سچ بتا دے ورنہ میں تیری گردن مار دوں گا۔''

اس پر اس کی ماں نے کہا کہ تیرا باپ نامرد تھا۔مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ مر جائے گا تو اس کا مال غیر لے جائیں گے تو میں نے ایک چرواہے کو بلا لیا' تو اس سے ہے' مگر بدبخت ولید پھر بھی ایمان نہ لایا۔

یہی ولید بن مغیرہ تیر فروش کی دکان کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اس کے تہ بند میں ایک تیر چبھا مگر اس نے تکبر سے اس کو نکالنے کے لیے سر نیچے نہ کیا۔اسی سے اس کی پنڈلی میں زخم آیا اور وہ اسی حال میں مر گیا۔

کفار قریش کے پانچ سردار عاص بن وائل سہمی' اسود بن مطلب' اسود بن عبدیغوث' حارث بن قیس اور ان سب کا سرغنہ ولید بن مغیرہ' حضور نبی کریم ﷺ کو بہت ایذا دیتے اور آپ کے ساتھ

تمسخر اور استہزا کرتے تھے۔ ایک روز حضور ﷺ مسجد حرام میں تشریف فرما تھے۔ پانچوں آئے اور حسب دستور طعن و تشنیع پر اتر آئے اور طواف کرنے لگے۔ اسی حال میں حضرت جبرئیل امین حضورؐ کی خدمت میں پہنچے۔ انہوں نے ولید بن مغیرہ کی پنڈلی کی طرف اور عاص کے کف پا کی طرف اور اسود بن مطلب کی آنکھوں کی طرف اور اسود بن عبد یغوث کے پیٹ کی طرف اور حارث بن قیس کے سر کی طرف اشارہ کیا اور کہا ان کا شر دفع ہو جائے گا۔ چنانچہ ولید بن مغیرہ کی پنڈلی میں زخم آیا اور وہ اسی حال میں مر گیا۔ عاص بن وائل گدھے پر سوار تھا۔ غار کے برابر گدھے نے ٹھوکر کھائی اور سر کے بل گڑھے میں اوندھا جا پڑا۔ وہاں زہریلا عقرب موجود تھا۔ اس نے کاٹا' سوجن ہوگئی اور سڑ سڑ کر مرا۔ اسود بن مطلب حضور اکرم ﷺ کی نقلیں اتارا کرتا تھا۔ ایک درخت کے نیچے سویا ہوا تھا۔ اٹھا تو سخت بے چین تھا۔ کہتا تھا میری آنکھوں میں کانٹے چبھ رہے ہیں اور ایسا درد ہوا کہ دیوار میں سر مارتے مارتے مر گیا' اور یہ کہتے ہوئے مرا کہ مجھ کو محمد ﷺ نے قتل کیا۔ اسود بن عبد یغوث کو استسقاء ہوا اور کلبی کی روایت میں ہے کہ بادِ سموم سے چہرہ جھلس کر سیاہ ہو گیا کہ گھر والوں نے بھی نہ پہچانا اور باہر نکال دیا۔ زبان پیاس کی شدت سے باہر نکل آئی اور اسی حال میں یہ کہتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا کہ مجھ کو محمد ﷺ کے رب نے قتل کیا۔ حارث بن قیس۔ اس کے پیٹ میں زرد پانی پڑ گیا۔ جو ناک اور منہ سے نکل آتا۔ اسی میں ہلاک ہوا۔

انہی کے بارے میں سورۂ حجر کی آیت نمبر 104 نازل ہوئی۔

ترجمہ: ''بے شک ان ہنسنے والوں پر ہم تمہیں کفایت کرتے ہیں۔''

عامر بن طفیل اور اربد بن ربیعہ:

عامر نے اربد بن ربیعہ سے کہا کہ محمد ﷺ کے پاس چلو۔ میں انہیں باتوں میں لگاؤں گا۔ تو پیچھے سے تلوار سے حملہ کرنا۔ یہ مشورہ کر کے وہ حضور کے پاس آئے اور عامر نے آپؐ سے گفتگو شروع کی۔ بہت طویل گفتگو کے بعد کہنے لگا۔ اب ہم جاتے ہیں اور ایک جرار لشکر آپ ﷺ پر لائیں گے۔ یہ کہہ کر چلا آیا۔ باہر آ کر اربد سے کہنے لگا کہ تو نے تلوار کیوں نہیں ماری۔ اس نے کہا۔ جب میں تلوار مارنے کا ارادہ کرتا تھا تو تو درمیان میں آ جاتا تھا۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے نکلتے وقت یہ دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ اکْفِھِمَا بِمَاشِئْتَ جب یہ دونوں مدینہ شریف سے باہر آئے تو ان پر بجلی گری۔ اربد جل گیا اور عامر راستہ ہی میں بدتر حال میں مرا۔

سورۂ رعد کی آیات نمبر 37-38 میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے:

ترجمہ: ''وہ کڑک بھیجتا ہے تو اسے ڈال دیتا ہے جس پر چاہے اور وہ اللہ (تعالیٰ)

میں جھگڑتے ہیں اور اس کی پکڑ بڑی سخت ہے۔"

اُمیہ بن خلف:

بدزبانی میں مشہور تھا۔ حضرت بلالؓ اس کی مِلک میں تھے۔ ان پر انتہائی ظلم اور سختیاں کرتا۔ آپ کو گرم زمین پر ڈال کر تپتے ہوئے پتھر ان کے سینے پر رکھتا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے گراں قیمت پر ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔ اس پر سورۂ والیل نازل ہوئی۔ حضرت بلالؓ کے ہاتھوں ہی یہ شقی القلب دارالبوار کو پہنچا۔

نضر بن حارث:

مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

عاص بن منبہ:

گدھے پر سوار تھا۔ طائف کی راہ میں کانٹا لگا' اسی کے زہر سے ہلاک ہوا۔

منبہ بن حجاج:

اندھا ہوا اور تڑپ تڑپ کر جان دی۔

زبیر بن ابی اُمیہ:

وبا کا لقمہ ہوا اور چل بسا۔





تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ

راجارشید محمود

محبت سچائی ہے
محبت حقیقت ہے
محبت خدا ہے
محبت بندگی بھی تو ہے

محبت خدا کے محبوب ﷺ کا حق ہے اور ان کے امتیوں کا فرض۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت ہی کا نام تو اسلام ہے۔

جس کے محبوب' خدا کے محبوب (ﷺ) نہیں' وہ مسلمان نہیں اور...... جو محبت میں جان عزیز کو عزیز نہ سمجھے' وہی محب ہے۔

محبوب کی عظمت کو سلام کرنا' محبوب کی عزت سے محبت کرنا' محبوب کی حرمت پہ مرمٹنا' محبوب کی ناموس کی مردانہ وار حفاظت کرنا...... اس راہ میں جان لے لینا یا جان دے دینا ہی معراج محبت ہے۔

غازی علم الدین' غازی عبدالرشید' غازی مرید حسین' غازی میاں محمد' غازی محمد صدیق' غازی عبدالقیوم' غازی محمد عبداللہ...... ایسے شہیدانِ ناموس سرکار (ﷺ) ہی محبت کی راہ میں عظمت کے مینار

ہیں۔

آسمانِ محبت کے ان درخشندہ وتابندہ ستاروں کوزمین کے حقیر ذروں کا سلام!
ہمارا سلامِ عقیدت اگر ان کی بارگاہ میں شرف قبول پالے تو ہماری زندگی با جواز ٹھہرے۔
ازل ابد کے ان زندوں سے نسبت ہمیں بھی زندہ رکھ سکتی ہے۔ خدا ہماری اس نسبت کو زندہ رکھے!!



قصرِ تاریخ کے شکستہ حصوں میں راجپال' شردھانند' پالا مل' سلمان رُشدی اور ان جیسے دوسرے بھوت پریت ہونکتے بھونکتے دکھائی دیتے ہیں۔
اس مخلوق کا سلسلۂ نسب "حمالة الحطب" اور "بعد ذلک زنیم" کے کھنڈرات میں ملتا ہے۔
اس نسل کے پھیلے ہوئے ہونٹوں اور لٹکتی ہوئی زبانوں کا انقطاع تاریخ کے ہر دور کی اہم ضرورت رہی ہے۔
تاریخ کے ہر عہد اور قصرِ تاریخ کے ہر حصے کی یہ اہم ضرورت' وقت پر متصرف کسی شخص نے پوری کر دکھائی۔
جب بھی ایسا موقع آیا...... گویا جوانمردی اور جاں سپاری کا سورج بامِ قصر پر چمکا۔ جھروکوں سے جھانکنے والے چہروں پر حیرت واستعجاب کے نقوش گہرے ہو گئے۔ آس پڑوس کے باسیوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کیے۔ تھڑ دلوں کی زبانیں گنگ ہو گئیں' حوصلہ مندوں نے سینے تان لیے۔
ناموسِ رسالت کے محافظ وقت پر حکمران تھے' دلیری ان کے قدم چومتی رہی۔ دنیا حیران ہوئی...... کہ ان سے پہلے جان لینے اور جان دینے کا عمل اتنا معمولی کب تھا۔
قصرِ تاریخ کے کھنڈرات کو شاتمیت کے بھوتوں کا مدفن بنا کر خوشی سے دار پر جھول جانے والے...... انسانیت کا ناز ہیں' ملت کا سرمایہ ہیں' اللہ کے محبوب ہیں۔
ان کے ذکر میں جھک جانے والے سر' کہیں نہیں جھکتے!!



یہ افتخار کوئی کم تو نہیں کہ میں غازی لاہور' غازی علم الدین شہیدؒ کے مزار پر سلیوٹ مارتا رہتا ہوں۔

یہ اعزاز بھی بہت بڑا ہے کہ میں اس ملت کا فرد ہوں---حقیر' کم مایہ اور نکما سہی---جس میں کئی شہیدانِ ناموسِ رسالت ﷺ پیدا ہوئے۔

لیکن اس حقیقت میں بھی تو میرے سر اٹھا کر چلنے کا جواز موجود ہے کہ میرے آباؤ اجداد بھی اسی ضلعے کے باسی تھے جس نے مرید حسینؒ اور میاں محمدؒ کو جنم دیا

بھلہ کریالہ اور تلہ گنگ اب چکوال میں ہیں تو چوآ سیدان شاہ کی وادیٔ گل بھی وہیں ہے۔

محمد عبداللہؒ کے جیالے صاحبزادے نے رام گوپال' اور صوبیدار غلام محمدؒ کے جوانمرد فرزند نے چرن داس کو کیفر کردار تک پہنچایا---خدا کرے راجا غلام محمدؒ کے معصیت پیشہ بیٹے کے ہاتھ رُشدی کی گردن تک پہنچیں وہ جہنم رسید ہو اور یہ گوہر مراد پالے۔

رُشدی کی کتاب چھاپنے والے ادارے پنگوئن میں ساٹھ فی صد حصص امیرِ کویت کے تھے۔

اس کا حال تو دنیا دیکھ رہی ہے' انجام بھی دیکھے گی۔

خدا کرے' شاتت سرکار (ﷺ) کی کسی بھی کوشش میں حصہ لینے والے ہر فرد کا انجام عبرت ناک ہو!



شہیدانِ ناموسِ رسالت ﷺ!

شاتمانِ رسولؐ کے دشمن'

استقامت کے تراشے ہوئے پیکر'

ایمان کی تجسیم کے مکمل شاہکار'

جنھوں نے جذبوں کی ثقاہت کو دار کی کسوٹی پر کس کے دیکھ لیا۔

شہیدانِ ناموسِ رسالت ﷺ!

شاتت سرکار (ﷺ) کی کسی خبر سے جن کا رُواں رُواں سر کشیدہ نظر آیا'

انہوں نے ضروری کارروائی کی تو شاتت کی ہر جسارت سرنگوں ہوئی اور حافظت حرمت کی کوشش سربلند ٹھہری!

شہیدانِ ناموسِ رسالت ﷺ!

جن کے ایثار پیشہ سراپا میں وہ خون پایا گیا جس کا گروپ غیرت ہے۔

یہ خون ان کی رگوں میں دوڑتا پھرتا اس لیے رہا کہ کسی کام آئے' غیرت گروپ کا یہ خون پہلے اُچھلا اور بے غیرتی کے مجسموں کو دبوچ لیا' پھر اُبلا اور شہادت کو گلے لگا لیا۔

خون کا غیرت گروپ--- دُنیا کی عظمتیں جس کی حیثیت کے سامنے سرفگندہ بیٹھی ہیں اور عقبیٰ کی نعمتیں اس کے خیر مقدم کو سرو قد کھڑی ہیں۔

مرحبا' غیرت گروپ' صد مرحبا!!



نعت صفحۂ قرطاس پر بھی رقم کی جاتی ہے اور دل کے کینوس پر بھی۔

نعت بحور و قوافی کی پابندی سے بھی کہی جاتی ہے اور نثر کی رنگینیوں اور نیرنگیوں کے جلو میں بھی۔

نعت' دماغ میں موجود ذخیرۂ الفاظ سے بھی بیان کی جاتی ہے اور دل کی لفظیات کے بل بوتے پر بھی۔

میں اور آپ' نعت کے حروف' الفاظ' تراکیب اور مصرعے روشنائی ہی سے لکھتے ہیں--- اور' شہیدانِ ناموسِ رسالت ﷺ نے مزرعِ نعت کی آبیاری اپنے خونِ پاک سے کی ہے۔

ہم نے مرغِ تخیل کو عروض کی قیود میں جکڑ کر--- اور' انھوں نے طائرِ روح مقید کو آزاد کر کے' نعت کے بند لکھے ہیں۔

ہم نے خیالات کی اڑان سے الفاظ کے نگینے جڑے ہیں' انھوں نے خونِ قلب کے ترشح سے مصرع ہائے تر کی صورت دیکھی ہے۔

محافظانِ حرمتِ آقا و مولا (علیہ التحیۃ والثناء) نے نعت کے ارقام کی خواہش میں' روشنائی کے طور پر اپنی رگوں سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ دیا' تو گویا لاثانی خالق و مالک کے لاثانی محبوب (ﷺ) کی حقیقی نعت لکھنے کا اہتمام کیا۔

جاں نثارانِ حرمتِ سرکار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جس عدیم النظیر اسلوب میں یہ نعت رقم کی ہے' خداوندا! ہمیں بھی وہ اسلوب اپنانے کی توفیق مرحمت فرما!

ہم نعت کہتے کہتے' نعت پڑھتے سنتے' محبت کے اس جادے پر گامزن ہو جائیں جو سلمان رُشدی کے قتل کی منزل پر پہنچا دے!

اور'--- بدلے میں ہمیں دار کو بوسہ دینے کی سعادت مل جائے!!



تحفظ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر منظوم کلام

نماز اچھی، حج اچھا، روزہ اچھا اور زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود اس کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجہ بطحا کی حرمت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

(مولانا ظفر علی خاں)

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مرد مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرف لا تدع مع اللہ الٰہا اخر

(علامہ اقبالؒ)

عالم نے' فقیہ نے کہی جب اپنی
اک بات دل حزیں نے کی مجھ سے بھی
آقا پر کریں زباں درازی جو لوگ
لازم ہے اُڑا کے رکھ دو گردن ان کی

(حزیں کاشمیری)

جان دو یا جاں لو تم مر نہیں سکتے کبھی
تم پہ غالب آ نہیں سکتی جہاں میں کوئی شے
سر میں رکھتے ہو اگر روشن چراغ آرزو
حفظ ناموسِ نبیؐ کا داعیہ گر دل میں ہے

(راجارشید محمود)

خدائے پاک کا فرماں ہے احترام رسولؐ
اساسِ کعبہ ایماں ہے احترام رسولؐ
نبیؐ کے نام پہ جاں دینے والے زندہ ہیں
بقائے زیست کا ساماں ہے احترام رسول

(محمد افضل کوٹلوی)

میں رسن کو چوم لیتا ہوں تڑپ کر دار پر
یا پلا دیتا ہے کوئی جام کوثر دار پر
یہ غلامانِ محمدؐ کی پرانی ریت ہے
کودتے ہیں آگ میں، چڑھتے ہیں اکثر دار پر
کس قدر ہے تیرے عاشق کو شہادت کی خوشی
کس قدر مسرور ہے، اللہ اکبر دار پر
کھینچتا ہے کیوں مجھے محبوب کی آغوش سے
اور رہنے دے مجھے جلاد ، دم بھر دار پر

(اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی)

کوئی بھی شے اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتی عزیز
ہے زیادہ عظمتِ انساں سے ناموسِ رسولؐ
کر دیا جاں دے کے ثابت غازی علم الدینؒ نے
قیمتی ہے غازیوں کی جاں سے ناموسِ رسولؐ
عزت و آرام و جاں دے دیں، مسلماں کٹ مریں
اور بچائیں شدتِ ارماں سے ناموسِ رسولؐ

آدمی کے واسطے ایمان سب کچھ ہے نثار
بڑھ کے ہے لیکن کہیں ایماں سے ناموسِ رسولؐ

(اصغر نثار قریشی)

نہیں ملحوظ جس کو عظمت و شانِ شہِ بطحاؐ
وہ ہے بدبخت و بدقسمت وہی محروم رحمت ہے
خدا کے قہر سے وہ شخص بچ سکتا نہیں ہرگز
وہ جو گستاخ دربار گہر بار نبوت ہے
نبی کے نام پر مٹنا سند ہے خلد پانے کی
فدا ہونا شہؐ کونین پر پیغام جنت ہے
تحفظ ہوسکے ہم سے نہ گر ناموس احمدؐ کا
تو پھر یہ زندگی اپنی سراسر ایک تہمت ہے

(پروفیسر محمد اکرم رضا)

اظہار میں باطن کی حقیقت نہیں ہوتی
مرزائی کا دل ہوتا ہے صورت نہیں ہوتی
پڑھتے ہیں محمدؐ کا زباں سے کلمہ بھی
شرح کلمہ ، ختم نبوت نہیں ہوتی
آئین کی رو سے وہ مسلمان نہیں ہیں
تاویل کی محتاج شریعت نہیں ہوتی
مرعوب کسی دعوے سے ہوتا نہیں قانون
انصاف کی آواز میں لکنت نہیں ہوتی
چپ رہتا مظفرؔ تو گنہگار ٹھہرتا
سچ کہنے سے توہین عدالت نہیں ہوتی

(مظفر وارثی)

دل و نگاہ کی پہنائیوں پہ چھائی ہے
محبتوں سے مرتب حسین قوسِ قزح

شہادتوں کی شفق رنگ سرخیوں کے طفیل
فلک ہے حرمتِ آقاؐ تو دیغِ قوسِ قزح
(راجارشید محمود)

شاتم سید کونینؐ کا خوں جائز ہے
آج تک بھی یہی جذبہ ہے مسلمانوں میں
دوستو آؤ محمدؐ پہ نچھاور کر دیں
تار جتنے بھی بقایا ہیں گریبانوں میں
(شورش کاشمیریؒ)

وضاحت کر نہیں سکتا' مگر آواز دیتا ہوں
کہ اس کرب و بلا میں سخت جانوں کی ضرورت ہے
کہاں ہیں سیدالکونین کی امت کے دیوانے؟
کہ ناموسِ نبی کے پاسبانوں کی ضرورت ہے
(شورش کاشمیریؒ)

اپنے خدا سے مانگ محمدؐ سے انتساب
ان کے حضورؐ عشق کے دیپک جلائے جا
آئے گی موت واقعتہً ایک دن ضرور
پھر موت کیا ہے کچھ نہیں غیرت دکھائے جا
ناموسِ مصطفیٰؐ کا تقاضا ہے ان دنوں
مہر و وفا کے نام پہ گردن کٹائے جا
(شورش کاشمیریؒ)

ہم کسی فرعون کی طاقت سے ڈر سکتے نہیں
ناچ تگنی کا حریفوں کو نچایا جائے گا
کر رہے ہیں اہلِ ربوہ سازشوں پہ سازشیں
اب انہیں اسلام کے در پہ جھکایا جائے گا

ہم کسی بھی دشمنِ اسلام کے ساتھی نہیں
ہم جو کہتے ہیں وہ کر کے بھی دکھایا جائے گا
(شورش کاشمیریؒ)

کٹ مروں گا خواجۂ کونینؐ کے ناموس پر
سر کوئی شے ہی نہیں یہ بھی کٹایا جائے گا
صورتِ حالات کے ویرانہ آباد میں
دبدبہ فاروقِ اعظمؓ کا بٹھایا جائے گا
(شورش کاشمیریؒ)

ترا آخرت میں وثیقہ یہی ہے
خدا کے لیے سر کٹائے چلا جا
خدا کے لیے سر کٹانے کا مطلب؟
نبیؐ کا پھریرا اُڑائے چلا جا
(شورش کاشمیریؒ)

ابتدا سے خواجۂ کون و مکاں کا ہوں غلام
میں کسی حاکم کے آگے ہاتھ پھیلاتا نہیں
فیصلہ دو ٹوک ہے شورش محمدؐ کی قسم
میرا موقف ہے شہادت اب مجھے جینا نہیں
(شورش کاشمیریؒ)

میرزائی سامراجی طاقتوں کے زور پر
ہم مسلمانوں کی غیرت کو مٹا سکتے نہیں
یادگارِ ابن ملجم ہے غلام احمد کی پود
ہم کسی عنواں اسے خاطر میں لا سکتے نہیں
(شورش کاشمیریؒ)

اس وطن میں دین کے باغی ٹھہر سکتے نہیں
ہم نے اس مقصد کو ہر مقصد پہ اولیٰ کر دیا

خواجۂ کونینؐ کی غیرت کا پرچم گاڑ کر
دیدہ و دل کو نثارِ راہِ بطحا کر دیا
(شورش کاشمیریؒ)

حرمتِ دینِ محمدؐ کے نگہبانو! اٹھو
شعلہ سامانی دکھاؤ' شعلہ سامانو! اٹھو
فتنہ یہ اٹھا ہے ہنگامہ اٹھانے کے لیے
مشعلِ نورِ محمدؐ کو بجھانے کے لیے
یہ بلا آئی ہے تم سب کو جگانے کے لیے
غیرتِ دینی تمہاری آزمانے کے لیے
تم ہو ناموسِ محمدؐ کے نگہباں یاد ہے
تم مسلماں ہو' مسلماں ہو' مسلماں یاد ہے
(سید امین گیلانی)

پر محمدؐ کی جہاں توہین ہو کٹ جائیں گے
وہ قدم دوزخ میں جائیں گے اگر ہٹ جائیں گے
تم بھی اس جانِؐ دو عالم سے وفاداری کرو
اس کے دشمن سے کھلا اظہارِ بیزاری کرو
(سید امین گیلانی)

اف یوں ہو' توہینِ محمدؐ اور پھر ملک ہمارا ہو
کیوں نہ جگر ہو ٹکڑے ٹکڑے اور دل پارہ پارہ ہو
صبر کی حد ہوتی ہے کوئی کب تک آخر صبر کریں
اس بے شرمی کے جینے سے بہتر ہے ہم ڈوب مریں
(سید امین گیلانی)

پھر کوئی بوبکر اور فاروق پیدا ہو یہاں
مرتدوں کی زد میں یا رب ارضِ پاکستان ہے

جان ہو قربان ناموسِ رسالت کے لیے
دل میں جامی کے ہمیشہ سے یہی ارمان ہے
(جامی بی اے علیگ)

نبیؐ کی عزت و حرمت پہ مرنا عین ایمان ہے
سر مقتل بھی ان کا ذکر کرنا عین ایماں ہے
جو فتنہ ملتِ بیضا کی بنیادوں سے ٹکرائے
میرے نزدیک اس کا سر کچلنا عین ایماں ہے
(فیروز فتح آبادی)

ہم نے ہر دور میں تقدیس رسالتؐ کے لیے
وقت کی تیز ہواؤں سے بغاوت کی ہے
توڑ کر سلسلۂ رسم سیاست کا فسوں
اک فقط نام محمدؐ سے محبت کی ہے
ہم نے بدلا ہے زمانے میں محبت کا مزاج
ہم نے ہر دل کو نئی راہ و نوا بخشی ہے
مرحلے بند و سلاسل کے کئی طے کرکے
چہرۂ دار و رسن کو بھی ضیاء بخشی ہے
(حفیظ رضا پسروری)

قادیانی نبوت کے افکار سے
اس کی گفتار اس کے کردار سے
دین کی آبرو کل بھی خطرے میں تھی!
دین کی آبرو آج بھی خطرے میں ہے!
(شریف جالندھری)

جن کو نہ ہو کچھ پاس پیغمبرؐ کے ادب کا
چن چن کے میں اس قوم کو مٹی میں ملا دوں
(مولانا ظفر علی خاں)

ہوشیار ہو اے ختمِ نبوت کے محافظ
کس کام میں مصروف ہے باطل کی ہوا دیکھ
(عتیق الرحمان)

غدار وطن غدار، نبیؐ اس پاک وطن میں کیونکر ہیں؟
میں پوچھتا ہوں یارانِ وطن یہ خار چمن میں کیونکر ہیں؟
(جانباز مرزا)

پستی پہ کھلے آپؐ کی رفعت کیونکر
محدود میں آ رہے یہ وسعت کیونکر
فکر و فہم و خرد سے جو عاری ہوں
ان پر ہو عیاں نبیؐ کی عظمت کیونکر
(حزیں کاشمیری)

دنیا سے دل لگا کے تجھے کیا ملا اسیر
اب عشق مصطفیٰؐ میں بھی جاں دے کے دیکھ لے
(غازی مرید حسین شہیدؒ)

ملعون رشدی کی سزا

ہر فیصلۂ عدل و وفا موت ہے بس موت
گستاخِ محمدؐ کی سزا موت ہے بس موت
زنداں میں حقیقت سے وہ بھاگا ہوا قیدی
اب اس کے لیے آب و ہوا موت ہے بس موت
اک روز اسے ڈھونڈ ہی لے گی کوئی گولی
اب اس کے ٹھکانے کا پتہ موت ہے بس موت
قرآں سے سزا رشدی ملعون کی پوچھی
ہر آیۂ قرآن نے کہا موت ہے بس موت
بے خوف نہیں ایک بھی لمحے سے وہ اپنے
ہر سانس اب اس کا بخدا موت ہے بس موت
کفار سے کتنی ہی سفارش وہ کرا لے
اس کے لیے آغوش کشا موت ہے بس موت
توبہ کے عوض بھی اسے جاں دینا پڑے گی
ردِ عمل حرف دعا موت ہے بس موت
دولت کے پجاری کو بلاتا ہے جہنم
شہرت کے بھکاری کی غذا موت ہے بس موت

(مظفر وارثی)

شاتمِ رسول سے

اربابِ وفا کا دل دکھانے والے!
اخلاق کی دھجیاں اڑانے والے!
پھٹ جائے فلک تجھ پہ، گرے تجھ پر رعد
حرمت پہ نبیؐ کی حرف لانے والے!



حرمت کو ہے تجھ سے عار، تجھ پر افسوس
زندیق! او نابکار! تجھ پر افسوس
کامل انسان کو برا کہتا ہے
افسوس! ہزار بار تجھ پر افسوس



مجرم ہے، بتا! چھپا رہے گا تا کے!
فاسق ہے، یہ کیا ستم کیا ہے، ہے ہے
اللہ کے غضب سے اب بچے؟ ناممکن!
ہے دین ترے خلاف، دنیا درپے



ظلم و جور و جفا کی شدت تُو ہے
ہو جس کی نہ انتہا وہ نفرت تُو ہے
آدم کا ملا ہے روپ تجھ کو بے شک
سچ یہ ہے کہ ننگ آدمیت تُو ہے



فطرت کے ذرا قریب جاتا تُو بھی
باطن میں کبھی تو جھانک آتا تُو بھی
انوارِ نبیؐ سے اک جہاں روشن ہے
آنکھیں ہوتیں تو دیکھ پاتا تُو بھی

(حزیں کاشمیریؒ)

جو شہیدانِ ناموسِ سرکار ﷺ ہیں

سلام ان پر ہوئے قرباں جو ناموسِ رسالتؐ پر
خدا کی رحمت ہو ان شہیدانِ محبت پر
ہوئے ہیں ایک پل میں جنت الفردوس کے راہی
نشانِ پا کو ان کے چومتی ہے عظمت شاہی
بجھائی زندگی، شمعِ رسالت کو کیا روشن
نبوت کا کیا شاداب اپنے خون سے گلشن
عظیم الشان مقصد کے لیے تھی ان کی قربانی
دکھاتی ہے یہی جوہر اگر ہو روحِ ایمانی
مبارک باد دیتے ہیں فرشتے حق کے پیاروں کو
وفا کیشوں، شہیدوں، غازیوں، طاعت گزاروں کو
ہوئی ان کشتگانِ عشق کو حق کی رضا حاصل
میسر آ گئی ان کو سکون و امن کی منزل
درِ رحمت کھلا ہے، سرفروشوں پاک بازوں پر
دعا گو ان شہیدوں کے لیے ہے روح پیغمبرؐ
ملا انعام حق ان کو نوید جاں فزا پائی
فدا ان جاں نثاروں پر ہوئی جنت کی رعنائی
متاع غیر فانی ہے وہ اک لمحہ شہادت کا
چمکتا ہو تصور جس میں ناموسِ رسالت کا
ملتی ہے دامنِ سرکارؐ سے وابستگی ان کو
عطا کی ہے خدائے پاک نے وارفتگی ان کو

رہِ حق کے مسافر واجب التعظیم ہوتے ہیں
رضائے حق کے جویا' خوگرِ تسلیم ہوتے ہیں
شہیدوں نے دیا ہے درس ہم کو جاں نثاری کا
فنا ہو کر دکھایا راستہ عالی وقاری کا
گزر آئے ہیں میدانِ عمل میں سرخرو ہو کر
سراپا ملتِ اسلامیہ کی آبرو ہو کر
گلستانِ وفا کی ہے بہارِ جاوداں ان سے
ہے عشق و سوز و مستی کا درخشندہ نشاں ان سے
زبانوں پر ترانے ہیں انہی کی کامرانی کے
حصولِ شادمانی کے' حیاتِ جاودانی کے
ہے ان کی ہر ادا میں نکہت و خوشبو محبت کی
جنابِ مصطفیٰؐ کی ذات سے حسنِ عقیدت کی
شہادت ایک تمغہ ہے شجاعت کا' حمیت کا
یہ اک اعجازِ لافانی ہے' آقاؐ کی محبت کا
شہادت گاہِ الفت میں ہے تزئین و ضیا ان سے
دلوں کا نور ہے ان سے' خیالوں کی جلا ان سے
اسی سے دامنِ فکر و نظر ہوتا ہے نورانی
یہی جذبہ ہے جس سے خون مسلم میں ہے جولانی
حبیبؐ اللہ کی الفت کو سوز جاں میں ڈھالا ہے
شہادت ان کے جذب و شوق کا رنگین نوالہ ہے
ملے گا تا ابد ہر ایک دل میں احترام ان کا
قیامت تک رہے گا زندہ و پائندہ نام ان کا

(حافظ لدھیانوی)

شہیدانِ ناموسِ رسالتؐ کا پیغام

ناموسِ مصطفیٰ پہ دل و جان وار دو
گستاخ کو جو دیکھو بلا خوف مار دو
شان و شکوہِ خواجۂ گیہاں پہ مر مٹو
حسن و جمالِ ملت بیضا نکھار دو
ہر شاتم و لعین کا گھربار پھونک دو
اس پاک سرزمین کا نقشہ سنوار دو
دل سے کبھی تو فرضِ عقیدت ادا کرو
سر سے کبھی تو قرضِ محبت اتار دو
عشقِ رسولؐ مخزنِ کیف و نشاط ہے
وحشتِ دل و نظر کو پیامِ بہار دو
سرکارؐ کے وقار پہ آئے نہ کوئی حرف
عمرِ عزیز بس اسی دھن میں گزار دو

(فیض الرسول فیضان)

آبروئے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

آبروئے مصطفیٰؐ پر جان بھی قربان ہے
جان تو کیا چیز ہے ایمان بھی قربان ہے
آبروئے مصطفیٰؐ سے آبروئے دین ہے
اس گلِ تر کی بدولت سب چمن رنگین ہے
آبروئے مصطفیٰؐ اسلام کی بنیاد ہے
جوہرِ آئینۂ ایام کی بنیاد ہے
آبروئے مصطفیٰؐ پر جو فدا ہو جائے گا
وہ حقیقت میں حقیقت آشنا ہو جائے گا
آبروئے مصطفیٰؐ قرآن کی تنویر ہے
علم کی تفسیر ہے' وجدان کی تطہیر ہے
آبروئے مصطفیٰؐ جس کو رہے مدِ نظر
اس کے اشکوں میں اجالے' اس کی آہوں میں اثر
آبروئے مصطفیٰؐ اللہ کو محبوب ہے
کیوں نہ ہو' آخر اسی محبوب سے منسوب ہے
آبروئے مصطفیٰؐ عشاق کی معراج ہے
صوفیا کی قدر و قیمت' اولیا کی لاج ہے
آبروئے مصطفیٰؐ عکس جمال حسن ہے
انتہائے نور و نکہت ہے' کمالِ حسن ہے
آبروئے مصطفیٰؐ سے عشق و مستی کا وجود
سوزِ پنہاں کا تلذذ' سازِ ہستی کی نمود

آبروئے مصطفیٰؐ سے کل جہاں وابستہ ہے
ہر زمیں وابستہ ہے، ہر آسماں وابستہ ہے
آبروئے مصطفیٰؐ فیضان میری جان ہے
یہ ہی میرا دین ہے، یہ ہی میرا ایمان ہے
(فیض الرسول فیضان)

تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ

دہلیزِ تیقن سے وہ محروم جبیں ہے
ناموسِ رسالت کا جسے پاس نہیں ہے
دنیا میں جو ناموسِ نبوت کا امیں ہے
گہوارۂ رحمت میں ہے وہ، خواہ کہیں ہے
تکریمِ محمدؐ کا جسے دل سے یقیں ہے
وہ صاحبِ ایماں ہے، وہی صاحبِ دیں ہے
جو شخص نہیں جانتا تعظیمِ محمدؐ
پھر اس کا دو عالم میں ٹھکانا بھی نہیں ہے
وہ جا کہ جہاں دفن ہیں عشاقِ رسالتؐ
جنت کا وہ اک ٹکڑا ہے جو زیرِ زمیں ہے
شمشیر بکف ہیں جو ہلال ان کی رضا میں
مرنا بھی حسیں ان کا ہے، جینا بھی حسیں ہے
(سید ہلال جعفری)

سلمان رُشدی کا قاتل

وہ ایک لمحہ
وہ وقت پر حکمران لمحہ
کہ جب عزیمت کی جرأت افزا منڈیروں پر جھلملاتے دیپک
اگائیں گے روشنی کی فصلیں
دھنک جمے گی فضا میں ہر سُو محافلِ رنگ و نور ہوں گی
زمانے بھر میں اجالا ہوگا
اجالا ہوگا سعادتوں کا
سعادتوں کا اجالا ہوگا جسارتوں سے
جسارتیں
جو محبتوں کی نقیب ہوں گی
جہاں کے محسن کی عزت و حرمت و تقدس کی نام لیوا
جسارتیں جو علم اٹھائیں گی حفظِ ناموسِ مصطفیٰؐ کا
جسارتیں جو گلا دبوچیں گی شاتمیت کا
اور
بے اصل رُشدی ایسا خبیث اس لمحے مارا جائے گا
جرأتوں کے، جسارتوں کے، عزیمتوں کے شناسا ہاتھوں سے
میرے ہاتھوں سے

(راجا رشید محمود)

تحفظِ ناموسِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثّناء

یہ محبت کا تقاضا ہے کہ جو محبوب کو
دیکھے میلی آنکھ سے اس کا تیا پانچا کرو
اس لیے ہر باحمیت اہلِ دیں پر فرض ہے
وہ فنا فی النار کر دے شاتمِ سرکارؐ کو



جس کو ہو ادراک ان کے مرتبے کا دہر میں
وہ مقدر کا سکندر ہے، وہ قسمت کا دھنی
ہوگیا لاریب وہ، چشمِ خدا میں سرفراز
سرورِ کونینؐ کی حرمت پہ جس نے جان دی



بہشت پاؤں پڑے اور فلک سلام کرے
بسا ہوا ہو نگاہوں میں جو نبیؐ کا جمال
جو ہو محبت سرکارؐ ضوفگن دل میں
جو ہو تحفظِ ناموسِ مصطفیؐ کا خیال

(راجارشید محمود)

جو شہیدانِ ناموسِ سرکار ﷺ ہیں

شان ان کی بڑی' ان کا رتبہ بڑا جو شہیدان ناموسِ سرکارؐ ہیں
ان پہ لطف و کرم خاص اللہ کا' جو شہیدانِ ناموسِ سرکارؐ ہیں
عشق کا منتہا' جان کا ہارنا...... راز ہم پہ افشا انہوں نے کیا
منزل زیست کے ہیں وہی رہنما جو شہیدان ناموسِ سرکارؐ ہیں
جب بھی فتنہ اٹھا' یہ مٹاتے گئے' جاں لٹاتے گئے' سر کٹاتے گئے
ان پہ حرمت نبیؐ کی ہوئی آشنا جو شہیدان ناموسِ سرکارؐ ہیں
ان سے خائف ہوئی موت' ڈرتی رہی' جھینپ سا ہو گئی' پاؤں پڑتی رہی
ڈرنے والے اجل سے کہاں ہیں بھلا' جو شہیدان ناموسِ سرکارؐ ہیں
کیسی الفت نبھائی ہے سرکار سے' کس محبت سے لپٹے ہیں وہ دار سے
پائیں گے خود پیمبرؐ سے اس کا صلہ جو شہیدان ناموسِ سرکارؐ ہیں
رہ نوردان راہ طلب! جان لو یہ حقیقت کہ ہے دو قدم مان لو!
ان کے مدفن سے فردوس کا فاصلہ جو شہیدانِ ناموسِ سرکارؐ ہیں
آؤ مل کر چلیں ان کے مرقد پہ ہم' ہوں مودب' پڑھیں فاتحہ دم بدم
ان سے ٹوٹے نہ یہ ربط' یہ سلسلہ جو شہیدانِ ناموسِ سرکارؐ ہیں
سرنگوں' لرزاں' حیراں نظر آئی جب ماسوا چند لوگوں کے مخلوق سب
شان ان کی ذرا حشر میں دیکھنا جو شہیدانِ ناموسِ سرکارؐ ہیں
حق کے محبوب ٹھہرے ہوئے اولیا' ان کو سرکارؐ کا قرب حاصل ہوا
ہے انہیں خوف کس کا' انہیں حزن کیا جو شہیدانِ ناموسِ سرکارؐ ہیں
شاتمانِ نبیؐ کا مخالف رہوں' جان حرمت پہ سرکارؐ کی وار دوں
جاؤں' کر لوں انہیں رہبر و رہنما جو شہیدانِ ناموسِ سرکارؐ ہیں
میرے دل میں نبیؐ کی محبت رہے' دشمنانِ نبیؐ سے عداوت رہے
کر عطا ان کا جذبہ مجھے اے خدا جو شہیدانِ ناموسِ سرکارؐ ہیں
رشدی لعنتی میرے ہاتھوں مرے' یہ سعادت خدایا مجھے بخش دے
ان کا مل جائے محمود کو راستہ جو شہیدانِ ناموسِ سرکارؐ ہیں

(راجا رشید محمود)

تحفظِ ناموسِ رسول ﷺ

ہماری جان بھی قربان ہے ناموسِ رسالتؐ پر
لٹا دیں دولتِ کونین ہم اس ایک دولت پر
یہی بس اصل ایمان اصل دیں اصلِ عقیدت ہے
فدا تن من سدا کرتے رہیں آقاؐ کی حرمت پر
کبھی جو زیست میں توقیرِ حضرتؐ کا سوال آئے
تو لازم ہے کہ دے دیں جان بھی ہم انؐ کی عظمت پر
کریں گھر بار بھی اپنا نچھاور شان پر ان کی
مگر دھبہ نہ آنے دیں کبھی ہم دیں کی شوکت پر
اگر رُشدی سا کوئی بدزباں ہذیان بکتا ہو
تو بن جائیں سراپا احتجاج ایسی جسارت پر
بحال اس طرح سے رکھیں ہمیشہ اعتماد اپنا
بھروسا ذات پر انؐ کی نظر ہو ان کی رحمت پر
نہ واریں روح بھی اپنی نبیؐ پر جب تلک نازش
”نہ جب تک کٹ مریں ہم خواجۂ طیبہ کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل اپنا ایماں ہو نہیں سکتا“

(محمد حنیف نازش)

ناموسِ رسالت ﷺ

ہے شاہد آج بھی تاریخ اس زندہ حقیقت پر
کہ آنچ آنے نہیں دیتے غلامِ آقاؐ کی عزت پر
ہوا ہرزہ سرا جب بھی کوئی شانِ رسالتؐ میں
گیا بچ کر نہ زندہ پھر وہ اپنی اس جسارت پر
دکھاتا ہے کوئی جانباز رہ اس کو جہنم کی
جھپٹتا ہے کوئی دیوانہ اس ابلیس فطرت پر
دیے ہر دور میں عشاق نے جانوں کے نذرانے
کیا سب کچھ تصدق اپنا ناموسِ رسالتؐ پر
اگرچہ راستہ روکا کیے دار و رسن ان کا
مگر چلتے رہے اہلِ وفا راہِ عزیمت پر
کبھی زنجیر سے الجھے' کبھی شمشیر سے کھیلے
ہے ناز اسلام کو ان جاں نثارانِ نبوت پر
کٹا دیتے ہیں سر اپنے' لٹا دیتے ہیں گھر اپنے
خدا رحمت کرے ان عاشقانِ پاک طینت پر
ہے شرطِ اوّل ایماں محبت سرورؐ دیں کی
تحفظ فرض ہے ناموسِ پیغمبرؐ کا امت پر
"سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں"

(ضیاءمحمدضیاء)

ناموسِ مصطفیٰ علیہِ التحیّۃ والثّناء

اسلام کا وقار ہے ناموسِ مصطفیٰ
ایماں کا خلد زار ہے ناموسِ مصطفیٰ
ناموسِ مصطفیٰ پہ ہیں قربان جان و دل
اپنا تو اک شعار ہے ناموسِ مصطفیٰ
جس کی مہک سے بزمِ جہاں عطر بیز ہے
پھولوں کا ایک ہار ہے ناموسِ مصطفیٰ
جو ہر دل و دماغ کو ٹھنڈک عطا کرے
وہ پیار کی پھوار ہے ناموسِ مصطفیٰ
سیراب اس سے کتنے دماغوں کی کھیتیاں
ذہنوں کی آبشار ہے ناموسِ مصطفیٰ
دنیا میں اس کے دم سے نہ کیوں پھول کھل اٹھیں
اس باغ کی بہار ہے ناموسِ مصطفیٰ
بوجہل و بولہب اسے کیسے گرا سکیں
مانند کوہسار ہے ناموسِ مصطفیٰ
کتنے ہی غازیوں کو وہ سرمست کر گئی
الفت کا وہ خمار ہے ناموسِ مصطفیٰ
بزمی کئی شہید ہیں اس کے نگاہباں
منظورِ کردگار ہے ناموسِ مصطفیٰ

(پروفیسر خالد بزمی)

محمد ﷺ کی محبت

سما سکتی ہے کیونکر حُب دنیا کی ہوا دل میں
بسا ہو جب کہ نقشِ حُبِ محبوبؐ خدا دل میں
محمدؐ کی محبت دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو ایماں نامکمل ہے
محمدؐ کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی
خدا کے دامنِ توحید میں آباد ہونے کی
محمدؐ کی محبت آنِ ملت شانِ ملت ہے
محمدؐ کی محبت روحِ ملت جانِ ملت ہے
محمدؐ کی محبت خون کے رشتوں سے بالا ہے
یہ رشتہ دنیوی قانون کے رشتوں سے بالا ہے
محمدؐ ہے متاعِ عالمِ ایجاد سے پیارا
پدر، مادر، برادر، مال جان، اولاد سے پیارا
یہی جذبہ تھا ان مردانِ غیرت مند پر طاری
دکھائی جن کے ہاتھوں حق نے باطل کو نگونساری

(ابوالاثر حفیظ جالندھری)

شہدائے ناموسِ رسالتؐ کے کارناموں کے تناظر میں

اے دنیا کے جھوٹے خداؤ‘ ہم سے الجھنا ٹھیک نہیں
ظلم کے طوفانی دریاؤ‘ ہم سے الجھنا ٹھیک نہیں
باطل کی منہ زور ہواؤ‘ ہم سے الجھنا ٹھیک نہیں
”جور و جفا کی تیرہ گھٹاؤ‘ ہم سے الجھنا ٹھیک نہیں
شمع رسالت کے پروانے کب ڈرتے ہیں ظلمت سے“
اس دنیا میں جس کی دنیا عشق نبی سرورؐ ہے
اس کی فقیری رشک شہانِ صد اَورنگ و افسر ہے
ہر افضل سے افضل ہے وہ‘ ہر برتر سے برتر ہے
”عشق نبیؐ والوں سے پوچھو تخت سے تختہ بہتر ہے
کوئی بڑا اعزاز نہیں ہے اس اعزاز شہادت سے“
اہل ستم! تم اپنے ترکش کا ہر تیر چلا دیکھو
ظلم کے سنگیں ایوانو! تم چاہے سو سو وار کرو
اے طاغوت کے طوفانو! ہاں شوق سے تم یلغار کرو
”وقت کے فرعونوں سے کہہ دو‘ تم جو چاہو کر گزرو
ہم نہ ڈرے ہیں‘ ہم نہ ڈریں گے طوفانوں کی شدت سے“
جان اگر جاتی ہے جائے‘ ہاں‘ قائم ایمان رہے
اونچا رہے نبیؐ کا جھنڈا اس کی اونچی شان رہے
دنیا اور دنیا کی دولت‘ سب اس پر قربان رہے
”ایماں والو! سن لو‘ سن لو دھیان رہے ہاں دھیان رہے
ہے ناموس مسلمانوں کا ناموسِ ختم نبوتؐ سے“

(پروفیسر محمد یونس حسرت)

وہ حکمِ قتل سُن کر کیوں تھا ہشاش

کسی نے جا کے علم الدینؒ سے پوچھا
تُو حکمِ قتل سُن کر بھی ہے ہشاش

مقام ایسے پہ اب تیرا گزر ہے
جہاں ہوتا ہے شیروں کا جگر پاش

تجھے مرنے کا اپنے کیا نہیں غم
کہ آتا ہے نظر ہشاش بشاش

کہا اس مردِ غازی نے یہ سن کر
سنو کرتا ہوں میں رازِ دلی فاش

مجھے ہے شوقِ دیدارِ محمدؐ
ہو دل کو خوف سے مرنے کے کیوں جاش

میں سنتا ہوں، محمدؐ کہہ رہے ہیں
کہ "علم الدینؒ خوش آئی و خوش جاش"

یہ مژدہ سُن کے سیروں بڑھ گیا خون
نظر آؤں میں کیوں غم کیش و طیاش

محمدؐ کو مری آنکھوں سے دیکھو
پڑے ہو کیوں جہاں میں مثل خفاش

(روزنامہ سیاست لاہور 15 نومبر 1929ء)

لاہوروکراچی

(غازی علم الدین شہیدؒ اور غازی عبدالقیوم شہیدؒ کے کارناموں کے حوالے سے)

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالم معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اھلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدروقیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مردِ مسلماں، تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ لاَ تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا آخَرُ

(حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ)



شہیدانِ ناموسِ رسالت ﷺ

حضور نبی کریمؐ کی عزت و ناموس پر قربان ہو جانے والے خوش نصیبوں کا ایمان افروز تذکرہ

ترتیب و تحقیق
محمد متین خالد

- شہدائے جنگ یمامہ
- شہدائے تحریک ختم نبوت 1953ء
- غازی علم الدین شہید
- غازی عبدالقیوم شہید
- غازی حاجی محمد مانک
- غازی مرید حسین شہید
- غازی میاں محمد شہید
- غازی عبدالرشید شہید
- غازی عبداللہ شہید
- غازی منظور حسین شہید
- غازی فاروق احمد
- غازی محمد صدیق شہید
- غازی احمد دین شہید
- غازی عبدالمنان
- غازی زاہد حسین
- غازی بابو معراج دین شہید

اور بہت سے دوسرے عنوانات

- ظلمت دہر میں "چراغ اسم محمدؐ" کی اجلی اور کومل لوؤں سے اجالا کرنے والے ضو ریز و ضیا بار ماہتابی و آفتابی کرداروں کا روشن تذکرہ
- تھانوں کی تنگ و تاریک حوالاتوں، پھانسی گھاٹوں کی بے نور فضاؤں اور جیلوں کی کال کوٹھڑیوں میں "آبروئے ما زنام مصطفیٰؐ است" کا ورد کرنے والے کفن بردوش مجاہدوں کی زندہ جاوید روداد اور انوکھے مشاہدات
- ایک ایسی کتاب جس کا ایک ایک لفظ ناموس رسالت ﷺ پر حملہ آور ہونے والے بدطینت انسان نما ابلیسوں کے ایوانوں کے لئے برق قضا کی حیثیت رکھتا ہے۔
- یہ کتاب محض ایک کتاب نہیں...... خواجہ بطحاؐ کی حرمت پر کٹ مرنے والوں اور دشمنان رسالت مآب ﷺ کے ناپاک وجود سے دھرتی کو پاک کرنے والی پاکیزہ ہستیوں کا مختصر مگر مبسوط انسائیکلو پیڈیا ہے۔

فاتح پبلشرز
یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ
اردو بازار لاہور ☏:7321118